إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا

تذکرۃ الخلیل

سوانح قدوۃ العلماء تاج المحدثین
زبدۃ الفقہاء سراج المناظرین الامام الہمام الاوحد
مولانا الشیخ ابوابراہیم خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہ

مؤلفہ
حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ

ناشر
مکتبۃ الشیخ
۳/۴۴۵۔ بہادر آباد۔ کراچی ۵

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝

الحمد للہ کہ سوانح قدوۃ العلماء تاج المحدثین زبدۃ الفقہاء سراج الناظرین
امام الہمام الاوحد مولانا الشیخ ابی ابراہیم خلیل احمد المدنی المہاجر قدس سرہٗ
بنام

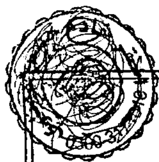
تذکرۃ الخلیلؒ

جس کے ضمن میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی، مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا الحاج صدیق احمد صاحب انبھٹوی، اور مولانا الحاج الشیخ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس اللہ اسرارہم کے پیارے حالات بھی آگئے ہیں۔ اور ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ مظاہر علوم کے دارالطلبہ و کتب خانہ اور قدیم دارالحدیث کے تین عکسی فوٹو مطبوعہ بھی شامل ہیں

مؤلفہٗ

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر مکتبۃ الشیخ ۳/۴۴۵ - بہادر آباد - کراچی



فہرستِ مضامین

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ آغاز

(از فرید الدین احمد الوجیہ)

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حق تعالیٰ شانہ کا کرم ہے کہ اس ہیچمداں کو برادرم الحاج شیخ متین احمد صاحب خلف اکبر محترم خان بہادر الحاج شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی ثم الباکستانی رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ تذکرۃ الخلیل کی اشاعت حسب خواہش وارشاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ اپنی بساط کے مطابق حصہ لینے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ سے میرے والد بزرگوار حضرت خان بہادر الحاج محمد وجیہ الدین صاحب میرٹھی ثم الباکستانی ثم مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اور میرے مرشد قطب العارفین حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی جو قلبی تعلق رہا ہے اس نے تذکرۃ الخلیل کے موجودہ ایڈیشن کی اشاعت کے لئے میرے قلب کے اندر ایک عجیب انبساطی کیفیت پیدا کردی اور میں اس خوش نصیبی کو انہی حضرات کا فیضان سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز خدمت کو اپنے کرم سے بہ طفیل حضور سرورِ کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ذخیرۂ آخرت بنائے۔

اس ایڈیشن میں سرخیوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جہاں ضرورت ہوئی ہے وہاں نئی سطر سے عبارت شروع کی گئی ہے، بغلی سرخیاں بھی جا بجا قائم کی گئی ہیں تاکہ جملہ افادی پہلو ناظرین کے سامنے آجائیں۔ ابواب کی اجمالی فہرست اور عنوانات کی تفصیلی فہرست کا بھی اضافہ کیا گیا ہے امید ہے کہ اس سے کتاب کی افادیت اور بڑھ جائے گی۔

کتاب کی اشاعت میں جن حضرات نے مختلف حیثیت سے دامے درمے سخنے قدمے میری امداد فرمائی ہے ان کا شکریہ ادا کرنا میرے فرائض میں سے ہے جن کے لئے دل سے دعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کے صلہ میں دارین کی عافیت عطا فرمائے۔ خصوصاً حسب ذیل حضرات قابلِ مبارکباد ہیں:-

الحاج الحافظ شیخ متین احمد صاحب } پسران خان بہادر حضرت الحاج شیخ رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
الحاج الحافظ شیخ انیس احمد صاحب

مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی

مولانا اخلاق احمد صاحب

مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی

خان صاحب الحاج پروفیسر بشیر احمد صاحب صدیقی

الحاج منشی محمد اعلیٰ صاحب

الحاج سرتاج الدین احمد صاحب ابن جناب حاجی حافظ مشتاق احمد صاحب کانپوری

الحاج آفتاب احمد صاحب ابن جناب حاجی حافظ مشتاق احمد صاحب میرٹھی مرحوم

اس صدی کے مشاہیر اہل علم میں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی بسنہ ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی گوناگوں دینی، علمی، تدریسی، اصلاحی اور تالیفی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں جن سے عوام اور خواص دونوں برابر استفادہ کرتے رہتے ہیں لیکن مولانا مرحوم کے حالات سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ مولانا میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور تراجم آئے دن چھپتے رہتے ہیں مگر ناشرین حضرات مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھتے۔ قارئین کو ان کے حالات کی جستجو ہوتی ہوگی مگر اس خصوص میں کچھ نہ معلوم ہونے سے ایک درجہ کی مایوسی ہوتی ہوگی۔

الحمد للہ کہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب مدظلہ نے ارشاد الملوک کے مقدمہ کے ساتھ مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات لکھ کر یہ کمی پوری فرمادی۔ حضرت شیخ مدظلہ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حالات "الجواہر الزواہر ترجمۃ البصائر" سے اخذ فرمائے ہیں اور اپنی طرف سے اضافہ بھی فرمایا ہے جو حسب ذیل ہے:-

مختصر حالات مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے اپنے ابتدائی حالات الجواہر الزواہر ترجمۃ البصائر میں خود ہی تحریر فرمائے ہیں اور بہت تفصیل سے ذکر فرمائے ہیں جن کو میں مختصراً نقل کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں:-

(نسب) عاشق الٰہی بن یاد الٰہی بن رحم الٰہی بن فضل الٰہی کی ولادت پانچ رجب سن بارہ سو اٹھانوے ہجری مطابق تین جون سن اٹھارہ سو اکیاسی عیسوی یوم جمعہ کو ہوئی۔

چار سال کی عمر میں الف با شروع ہوئی اور سن تیرہ سو چار ہجری میں جبکہ میری عمر چھ سال کی تھی قرآن پاک ناظرہ اور کچھ اردو کی کتابیں پڑھ لی تھیں اور بے پڑھے اخبارات کو فرفر پڑھنے لگا۔ سن تیرہ سو پانچ ہجری میں عربی شروع کر دی، اس کے بعد انگریزی اسکول میں دو سال تعلیم پائی اور اسی طرح متفرق تعلیم ہوتے ہوئے جمادی الثانیہ سن تیرہ سو گیارہ ہجری میں جبکہ میری عمر تیرہ سال کی تھی مدرسہ قومی میرٹھ میں داخلہ ہوا اور ابتداء سے میزان وغیرہ ہوئی۔ سن تیرہ سو بارہ ہجری میں مشکوٰۃ شریف شروع ہوگئی جبکہ عربی شروع کئے ہوئے صرف دس مہینے ہوئے تھے دو سال میں جملہ کتب صحاح و دینیات ختم ہوگئیں اور حضرت مولانا میر حسن صاحب امروہی نے دستار بندی فرمائی اس وقت میری عمر سولہ سال کی تھی۔

ربیع الثانی سن تیرہ سو پندرہ ہجری میں میرا نکاح اول ہوا اور اسی سال رجب سن تیرہ سو پندرہ ہجری میں لاہور مولوی فاضل کی تعلیم کے لئے چلا گیا اور اعلیٰ نمبر کی کامیابی حاصل کی

چار محرم سن تیرہ سو سولہ ہجری کو کامیابی کا انعام لینے کے لئے لاہور روانہ ہوا تو راستہ میں گنگوہ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت کی۔ ایک شب قیام کے بعد لاہور روانہ ہوگیا۔

واپسی پر سن تیرہ سو سترہ ہجری میں ندوۃ العلماء کی طلب پر ملازمت پر گیا اور چھبیس محرم سن تیرہ سو سترہ ہجری کو ندوہ میں پچیس روپیہ ماہوار پر میرا تقرر دار العلوم ندوہ کی دوم مدرسی پر ہوگیا لیکن آب و ہوا کی عدم موافقت اور اکابر کے عدم پسندیدگی کی وجہ سے آخر رجب میں واپسی ہوگئی۔

اور کچھ روپیہ قرض لیکر صفر سن تیرہ سو اٹھارہ ہجری میں خیر المطابع کے نام سے مطبع کھولا جس سے اجرت پر کتابیں طبع کرانے لگا اور ساتھ ہی مفید کتابوں کے تراجم میں مشغول ہوگیا۔ اور سب سے اول قرآن مجید کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور سن تیرہ سو انیس ہجری میں بصورت حمائل اس کو طبع کرایا وہ بہت جلد فروخت ہوگئی اور سن تیرہ سو بیس ہجری میں اس کو دوبارہ طبع کرایا اور اس کے ساتھ ہی اپنی تالیف الاسلام طبع کرائی جن میں اتنا نفع ہوا کہ جس سے میرا قرضہ بھی ادا ہوگیا اور مجھ پر حج بھی فرض ہوگیا۔

سترہ رجب سن تیرہ سو اکیس ہجری کو مع اپنی والدہ کے حج کے سفر کے لئے روانہ ہوا۔ حج کے بعد مدینہ منورہ بدامنی کی وجہ سے جانا نہ ہوسکا۔ محرم سن تیرہ سو بائیس ہجری میں سفر حج سے واپسی ہوئی اور اپنے سابقہ تجارتی مشغلہ میں مشغول ہوگیا۔ سن تیرہ سو تئیس ہجری میں دوسرا حج جو اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حج بدل تھا کیا اور ربیع الاول سن تیرہ سو چوبیس ہجری میں سفر حج سے واپسی ہوئی۔

سن تیرہ سو چھبیس ہجری میں تذکرۃ الرشید شائع کی۔

اور سن تیرہ سو اٹھائیس ہجری میں جب حضرت اقدس مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ

اور حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو میں نے بھی دفعۃً حج کا ارادہ کرلیا۔ اسی سفر میں شام، فلسطین اور مصر کا بھی سفر کیا۔

اور سن تیرہ سو تینتیس ہجری میں یہ رسالہ ارشاد الملوک ترجمہ امداد السلوک تصنیف اور طبع کیا۔

بائیس محرم سن تیرہ سو سینتیس ہجری کو میری پہلی اہلیہ نے انتقال کیا تین لڑکے (ڈاکٹر محمود الٰہی، مولوی حافظ مسعود الٰہی، حافظ مقبول الٰہی) اور دو لڑکیاں پسماندگان چھوڑیں۔ اسی سال ربیع الاول سن سینتیس ہجری میں میرا دوسرا نکاح ہوا اور اکیس شوال سن تیرہ سو اکتالیس ہجری میں مع دوسری اہلیہ کے چوتھے حج کے لئے روانہ ہوگیا۔ ربیع الاول سن تیرہ سو بیالیس ہجری کو واپسی ہوئی۔

ذی قعدہ سن تیرہ سو بیالیس ہجری میں پانچویں حج کے لئے روانہ ہوا حج سے فراغت پر مصر جاکر ٹائپ خریدا جس پر ہندوستان آکر جمع الفوائد طبع کرائی۔ یہ حالات الجواہر سے ماخوذ ہیں۔

اضافہ از زکریا

سن تیرہ سو چوالیس ہجری میں جبکہ حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ مستقل قیام کے لئے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کا ارادہ کررہے تھے تو تین جمادی الثانیہ سن چوالیس ہجری کو تین حضرات کا مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی کے لئے انتخاب فرمایا حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، الحاج شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی ثم پاکستانی نور اللہ مراقدہم یہ حضرات آخر حیات تک مظاہر علوم کے سرپرست رہے۔ حضرت میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے انتہائی مشاغل کے باوجود بہت ہی زیادہ انہماک اور توجہ سے اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار سمجھ کر مظاہر کی ایسی سرپرستی فرمائی کہ باید و شاید۔ بار بار تشریف لاتے، مدرسین کے اسباق میں بھی تشریف رکھتے۔ مدرسہ کے حسابات کو بھی بہت اہتمام سے ملاحظہ فرماتے۔ مولانا کو دفتری اور حسابی کاموں سے بھی بہت زیادہ مناسبت تھی، مالیات کے رجسٹروں کا گہری نظر سے ملاحظہ فرماتے، خزانہ کی پڑتال کرتے۔ سال میں کئی کئی مرتبہ طلب پر اور بلا طلب دفعۃً بھی بار بار تشریف لاتے۔

سن تیرہ سو اڑتالیس ہجری کے آخر میں چھٹے حج کے لئے تشریف لے گئے اور بیس محرم سن تیرہ سو انچاس ہجری کو حجاز سے واپسی ہوئی۔ حضرت میرٹھی نے الجواہر میں اپنے پانچ حج تحریر فرمائے ہیں، اس کے بعد اس ناکارہ کو بھی ایک حج یاد ہے جس کو بندہ نے لکھا ممکن ہے کہ مولانا نے کوئی اور بھی حج کیا ہو جو مجھے یاد نہیں۔

مولانا انتہائی زکی، انتہائی مدبر ظریف، خوش مزاج تھے لیکن منکرات پر بہت زیادہ غصہ آجاتا جو بسا اوقات سخت کلامی تک پہنچ جاتا۔ اول حضرت اقدس گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت کی تھی وہ اوپر ذکر ہوا۔ حضرت

قدس سرہٗ کے وصال کے بعد حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہ مہاجر مدنی سے رجوع کیا اور حضرت ہی سے خلافت اور اجازت بیعت سلوک ملی۔ حضرت اقدس سہارنپوری رحمہ اللہ کے وصال کے بعد مرشدِ اول کی سوانح کی طرح مرشدِ ثانی کی سوانح بھی تذکرۃ الخلیل تصنیف فرمائی جس میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت اقدس شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی نور اللہ مراقدہم کے مختصر حالات بھی ذکر فرمائے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد تصانیف وتراجم مولانا کی تصانیف میں مشہور و معروف ہیں۔

یکم شعبان سن تیرہ سو ساٹھ ہجری مطابق پچیس اگست سن انیس سو اکتالیس عیسوی دوشنبہ کی صبح کو چھ بجے وصال ہوا۔ چار بجے شام کو مکان کے قریب ہی اپنے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

حادثہ کے وقت بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ حضرت اقدس مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ ایک سفر سے سہارنپور واپس تشریف لائے اور اس ناکارہ زکریا سے ارشاد فرمایا کہ حضرت میرٹھی کی شدت علالت کی خبریں سنی جارہی ہیں خیال یہ ہے کہ رائے پور جانے سے پہلے حضرت میرٹھی کی عیادت بھی کرتا جاؤں بشرطیکہ آپ بھی ساتھ ہوں۔ میں نے قبول کرلیا اور قرار یہ پایا کہ اتوار کے دن جاکر دیوبند حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں قیام کیا جائے اور پیر کی صبح کو میرٹھ روانگی ہو۔ چنانچہ اتوار کو دیوبند حاضری ہوئی اور پیر کی صبح کو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ سے جب میرٹھ جانے کی اجازت چاہی تو حضرت مدنی قدس سرہ نے فرمایا کہ آج عقیقہ ہے[1] بکرا ابھی ذبح کراتا ہوں اس کا گوشت کھاکر جائیں لیکن مولانا میرٹھی کی کرامت ہو یا حضرت رائے پوری رحمہ اللہ کی، حضرت مدنی رحمہ اللہ سے اجازت لیکر میرٹھ روانگی ہوگئی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ چھ بجے مولانا میرٹھی کا انتقال ہوچکا ہے اور دو تار سہارنپور پہلا حادثہ کی اطلاع کا اور دوسرا جنازہ کی نماز میں انتظار کا سہارنپور جاچکے ہیں اور حادثہ کی اطلاع کا تار دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں بھی جاچکا ہے اور حضرت میرٹھی کی وصیت کے موافق جنازہ کی نماز میں اس ناکارہ کا انتظار تھا۔ جنازہ تیار تھا اور مکان سے متصل مسجد میں رکھا ہوا تھا اور زائرین کا ہجوم ہورہا تھا اس وقت حضرت اقدس مدنی کی تعمیلِ ارشاد نہ ہونے کی ندامت بھی جاتی رہی بعد میں حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی جانے کی تصویب فرمائی۔

---

[1] یہ عقیقہ عزیزم الحاج مولوی حافظ ارشد سلمہ کا تھا۔ (ز)

حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہ کی تصانیف بھی متعدد ہیں جو عام فہم ہونے کے علاوہ بہت زیادہ دینی حیثیت سے مفید ہیں مگر افسوس کہ وہ سب نایاب ہوگئیں۔ یہ رسالہ ارشاد الملوک بھی حضرت میرٹھیؒ کی تصنیف ہے اللہ جل شانہ پڑھنے والوں کو اس سے منتفع فرمائے اور حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہٗ اور ان کے مرشد اعظم قطب عالم حضرت گنگوہیؒ جن کی کتاب امداد السلوک کا یہ ترجمہ ہے اور اصل رسالہ مکیہ کے مصنف نوراللہ مرقدہ تینوں حضرات کی ارواح مقدسہ کو پڑھنے والوں کے پڑھنے کا ثواب عطا فرمائے اور ان ارواح پر اللہ تعالیٰ کی بہت ہی رحمتیں نازل ہوں کہ سالکین کے لئے اصل کتاب اور اس کا ترجمہ بہت ہی نافع ہے۔

اللہ یوفقنا لما یحب ویرضیٰ

تمہید حضرتِ مؤلف

مُبسمِلاً وّحامِداً وّ مُصلّیاً وّ مُسلّماً

بندۂ ناچیز عاشق الٰہی عرض کرتا ہے کہ تالیف کی دشواریاں وہی سمجھتا ہے جس کو اس کا اتفاق پیش آیا ہو، خصوصاً سوانح عمری جس کا مدار حافظہ و یادداشت پر ہے کہ زندگی میں کسی کو پتہ نہیں کون پہلے مرے گا کون پیچھے، اور اس لئے واقعات کے ضبط کرنے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ پھر سوانح بھی جب کسی جامع شریعت و طریقت بزرگ کی ہو جس کی عمر کا ہر لمحہ دین کے کسی علمی و عملی نرالے رنگ میں گذرا ہو کہ کوئی حال چھوڑنے کے بھی قابل نہیں اور کوئی ہر وقت ساتھ بھی نہیں رہا کہ تمام کارناموں کو محفوظ کرلے۔ اور اگر صاحبِ سوانح مؤلف کا روحانی باپ ہو تب تو اس کی دشواری کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا کہ یہ تعلق دردِ فراق سے رونے پر مجبور کرتا اور چلتے ہوئے قلم کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ ایسی اہم خدمت پر احباب اور بزرگوں نے مجھ جیسے نااہل کو مجبور کیا اور وہ بھی ایسے وقت کہ دماغ و دل بیکار ہوچکا اور ہاتھ میں رعشہ بڑھ گیا ہے۔

برادرانِ طریقت ؏ سے مدد چاہی کہ اپنی معلومات قلمبند کرکے بھیجدیں تو اکثر جگہ سے جواب آگیا کہ کچھ یاد ہی نہیں ہے اور بعض حضرات نے اپنے مکاتیب بھیجدیئے کہ اس سے انتخاب کرلو۔ یہ ایک مستقل دردسری تھی اور وہ بھی ناتمام، ہاں بعض حضرات نے کچھ معلومات بھیجیں جن کا شکرگذار ہوں مگر ضرورت تھی ہر عنوان میں کچھ نہ کچھ مدد کی اور وہ کہیں سے نہ ملی، سفر بھی کئے تقاضے کے خطوط بھی بار بار جگہ جگہ لکھے مگر جب کچھ نہ بن پڑا تو اپنی ہی یادداشت پر اکتفا کرکے بنامِ خدا قلم ہاتھ میں لے لیا اور سرسری فکر سے جو کچھ یاد آتا گیا لکھنا شروع کردیا۔ چونکہ بچپن سے اس کی عادت ہے کہ جب تک کاتب کے تقاضے کا بوجھ نہ پڑے کوئی مضمون لکھا نہیں جاتا اس لئے کتابت و طباعت کا ساتھ ساتھ معاملہ کرلیا۔

اتفاق کی بات کہ میری بھتیجی مرضِ احتباسِ نفاس میں مبتلا ہوگئی اور ایک مہینے سے زیادہ اس کو سرسامی دورے پڑے کہ ہر وقت تیمارداری ضروری تھی آخر اس کا انتقال ہوگیا اور مہینہ بھر بعد اس کی نشانی جس کی ولادت ماں کے لئے مرض الموت بنی تھی نیز رخصت ہوگئی۔

اسی اثنا میں بعض مخلص دوستوں کی شدتِ علالت اور نیز دیگر ضروریات سے بار بار سفر پیش آیا

اور دو مہینے یہ حالت رہی کہ ہفتہ میں تین دن کے لئے گھر آتا اور ہفتہ بھر کا مضمون لکھ کر کاتب کے حوالہ کر کے دوسرے سفر میں چلا جاتا تھا۔ اس سراسیمگی میں چلتے پھرتے پریشان و متفرق اوراق پر اس کا مضمون لکھا گیا کہ نظر ثانی کی بھی نوبت نہیں آئی اور ساتھ ساتھ لکھائی و چھپائی ہو کر چار مہینے میں مطبوعہ کتاب بن گئی صرف حق تعالیٰ شانہٗ کا فضل تھا کہ اس نے کام لے لیا ورنہ ظاہری لحاظ سے مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو حضرت کی حیاتِ طیّبہ کی سوانح کہہ سکوں۔ الحاصل جو کچھ بھی ہوا وہ نمونہ دکھانے کے لئے ضرورت پوری کرنے کے درجہ میں اس وقت پیش کرتا ہوں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اور التجا کرتا ہوں کہ زلت و لغزش سے چشم پوشی فرما کر دعائے خیر میں یاد رکھیں ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا[1]

کیا عجب ہے کہ دوبارہ طبع ہو تو اس سے اچھی حالت میں ہو جائے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ.

---

[1] میں امت کے بزرگوں سے محبت رکھتا ہوں گو خود ان میں نہیں ہوں شاید اللہ تعالیٰ اس محبت کی برکت سے مجھے بھی صلاحیت عطا فرمادیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی　　کز تو مجنوں شد پریشان وغوی[1]

از ہمہ خوباں تو افزوں نیستی　　گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا　　ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گذرا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ظلمتکدۂ[2] عالم کو نور بخشنے والا وہ پیغمبر دنیا میں بھیجا جس کے ہاتھ میں سیادتِ[3] رسل کا جھنڈا اور سر پر خاتمیتِ[4] انبیاء کا تاج تھا کہ قحط کی ماری ہوئی سوکھی زمین اُس کے قدموں کی برکات سے لہلہانے لگی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا ملک اُس کے چمکتے ہوئے چہرہ کی شعاعوں سے جگمگا اٹھا۔ وہ مخلوق جس کے قلوب اپنے پیدا کرنے والے خدا سے اتنے ناآشنا ہو چکے تھے کہ اپنی جیسی حادث وفانی ہستیوں بلکہ اپنے ہاتھوں گھڑی ہوئی مٹی اور لکڑی کی مورتوں کو عالم میں تصرف[5] کرنے والا خدا سمجھ بیٹھے اور کفر وشرک کو دین وایمان بنائے ہوئے تھے دفعۃً چونکے اور آخر اُس مقناطیسی کشش کی طرف منجذب[6] ہو کر جو آہن کو پارس بنانے کی غرض سے آئی تھی ایسے موحد بنے کہ دنیا میں شرک کا وجود اُن کو شاق گذرنے لگا اور اُن کی منتہائے[7] مراد صرف یہ رہ گئی کہ سطحِ عالم پر جو بھی پیدا ہو وہ کاش بجز حق تعالیٰ کے کسی کا بھی بندہ وغلام نہ بنے۔

اللہ اللہ، یا وہ وقت تھا کہ جس دن آپ نے توحید کا اعلان کیا تو ایک شخص بھی آپ کا ہمنوا نہ تھا بلکہ آپ کی انوکھی صدا کو بچہ بچہ حیرت ورنج وغصہ اور عتاب ودشمنی کی تیز نظروں سے دیکھتا تھا اور یا بائیسویں سال وہ وقت آیا کہ آپ محبانہ شوق میں اپنے محبوب خدا کا فریضۂ[8] حج ادا کرنے کیلئے

---

[1] بادشاہ نے لیلیٰ سے کہا کیا تو ہی ہے وہ جس کی وجہ سے مجنوں پریشان وسرگشتہ پھر رہا ہے۔ اور سب حسینوں سے تو تو زیادہ نہیں ہے بولی خاموش رہو کیونکہ تم مجنوں نہیں ہو۔ اگر تم کو مجنوں کی آنکھ میسر ہوتی تو سارا عالم تمہاری نظر میں بے قدر ہوتا۔ یہ اشعار مثنوی مولانا رومی کے ہیں یہ مضمون کے لئے ہیں کہ دنیوی عشق دوسری ہر چیز کو بے قدر کر دیتا ہے تو عشقِ خدا ورسول کے بعد کیا چیز قابلِ توجہ رہ سکتی ہے۔

[2] اندھیرا گھر۔ [3] تمام پیغمبروں کی سرداری کا۔ [4] سب پیغمبروں کو ختم کرنے والا ہونے کا تاج کہ بعد میں کسی قسم کا کوئی نبی نہ ہوگا۔ [5] موجود و نابود کرنے والا۔ [6] کھنچ کر۔ [7] لوہے کو پارس پتھری جس کے لگنے سے ہر چیز سونا بن جاتی ہے۔ [8] آخری۔ [9] حجۃ الوداع ۱۰ھ میں آخری حج۔

گھر سے نکلے تو ایک لاکھ سے زیادہ مجمع جس میں بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت، ملکی و غیر ملکی، امراء و فقرا، حکام و محکومین سب ہی شامل تھے، مشتاقانہ و غلامانہ طریق پر آپ کے ہمرکاب اور آپ کی ہر ہر ادا پر عاشقانہ و والہانہ طرز پر جاں نثار کرنے والے ساتھ تھے جن میں ہر فرد صرف ہدایت یافتہ ہی نہیں بلکہ ہادی و راہبر ہونے کی سند لے چکا اور اس کو سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ پروانہ عطا ہو چکا تھا کہ ان اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم[1] حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دینِ مبین کی پائیدار تخم ریزی چونکہ ختم دنیا تک قائم رہنے والی تھی اور آپ کے ہاتھوں کا لگایا ہوا باغ قیامت تک باقی و قائم رہنے والا تھا اس لئے آپ کے روشن کئے ہوئے چراغوں کا سلسلۂ نور رسانی متعدی ہوا اور ایک مشعل سے دوسری مشعل اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو کر ہر قرن اور ہر زمانے میں، ہر ملک اور ہر بستی کے اندر اس نور کا مخلوق کو نظارہ کراتا رہا جس کا اصل مخزن[2] قلبِ محمدی اور جس کا مشکوٰۃ[3] سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ باجود[4] تھا کہ حضرت روحی فداہ[5] خود ارشاد فرما چکے تھے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل[6]۔ یہ علماءِ امت جنھوں نے اپنے پیشوا، اپنے امام، اپنے ہادی اپنے سرور، اپنے آقا، اپنے مولیٰ اور اپنے مورثِ اعلیٰ[7] سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمِ قدس کو روانہ ہو جانے کے بعد آپ کی نیابت میں فرائضِ نبوت کو انجام دیا اور مخلوق کی رہبری کو اپنا مقصودِ حیات بنا دیا اولیاء اللہ کہلاتے ہیں جن کی تعداد حیطۂ شمار[8] سے باہر اور انسانی حدود حساب سے بیرون ہے۔

اسی گروہ کے ایک فرد کا کہ جن کا مبارک نام مولانا خلیل احمد ہے یہ شیریں تذکرہ ہے کہ اہل اللہ کے حالات اور سوانح میں بھی قدرت نے ایک ایسی حلاوت اور کشش عطا فرمائی ہے جو مظلم[9] قلوب کو نور، اور افسردہ دلوں کو تازگی بخشتی ہے جس کی وجہ سے ان حضرات کے کارنامے صدقاتِ جاریات[10] بن جاتے ہیں کہ بزمانۂ حیات جس طرح مخلوق نے اُن کی صورت کے نظارہ سے ہدایت کا سبق لیا تھا اسی طرح بعد الوفات ان کے حالاتِ عالیہ کی سماعت و مطالعہ سے توجہ الی اللہ[11] کا نفع پاتی اور رغبت و شوق کے ساتھ یہ کہتی ہوئی اپنے خدا کی طرف لپکتی ہے ؎

---

[1] میرے صحابی مثل ستاروں کے ہیں کہ جس کا اتباع کرو گے راہ یاب ہو جاؤ گے۔ [2] خزانہ۔ [3] وہ طاق جس میں چراغ رکھا ہو [4] سخاوت و فیض والا وجود۔ [5] میری روح ان پر فدا ہو۔ [6] میری امت کے علما بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں، یعنے جیسے وہ حضرات اپنے اپنے حلقہ میں دین کی حفاظت و اشاعت تبلیغ اور باطن کی درستی کیا کرتے تھے یہ بھی اپنے اپنے حلقہ میں کرتے مگر خاتم الانبیا کے خاتم الادیان کے لئے۔ [7] سب سے اوپر کے وراثت دینے والے کہ حضور کی میراث علم دین و تزکیہ ظاہر و باطن ہی ہے مال و دولت نہیں، جیسے حدیثوں سے ثابت ہے۔ [8] گنتی کے احاطہ سے باہر۔ گو محی الدین ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ ہر زمانے میں ایک لاکھ چوبیس ہزار ولی ہوتے ہیں جو تعداد بعض حضرات نے صحابہؓ کی لکھی ہے اور ایک حدیث میں انبیا علیہم السلام کی آئی ہے گو متواتر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر عقیدہ قائم نہ ہو گا۔ [9] تاریک [10] وہ نیکیاں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی قیامت تک ملتا رہے گا [11] اللہ سے محبت کی لو لگنے کا

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا[1]

تذکرۃ الخلیل کا سببِ تالیف

ایک ہرے بھرے باغ میں ہزارہا قسم کے پھول ہوتے ہیں جن میں ہر ایک کا رنگ دوسرے سے جُدا اور ہر ایک کی بُو دوسرے سے الگ ہوتی ہے لیکن اگر بلبل صرف گلاب کی پتیوں پر صدقے اور واری ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پھول پھول نہیں، یا اُن کی بوئے خوش جیجانے کے قابل نہیں۔ اسی طرح امتِ محمدیہ م کے ہزاراں ہزار سردارانِ ملّت میں سلفاً و خلفاً ہر بزرگ ایک جدا دلربائی لایا ہے جس کے میٹھے تذکرہ سے روح کو فرحت پہنچتی ہے مگر باوجود اس کے بندۂ ناچیز گلستانِ رشیدی کے ایک خاص نونہال کے تذکرہ کی طرف صرف اس لئے متوجہ ہوا کہ میری پیاس بجھانے اور ہر آن و ہر لحہ مجھ پر ایک خاص احسان فرمانے میں اس مقدس ہستی کو خاص دخل تھا۔ اس لئے جس طرح کسی دلق پوش بے نوا فقیر سے پوچھا جائے گا کہ تجھے سب سے پیارا کون ہے تو وہ کہے گا کہ میرا باپ۔ اسی طرح مجھ سے اگر کوئی سوال کرے گا کہ تیرے نزدیک بزرگ تر کون ہے؟ تو میرے روئیں روئیں سے یہی نکلے گا کہ مولانا **خلیل احمد** قدس سرہ العزیز۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتے[2] | تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامی شہر ازانہا خوشتر است | گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

بایں ہمہ اعتقاد ہے کہ اموات ہوں یا احیاء اور اسلافِ[3] گذشتہ ہوں یا اخلافِ موجودہ جتنے بھی اہلِ حق نائبینِ[4] رسالت ہیں اپنے سر کے تاج اور محبوب و مطاع ہیں کہ گو اُن[5] مختلف اور طرقِ تربیت الگ الگ ہیں مگر سب ایک بحرِ توحید کے غواص[5] اور ایک دریائے ہدایت کی نہریں ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے مراتبِ عالیہ میں ترقیات بخشے اور مخلوق کو ان کی ذات سے دینی برکات حاصل کرنے کا تا دیر وقت عطا فرمائے کہ یہی حضرات بقائے کائناتِ عالم کا سبب[6] بنے ہوئے ہیں۔

کسی بزرگ کی سوانح لکھنا درحقیقت اس کا منصب ہے جو صاحبِ سوانح کے حالات ظاہرہ و باطنیہ سے واقفیتِ کاملہ اور اس کے ساتھ مناسبت و مجانستِ تامّہ رکھتا ہو کہ ہر قول و فعل کو جو کہ

---

[1] ترجمہ تمہید کے آخر کے حاشیہ میں ہے۔ [2] ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ اے جوان تو نے تو سفر میں بہت شہر دیکھے ہیں ان میں سب عمدہ شہر کونسا ہے بولا وہی شہر جس میں محبوب ہو۔ [3] اگلے بزرگ، اخلاف پچھلے۔ [4] حضور کے قائم مقام۔ [5] غوطہ لگانے والے۔ [6] کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت جب آئے گی جب کوئی اللہ کہنے والا نہ رہے گا، ان حضرات کی بدولت اللہ اللہ کہنے والے رہیں گے تو دنیا باقی رہے گی، یہ نہ ہوں گے تو کہنے والے کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائیں گے پھر کائنات دنیا بھی ختم ہو جائے گی اس لئے یہ حضرات کائنات کے باقی رہنے کا سبب ہیں۔

ثمرہ ہے حالتِ قلبیہ کا وزن کرسکے اور اس کو اپنے موقع پر استشہاد[1] میں لاسکے، مگر بندۂ ناچیز کا حال یہ کہ اپنے مشاغلِ دنیا میں منہمک رہنے کی وجہ سے حاضری کا اتفاق بھی ماہوار ایک دو دن سے زیادہ نصیب نہ ہوتا تھا اور مناسبت کا تو ذکر ہی کیا کہ "چہ نسبت[3] خاک را با عالمِ پاک" مشہور مقولہ ہے۔ لہٰذا حضرت کے علم دوست اعزہ اور اہلِ مدرسہ سے منتظر تھا کہ اس خدمت کو انجام دیگر ایک جمِ غفیر کو مرہونِ منت اور خوشوقت بنائیں گے، مگر افسوس کہ تمنا پوری نہ ہوئی اور آخر یہ سمجھ کر کہ عمر کا ہر لمحہ غنیمت ہے جتنا وقت بھی اس خیال و دھیان میں گذر جائے نعمت ہے، اور مشتے نمونہ از خروارے[4] جو کچھ بھی ہدیۂ ناظرین ہو سکے مبارک ہے اس شغل کی طرف مائل ہوا اور شوق پورا کرنے لگا کہ مالا یدرک[5] کلہ لا یترک کلہ۔

سوانح کی ترتیب کے لئے مؤلف کا انتخاب

اس ترتیبِ سوانح میں بڑا دخل میرے بزرگوں حضرت مولانا سر رحیم بخش صاحب و حاج شیخ رشید احمد صاحب اور مخلص دوستوں حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب[2] کو ہے کہ ان حضرات کا حکم اور اصرار ہوا جس کی تعمیل سے انکار کو سوءِ ادب سمجھا ورنہ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں اپنی بے بضاعتی[6] و ناکارگی کے سبب حضرت کی سوانح لکھنے کا اہل نہیں اور نہ وہ قابلیت اپنے اندر پاتا ہوں جو کسی جامع شریعت و طریقت شیخ کی سوانح عمری کے لئے ضروری ہے۔ رہا تذکرۃ الرشید[7] کا قصہ کہ جس کی وجہ سے احباب کی نظریں میری طرف اٹھیں، سو حقیقت یہ ہے کہ اس کی تسطیر[8] و تکمیل جو کچھ بھی ہوئی وہ خود حضرت قدس سرہٗ کی توجہاتِ روحانیہ اور اعاناتِ قلبیہ و لسانیہ کی بدولت ہوئی، جس پر مجھے خود حیرت و استعجاب[9] ہے مگر اب خود حضرتؒ کی سوانح کس قلب اور کس قلم سے لکھوں کہ خود یتیم[10] اور مصدوم[11] القلب ہوں، اور یوں بھی بائیس[22] سال کا زمانہ گذر جانے کے سبب نہ وہ امنگ ابھار ہے اور نہ قلب و قلم میں وہ طاقت و زور کہ ہر قوت انحطاط پذیر ہے۔

مگر سمجھتا ہوں اس وقت سوانح کا مقصود تمامی احوال کا استیعاب[12] تو ہے نہیں کہ جس شخص نے اپنی عمر کے ستر سال کے ان گنت لمحات کو دینی خدمات میں صرف کیا اس کا وہی احاطہ کر سکتا ہے جو ہر لمحہ ساتھ رہا اور ہر قول و فعل کو ضبط و محفوظ کرتا رہا ہو اور ایسا دنیا میں کوئی ہے نہیں بلکہ جس کے ساتھ قلوب کو محبت و عقیدت ہوتی ہے اس کی زندگی میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ دن بھی خدا

---

[1] دلیل۔ [2] اسی وجہ سے متوسلین نے حضرت مؤلف جیسے خلیفۂ اجل کو انتخاب کیا تھا۔ [3] خاک کو پاک جان سے کیا نسبت۔ [4] ڈھیر میں سے ایک مٹھی نمونہ ہوتا ہے۔ [5] جو چیز سب نہ مل سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ [6] بے سامانی اور کام کے قابل نہ ہونے کے سبب۔ [7] حضرت مولانا محدث و قطبِ عالم رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی سوانح عمری جو آپ ہی کی تالیف ہے۔ [8] سطر بندی یعنی لکھنا۔ [9] سخت تعجب۔ [10] روحانی باپ سے یتیم۔ [11] دل کا صدمہ زدہ۔ [12] پورا جمع کرنا۔

دکھائے گا کہ یہ سایہ ہمارے سروں سے اُٹھ جائے گا اور لوگ ہم سے خواہشمند ہوں گے کہ ان کی سوانح لکھو اس لئے جو واقعات نظر کے سامنے گذرتے بھی ہیں وہ محفوظ نہیں رہتے اور اگر ان کو سوچا بھی جائے تو زلت[1] و غلطی کا احتمال ان کو لکھنے سے روکتا ہے۔

سوانح کی ترتیب میں مشکلات

اور ان وجوہ سے صاحبِ سوانح کے متوسلین[2] جن سے بھی درخواست کی جائے کہ اپنی معلومات قلمبند کر دیجئے کہ سب کو فراہم کر کے سوانح مرتب کر لی جائے تو چار طرف سے سکوت، یا یہ جواب ملتا ہے کہ کوئی بات بھی یاد نہیں۔ بایں وجہ سوانح میں کسی بزرگ کے ہزار کمالات میں ایک کمال کا اظہار بھی دشوار ہے۔ البتہ محض نمونہ کے درجے میں چند محاسن تذکرہ میں آجاتے ہیں جن کا مقصود صرف یہ ہے کہ جن قلوب میں تعلق مع اللہ[3] کی استعداد ہے ان کو اتباع کا شوق و رغبت پیدا ہو جائے اور یہ ذریعہ بن جائے ہدایت اور اس نور کے شیوع کا جو بوسائط اکابر امت سلسلہ بہ سلسلہ قلبِ محمدی کی مشعل و مشکوٰۃ سے حاصل ہوا اور تا روز قیامت منور و منتقل ہوتا رہے گا۔

پس جو کچھ بھی بن پڑا شکستہ دلی و ہموم[4] قلب کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پیش کرتا ہوں اور ہمعصر حضرات سے مستدعی ہوں کہ مورخ کی مشکلات اور نا اہل کی دشواریوں پر نظر فرما کر مسامحۃ[5] و چشم پوشی سے کام لیں اور ناقدانہ و معترضانہ نگاہ نہ ڈالیں کہ اپنے علمی و عملی ہر قسم کے ضعف کا مجھے خود اقرار ہے۔ جس نیت سے قلم اٹھانے کی جرأت ہوئی ہے حق تعالیٰ اس کو قبول اور زلتِ قلم[6] کو محو و معاف فرمائے تو انشاء اللہ کسی درجہ میں میرے اور نیز ناظرین کے لئے دینی بہبودی اور روحانی نفع سے خالی نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

---

[1] لغزش۔ [2] مرید اور فیض لینے والے [3] دنیا سے ہٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی قابلیت۔ [4] دل کے افکار [5] درگذر۔ [6] قلم کی لغزش کو مٹا دیں۔

حضرت کا وطن اور نسبی شرافت

خدا[1] در انتظارِ حمد ما نیست — محمدؐ چشم برراہِ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفٰی بس — محمدؐ حامد حمدِ خدا بس
مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد — بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمدؐ از تو می خواہم خدارا — الٰہی از تو حبِ مصطفٰی را

انبہٹہ کی وجہ تسمیہ سہارنپور[2] سے سولہ میل بجانبِ جنوب شرفاء کی ایک قدیم بستی ہے جس کو بزمانۂ فیروز تغلق بادشاہ ۷۷۲ھ میں سپہ سالارِ فوج سعد اللہ بیگ نے آباد کیا اور فیروز آباد نام رکھ کر فوجی کیمپ قرار دیا تھا، کچھ مدت کے بعد اس قصبہ کی شہرت انبہٹہ کے نام سے ہوگئی جس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے کہ بعض کہتے ہیں اس زمین کی صلاحیت اور زراعت و غلہ جات کی کثرتِ پیداوار کے سبب اس کا نام انبہٹہ ہوا کہ آنؔ غلہ کو کہتے ہیں، یا چونکہ انبہ اس جگہ بکثرت ہوتا تھا اس لئے انبہ ہٹہ یعنی انبہ کی آڑت اور منڈی بن کر انبہٹہ کہلانے لگا۔ بہر حال اس سرزمین کو نجیب النسل خاندانوں کی بود و باش کا فخر حاصل ہوا کہ صدیقی و فاروقی و ایوبی شیوخ اس میں آباد ہوئے۔

شاہ ابو المعالیؒ ۱۰۰۱ھ میں امام وقت حضرت شاہ ابو المعالی قدس سرہٗ نے اس کو قیام گاہ بنا کر اس فخر میں بیش از بیش اضافہ کر دیا کہ آپ کا وطن بن جانے کے بعد اس کا نام انبہٹہ پیرزادگان ہوگیا کیونکہ آپ نسباً سید اور مشرباً خاندانِ چشتیہ کے چمکدار ستارہ تھے جن کے نور سے بستی اور اس کا نواح معمور ہوا اور آپ کے صاحبزادہ شاہ محمد باقر کی پوتی محفوظ بی بنت نظام الدین ایوبی خاندان میں شاہ غلام محمد سے بیاہی گئیں اس رشتہ سے یہاں کے انصاری شیوخ شاہ ابو المعالی کی دختری اولادیں ہوئے اور پیرزادے کہلائے۔

شاہ ابو المعالی کی متوکلانہ زندگی شاہ ابو المعالی متوکلانہ و فقیرانہ شان سے ایام گذاری کرتے، کچے کوٹھے میں رہتے اور فاقہ و گمنامی کو محبوب[3]

---

[1] خدائے تعالیٰ ہماری تعریف کے انتظار میں نہیں نہ حضورؐ ثنا کے منتظر، حضور کی ثنا کیلئے پیدا کرنے والا خدا کافی، خدا کی تعریف کیلئے حضور تعریف کرنے والے کافی ہیں، اگر تم خدا و رسول سے مناجات کروگے ہی تو ایک شعر پر بھی قناعت کر سکتے ہو۔ کہ حضور آپ سے تو میں خدا کو طلب کرتا ہوں اور اے اللہ آپ سے حُبِ مصطفٰی کو۔ [2] ہندوستان کے صوبہ یوپی کا مشہور اور مردم خیز شہر۔ [3] اس لئے بے حد تنگی و فقر میں ساری عمر گذری۔ دنیا سے بے تعلقی اور آخرت سے شدید تعلق کا کمال ہے۔

سمجھتے تھے مگر آپ کا نور چونکہ پھیلنے والا تھا اس لئے شہرت مقدر تھی اور آج ایک کثیر مخلوق آپ کی ثناخواں ہے۔

شاہ بھیکؒ

شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ جن کا وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع انبالہ تھا حضرت شاہ ابوالمعالی کے خادمِ خاص اور عاشقِ جاں نثار تھے۔ ایک مرتبہ بارش زیادہ ہوئی اور شاہ بھیک اپنے وطن میں تھے کہ بارش کی کثرت دیکھ کر فکر ہوا کہ میرے پیر کا کچّا کوٹھا بارش سے گر گیا ہوگا اس لئے بے چین ہوکر گھر سے نکل کھڑے ہوئے راستہ میں دریا پڑتا تھا جس میں کشتی بھی نہ تھی مگر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اُسے عبور کرکے راتوں رات چل کر صبح کے وقت انبہٹہ پہنچے اور دیکھا کہ درحقیقت کوٹھا گر گیا اور شیخ باہر بیٹھے ہیں، سلام کیا اور شیخ کے دریافت کرنے پر اپنے مضطربانہ سفر کی وجہ بیان کرکے مٹّی لا لاکر کوٹھا دوبارہ تعمیر کردیا۔

شیخ کی خدمت

شیخ ایک مرتبہ کسی مخلص کی استدعا پر سہارنپور آئے تو شاہ بھیک ساتھ تھے اور ان کو معلوم تھا کہ پیرانی صاحبہ اور صاحبزادہ کو فاقے پر فاقے ہوتے ہیں اس لئے جب حضرت شیخ کی دعوت ہوتی تو شاہ بھیک علیحدہ جاکر یہ طے کر لیتے کہ دو آدمی کا کھانا زائد دینا پڑیگا[۱] چنانچہ عشا کی نماز شیخ کے ساتھ پڑھتے اور اس کے بعد دو نفر کا کھانا لیکر انبہٹہ روانہ ہوجاتے، دستک دیکر دروازہ کھلواتے اور کھانا حوالہ کرکے اُلٹے پاؤں واپس ہوتے حتیٰ کہ شیخ جب تہجد کے لئے حسبِ معمول اٹھتے تو شاہ بھیک لوٹا بھر کر پیش کرتے۔

چند روز بعد جب حضرت ممدوح انبہٹہ آئے اور بی بی سے پوچھا کہ کیونکر گذری تو ان کو تعجب ہوا اور کہا کہ اس دفعہ تو تم روزانہ کھانا بھیجتے رہے پھر گذر کا سوال کیسا؟ اور بیان کیا کہ دو گھڑی رات گذرنے پر ہر رات شاہ بھیک کھانا لاتے اور واپس ہوجایا کرتے تھے۔ شیخ یہ سن کر خاموش ہوگئے اور باہر آکر شاہ بھیک سے پوچھا تو انھوں نے صورتِ حال عرض کردی اور کہا کہ ماں جی اور صاحبزادہ صاحب تو فاقہ کرتے اور بھیک اپنا پیٹ بھرتا اِس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا۔

خدمتِ شیخ کا ثمرہ

شیخ کو اس جواب پر مسرت ہوئی اور یہ فرما کر کہ تو نے میرے توکّل میں تو فرق ضرور ڈالا مگر خدمت کا حق ادا کردیا اپنی چھاتی سے لگالیا اور روحانی نعمت جو کچھ دینی تھی وہ عطا فرمادی۔ شاہ بھیک نے اپنے قلب کو نورِ معرفت سے معمور دیکھا تو شیخ کے قدم[۲] چوم لئے اور مستانہ وار شوق میں یہ دوہا زبان سے نکلا۔

[۱] دعوت شاہ بھیک کی بھی ہوتی اور جس کی دعوت ہو اس کو کوئی شرط کرنا درست بھی ہے کہ اگر دعوت والا شرط مانے تو دعوت منظور ورنہ نامنظور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت میں حضرت عائشہؓ کی شرط لگائی تھی۔ [۲] یعنی عاجزی وانکساری کی اور شکریہ ادا کیا۔ یہ صرف محاورہ کے طور پر ہے قدم پر منہ رکھنا نہیں ہے۔

بھیکا مالی[1] پر واریاں پل میں سو سو بار ۔ کاگا[2] سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

یعنی بھیک (اپنے مرشد) ابوالمعالی پر ہر آن سو سو دفعہ قربان ہو کہ انھوں نے اس کو زاغ سے ہنس (یعنی ناکارہ و نااہل سے اہل) بنا دیا اور (ایسی جلدی بنایا کہ) دیر بھی نہ لگی۔ (ادھر سینہ سے سینہ لگا اور اُدھر ولایت و معرفتِ الٰہیہ نصیب ہو گئی)۔

۱۱۱۶ھ میں شاہ ابوالمعالی نے وصال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے بستی کی غربی جانب آپ کی خانقاہ اور مزار اب بھی موجود ہے۔

شاہ مدار آپ کے خلیفہ حضرت شاہ مدار اپنے شیخ کے جانشین[3] ہوئے جن کا مزار سمتِ مشرق ہے اور دوسرے خلیفہ حضرت شاہ بھیک ؒ نے موضع کوہ رام میں قیام کیا اور وہیں وصال فرما کر مدفون ہوئے۔

شاہ بھیک کی کرامت محمد شاہ[4] بادشاہ کا وزیر روشن الدولہ حضرت شاہ بھیک سے بیعت اور آپ کا مخلص مرید تھا اس کے اپنے دادا پیر شاہ ابوالمعالی کے پوتوں شاہ امام الدین اور شاہ نظام الدین کو صوبہ دار بنا دیا تھا کہ مخدوم بن کر آرام سے زندگی گذاریں۔ ایک مرتبہ ملک میں امساکِ باراں ہو کر قحط پڑا اور مخلوق گھبرا گئی تو محمد شاہ نے وزیر سے کہا کہ میں تو تمہارے پیر کا معتقد اس وقت ہوں گا جبکہ کل کو بارش ہو۔ روشن الدولہ نے عرض کیا کہ حضور میرا پیر تو خدا نہیں تھا کہ بارش برسانا اس کے اختیار میں ہو، البتہ خدا کا مقبول بندہ تھا اس لئے واسطہ دیکر اللہ سے دعا کروں گا، کیا عجب ہے کہ قبول ہو جائے۔ چنانچہ عشاء سے فارغ ہو کر تمام رات جاگا اور دعا مانگی کہ یا اللہ شاہ بھیک کا واسطہ[5] مجھ فقیر کو بھیک دے۔ آخر شب میں غنودگی طاری ہوئی اور خواب میں شاہ بھیک کی زیارت ہوئی کہ فرماتے ہیں کیوں گھبراتے ہو تمہاری دعا قبول ہوئی اور فلاں وقت بارش ہو گی۔ صبح کو روشن الدولہ دربار میں آیا تو بادشاہ نے پوچھا کہو دعا بھی مانگی؟ عرض کیا کہ ہاں جہاں پناہ مانگی اور الحمد للہ قبولیت کی بشارت بھی ملی کہ فلاں وقت بارش ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی وقت بارش ہوئی اور اتنا موسلا دھار مینھ برسا کہ مخلوق نہال ہو گئی۔

---

[1] باغ بنانے والا یعنی پیر۔ [2] کوا۔ [3] یعنی تعلیم و تربیت اور ظاہری و باطنی درستی میں ورنہ ایسی جانشینی جو بدعت ہے وہاں نہ تھی کہ اہل ہو نااہل ہو خواہ مخواہ پیر کا جانشین بنا دیں۔ درحقیقت ان حضرات کا مقام تو اللہ سے قوی تعلق اور سب کا ان سے تعلق قوی کرنا ہے جو اس کام کا اہل ہو یہ کام کرے جہاں رہ کر بھی کرے وہ قائم مقام اور جانشین ہے جو ایسا نہیں تو وہ تو دھوکہ باز اور دکاندار ہو اہلِ حق میں یہ نہیں ہوتا۔ [4] اورنگ زیب عالمگیر کا بیٹا۔ [5] یعنی آپ کا جو تعلق اپنے ولی شاہ بھیک سے ہے اور ان سے محبت کرنے والوں کو محبت ہے اس تعلق کے واسطہ سے بھیک مانگتا ہوں یہ اللہ سے مانگنا ہے اسی کی صفتِ تعلق کے واسطے سے مانگنا ہے یہ وسیلہ جائز ہے ورنہ خدائے تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں ہو سکتا۔ م

م احتیاط کرنے کی ضرورت ہے ورنہ بعض دفعہ گناہ اور بعض دفعہ شرک تک نوبت آجاتی ہے۔

بادشاہ نے خوش ہوکر وزیر سے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو، وزیر نے جواب دیا کہ میرے پاس حضور کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اب جو دینا ہو وہ میرے پیر کی اولاد پر وقف کر دیجئے چنانچہ بائیس[۱] گاؤں مزار کوہ رام پر وقف کئے گئے مگر شاہ بھیک کے جانشین سجادہ نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہاں جو کچھ آیا ہے وہ حضرت ابو المعالی رح کی عنایت و توجہ سے آیا ہے لہٰذا وہی مقدس جگہ اس کی مستحق ہے کہ اس پر وقف ہو، اس بنا پر معافی دوام شاہی عطیہ شاہ ابو المعالی کی اولاد کے نام منتقل ہوا جس کی آمدنی چھ ہزار تھی اور اب تک سجادگانِ شیخ اس پر قابض و متصرف ہیں۔

یہی انبہٹہ پیرزادگان حضرت مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی قدس سرہ العزیز کا وطن ہے جو کہ آپ کے مرشد حضرت قطب العالم مخدوم الکل امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کے وطن یعنی قصبہ گنگوہ سے پانچ[۱] کوس ہے۔

نسبِ عالی اور آپ اسی ایوبی خاندان کے ایک ممتاز فرد تھے جن کو شاہ ابو المعالی قدس سرہ کی دختری اولاد ہونے کے لحاظ سے سادات سے تعلق اور سید الاشراف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے، اس رحمی علاقہ کی وجہ سے بعض پیرزادگان نے اپنے کو نسباً سید سمجھا مگر حضرت قدس سرہ نے سلسلۃ الانساب کو اجداد کے ساتھ اہم اور اصل قرار دیکر ہمیشہ اپنے آپ کو ایوبی[۲] بتایا کہ نسبی شرافت کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں کہ آپ کے جد امجد حضرت ابو ایوب خالد انصاری صحابی رضی اللہ عنہ ہیں جن کا گھر اس مہاجر ماہتابِ رسالت کا مدینہ میں سب سے پہلا قیامگاہ بنا جس کو اہلِ مکہ[۳] نے ناقدردان بن کر اپنے سے علیحدہ کیا تھا کہ اسی گھر سے نعمتہائے خداوندی کی وہ تقسیم شروع ہوئی جس سے آج دنیا کا گوشہ گوشہ مالامال ہو رہا ہے ؎

مبارک منزلے[۳] کان خانہ را ماہے چنیں باشد ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

نسبی غلطی کی اصلاح چنانچہ آپ نے اپنے بھتیجے لطیف[۴] احمد سلمہ اللہ کو ان کے والد یعنی اپنے بھائی مولوی رشید احمد کے انتقال پر نسبی تحقیق کے جواب میں ایک خط تحریر فرمایا تھا جس کا ضروری حصہ بجنسہٖ درج کرتا ہوں :۔

---

[۱] تقریباً چھ میل مشرق میں ہے۔ [۲] صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ دختری اولاد کا نسب حضور سے ہے ورنہ نسب باپ کی طرف سے ہوتا ہے اب کسی سید کا نواسہ سید نہیں، حضور کا تعلق تو ہے اس لئے برکات کا سبب ہے۔ [۳] کتنا مبارک ہے وہ گھر کہ جس گھر میں ایسا چاند ہو، کیسی مبارک ہے وہ سلطنت کہ جس میں ایسا بادشاہ ہو۔ [۴] کراچی میں قیام تھا وہیں انتقال ہوا، اب ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد حنیف بھی راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔

"رشید احمد مرحوم ساکن انبہٹہ ضلع سہارنپور انصار کے خاندان میں سے تھے۔ اس نواح کے انصاری خواجہ ابوایوبؓ کی اولاد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے اجداد اصل گنگوہ کے رہنے والے ہیں جو انبہٹہ سے پانچ کوس ہے، ان کے اجداد میں سے شیخ عبدالرشید کے والد ایک خانہ جنگی میں مقتول ہوئے اس لئے ان کی والدہ ان کو اپنے میکہ سہارنپور میں لے آئیں اور ایک عرصہ تک سہارنپور رہیں، اس کے بعد ان کی اولاد میں سے شیخ غلام محمد کی شادی سید شاہ ابوالمعالی کے خاندان میں ہوئی اس کے بعد ان کی اولاد کا قیام انبہٹہ میں رہا۔ مرحوم کے والد کے دادا شاہ قطب علی صاحب انبہٹہ ہی میں رہے چونکہ شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سید تھے اس لئے شیخ غلام محمد کی جو اولاد سیدہ کے بطن سے ہوئی وہ اپنے آپ کو غلطی[1] اور بے علمی سے سید سمجھتے رہے۔ مرحوم چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لئے انھوں نے اس غلطی کو خلافِ دیانت سمجھ کر اپنے لئے پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے اجداد انصارین کی طرف منسوب کرتے رہے"۔

جدّی نسب حضرت قدس سرہ کا جدّی سلسلۃ الانساب جس کو حضرت کے چچازاد بھائی مولانا صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ مولانا فاروق احمد صاحب سلمہ ربہ شیخ الحدیث ریاست بھاولپور نے تحریر فرماکر بھیجا اور حضرت کے نواسہ داماد مولوی مسعود علی صاحب مدرس مظاہرِ علوم نے رسالہ المظاہر میں درج کیا ہے اس طرح ہے:-

مولانا شاہ خلیل احمد بن شاہ مجید[۱] علی بن شاہ احمد[۲] علی بن شاہ قطب[۳] علی بن شاہ غلام[۴] محمد بن شرف[۵] الدین[۶][2] خاں بن غلام محی الدین بن عبدالرشید[۷] بن محمد فضیل[۸] بن نظام الدین بن امن الدین عرف قاضی امن بن خواجہ فرید الدین بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤ الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ عبدالحمید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبداللہ انصاری بن خواجہ ابی منصور محمد بن علی بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابی منصور مست بن ابی ایوب خالد الخزرجی الانصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کہ قسطنطنیہ کی جنگ میں شہید اور وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت گنگوہیؒ سے نسبی اتصال دسویں پشت یعنی قاضی امن پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب اپنے روحانی باپ حضرت مرشد گنگوہی قدس سرہ کے ننہیالی نسب سے مل جاتا ہے جس کو بندہ تذکرۃ الرشید کے شروع میں بحوالہ شیخ محمد شفیع قدوسی گنگوہی نقل کرچکا ہے[3]۔

---

[1] کیونکہ نسب باپ کی طرف سے چلتا ہے گو بذریعہ ماں کے تعلق کے بھی حضور سے یہ علاقہ مفید ہوگا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت میں میرا نسب باقی رہے گا۔ [2] ان کا پورا نام نواب شرف الدین خاں تھا۔ [3] دیکھو تذکرۃ الرشید

مگر ہر دو منقولہ سلسلۃ الانساب میں اوپر چل کر کچھ اختلاف ظاہر ہو رہا ہے کہ گنگوہی شجرۃ الانساب میں خواجہ فریدالدینؒ اور خواجہ محمد فاضل کے درمیان خواجہ شاہ کا اور خواجہ شرف الدین[۱۸] و خواجہ عبدالحمید کے درمیان خواجہ بڈا کا توسط زائد ہے جو انبہٹوی نقل میں نہیں ہے۔ نیز اس میں خواجہ عبدالحمید[۱۹] ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ عبدالمجید ہے، اسی طرح اس میں خواجہ[۲۵] ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبداللہ ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ ہاشم بن خواجہ اسمٰعیل بن خواجہ عبداللہ ہراتی ہے اور ابومنصور[۳۳] مست و حضرت ابوایوب کے درمیان حضرت ایوب بن ابی ایوب کا توسط زائد ہے جو کثرتِ نقول میں کاتب کی زلتِ قلم سے اکثر ہو جاتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ صواب اس نقل میں ہے یا اس نقل میں۔

اجداد کا انبیٹھہ میں توطن

بہرحال حضرت قدس سرہ سلسلۂ اجداد سے ایوبی النسل ہیں اور آپ کے جدِ رابع شاہ غلام محمد کا عقد چونکہ حضرت سیدہ محفوظ بی بنت شاہ نظام الدین بن شاہ محمد باقر بن شاہ ابوالمعالی سے ہوا جن کے بطن سے شاہ قطب علی پیدا ہوئے اور یہی تعلق آپ کے اجداد کے قیام و توطن انبہٹہ کا سبب ہوا لہٰذا آپ کو سلسلۂ سادات کی طرف انتساب حاصل ہوا اور اس غیر اختیاری شرافتِ حسبی و نسبی نے آپ کے کمالاتِ علمیہ و عملیہ اور اخلاق طبیعیہ و روحانیہ میں وہ بے بہا اضافہ کر دیا جس پر زبان سے بے اختیار نکلتا ہے ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام   بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری[ل]

شاہ قطب علی اور ان کی اولاد

شاہ قطب علی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ نسبت بزرگ تھے ان کی لڑکیاں تو کئی[ع] تھیں جن کا تعلق ازدواج ساڈھورہ وغیرہ میں خاندان پیرزادگان کے ساتھ ہوا مگر لڑکا بڑی تمناؤں کے بعد حق تعالیٰ نے ایک ہی عطا فرمایا تھا جن کا نام احمد علی رکھا گیا، ان کو حق تعالیٰ نے بڑا صاحبِ نصیب بنایا اور چھ بیٹے عنایت فرمائے: شاہ محمد علی شاہ محمد نواز، شاہ احمد حسن، مولانا انصار علی، شاہ مجید علی، اور شاہ حبیب محمد۔

ایوبی خاندان میں گیا ہوا علم سب سے پہلے مولانا انصار علی صاحب کے ذریعہ آیا جن کے تین صاحبزادوں میں مولوی عبداللہ صاحب ناظم دینیات علیگڈھ کالج زیادہ مشہور ہیں۔

شاہ مجید علی اور ان کی اولاد

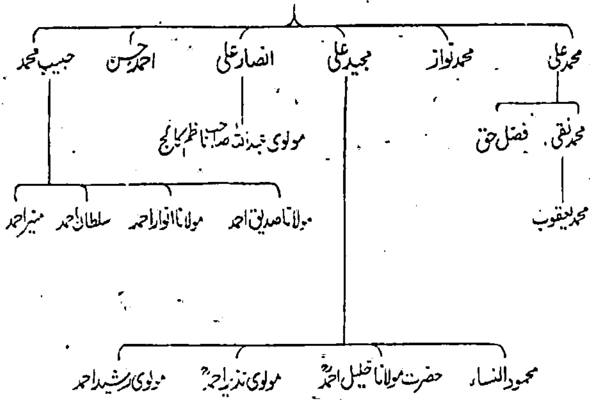
شاہ مجید علی صاحب کے چند لڑکیاں ہوئیں جن میں پانچ نے خورد سالی میں انتقال کیا اور ایک زندہ رہ کر صاحبِ اولاد ہوئیں

ل میں دنیا کے سب کناروں میں گھوما سب لوگوں کی محبتوں کو برتا، بہت سے اچھے لوگوں کو دیکھا ہے مگر تم ایک دوسری ہی چیز ہو۔ ۳۳ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ میں وفات پائی ۱۲ شیخ الحدیث

ع شاہ قطب علی کی سات لڑکیاں تھیں۔ (اخلاق احمد غفرلہ) ص جز ثالث

جن کا نام محمود النساء[عہ] تھا اور تین صاحبزادے ہوئے: حضرت مولانا خلیل احمدؒ، مولوی نذیر احمد[۱]، اور مولوی رشید احمد۔ اور شاہ حبیب محمد صاحب کے جو سب میں چھوٹے تھے چار فرزند ہوئے، مولانا صدیق احمد، مولانا انوار احمد، سلطان احمد، منیر احمد۔ وضاحت کے لئے مختصر شجرہ درج کرتا ہوں جس سے آئندہ تذکرہ واقعات میں مدد ملے گی اور معلومات تعلقات میں سہولت ہوگی۔

شاہ احمد علی



عہ موصوفہ کی شادی سہارنپور کے انصاری خاندان میں محمد حسن صاحب سے ہوئی ان کے دو لڑکے تھے الطاف احمد اور اشفاق احمد آخر الذکر میرے والد تھے۔ (اخلاق احمد غفرلہ)

۱ حضرت کی اولاد میں سے صرف ایک صاحبزادی منیر النساء زوجہ محمد ایوب کی اولاد صرف ایک بیٹی عطیہ خاتون زوجہ مولانا قاری سلطان سعود آج کل ڈیرہ غازی خاں میں ہیں جن کی اولاد ایک لڑکا بنام حنیف احمد ارشاد و پانچ لڑکیاں ہیں۔ (جمیل احمد تھانوی)

شاد[1] باش اے خستہ ہجرانِ بلا	کز پئے دردِ تو درماں میرسد
در دلِ افسردہ روحے می دمد	مردہ تن را مژدۂ جاں میرسد
بہرِ نشرِ علم و نشرِ نورِ دیں	بحرِ عرفاں مہرِ تاباں میرسد
سالکانِ جادۂ تحقیق را	قافلہ سالارِ کنعاں میرسد

ولادت اور طفولیت

حضرت قدس سرہ اواخر صفر ۱۲۶۹ھ ہجری مطابق اوائل دسمبر ۱۸۵۲ء میں اپنی نانہیال قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے آپ کی والدۂ ماجدہ بی مبارک النساء مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی حقیقی بہن اور حضرت استاذ الکل مولانا مملوک العلی صاحب قدس سرہ کی بیٹی تھیں جو کہ شوہر کے کسی ریاست میں ملازم ہونے کے سبب اپنے میکہ میں مقیم تھیں۔

مولانا مملوک العلیؒ

مولانا مملوک العلی صاحب جنھوں نے درسیات کا اکثر حصہ ماہتابِ ہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب دہلوی سے پڑھا تھا، فلکِ علم کے نیّرین[2] امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی و قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا محمد مظہر صاحب صدر المدرسین مظاہرِ علوم سہارنپور جیسی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاذ تھے کہ ان سب حضرات نے علوم دینیہ و فنونِ ادبیہ کی پیاس اسی بحرِ ذخار کے آبِ دہن سے بجھائی اور ہر چہار طرف سے پریشان ہو کر اسی آستانہ پر شفا و تسکین پائی تھی۔ آپ کی دوسری صاحبزادی مسماۃ نجیب النساء حضرت کے چچا مولوی انصار علی صاحب کے عقدِ نکاح میں آئیں کہ مولوی عبداللہ صاحب ناظمِ دینیات علیگڈھ کالج حضرت قدس سرہ کے چچیرے بھائی بھی تھے اور خلیرے بھی۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ دونوں کے حقیقی ماموں تھے۔

توأم ولادت

حضرتؒ اپنی والدۂ محترمہ کے بطن سے توأم پیدا ہوئے کہ آپ سے چند گھنٹے قبل آپ کے ایک بھائی تولد ہوئے جو تنومند اور خوش رو تھے اور ان کی دیکھ بھال میں مشغول ہو کر حضرت کی طرف کسی کی توجہ بھی نہ ہوئی کہ دُبلے ضعیف اور نحیف الجثہ[3] تھے۔ حتیٰ کہ آپ کو دایہ نے غسل بھی نہیں دیا اور ململ کے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر آپ کو علیحدہ کھٹولے پر ڈال دیا مگر قدرت کو منظور تھا

---

[1] خوش ہو جاؤ اے مصیبتِ ہجر کے مارو کہ تمہارے درد کے لئے علاج پہنچ رہا ہے، سست دل میں ایک روح پھونکی جا رہی ہے بے جان بدن کو جان کی خوشخبری پہنچ رہی ہے، علم پھیلانے اور دین کے انوار بکھیرنے کے لئے معرفت کا سمندر روشن سورج پہنچ رہا ہے؛ تحقیق کے راستہ پر چلنے والوں کے لئے کنعان کے قافلہ کا افسر (حضرت یوسفؑ جیسا) پہنچ رہا ہے۔ [2] آسمانِ علم کے چاند سورج۔ [3] کمزور جسم کے۔ (جمیل احمد)

کہ اس بچہ پر جس کی طرف ماں کی نگاہِ توجہ بھی نہیں اٹھتی ہے کسی وقت دنیا کی نظریں پڑیں اور اس کا نورانی چہرہ تماشاگاہِ عالم بنے اس لئے تو مند بھائی کو دنیا سے اٹھا لیا اور اس طرح ماں کی آغوش آپ کے لئے خالی ہو گئی کہ اب سارے کنبہ کی محبت و پیار کی نظریں خالص آپ پر پڑنے لگیں۔

آپ کے نام

ظہیر الدین اور خلیل احمد[1] دو نام آپ کے تجویز ہوئے اور چونکہ آپ کا بھائی نوزائیدہ دنیا سے رخصت ہوا تھا اس لئے تفاؤل کے درجہ میں اللہ رکھا بھی آپ کا نام پڑا۔ کنبہ کی بڑی بوڑھی عورتیں بچپن میں اسی نام سے آپ کو پکارتی تھیں۔ نیز چونکہ شروع سے آپ خوبصورت تھے جیسے گلاب کا پھول اس لئے بعض عزیزوں نے آپ کا نام موتی رکھا اور اسی نام سے آپ کو پکارنا ان کو پیارا معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے والد ماجد شاہ مجید علی[2] چونکہ ریاست میں ملازم تھے اور سفر کی وہ سہولتیں مہیا نہ تھیں جو آج ریل اور پختہ سڑکوں و موٹروں کی وجہ سے نصیب ہیں اس لئے برسوں میں وطن آنا ہوتا تھا اور اس وجہ سے آپ کی رضاعت اور ابتدائی تربیت زیادہ تر آپ کے ماموں اور نانا کے پاس ہوئی، تاہم آپ کی والدہ آپ کو لے کر انبہٹہ آتیں اور یہاں سسرال میں بھی کافی قیام کیا کرتی تھیں۔

مولانا مملوک العلیؒ صاحب نے بسم اللہ پڑھائی

عمر شریف کا پانچواں سال شروع ہوا تو آپ کو مکتب میں بٹھانے کی تجویز ہوئی اور خود آپ کے نانا حضرت مولانا مملوک العلی صاحب نے تبرکاً بسم اللہ شریف پڑھا کر قاعدہ شروع کرا دیا۔ فطرۃً آپ ذکی اور ذہین تھے اس لئے ناظرہ قرآن شریف جلد ختم کر لیا اور اس کے بعد اردو پڑھنا شروع کر دیا، انہی ایام میں ۱۸۵۷ء کا وہ سانحہ پیش آیا جو غدرِ[3] ہندوستان کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تاریخ ہندوستان سے اسلامی سلطنت کے جانے کی تاریخ ہے۔

۱۸۵۷ء کا حادثہ اور شاہ ظفر کے پیر حسن عسکری

آپ کے چچا شاہ حبیب محمد کے خسر حضرت شاہ حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ جن کی شادی انصاری خاندان انبہٹہ میں ہوئی تھی دراصل رامپور منہیاران کے رہنے والے تھے مگر ظفر بادشاہ ان کے معتقد تھے اس لئے حضرت ممدوح کا قیام دہلی میں رہتا تھا۔ جب شاہ دہلی قید کر کے رنگون بھیج دئیے گئے تو گورنمنٹ برطانیہ نے

---

[1] دین کے معاون اور حضورؐ کے دوست، قدرتی طور سے جامع شریعت و طریقت ہونے کا اشارہ بن گیا جو اللہ تعالیٰ نے سب کی زبانوں پر جاری فرمایا اور حفظ و امان میں ہونے کا اشارہ اللہ رکھا سے ظاہر کرا دیا اور حسنِ ظاہری و باطنی کو موتی سے (جمیل احمد)

[2] پیر جی مجید علی صاحب حضرت قدس سرہٗ کے والد کا انتقال ۲۲ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ کو ہوا۔ (شیخ الحدیث)

[3] انگریزوں کی غداری نے نام غدر مشہور کر دیا ورنہ جنگ آزادی کا آغاز تھا جو پاکستان کی بنیاد قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ جگہ جگہ اس پر جہاد ہوا اور بہت سے علماء شہید ہوئے بہت سے علماء نے ہجرت کی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے ہجرت اسی جہاد کے بعد کی تھی بہت علماء قید و قتل کئے گئے کتب خانے اور قرآن کی جلدیں جلائی گئیں دین پر طرح طرح کے حملے کئے گئے جن کی روک تھام کے لئے مدرسے قائم کئے گئے۔ (جمیل احمد)

شاہی خواص کو بھی بنگاہِ اشتباہ دیکھا اور اس لئے شاہ حسن عسکری روپوش ہوکر انبہٹہ چلے آئے کہ گو ان کی بیوی کا غدر سے چند سال قبل انتقال ہوچکا تھا مگر ان کی لڑکی مسماۃ امۃ اللہ جو کہ حضرت کی چچی اور مولانا صدیق احمد صاحب کی والدہ ہیں انبہٹہ میں موجود تھیں، اور یہ مصاہرت کا رشتہ اس کی امید دلاتا تھا کہ انصاری خاندان ان کی مدد میں کوتاہی نہ کریگا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شاہ احمد حسن کے علاوہ جو کہ اس وقت بسلسلۂ گورنمنٹی ملازمت کسی معزز عہدہ پر سندھ میں تشریف رکھتے تھے باقی پانچوں بھائی وطن میں موجود تھے اور انھوں نے پناہ گزیں عزیز کی حمایت میں اپنی جائیداد اپنے مال، اپنی آبرو، اپنے عیش وآرام اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالدیا کہ بارہا ان کے اور ان کی اکثر رعایا کے مکانوں کی تلاشی ہوئی مگر محصور کا پتہ نہ چلا اور گرفتاری عمل میں نہ آسکی۔ گورنمنٹ کی نظر اس وقت سیاست وانتظام پر تھی اور یہ حضرات اس پر اَڑے ہوئے تھے کہ بادشاہ کے پیر کو ملکی معاملات سے کیا تعلق اور بے گناہ کو اِس کس مپرسی کے زمانے میں موت کے حوالہ کردینا صریح ظلم اور بے دردی ہے جو کہ مذہب اور شرافت دونوں کے خلاف ہی ہاں امن ہوجانے کے بعد جبکہ تحقیقِ حالات کا زمانہ آئے تو معاملہ زیرِ تحقیق لایاجائے۔

حضرت کے والد اور چچاؤں کی گرفتاری

مگر وقت نازک تھا اور اس حمیت کو باغی کی حمایت سمجھا جاتا تھا اس لئے پانچوں بھائیوں کو گرفتار کر کے سہارنپور کی حوالات میں بند کردیا گیا اور کم وبیش ڈیڑھ دوماہ ان صاحبوں کو ان تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا، آخر شاہ احمد حسن صاحب اطلاع پاکر سہارنپور پہنچے اور بھائیوں کو چھڑا کر وطن لائے۔

شاہ حسن عسکری کی جرأت اور شہادت

شاہ حسن عسکری نے جب دیکھا کہ صرف میری وجہ سے میرے عزیزوں کو طرح طرح کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے اور ان کی شرافتِ خاندانی اس کو گوارا نہیں کرتی کہ مجھے آزاد کریں تو خفیہ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور سہارنپور پہنچکر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کردیا۔ آخر پھانسی پر چڑھادیئے گئے اور ساری جائیداد ضبط کرلی گئی جو امر مقدر تھا وہ کسی کے ٹالے نہ ٹلا مگر جس کے نامۂ اعمال میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ لکھ لیا گیا۔

مولانا صدیق احمد صاحب تو شاہ حسن عسکری کے نواسہ ہی تھے مگر ان کے ساتھ خود حضرت سے بھی شاہ صاحب کو اس درجہ محبت تھی کہ گویا نواسہ ہی ہیں اور یہ علامت تھی اس سعادت کی جس کا آئندہ ظہور ہونے والا تھا[۱]

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

[۱] یہ نیکی کی قوت بازو کے زور سے نہیں ہوسکتی جبتک کہ بخشنے والا خدا ہی نہ کسی کو بخشدے۔ (جمیل احمد)

اردو فارسی کی تعلیم

حضرتؒ نے قرآن مجید اور ابتدائی کتب اردو و فارسی کی تعلیم انبہٹہ اور نانوتہ میں مختلف اساتذہ سے پائی۔ آپ کی والدہ جہاں جہاں جاتیں آپ ان کے ساتھ ہوتے اور وہیں کسی مکتب میں سلسلۂ تعلیم شروع فرما دیتے کہ وقت ضائع نہ ہو۔ فارسی میں آپ بوستاں تک پہنچ لئے تھے مگر "ہونہار بِروا[1] کے چکنے چکنے پات" آپ پریشان رہا کرتے تھے کہ جس نظم اور قابلیت کے ساتھ جلد آپ فارغ ہونا چاہتے تھے وہ نانوتہ یا انبہٹہ میں کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اتفاق سے آپ کے چچا مولوی انصار علی صاحب جو کہ ریاست گوالیار میں بعہدۂ صدر الصدور فائز تھے بحصول رخصت وطن تشریف لائے اور بھتیجے کا شوق اور ذکاوت و ذہن دیکھ کر خواہشمند ہوئے کہ اپنے ساتھ گوالیار لیجائیں اور خود عربی و دینیات پڑھائیں۔

مولانا انصار علی کے ساتھ گوالیار میں

ہر چند کہ عزیزوں کا اور خصوصاً ماں کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ نورِ نظر کو آنکھ سے اوجھل کریں اور ایسے وقت کالے کوسوں بھیجدیں کہ آج آنے کا قصد کرو تو رتھ[2] اور بہل کی سواری میں مہینہ بھر گذار کر وطن پہنچو، مگر اللہ رے شوق علم دین کہ کسی نے بھی خلاف نہ کیا اور آپ طالب علم بن کر چچا کے ساتھ بہل میں سوار ہو گئے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت میں اپنے چچا کے ساتھ بہل میں سوار ہو کر بقصد گوالیار چلا ہوں تو میری عجیب کیفیت تھی، کبھی وطن کا چھوٹنا، والدہ کا فراق اور اقربا و ہمجولیوں سے جدا ہونا اپنا اثر ڈالتا اور مجھ کو پریشان بنا دیتا تھا اور کبھی وطن میں تعلیم کی بدنظمی اور حصولِ علم میں اپنی ناکامی و نقصان کا تصور ہو کر گوالیار میں یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مشغولیت اور چچا کی شفقت و حسنِ تعلیم کا رنگ غالب آتا تو مجھے باغ باغ کئے دیتا تھا، آخر اسی کشاکش میں بہلی روانہ ہو گئی اور میں وطن سے باہر نکلا۔ اس سفر میں کچھ ایسی دلچسپیاں تھیں کہ تھوڑا ہی سفر طے ہونے کے بعد وطن اور اہلِ وطن کا خیال نسیاً منسیا[3] ہو گیا اور سفر میں ہر نئی چیز کو دیکھ کر چچا سے اس کے متعلق پوچھتا اور تحقیق کرتا ہوا خوش خوش گوالیار پہنچ گیا۔ نیز فرمایا کہ میری عمر اُس وقت گیارہ سال کی تھی اور وہ واقعات اب محض خواب کی طرح ذہن میں رہ گئے۔

چچا کی شفقت اور عربی تعلیم کا آغاز

چچا کی شفقت و محبت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ گوالیار میں کوئی یہ نہ سمجھتا تھا کہ خلیل احمد ان کا بیٹا نہیں ہے، میرے چچا زاد بھائی مولوی عبد اللہ بھی چچا صاحب کے پاس تھے اور سب کو اتنا معلوم تھا کہ ان میں ایک حضرت مولانا کا بیٹا ہے اور ایک برادر زادہ، وہ مولوی عبد اللہ کو برادر زادہ خیال کرتے تھے

---

[1] پودہ۔ [2] یہ دونوں سواریاں بیلوں سے چلتی تھیں رتھ میں چار اور بہلی میں دو پہیے ہوتے تھے۔ [3] بھولا بھلایا (جمیل احمد)

حالانکہ واقعہ برعکس تھا کہ وہ بیٹے تھے اور یہ بھتیجا۔

گوالیار پہنچ کر حضرتؒ نے میزان الصرف اپنے عم بزرگوار سے شروع کی اور فطری ذہانت سے چند ہی روز میں صرف میر اور پنج گنج تک پڑھ لیا۔

گوالیار سے واپسی

اتفاق سے اسی زمانے میں حضرت کے والد ماجد شاہ مجید علی صاحب جن کی عمر کا اکثر حصہ ریاستوں کی ملازمت میں باہر ہی گذرا تھا ملازمت ترک فرما کر وطن تشریف لائے اور مستقل قیام فرمایا تو حضرت کو گوالیار سے وطن واپس بلالیا کہ خود پردیس سے آکر بھی لخت جگر پردیس میں نگاہوں سے دور رہا تو وطن آنے کا حظ ہی کیا نصیب ہوا۔ والدین کی محبت بھری آغوش اور نظر کے زیر سایہ رہ کر آپ کی تعلیم مولوی سخاوت علی صاحب کے حوالہ ہوئی جو قصبہ کے مشہور استاذ اور محترم عالم تھے اور آپ نے ان سے کافیہ تک پڑھا مگر آپ کی ذکاوت استاذ میں جس قابلیت اور تعلیم میں جس نظم کی جویاں تھی وہ یہاں حاصل نہ تھی اور یوں بھی وطن کا قیام اور گھر کا عیش و آرام اس شوق کو پورا نہ ہونے دیتا تھا جو آپ کے قلب میں موجیں مارا کرتا تھا۔

چھ ماہ انگریزی اسکول میں

آخر بعض اعزہ کی رائے ہوئی کہ اس طرح عمر ضائع کرنے سے کیا حاصل، ان کو سرکاری مدرسہ میں داخل کردیا جائے کہ انگریزی پڑھ لیں۔ چنانچہ آپ اور آپ کے چچا زاد بھائی مولانا صدیق احمد صاحب قصبہ کے انگریزی اسکول میں داخل ہوگئے جس کا ماسٹر ہندو تھا اور کافیہ تک نحوی استعداد ہونے کی وجہ سے چھ ماہ میں دونوں صاحبوں نے اتنی انگریزی پڑھ لی کہ دو سال سے پڑھنے والی جماعت کا مقابلہ کرنے لگے۔ اور گرامر یعنی انگریزی ترکیب پر تو اتنے قادر تھے کہ ماسٹر حیران ہوتا اور کہا کرتا تھا کہ تم ایسی جلد اور صحیح ترکیب کرتے ہو کہ میں بھی نہیں کرسکتا۔ مولانا صدیق احمد نے جواب دیا کہ ہم نے عربی میں شرح جامی پڑھی ہے اور اس لئے ترکیب[1] نحوی کسی زبان کی بھی ہو ہمیں دشوار نہیں، اس نے کہا کہ ہم کو بھی عربی پڑھادو، فرمایا بہت اچھا۔ مگر اس کو پڑھانے کا وقت کیا آتا خود انگریزی پڑھنے ہی کا وقت قریب الختم تھا کہ گو اپنے بڑوں کی تعمیل میں انگریزی شروع کردی تھی مگر دل اچاٹ تھا اور وہ قلب جو علوم عربیہ کا لذت آشنا ہوچکا تھا اس کا خواہشمند تھا کہ کاش علوم دین کی تعلیم کا کوئی بہترین انتظام ہوجائے اور یہاں سے چھٹکارا نصیب ہو۔

---

[1] لفظوں کے آپس کے جوڑ کے قاعدے جو کہ قرآن و حدیث کے حرف حرف کو پوری طرح حل کرنے کے لئے مسلمانوں نے مقرر کئے اور ایسے ہی لفظوں کے ردوبدل یعنی صرف کے اور جملوں کے تفاوت اور بلاغت کے بھی اور ساری دنیا کی زبانوں میں یہی قاعدے معمولی فرق سے چلتے ہیں پھر دین کے اہتمام کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا اہتمام بھی بہت رہا ہے اس لئے عربی کے ان قاعدوں کا جاننے والا ہر زبان کو ان قاعدوں سے جان لیتا ہے دوسرا شخص نہیں جانتا وہ تو محض رٹ لیتا ہے۔ (جمیل احمد)

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور موصوف کا داخلہ

دفعتہً ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد قائم ہونے کی خبر آپ کے کانوں میں پڑی اور یہ بھی سُنا کہ صدر مدرس آپ کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قرار پائے لہذا آپ کی طلب میں جوش آیا اور والدین سے اجازت چاہی کہ دیوبند بھیجدیں چنانچہ آپ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے آپ کے لئے کافیہ کا سبق تجویز فرما کر جماعتِ کافیہ میں شریک کر دیا۔

مدرسہ مظاہرِ علوم کا قیام اور موصوف کا دیوبند سے سہارنپور آنا۔

دارالعلوم دیوبند سے چھ مہینے بعد رجب ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا افتتاح ہوا اور مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کہ وہ بھی قریبی رشتہ سے حضرت کے ماموں ہوتے تھے یہاں صدر مدرس تجویز ہوئے۔ ہر چند کہ دیوبند میں تعلیم کے بہترین نظم کے ساتھ حقیقی ماموں کی شفقت مادری شفقت کا لُطف دے رہی تھی مگر قدرت کو منظور تھا کہ جس نونہال کے ہاتھوں مظاہرِ علوم کو حیرت بخش ترقی ہونے والی مقدر ہے وہ اسی مدرسہ کا خوشہ چیں و مرہونِ احسان بنے، اس لئے دیوبند سے آپ کا دل گھبرایا اور آپ سہارنپور چلے آئے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب سے بہ نسبت مولانا محمد مظہر صاحب کے اگرچہ زیادہ قریبی تعلقِ قرابت تھا لیکن پھر بھی خدا جانے دیوبند میں کیوں دل نہ لگا۔ جس وقت میں یہاں پہنچا ہوں بس اس طرح مانوس ہو گیا کہ گویا ہمیشہ سے یہیں رہتا تھا۔

انگریزی حرف شناسی

ہر چند کہ انگریزی کی چند ماہہ تعلیم کو آپ نے خیرباد کہہ دیا اور علم دین کے اشغال میں کوشش بھی کی کہ وہ پڑھا ہوا ذہن سے نکل جائے مگر اس بے توجہی پر بھی آپ انگریزی[1] حروف اور ہندسے پہچان لیتے اور حروفِ مفردہ کو جوڑ کر خطوط کی مہر وغیرہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ آپ کے بھتیجے مولوی فاروق احمد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ بہاولپور تشریف لائے اور آپ کے نام ایک خط آیا جس میں کاتب نے اپنا پتہ نہ لکھا تھا، حضرتؒ سوچنے لگے کہ کس کا خط ہے اور کہاں سے آیا ہے میں نے عرض کیا کہ مُہر ڈاکخانہ دیکھ لی جائے شاید اس سے کچھ پتہ چلے،

---

[1] میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ حضرت قیلولہ فرمانے کے بعد بیت الخلاء میں گئے، اس دوران میں میرے تایا زاد بھائی احسان احمد اپنی نئی سائیکل لے کر گھر میں آئے اور سائیکل ستون سے لگا کر کھڑی کر دی۔ جب حضرت فارغ ہو کر تشریف لائے تو ان کو شفقت سے پیار کیا پھر ان کی سائیکل دیکھی اور اس کی گدی پر انگریزی میں لکھا ہوا دیکھ کر فرمایا کیا لکھا ہے "بروکس"
(اخلاق احمد غفرلہ)

حضرت نے مُہر پر نظر ڈالی اور فرمایا فلاں فلاں حروف پڑھے جاتے ہیں، اور خط کا رُخ میری طرف کر دیا میں نے حیرت کے ساتھ عرض کیا کہ انگریزی حروف بھی حضرت پڑھ لیتے ہیں؟ فرمایا ہاں جب ابتدا میں انبہٹہ کے انگریزی مدرسہ میں داخل ہوا تھا اس وقت سیکھے تھے۔ حضرت اس کو مسرت اور شکر گذاری کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ حق تعالیٰ شانہٗ نے انگریزی سے نجات[1] دی اور علم دین نصیب فرمایا۔

تکمیلِ علم اور فراغِ تحصیل

جس وقت حضرت قدس سرہٗ مظاہر علوم میں تشریف لائے تو کافیہ شرح جامی کا کوئی سبق مدرسہ میں نہ تھا اور تمامی اسباق کا نظام الاوقات مرتب ہو چکا تھا لہٰذا مولانا محمد مظہر صاحب نے آپ کو مختصر معانی کی جماعت میں شریک کر دیا اور آپ دل نہاد ہو کر ہمہ تن تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے، آپ نے اکثر کتابیں خصوصاً کتبِ حدیث و فقہ و اصول و تفسیر حضرت مولانا محمد مظہر صاحب سے پڑھیں اور باقی کتابیں بالخصوص منطق و فلسفہ و ہیئت و ریاضی مدرسہ کے دیگر مدرسین سے، اس طرح ۱۲۸۸ھ میں جبکہ آپ کی عمر شریف انیس[19] سال تھی آپ نے درسِ نظامیہ ختم کر لیا اور پانچ سال میں مدرسہ سے سندِ فراغ حاصل کی۔

---

[1] آجکل کے مسلمان انگریزوں سے مرعوب ذہن کی بدولت انگریزی پڑھنے کو بیش بہا نعمت قرار دے رہے ہیں مگر یہ بات حقیقت پر غور نہ کرنے سے ہے۔ سینئے علم خود مقصود نہیں جس کام کا علم ہے وہ کام مقصود ہوتا ہے اور تمام علوم تو کوئی حاصل کر نہیں سکتا لامحالہ اہم اور ضروری کا انتخاب کریگا تو دین کا ہر کام ضروری اور بہت اہم ہے اس کے کاموں کا علم سب سے اہم فرض ہے اور اس میں کمال پیدا کرنا کچھ پر تو فرض باقی پر مستحب ہے اگر دنیوی علموں میں لگ کر یہ دینی فرض ترک ہوا جیسے کہ ہو رہا ہے تو انتہائی خسارہ ہے اور مستحب علم ترک ہوا تو یہ بھی خسارہ ہے گو اس سے کم ہے اور دونوں کو جمع کرنا جیسے ناتجربہ کار کہتے ہیں دونوں کو ناقص رکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جتنا وقت دنیوی علم پر لگے گا وہ دینی علم سے خالی رہ کر خسارہ کا سبب اور کمی کا باعث ہوتا ہے، دوسرے ضرورتیں سب کو ہیں نفس و شیطان سب کے ساتھ ہے اگر دینی طالب علم کو دنیا کا کوئی علم یا فن بھی سکھایا جائے تو اس میں غیر دلچسپی ہو کر اس میں نقص اور خلل ہوتا ہے کم سمجھ لوگ ہی ایسی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن جسقدر علمِ دین فرضِ عین ہے کہ عقائد و اعمال کے مسئلے معلوم ہوں وہ اسکولوں میں ہونا ضروری ہے تاکہ بچے مسلمان رہ سکیں اس کا اہتمام ضروری ہے

مولانا فیض الحسن سے عربی ادب کی تحصیل

اس کے بعد علوم ادبیہ میں مہارت کا شوق آپ کو پنجاب کی طرف کھینچنے لگا کہ ہندوستان کے مشہور ادیب مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اس وقت اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور علوم مشرقیہ کے استاذ اعظم تھے کہ طالبانِ علوم دور دور سے آکر انوارِ ادبیہ کا مولانا سے اقتباس کرتے اور فصاحتِ عرب کی حقیقت سے آشنا ہوکر مسرور و شادکام جایا کرتے تھے اس لئے باوجودیکہ فراغ کے بعد آپ کا تقرر بعہدہ معین المدرسین اسی مدرسہ میں ہو چکا تھا مگر ذوقِ عربیت نے آپ کو سفر پر مجبور کیا اور آپ نے لاہور پہنچکر مولانا سے علوم ادبیہ کی خاطر خواہ تکمیل فرمائی۔

حدیث و فقہ سے شغف

ہرچند کہ آپ نے تمامی علوم نقلیہ و عقلیہ میں کمال حاصل کیا مگر جو انس اور تناسب آپ کی طبیعت کو کلام الرسول اور علم فقہ کے ساتھ تھا وہ خود ہی اپنی نظیر ہے اور اس کی شہادت کے لئے حضرت کے چند ہزار وہ فتاویٰ جن سے مدرسہ کی ضخیم ضخیم چار جلدیں لبریز اور بھری ہوئی ہیں، و نیز آخر عمر کا زریں کارنامہ جس کا نام بذل المجہود فی حل ابی داؤد ہے پیش کرنا کافی ہے کہ بذل المجہود پانچ جلد بنکر مطبوع ہو چکی اور ہزاراں ہزار تشنہ کامانِ علم کو سیراب کر رہی ہے، اور فتاویٰ کے متعلق بھی خیال ہے کہ مدرسہ کی طرف سے مطبوع[۲] ہو جاویں تاکہ ہر قسم کی ضروریات شرعیہ سے عامۂ مخلوق قیامت تک منتفع ہوتی رہے۔ چند مخصوص فتاویٰ جو حضرت کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے تھے اور جن میں کسی عالم کی خلافِ تحریر کے سبب اہمیت تھی وہ نقل کراکر درج سوانح بھی کردونگا

مشکوٰۃ شریف اور صحاحِ ستہ کی تعلیم

مدرسہ کی روداد قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی پہلی کتاب مشکوٰۃ شریف حضرت نے ۱۲۸۵ھ میں پڑھی اور امتحان سالانہ میں اعلیٰ نمبر حاصل کرکے مختصر معانی و شرح عقائد انعام میں پائی۔ ۱۲۸۶ھ میں بخاری و ہدایہ اخرین میں امتحان دیا اور جامع ترمذی انعام میں ملی

ابوداؤد کی تعلیم لکھنوتی میں

غرض صحاح کی اکثر کتب آپ نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ سے ختم کیں مگر ابوداؤد اس زمانے میں نہیں پڑھی۔ چنانچہ بذل المجہود کے ترجمۃ المؤلف کی تسطیر کے وقت مولانا محمد زکریا صاحب کے استفسار پر حضرت نے خود فرمایا کہ میں نے

---

[۱] حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے فیض یافتہ بڑے زبردست عالم بیضاوی کامل کے محشی فیضی شرح حماسہ ریاض الفیض شرح سبعہ معلقہ وغیرہ بے مثال کتابوں کے مصنف، عربی فارسی اردو شاعری میں صاحب دیوان تھے۔ [۲] افسوس یہ نادر تحقیقات کا بیمثال مجموعہ ابتک طبع نہیں ہوا اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی صورت بنا دیں۔ (جمیل احمد)

ابوداؤد شریف دورہ کے ساتھ نہیں پڑھی بلکہ اپنی ملازمت کے زمانہ میں پڑھی ہے۔ میں خود بھی جہاں ملازمت پر ہوتا رمضان میں مکان پر چلا آتا اور حضرت استاذ بھی رمضان المبارک ان ایام میں اپنی سسرال قصبہ لکھنوتی میں گزارا کرتے تھے۔ ایک سال میں نے بھی رمضان وہیں گذارا اور ابوداؤد شریف[1] پڑھی۔ سال کی تعین تو یاد نہیں مگر میں تعلیم سے فارغ ہو ہوا کر ملازم ہو چکا تھا۔

سلسلۂ اسنادِ حدیث

پہلی سند از حضرت مولانا محمد مظہرؒ یہ ابتدائے حضرت کی دورہ کی تعلیم ہے جس کا سلسلۂ اسناد اس طرح ہے کہ آپ کے استاذ حضرت مولانا محمد مظہر[1] اور ان کے استاذ مولانا مملوک العلیؒ[2] اور وہ شاگرد تھے مولانا رشید الدین خاںؒ[3] دہلوی کے اور وہ مولانا شاہ عبد العزیزؒ[4] کے اور وہ حضرت حجۃ اللہ مولانا شاہ ولی اللہ[5] محدث دہلوی کے جن کا سلسلۂ اسناد مشہور و معروف اور اکثر کتب حدیث بالخصوص ترمذی شریف کے اوائل میں مطبوع موجود ہے اس لئے ان کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مظہر علوم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے بخاری شریف حضرت اقدس مولانا شاہ اسحاق صاحب مہاجر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی پڑھی ہے، اور شاہ صاحب اعلیحضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کے مشہور شاگرد ہیں۔ اس طرح پر حضرت کا سلسلۂ سند صرف دو واسطوں سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ کے ساتھ جا ملا۔

دوسری سند از مولانا عبد القیوم نیز ۱۲۹۳ھ میں جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھوپال میں مدرسی پر فائز تھے تو حضرت مولانا عبد القیوم[1] صاحب بڈھانوی سے جو کہ حضرت مولانا شاہ اسحاق[2] صاحب کے ارشد تلامذہ ہونے کے علاوہ داماد بھی تھے دوبارہ بخاری شریف، شمائل ترمذی، اور کچھ حصہ مسلم شریف کا و نیز مسلسلات[2] حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ و نوادر[3] اور درثمین پڑھ کر جملہ احادیث کی اجازت اور سند حاصل کی۔

---

[1] سات سو صفحات کی کتاب اس قدر قلیل عرصہ میں استاد شاگرد دونوں کی کرامت ہے۔ [2] وہ حدیثیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ کو پھر شاگرد در شاگرد آج تک ہر استاد سے اس کے شاگردوں کو کسی خاص کیفیت سے پہنچائی گئی ہیں بعض مصافحہ کے ساتھ بعض زمزم و کھجور کی دعوت کے ساتھ بعض ملتزم پر قبول دعا کے واقعہ کے ساتھ مسلسل آئی ہیں یہ رسالہ مطبوعہ ہے ملتا ہے۔ [3] وہ حدیثیں جو حضرت شاہ صاحب کو بلا واسطہ خود حضور سے پہنچی ہیں خواب میں یا بیداری کے مشاہدہ میں۔ (جمیل احمد)

تیسری سند از شیخ احمد دحلان پھراسی سال کے ختم پرجبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو حرمین شریفین کی پہلی مرتبہ حاضری نصیب ہوئی جو کہ حج فرض کا سفر تھا تو مکہ مکرمہ میں شیخ المشائخ مولانا الشیخ احمد دحلان مفتی شافعیہ سے روایت و اجازتِ حدیث حاصل کی۔

چوتھی سند از شاہ عبد الغنی مجددی اور مدینۃ الرسول میں محدث دار الہجرت استاذ الکل حضرت مولانا الشاہ عبد الغنی المہاجر المجددی النقشبندی کو جملہ کتبِ حدیث کے اوائل سنا کر بالاجمال اور قبولیت دعا عند الملتزم[1] کی بالتفصیل اجازت حاصل کی۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا عطا کردہ اجازت نامہ جس کو بندہ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرلیا تھا اور دعا عند الملتزم کی سند جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بندۂ ناچیز کو عطا فرماتے وقت خود ارشاد فرمائی تھی تبرکاً درج کرتا ہوں۔

اجازت نامہ از حضرت شاہ عبد الغنی مجددیؒ

الحمد للہ اولاً و اٰخراً والصلوٰۃ والسلام دائماً وسرمداً۔ اما بعد فیقول الملتجی الی حرم النبی عبد الغنی بن ابی سعید المجددی ساعفی اللہ بلطفہ الخفی قد قرء علیّ من اوائل الکتب الستۃ مولانا الشیخ خلیل احمد وطلب منی اجازتہا واجازۃ بقیۃ کتب الاحادیث والفقہ والتفسیر فاجزتہ ان یروی عنی ویجیز غیرہ من تاھل لھذا الفن الشریف مع الشرائط المعتبرۃ عند علماء ھذا الشان واللہ المستعان وصلی اللہ علی سید الانس والجان علیہ وعلی اٰلہ الصلوٰۃ و السلام الاتمان الاکملان + فی المدینۃ المنورہ سنہ ۱۲۹۴ھ (مہر)

یقول مولانا الشاہ عبد الغنی[1] اخبرنی بہ شیخنا عابد[2] سندی اجازۃ قال اروبہ عن عمی محمد حسین[3] الانصاری عن الشیخ محمد[4] بن محمد بن عبد اللہ المغربی عن الشیخ عبد اللہ[5] ابن سالم البصری عن الشیخ محمد[6] بن علاء الدین البابلی عن الشہاب[7] احمد بن خلیل السبکی عن النجم محمد[8] بن احمد بن علی الغیطی عن القاضی زکریا[9] الانصاری عن الحافظ ابن[10] حجر عن شرف[11] الدین ابی بکر بن عز الدین بن عبد العزیز بن جماعۃ عن یحیی[12] بن فضل اللہ العمری عن مکی[13] بن علان انا ابو طاہر[14] السلفی سمعت ابا الفتح[15] ابن مسعود الغزنوی یقول سمعت ابا الحسن[16] علی بن محمد بن نصر اللبان یقول سمعت ابا القاسم[17] حمزہ بن یوسف السہمی بجرجان

---

[1] ملتزم یعنی حجر اسود سے بیت اللہ کے دروازے تک کے حصہ پر دعا کے قبول ہونے کی جگہ۔

يقول سمعت ابا القاسم[١٨] عبد الله بن محمد بن خلف البزار بمصر يقول سمعت محمد[١٩] بن الحسن بن راشد الانصاری يقول سمعت ابابكر محمد ادريس[٢٠] المكى وهو وراق الحميدی واسم جده عمر يقول سمعت عبد[٢١] الله بن الزبير الحميدی يقول سمعت سفيان[٢٢] بن عيينة يقول سمعت عمرو[٢٣] بن دينار يقول سمعت عبد[٢٤] الله بن عباس[١] يقول سمعت النبی صلے الله عليه وسلم يقول الملتزم موضع يستجاب فيه الدعاء وما دعا الله فيه عبد الا استجابها قال ابن عباس فوالله ما دعوت الله عز وجل فيما الا استجاب لی منذ سمعت هذا من رسول الله صلے الله عليه وسلم قال عمرو وانا والله ما اهمنی امر فدعوت الله عز وجل الا اجابنی منذ سمعت هذا من ابن عباس وهكذا قال كل راو۔ يقول عبد الغنی وانا والله دعوت الله عز وجل فاستجاب لی (واجازنی بها الشيخ مولانا الحاج خليل احمد المهاجر الايوبی الانصاری اجازة وقال بعد سرد اسناده وانا اقول انی دعوت الله عز وجل فاستجاب لی) واخرج سعيد بن منصور والبيهقی فی سننهما عن ابی الزبير عن ابن عباس موقوفاً۔

تین دعائیں جو مقبول ہوئیں

عمر شریف کے اخیر حصہ میں جبکہ حضرت قدس سرہ نے بذل المجہود کی تالیف سے بلدۃ الرسول میں فراغ پایا تو فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حق تعالیٰ سے تین[٣] دعائیں مانگی تھیں جن میں دو کی قبولیت دیکھ چکا ہوں اور تیسری کا متوقع اور منتظر ہوں۔ ایک[١] دعا یہ مانگی تھی کہ عرب میں امن وامان کی حکومتِ اسلامیہ شرعیہ دیکھ لوں، سو الحمد لِلّٰہ وہ امن وامان آنکھوں سے دیکھا کہ جہاں پہاڑیوں میں قافلوں کا چلنا مشکل تھا اب تنہا آدمی سونا اُچھالتا ہوا بے خطر چلتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ دوسری[٢] دعا یہ تھی کہ بذل المجہود زندگی میں ختم کر لوں، سو الحمد للہ فارغ ہو لیا۔ تیسری[٣] دعا یہ تھی کہ بجوارِ رسولؐ اس سرزمین میں دفن ہونا نصیب ہو، سو توقع تو ضرور ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

چنانچہ دو ہی مہینے بعد اس کا ظہور ہو گیا کہ آپ نے بذل کے ختم سے پورے سات ماہ اور چوبیس[٢٤] دن بعد یعنی ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ یوم چہار شنبہ کو بعد عصر وصال فرمایا اور قبۂ اہلِ بیت کے متصل مدفون ہوئے۔ اطاب[٢] الله ثراه وجعل الجنة مثواه۔

---

[١] عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ ملتزم ایسی جگہ ہے کہ اس میں دعا قبول کی جاتی ہے کسی بندہ نے اس جگہ دعا نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرما لیا۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں خدا کی قسم جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا تھا کوئی دعا نہیں مانگی مگر وہ قبول ہوئی ایسے ہی سب راویوں نے کہا ہے۔ [٢] اللہ تعالیٰ ان کی مٹی کو پاکیزہ اور جنت کو ان کا ٹھکانہ بناویں۔ (جمیل احمد)

پانچویں حج کے بعد ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں بذل المجہود کا آغاز

میرا غالب خیال ہے کہ یہ تینوں دعائیں ملتزم ہی پر مانگی ہوئی تھیں جن کا شکراً للہ تعالیٰ[1] وتوثیقاً لھذہ الروایۃ المأثورۃ اس طریق پر اظہار فرمایا۔ بالخصوص تکمیل بذل المجہود کی دعا کہ ماہ شعبان ۱۳۳۴ھ پانچویں سفرِ حج سے واپس ہو کر آپ نے اس خیال و شوق کو ظاہر فرمایا اور ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو بنام خدا افتتاح فرما دیا، کام بہت بڑا تھا اور علاوہ اس کے کہ بہت یادِ علمی قابلیت اور دماغی محنت کو چاہتا تھا۔ کتاب کی ضخامت زیادہ ہونے کے سبب مدت مدیدہ اور زمانِ کثیر کو چاہتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کا دماغ علاوہ مجاہدہ و ریاضات اور افکار و صدمات و حوادث مختلفہ کے پوری نصف صدی یعنی پچاس برس خدمتِ تدریس میں مشغول رہنے کے سبب بہت زیادہ ضعیف ہو چکا تھا اس لئے بظاہر اسباب اس تالیف کی جس میں بیک وقت متعدد شروح و حواشی کے اقوالِ مختلفہ و کثیرہ کو مستحضر رکھنے اور کھوٹا کھرا پرکھ کر مشاہیر علماء کے آراء متنوعہ میں حق کو محقق کرنے کی ناقابلِ برداشت محنت تھی کسی طرح ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ موت کا استحضار اور لقاءِ رب کا اشتیاق ہر وقت آپ کے دل کو اُچاٹ بنائے ہوئے تھا اور بار بار آپ کی زبان پر آتا تھا کہ میرے اقران و ہمعصر سب رخصت ہو چکے دیکھئے اس مٹی کو کتنک گھسیٹنا مقدر ہے۔ اگر کبھی شوق کا داعیہ ہوتا بھی تھا تو مدت کا خیال فرما کر آپ خاموش ہو جاتے تھے کہ برسوں میں ختم ہونے والے کام کی امید کون باندھے۔

مگر سفرِ پنجم سے واپسی پر یکایک خیال کا عزم اور فعل کے درجہ میں آنا اس کی علامت تھی کہ آپ ملتزم پر دعا مانگ کر آئے ہیں اور قبولیت کے اذعان و یقین پر مایوس کن مشقت اور طولِ مدت کے واہمہ سے خالی الذہن ہو چکے ہیں، ورنہ یوں تو صدہا دعائیں آپ کی قبول ہوئیں اور متوسلین تو اس کے خوب تجربے کر چکے ہیں کہ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو حضرت سے دعا کی استدعا کرتے اور اس کی فوراً ہی قبولیت کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ پس یہ قوتِ یقین آپ کی ایک مستقل کرامت ہے جس کے سامنے ہزار کشوف و خوارق[2] بھی ہیچ در ہیچ ہیں کہ اس یقین ہی کے حاصل کرنے کو طالبانِ حق نے سلطنت چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور تخت و تاجِ دنیا پر لات مار کر دلقِ گدائی[3] اور صحرا نوردی کو ترجیح دی ہے ؎

خلیل آسا درِ ملک یقیں زن ۔۔۔ صدائے لا احب الآفلیں زن[4]

---

[1] اللہ تعالیٰ کے شکر اور اس حدیث کے بھروسہ کے لئے ذکر فرمایا۔ [2] معمول کے خلاف کام یعنی کرامتیں۔
[3] فقیری کی گدڑی اور جنگل جنگل گھومنے کو۔ [4] حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح ملک یقین کا دروازہ کھٹکھٹا اور نعرہ لگا کہ میں غائب ہونے والوں کو نہیں چاہتا یعنی فانی کو نہیں باقی کو چاہتا ہوں (جمیل احمد)

شاہ عبدالغنیؒ مجدّدی کا سلسلۂ اسناد

شاہ عبدالغنی صاحبؒ مہاجر مدنیؒ سلسلۂ طریقت میں اپنے جدّ بزرگوار مجدّد الف ثانی حضرت سید احمد سرہندی قدس سرہ کے طریقۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کے متمسک[1] اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ ابو سعید قدس سرہٗ سے بیعت اور مجاز[2] تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اور اسناد سلوک و اخذ طریقت ساتویں پشت پر حضرت مجدّد صاحبؒ سے اس طرح ملتا ہے: شیخ عبدالغنی بن ابی سعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسٰی ابن سیف الدین بن محمد معصوم بن احمد العمری السہرندی قدس اللہ اسرارہم۔

مسلم شریف، ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، سنن ابن ماجہ اور موطا امام مالکؒ بالاستیعاب آپ نے اپنے والد شاہ ابو سعیدؒ سے پڑھی، اور بخاری شریف قراءۃً و سماعاً[3] حضرت شاہ اسحاقؒ سے، شاہ اسحاق صاحبؒ اور شاہ ابو سعید صاحبؒ دونوں حضرات شاگرد ہیں حضرت محدث زماں شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم العمری کے پس ہر دو سلسلہ سے آپ کی اسنادِ حدیث تیسری پشت پر حجۃ اللہ البالغہ[4] سے جا ملی ہے۔

مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ صاحب نے شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادہ حضرت مولانا مخصوص اللہ کو پڑھ کر سنائی اور بعد ہجرت مدینۃ الغراء میں بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرکاً شیخ محمد عابد الانصاری السندی ثم المدنی کو پڑھ کر سنایا اور حضرت ممدوح نے جملہ صحاح کی آپ کو اجازت دی اور اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر عطا فرمائی۔

پانچویں سند از شیخ اسماعیل الرومیؒ

پھر مدینۃ الرسول ہی میں شیخ اسمٰعیل بن ادریس الرومی نے جو کہ مقدونیہ کے مشہور علامہ تھے خود اپنی خوشی سے صحاح کی اجازتِ کلّیہ آپ کو عطا کی۔ پانچوں اساتذہ کی اسانید بالتفصیل ایک مستقل کتاب کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں جس کا نام الیانع الجنی ہے لہٰذا نقل نہیں کی گئیں۔ انھیں سلاسلِ اسناد میں اگر حضرت قدس سرہ کا نام درج کر دیا جائے تو حضرتؒ کے تلامذہ کی اسنادِ حدیث صاحب الکلام والحکم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل و مکمل ہو جائے گی۔

محدث برزنجی مدنیؒ کی اجازت و سند

اس کے بعد ۱۳۲۳ھ میں جب حضرت قدس سرہ تیسری مرتبہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت مولانا سید احمد البرزنجی المفتی الشافعیہ ببلدۃ الرسول نے جملہ کتبِ حدیث اور تمامی فنون معقول و منقول

---

[1] تھامے ہوئے۔ [2] مرید کرنے کی اجازت دیئے ہوئے۔ [3] خود پڑھ کر اور دوسروں کے پڑھنے کو سن کر۔ جمیل احمد

[4] یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ (اخلاق احمد)

اور فروع واصول کی آپ کو اجازت دی اور اجازت نامہ لکھوا کر مہر سے مزین فرما کر آپ کے حوالہ کیا چونکہ بندۂ ناچیز اس سفر میں حضرت قدس سرہٗ کے ہمرکاب اور مولانا برزنجی کی خدمت میں حاضری کے وقت حضرت کے ساتھ تھا اس لئے خود بھی اس اجازت سے مشرف ہوا جو میرے پاس محفوظ ہے اور اس کا سلسلۂ اسناد نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت کے تلامذہ اخذ کر سکیں ÷

اجازت نامہ از حضرت مولانا سید احمد البرزنجی المفتی الشافعیہ بالمدینۃ المنورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی رفع دین الاسلام علی سائر الادیان۔ وجعل شانہ عالیا باصح سند برھان۔ وشید اعلامہ المشہورۃ الباھرۃ وآثارہ المعروفۃ المتواترۃ حتی لم یبق ریب بین الانام الخاص منھم والعام۔ فی انہ الحق المبین۔ وحبل اللہ المتین۔ فطرب عند روایۃ احادیثہ الحسنۃ الاسماع۔ واعترف ارباب النقد الصحیح بقبول وصلہ والاتباع۔ واستفاض بنقل الثقات العدول الاثبات دلائل صدقہ۔ وانکشف الغطا وبرح الخفا براھین حقہ۔ فمن اھتدی بھداہ الی صراطہ المستقیم۔ فاز بالحظ الاوفی والخیر العمیم۔ والصلوۃ والسلام الاکملان مددا۔ الاوفران عددا علی من ارسلہ اللہ علی فترۃ من الرسل نورا مبینا۔ یھدی الی اقوم السبل۔ فکشف الغمۃ وھدی الامۃ۔ واخرجھم من الظلمات الی النور۔ وفتنۃ الشیطٰن الکفور۔ وعلی الہ وصحبہ الذین اقتفوا آثارہ۔ وحفظوا سنتہ وآثارہ۔ وکل تابع باحسان۔ وحافظ الدین بالضبط والاتقان۔ اما بعد فان اشرف مقامات العبد القرب من المعبود۔ والتحلی بصفۃ الحضور والشھود۔ واعظم وسیلۃ الی ھذا المطلب النفیس الذی بہ تکون تزکیۃ النفوس فی القدیم والحدیث۔ علم الاسناد والحدیث۔ المشتمل علی الحکمۃ التی من اوتیھا فقد اوتی خیرا کثیرا وعلی ھدی خیر العباد الذی من اقتدی بہ فقد فاز فوزا کبیرا۔ فمن ثم توجھت ھمۃ صاحب الفضل والسماحۃ۔ والعلم والرجاحۃ۔ الھمام الاورع۔ والشھم السمیدع۔ الفائز من مدارک التقی باوفر نصیب۔ والحائز من مسالک الھدی للسھم المصیب۔ ذی المجد الشامخ۔ اللوذعی الکامل والعلامۃ الفاضل۔ حضرۃ جناب الشیخ خلیل احمد[1] بن الشاہ مجید علی حفظ اللہ واوصلہ اللہ الی ما یتمناہ لنیل ھذہ الطریقۃ المثلی۔ والسبق الی غایۃ تلک القصوی۔ فطلب منی ان اجیزہ بما رویناہ سماعا واجازۃ من الاسانید المختارۃ الممتازۃ وتلقیناہ من علماء ھذا الشان۔

---

[1] سلسلات جو خود حضرتؒ کی طبع کرائی ہوئی ہے اس میں یہاں یہ لفظ ہیں الشیخ خلیل احمد حفظہ اللہ الصمد بلفظہ المرید لنیل الخ (تیخ الحدیث)

واسلافنا الصالحين وسائر الاعيان. فلبينا دعوته واسرعنا اجابته واجزناه اجازة خاصة وعامة وشاملة تامة بجميع مسموعاتنا ومرو ياتنا من الصحاح والحسان فى المسانيد والسنن. العاصمة من رعاها حق رعايتها من الاهواء والفتن. وسائر المصنفات فى العلوم الشرعية الاصلية والفرعية و وسائلها من الفنون التى بها يتأدب الاديب. ويتطرز باعلامها حلة كل فاضل اريب. مما هو مرسوم فى اسانيد مشايخنا الاعلام. الكاشفين بنور التحقيق حجب الاوهام. عن وجوهات مخدرات من مقصورات فى الخيام. الذين منهم والدى العلامة المحقق الفهامة السيد اسمعيل عن والده العلامة السيد زين العابدين مفتى المذهب الحنفى والشافعى. مقنع القانع وشافى العى. عن والده جميل المآثر ذى الفضل الباهر السيد محمد الهادى عن عمه الامام العلامه السيد جعفر عن والده العلامه ابن فارض زمانه و حافظ عصره واوانه السيد حسن عن والده العلامه الآمر بالمعروف والناهى عن المنكر السيد عبد الكريم المدفون بجدة الشهير بالمظلوم عن والده الامام الاوحد والعلم المفرد العلامة السيد محمد بن السيد عبد الرسول الحسينى الموسوى البرزنجى مجدد القرن الحادى عشر ذى التصانيف السائرة سير المثل فى البدو والحضر وهو قد اخذ العلم عن جمع كثير وجم غفير من اعيان العراق والشام من كل نحرير وهمام ح وعن والدى السيد اسمعيل المشار اليه عن شيخ وقته الاستاذ المسند الشيخ صالح بن محمد الفلانى العمرى عن الشيخ المعمر المحقق المدقق محمد بن محمد العمرى الفلانى وعن غيره من اعيان عصره. ح وعن شيخنا العلامة السيد محمد الموافى الدمياطى نزيل طيبة عن الاستاذين الجليلين حسن عطار والشيخ ابراهيم الباجورى. وعن غير هؤلاء من اعيان عصر المتميزين وجهابذة المبرزين فاجزناه بجميع ما تلقيناه ورويناه واجازنا به اشياخنا المذكورون وغيرهم ووصيناه بالعمل والتقوى والاخلاص فى العلن والنجوى. فان لكل امرء ما نوى. بلغنا الله واياه من الديانة اعلى النهاية. واوفانا واياه من الامانة على كل غاية. ووفقنا جميعاً لنصر الحق ونصح الخلق ورزقنا سعادة الدارين وشفاعة سيد الكونين وصلى الله على من بهرت اياته وظهرت معجزاته سيدنا محمد سيد المرسلين وعلى اله الطيبين وصحبه اجمعين والحمد لله رب العالمين +

(مهر)

امر بكتابته مفتى الشافعية بالمدينة المنورة سابقاً

السيد احمد البرزنجى عفى الله عنه

شیوخِ روایت

الحاصل چونکہ حضرت قدس سرہٗ کو حدیث میں کثرتِ روایات، اور قوت سند کا جوکہ اس فن شریف کا مایۂ ناز ہے اہتمام تھا اس لئے مشاہیر علماء زماں میں آپ کے اساتذہ پانچ ہوئے: (۱) مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی۔ (۲) مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی۔ (۳) مولانا الشیخ احمد دحلان المہاجر المکی۔ (۴) مولانا الشاہ عبدالغنی المہاجر المدنی۔ (۵) مولانا السید احمد البرزنجی اطاب اللہ ثراہم وجعل الجنۃ مثواہم۔

سند ۶ از شیخ بدرالدین محدثِ دمشق

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تو وثوق کے ساتھ نقل فرماتے ہیں اور مجھے بھی غالب یاد اسی طرح ہے کہ ۱۳۲۹ھ میں جب بندہ حضرت سے اجازت لیکر براہِ حجاز ریلوے مدینہ منورہ سے دمشق گیا اور وہاں قطب الوقت مولانا السید بدرالدین محدث دام ظلہ کی زیارت کی جو علامہ نووی کے مشہور دارالحدیث کے جانشین اور نہایت متبع سنت یگانۂ وقت مرجع العلماء بزرگ ہیں تو بندہ کو احادیثِ صحاح اور بعض اورادِ مخصوصہ کی انھوں نے اجازت دی اور اجازت نامہ تحریری دستخطی مجھ کو عطا فرمایا۔ واپسیٔ وطن کے بعد جب حضرت سے اس کا تذکرہ ہوا تو حضرت نے بھی شوق ظاہر فرمایا کہ ایسے علامہ سے مجھے روایتِ حدیث کی اجازت حاصل ہوتی تو بندہ نے ایک مطبوعہ اجازت نامہ جس کے تین نسخے شیخ ممدوح نے چلتے وقت مجھ کو دیئے تھے کہ جس کو اس کا اہل پاؤ اس خالی جگہ میں اس کا نام لکھ کر میری طرف سے دیدینا، میں نے حضرت کا اسم شریف لکھ کر حضرت کی نذر کر دیا۔ یا یہ کہ حضرت نے والانامہ تحریر فرمایا اور شیخ بدرالدین نے اجازت نامہ خود دمشق سے روانہ فرمایا۔ بہرحال اگر یہ واقعہ صحیح ہے جیسا کہ غالب گمان ہے تو یہ سلسلۂ اسناد چھٹا ہے جس کو اپنی کتاب سے بہ تبدیلِ نام نقل کرتا ہوں کہ محفوظ رہے۔

اجازت نامہ از شیخ بدرالدین محدثِ دمشق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدك اللهم على متواتر آلائك۔ ونشكرك على مسلسل نعمائك۔ ونسئلك متصل الصلوات والتسليمات على المرفوع من بين المخلوقات وعلى آله المشهورة اخبارهم۔ واصحابه المستفيضة آثارهم۔ اما بعد۔ فان الاسناد من الدين۔ والآخذ به متمسك بالحبل المتين۔ فمن ثم عكف اهل العلم عليه۔ وتوجهت مطايا هممهم اليه۔ وامّا كان منهم مولانا الشيخ خليل احمد بن الشاه مجيد على الساكن فى سهارنفور من بلاد الهند وفقه الله تعالى لارشاد العباد۔

وسهل الله تعالیٰ لنا ولطرق السداد۔ طلب منی الاجازۃ التی ھی امان عند اقتحام المفازۃ۔ ولست اھلا ان استجاز۔ وھل یقال بمثل ھذا الجواز۔ الا انہ حسن فی ظنہ۔ اثابہ اللہ تعالیٰ علی قصدہ الجنہ۔ فاجزتہ بالمعقول والمنقول من فروع واصول۔ والاحادیث الشریفہ والآثار المنیفہ۔ کما اجازنی بذلک فضلاء العصر وجھابذۃ مصر منھم بحر الفضلاء ومعترف الفحول والنجلاء افضل من عنہ یتلقی۔ الشیخ ابراھیم السقا عن الامام المھذب العلامۃ الشیخ ثعیلب عن العلامۃ الشھاب الملوی ذی النور فی الدیجور عن الامام الشیخ عبداللہ بن سالم صاحب الثبت المشھور۔ وعن العلامۃ الشیخ محمد امیر عن والدہ الشیخ الکبیر وقد حوی ثبتہ الاسانید بما لایحتاج الی مزید فروی صحیح البخاری عن العلامۃ الشیخ علی الصعیدی حال قراءتہ بالجامع الازھر عن الشیخ محمد عقیلۃ المکی عن الشیخ حسن بن علی العجیمی عن ابی العجل الیمنی عن الامام یحیی الطبری قال اخبرنا البرھان ابراھیم بن محمد بن صدقۃ الدمشقی عن الشیخ عبدالرحمن بن عبدالاول الفرغانی عن ابی عبدالرحمن محمد بن شاذان بخت الفرغانی بسماعہ لجمیعہ علی الشیخ ابی لقمان بن مقبل شاھان الختلانی عن محمد بن یوسف الفربری عن جامعہ ۔ وروی صحیح مسلم عن الشیخ علی السقاط عن الشیخ ابراھیم الفیومی عن الشیخ احمد الفرقاوی عن الشیخ علی الاجھوری عن الشیخ نورالدین علی القرافی عن الحافظ جلال الدین السیوطی عن البلقینی عن التنوخی عن سلیمان بن حمزہ عن ابی الحسن علی بن نصر عن الحافظ عبدالرحمن بن مندۃ عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبداللہ عن مکی النیسابوری عن الامام مسلم ۔ واوصی المجاز المشار الیہ نظر اللہ تعالیٰ بعین العنایۃ الیہ بمجاھدۃ النفس وتفریغ القلب عن الاغیار۔ وتطھیرہ عن سفاسف ھذہ الدار وبملازمۃ الاذکار الماثورۃ۔ والادعیۃ المشھورۃ۔ والاکثار من الصلوۃ والسلام علی خیر الانام۔ مع المشاھدۃ المعنویۃ المنتجۃ للمجالسۃ الحسیۃ والمرجو من الشیخ المذکور ضاعف اللہ تعالیٰ لنا ولہ الاجور۔ ان لاینسانی من دعوۃ صالحہ۔ جعل اللہ تعالیٰ تجارۃ الجمیع رابحہ۔ وامدنا بالمدد الاسنیٰ وختم لنا بالحسنیٰ ۃ

العبد الفقیر الیہ تعالیٰ



محمد بدرالدین عفی عنہ۔ امین

حفظِ قرآن مجید اور اس کی محافظت

ایں[1] نہ عشق است آنکہ در مردم بود — ایں فساد از خوردنِ گندم بود
عشق[2] با مُردہ نہ باشد پائیدار — عشق را باحی و قیوم دار
عشقہائے[3] کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
عاشقی[4] با مُردگاں پایندہ نیست — زانکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست
خود[5] قوی تر میشود خمرِ کہن — خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

آہ زمانہ کا انقلاب بھی کیا عجیب تماشا گاہ ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ نومسلم اللہ والے دنیا کی ہر محبوب و پیاری چیز کو چھوڑ کر دین کے ایک مستحب اور مسنون فعل کی طرف لپکتے اور اس میں جو دشواری و تعب بھی پیش آئے اس کو لذیذ سمجھتے تھے، اور آج قدیم الاسلام حضرات دین کی معلومات کو بھی حقیر و بے سُود سمجھتے بلکہ کوئی دوسرا طلبِ علمِ دین میں پڑ جائے تو اس کو تنگ خیال اور بیوقوف سمجھتے ہیں، فیا اسفا نہ یہ بن پڑتا ہے کہ یکسو ہو بیٹھیں اور اتنا عرض کرکے خاموش ہو جائیں ؎

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

اور نہ اس کی کوئی صورت سمجھ میں آتی ہے کہ ان کو اللہ و رسول کی سچی محبت و عظمت سے آشنا کر دیا جائے اور پھر عرض کیا جائے کہ ؎

غمِ[6] دین خور کہ غمِ غمِ دین است — ہمہ غمہا فروتر از این است
غمِ[7] دنیا مخور کہ بیہودہ است — ہیچ کس در جہاں نہ آسودہ است

عجب پریشانی کا وقت ہے ؎

دوگونہ[8] رنج و عذاب است جانِ مجنوں را — بلائے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ

[1] یہ کوئی عشق نہیں جو انسانوں میں ایک دوسرے سے ہوتا ہے یہ تو گندم کھانے سے ایک فساد پیدا ہوا ہے۔ [2] مرجانے والے کے ساتھ عشق پائیدار نہیں ہو سکتا عشق تو اس ذات سے رکھ جو زندہ اور سب کی ذمہ دار ہے۔ [3] یہ جو عشق رنگ روپ کی وجہ سے ہوتے ہیں یہ عشق ہی نہیں انجام کار شرمندگی بنتے ہیں۔ [4] مرجانے والوں کے ساتھ عشق کرنا دیر تک رہنے والا نہیں ہو سکتا کیونکہ مر کر ہماری طرف وہ آنے والا ہی نہیں۔ [5] بہت قوی ہو جاتی ہے پرانی شراب خاصکر وہ شراب جو حق تعالیٰ کے پاس کی ہو۔ [6] تو اس پر افسوس ہی افسوس ہے۔ [6] دین کا غم کھایا کرو کہ غم تو بس دین کا ہی غم ہے اور سارے غم اس سے کم تر ہیں یعنی صرف دین کی فکر کرو۔ [7] دنیا کا غم نہ کھاؤ کہ بے فائدہ ہے بلکہ بے فکر رہو کیونکہ دنیا میں کوئی بھی آرام سے نہیں رہتا۔ [8] دونوں طرح مجنوں کی جان کو رنج و عذاب ہی ہے لیلیٰ کی جدائی کا امتحان بھی وصل کا بھی۔ (جمیل احمد)

جن کے قلوب ایمان سے خالی ہیں ان سے تو خطاب نہیں لیکن جن حضرات کو مرشدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بننے پر مسرت و فخر ہے ان سے ضرور کہا جائے گا کہ خدارا دنیا کی محبت اور طلب میں اتنے نہ کھیو کہ دین کی تعلیم سے عار و نفرت ہو جائے اور حفظِ قرآن مجید کو جو برکاتِ الٰہیہ کا سرچشمہ ہے عظمت کی نگاہ سے دیکھو کہ کلام کی عظمت سے صاحبِ کلام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے ؎

چیست[1] قرآں اے کلام حق شناس — رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف[2] حرفش راست در ہر معنٰی — معنٰی در معنٰی در معنٰی

تم کو اور تمہارے اسلاف کو ساری دنیا پر اس کی بدولت فخر ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہارے حوالے اپنا وہ کلام کیا جس کی حلاوت و طراوت کی نظیر سطحِ زمین پر نہیں ہے۔ وائے افسوس کہ اب شرفاءِ اسلام اس کی تلاوت و حفاظت سے بھی مستغنی و بے نیاز ہو جاویں ؎

دنیائے دنی[3] کی یہ ہوس جانے دو — گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو

مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ — اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

انگریزی سے گھبراہٹ

ہر چند کہ زمانے کی ہوا کم و بیش سب پر اثر کرتی ہے اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے والدین بھی قصبہ والوں کے بار بار مشورہ دینے اور خیر خواہانہ صورت پر اصرار کرنے سے متاثر ہوئے اور آپ کو بچپن میں انگریزی اسکول میں بھیج دیا کہ آپ کی فطری ذہانت سے بہت جلد ہر قسم کی دنیوی ترقیات متوقع تھیں۔ مگر قدرت کو آپ سے وہ دینی خدمات لینا تھیں جو انسان کی پیدائش کا مقصودِ اعظم ہیں اس لئے آپ کا مبارک قلب طفولیت کی کم سمجھی کے زمانے میں بھی انگریزی تعلیم سے گھبرایا اور روحانی علومِ الٰہیہ کا ایسا جویاں ہوا جیسا نوزائیدہ بچہ پستانِ مادر کے دودھ کا جویاں ہوتا ہے کہ اس طلب کے لئے نہ اس کو ترغیب کی ضرورت ہے نہ کسی کی رہبری و تعلیم کی حاجت۔ لہٰذا آپ کا خلت[4] آشنا دل از خود اس طرف متوجہ ہوا کہ عزیز وطن کو چھوڑ کر پردیس اختیار کریں اور پیرزادے یا ماموں کے لاڈلے بھانجے بن کر نہیں بلکہ ادنیٰ طالب علم بن کر غلامانہ انداز سے استاد کے سامنے بیٹھیں۔ پھر اہلِ وطن اور اقارب مجنوں کہیں یا دیوانہ، کسی کی ایک نہ سنیں ؎

دلا[5] خو کسے کہ داری دل در و بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

---

[1] اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن مجید کیا ہے؟ یہ لوگوں کے پروردگار کا جلوہ دکھانے والا ہے سب لوگوں کے پاس آیا ہے۔ [2] اس کے تو ایک ایک حرف کی بغل میں ایک معنی اور پھر معنی میں معنی، معنی میں معنی ہیں۔ [3] کمینی۔ [4] خلیل دوست پروردگار ہونے کا شوقین۔ [5] دل کے آرام کی جو چیز یعنی محبوب رکھتے ہو بس دل اسی میں لگاؤ پھر تمام جہان سے آنکھ بند کر لو۔

اسی دیوانگی نے آپ کو گیارہ برس کی عمر میں آغوشِ مادر سے جدا کرکے گوالیار پہنچایا اور اسی شوق و ولولہ نے جبکہ آپ کی عمر کا چودہواں سال شروع ہوا انگریزی چھڑا کر دیوبند پہنچایا۔ یہی علمِ دین کا احترام اور اس کے حصول میں تعب و تنہائی کا لطف آپ کو سہارنپور لایا ؎

کشند[1] از برائے دلے بارہا ۔۔۔ خورند از برائے گلے خارہا

اور یہی اشتیاق آپ کو بیس سال کی عمر میں لاہور لے گیا حالانکہ آپ علومِ دینیہ سے فارغ ہوتے ہی مظاہرِ علوم میں معین المدرسین بنا دیئے گئے اور چار روپیہ ماہوار کا بصورتِ وظیفہ تقرر ہو کر کارِ تدریس آپ کے حوالہ کر دیا گیا تھا مگر علم تو سمندر کا پانی ہے کہ جتنا پیو اسی قدر پیاس بڑھے اور عمرِ نوح بھی اس میں ختم ہو تو هَلْ مِنْ مَّزِيْد[2] کی صدا بلند ہو ؎

رَضِيْنَا قِسْمَةَ[3] الْجَبَّارِ فِيْنَا ۔۔۔ لَنَا عِلْمٌ وَّ لِلْجُهَّالِ مَالُ
فَاِنَّ الْمَالَ يَفْنٰى[4] عَنْ قَرِيْبٍ ۔۔۔ وَاِنَّ الْعِلْمَ بَاقٍ لَّا يَزَالُ

قرآن کریم حفظ کرنے کا واقعہ مدارس میں ماہِ رمضان کی تعطیل ہوا کرتی اور آپ امتحان سے فارغ ہو کر آخر رمضان میں مکان تشریف لے آیا کرتے تھے کہ والدین کی زیارت کے ساتھ ساتھ مبارک مہینے کے دن روزوں میں اور راتیں تراویح و تلاوتِ قرآن مجید میں گزار کر سال آئندہ کی دماغی محنت کے لئے طیار ہو جائیں۔ وطن میں حفاظ کی کمی تھی بالخصوص شرفا میں کہ حفظِ قرآن مجید کا شوق بھی نہیں رہا تھا اس لئے آپ اور آپ کے چچازاد بھائی مولوی صدیق احمد صاحب جو دیوبند میں پڑھتے اور پھر حصولِ علم کے لئے مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے محلہ سے دور مسجد میں تراویح پڑھا کرتے تھے جہاں حافظ رحیم بخش نور باف[5] سنایا کرتے تھے۔ ایک سال بزمانہ طالب علمی آپ رمضان میں سہارنپور سے اور مولوی صدیق احمد صاحب مالیر کوٹلہ سے وطن آئے ہوئے تھے یہ دونوں حضرات اپنے ایک تیسرے عزیز مولوی اسحاق بن حمید علی کو کہ وہ بھی طالب علم تھے لے کر حافظ صاحب کے پاس گئے اور درخواست کی کہ امسال ہماری مسجد میں قرآن مجید سنا دیجئے کہ جو لوگ ضعف یا کسل کے سبب یہاں نہیں آسکتے اُن کے کان بھی اس کے لذت[6] چشیدہ بن جاویں۔ مگر انھوں نے بے پرواہی کے ساتھ ٹکا سا انکاری جواب دیدیا اور برواینۃ! بار بار اصرار پر انھوں نے تیز لفظوں میں کہا کہ ایسا ہی قرآن سننے کا شوق ہے تو خود حفظ کیوں نہیں کر لیتے حدیث پڑھنے کے لئے تھے قرآن یاد نہیں ہوتا۔

---

[1] ایک دل کے واسطے بہت سے بوجھ کھینچتے ہیں ایک پھول کے واسطے بہت کانٹے کھاتے ہیں۔ [2] کیا اور بھی زیادہ ہے۔
[3] ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر جو ہم لوگوں کے درمیان ہے خوش ہیں کہ ہمارے لئے علم ہے اور جاہلوں کے لئے مال۔ [4] کیونکہ مال عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم لازوال باقی رہے گا۔ [5] کپڑا بننے والے۔ [6] مزہ چکھے ہوئے۔ جمیل احمد

ان کا یہ کہنا حضرت کو بہت شاق گذرا کہ گویا قرآن مجید کا حفظ کرنا حدیث پڑھنے سے زیادہ مشکل و دشوار ہے اس لئے وہاں تو خاموش ہوگئے مگر تینوں نے مشورہ کیا کہ اس مرتبہ تو جس طرح ہو سکے گذار لو مگر آئندہ سال تینوں دس دس پارے یاد کر کے وطن آویں کہ ایک شروع کے دس اور دوسرا درمیان کے دس اور تیسرا آخری دس، اور اپنی مسجد میں سناؤ کہ یہ احتیاج سوال پھر نہ ہو۔ چنانچہ بعد رمضان اپنے اپنے مدرسہ میں چلے گئے اور مطالعۂ کتب و تکرار سے جو وقت بچتا اس میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ ہرچند کہ ارادہ دس پارہ کا تھا مگر جب سلسلہ چل پڑا تو آپ کی بڑھنے والی ہمت رکی نہیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ جب آخر رمضان میں وطن آئے تو پورے قرآن مجید کے حافظ بن کر آئے۔ اور یہی قصہ مولوی اسحاق صاحب کا ہوا مگر افسوس کہ مولوی اسحاق کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ حافظِ قرآن بن کر محراب سنانے سے قبل شعبان ہی کے مہینے میں انتقال فرما گئے۔
مولانا صدیق احمد صاحب حسب قرارداد دس پارے حفظ کر کے آئے مگر جب دیکھا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اپنی مسجد میں محراب سنائی اور تراویح میں ختم قرآن کا استیعاب پورا ادا کر لیا تو آئندہ سال آپ نے بھی پورا کر لیا۔ اِدھر ان حضرات کو حافظِ قرآن دیکھ کر دوسرے بھائی مولوی نور احمد صاحب کو حرص ہوئی تو سال آئندہ انھوں نے شروع کیا اور تین سال میں وہ بھی حافظِ قرآن بن گئے کہ محلہ اور آس پاس کی تین مسجدیں ہمیشہ کے لئے انوارِ قرآنیہ سے معمور[1] و منور بن گئیں۔

حضرتؒ نے خود بارہا یہ قصہ نقل فرمایا اور آخر میں یہ لفظ ارشاد فرمائے کہ یاد تو خیر یاد ہی ہوتا ہے لیکن الحمدللہ کچھ دال دلیا ہو ہی گیا۔ حق تعالیٰ کو ایک نعمت عطا فرمانا تھی وہ اس طریق پر عطا فرما دی۔

تلاوت کا معمول

اس کے بعد حضرت نے اس نعمت کی محافظت کا اس درجہ اہتمام فرمایا کہ گرمی ہو یا سردی اور عسر[2] ہو کسی حال میں آپ نے کوئی دن اس کی تلاوت مخصوصہ سے خالی نہیں رکھا۔ مشاغلِ علمیہ آپ کے دن بدن بڑھتے اور تعلیم و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کے تعلقات روز افزوں ہوتے رہے اس لئے آپ نے پورے قرآن مجید کا ختم اپنی نماز کا جزو بنا لیا کہ کم از کم سوا پارہ ورنہ دو اڑھائی پارے بعد مغرب صلوٰۃ الاوابین کی چھ رکعت میں پڑھا کرتے جو کبھی سفر اور مرض میں بھی قضا نہ ہوتی تھیں الا نادراً۔ اور کبھی ریل میں سفر اور ہجوم سواریاں کی وجہ سے طویل نوافل کا اتفاق سے موقع ہی نہ ملا تو پارہائے قرآن مجید کو بیٹھ کر ضرور پورا فرما لیتے تھے۔ اسی طرح تہجد کی بارہ نفلوں میں دوسرا ختم معمول تھا کہ دو پارے سے لیکر چار پارے تک جتنا وقت اور سکون کے ساتھ

[1] آباد و نورانی۔ [2] تنگی ہو یا آسانی۔ (جمیل احمد)

جس مقدار میں طبیعت کا لگاؤ پاتے وہ تلاوت فرمانے کہ اس کا بھی اسقدر اہتمام تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔[1]

ادائے معمولات گھر تو بہرحال اپنا گھر ہے اور ادائے معمولات کے لئے ہر قسم کا آرام مہیا رہتا ہے مگر میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اسفار میں ایسی اجنبی جگہ پر جہاں یہ بھی معلوم ہونا مشکل تھا کہ پانی کہاں ہے اور مسجد کہاں، آپ کے اس معمول کو قضا ہوتے نہیں دیکھا۔

جیپور کا سفر ایک مرتبہ حضرتؒ جیپور کے سفر میں تھے اور بندہ ہمرکاب تھا، گاڑی بعد عشا پہنچی اور میزبان مولوی عبدالغنی صاحب نے کہ وہ بھی شہر سے فی الجملہ اجنبی ایک سرائے میں ہم کو لا اتارا جس کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بُو آرہی تھی، پاس نہ روشنی کا سامان تھا نہ کھانے پینے کا، بھوک لگ رہی تھی اور شب کا چوتھائی حصہ گذر چکا تھا کہ اکثر دکانیں بند ہو گئی تھیں، رفیقِ سفر میزبان حضرتؒ سے اجازت لے کر روشنی اور کھانے کا انتظام کرنے کو سرائے سے باہر نکلے اور ہم دونوں اندھیری کوٹھری ہاتھ سے ٹٹول کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ دیر ہو گئی اور چراغ نظر نہ آیا تو طبیعت گھبرائی اور میں نے حضرت سے عرض کیا کہ نہ بیکار بیٹھے بن پڑتی ہے نہ حضرت کو تنہا چھوڑ کر جائے بن پڑتا ہے ورنہ خود ہی کہیں ٹکریں مار کر موم بتی اور دیا سلائی لاتا۔ حضرت چپ ہو رہے اور تھوڑی دیر اور انتظار فرما کر خود ہی کہا کہ بہتر ہے تم ہی اٹھو اور دیکھو مولوی عبدالغنی کہاں گئے۔ میں اٹھا اور سرائے کے اندھیرے میدان کو پاؤں سے ٹٹولتا ہوا دروازہ کی طرف چلا کہ دروازہ پر مولوی عبدالغنی آتے ہوئے مل گئے اور میں ان کو لیکر واپس ہوا، ڈھم ڈھکم چراغ جلایا اور ذرا اچھی کسی ہوئی چارپائی دیکھکر اس پر حضرت کا بستر بچھا دیا، اس کے بعد جو کچھ کھایا گیا کھانا کھایا اور مشکل سے پانی دستیاب ہوا جس کو پی کر شکرِ حق ادا کیا۔ ہر چند کہ مجھے حضرت کے ساتھ بارہا سفر کا اتفاق ہوا اور خوب جانتا تھا کہ حضرت اپنے معمولات کے بہت ہی زیادہ پابند ہیں مگر آج شب کی کوفت اور کلفت محسوس کر کے اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ تہجد کے لئے حضرت کے واسطے پانی اور کم سے کم اتنی صاف جگہ کا انتظام کر دوں کہ حضرت نوافل ادا کرلیں، یہ ضرور فکر تھا کہ دیکھئے نماز فجر کس طرح ادا ہو۔ چراغ جس نے کھانے کا ساتھ بھی ٹمٹما کر بمشکل دیا تھا سلام کر گیا اور بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ پڑ کر سو رہیں۔ آدھی رات گذر چکی تھی اور بدن کو تعبِ سفر نے گویا کوٹ دیا تھا اس لئے حضرت بھی لیٹ رہے اور میں بھی کوٹھری کو کھلا چھوڑ کر کہ کچھ تو روشنی نظر آئے پڑتے ہی سو گیا۔

صبح صادق سے گھنٹہ بھر پہلے دفعۃً آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ حضرت کی چارپائی خالی ہے،

---

[1] نیز ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر حضرت اس جگہ جہاں فوٹو میں حجرہ سے متصل تکیہ رکھا ہے قرآن شریف کھول کر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (اخلاق احمد عفی عنہ)

گھبرا کر اُٹھا اور باہر آکر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہاں تشریف لے گئے مگر کہیں نظر نہ آئے۔ تاروں کی جھلملاہٹ میں ذرا دور ایک مسجد نظر آئی اور میں اس طرف چلدیا۔ شکستہ حال مسجد کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر کچھ چوٹ بھی کھائی مگر صحن میں قدم رکھا تو حضرت کی آواز کان میں پڑی کہ اندر گوشہ میں کھڑے ہوئے تلاوت فرما رہے اور اپنے معبود کے سامنے غلامانہ حاضری کا معمول بجالا رہے ہیں، آواز میں گریہ اور رعشہ تھا اور لہجہ میں خوف وخشیہ ملا ہوا حضور۔ میں حیران تھا کہ حضرت نے مسجد کا پتہ کس وقت لگایا اور مطمئن ہو کر چارپائی پر لیٹ رہے کہ خود بھی پانی اور مصلے کا اہتمام کئے بغیر سو گئے۔ بس میزبان کی تلاش میں چند منٹ کے لئے میرا علیحدہ ہونا حضرت کے لئے گنجائش تھی کہ اپنی اصل ضرورت کا پتہ لگا کر آبیٹھے اور سونے والوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے وقت پر اپنے خدا کے سامنے آکھڑے ہوئے، مجھے شرم کے مارے پسینہ آگیا کہ تف تیری جوانی پر کہ حضرت اس بڑھاپے اور ضعیفی میں اتنے مستعد اور تو عالم شباب میں اتنا کاہل اور کم ہمت۔ آخر اندھیرے میں ٹٹول کر لوٹا اُٹھایا اور پھر پانی ڈھونڈتا پھرا کہ کنواں ہے یا حمام، کہاں سے پانی لوں، اور ہر دشواری پر اس کا اندازہ کرتا گیا کہ یہی دشواری حضرت کو بھی پیش آئی ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ نہ معلوم حضرت کس وقت اُٹھے اور کب سے نفلوں میں مشغول تھے۔ اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے کی بھی طویل قراءت سوا پارے سے کم نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی اور جماعت سے فرض ادا کر کے باہر آئے تو شرم کے مارے میری نظریں جھکی ہوئی تھیں کہ نوافل کے لئے اہتمام نہ کیا تھا مگر حضرت کو گویا اس کا وہم بھی نہ تھا کہ آج ادائے معمول میں کچھ دشواری پیش آئی، وہی انبساط تھا اور شفقت کے ساتھ پوچھ رہے تھے کہ رات کچھ نیند بھی آگئی تھی؟ بھئی ہمیں تو تکیہ پر سر رکھ کر خبر نہ رہی کہ سرائے میں پڑے ہیں یا گھر۔

ٹونک کا سفر اور معمولات

ایک بار ٹونک کے سفر میں شب کو گیارہ بجے حضرت کے ساتھ دہلی سے پسنجر میں سوار ہوا تو ہجوم مسافران کی یہ حالت تھی کہ بیٹھنا بھی دشوار تھا حسب عادت لوٹا بھر کر بنچ کے نیچے ضرور رکھ لیا تھا مگر حیران تھا کہ کیسا وضو اور کیسی نفلیں، مگر آخر شب میں حضرت کے اُٹھنے کا وقت آیا اور اتفاق سے جھپکی آکر میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں حضرت لوٹا لئے ہوئے ریل کا دروازہ کھول کر وضو فرما رہے ہیں، جلدی سے اُٹھا او حضرت کو وضو کرایا، مگر اب پریشان تھا نماز کی جگہ کہاں کروں کہ اُجڈ مسافروں کے چار طرف پاؤں اور اسباب پھیلے ہوئے ہیں، کسی چیز کو ذرا سرکاؤں گا تو کوئی دھپ رسید کریگا مگر اللہ رے ہمت واستقلال حضرت نے جگہ نکال ہی لی اور اسی طمانیت کے ساتھ کھڑے ہو کر لمبی لمبی آٹھ نفلوں میں اپنے معمول تلاوت کو پورا فرمایا کہ نہ متشابہ لگا نہ رکاوٹ ہوئی۔

منیٰ میں معمولات پرعمل

سفرِ حج میں جاتے وقت منیٰ کا قیام تھا اور رکھا کچھ اسباب کے گرد برابر برابر شغدف[1] لگے ہوئے تھے کہ قبیل صبح صادق مطوف آیا اور شور مچایا کہ طیار ہو جاؤ عرفات کے لئے۔ دیکھتا ہوں تو حضرت دو شغدفوں کے بیچ میں گلی نما جو تنگ جگہ چھوٹتی ہے اس میں کھڑے ہوئے اپنے مولیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہیں اور یاد رہائے قرآن مجید کی اس تلاوت کو پورا فرما رہے ہیں جس کا حفظِ قرآن کے وقت سے آپ نے التزام کیا تھا۔ مطوف[2] جمالین نے سب کچھ شور مچایا مگر حضرت کے طویل قیام میں ایک آیت کا بھی فرق نہ آیا۔

اتباعِ سنت کا خاص اہتمام

تلاوتِ قرآن جس سکون کو چاہتا ہے اس کا حق ادا فرما کر جب آپ نے سلام پھیرا تو اللہ کے شیر پر ایک غصہ کے آثار نمودار تھے اور تند و تیز لہجہ میں آپ نے مطوف سے کہا "تم بھول گئے ہم نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ سنت کے خلاف ہم ہرگز نہ کریں گے اور تم نے اقرار کیا تھا کہ جس طرح کہو گے اسی طرح کروں گا پھر قبل طلوع آفتاب لے چلنے پر ہم سے کہنے کا تم کو کیا حق ہے کہ فضول پریشان کر رہے ہو" مطوف نے کہا کہ میں کیا کروں جمال نہیں مانتے جن پر کسی کا زور نہیں اور یہ اونٹ لیکر چلدیتے تو حج فوت ہو جائے گا سنت کی خاطر فرض کو خطرہ میں ڈالنا تو اچھا نہیں۔" اس جواب پر حضرت کا غصہ تیز ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا ہم نے تم کو مطوف قرار دیا ہے استاذ اور پیر قرار نہیں دیا کہ علمی مشورہ لیں، جاؤ اپنا کام کرو ہم شروقِ آفتاب[3] سے ایک منٹ پہلے بھی نہیں اٹھیں گے کہ ہمارا مال خرچ اور صعوبت[4] برداشت کر کے آنا حج کو بطریقِ سنت ادا کرنے کے شوق میں ہوتا ہے نہ کہ تمہارے اور جمالوں کے غلام بننے کے لئے۔ جمالوں کو اپنے اونٹوں کا اختیار ہے ان کا جی چاہے وہ ان کو لیجاویں باقی ہم پر ان کو کوئی اختیار نہیں کہ اٹھنے پر مجبور کریں، تم نے ناوقت شور مچا کر ہم کو پریشان کر دیا اور نماز تک نہیں پڑھنے دی اس لئے ہم تم کو بھی آزاد کرتے ہیں اپنے دوسرے حاجیوں کو سنبھالو ہم کو ہمارے حال پر چھوڑو، اللہ کا شکر ہے ہم لولے لنجے نہیں ہیں اور نہ عرفات کچھ زیادہ دور، اونٹ چلے جائیں گے تو پیدل بھی ہم انشاء اللہ پہنچ جائیں گے مگر تم یہ چاہو کہ سنت چھوڑ کر تمہارا کہنا مانیں سو اس کی ہرگز ہم سے توقع مت رکھو۔

اب مطوف کے پاس جواب ہی کیا تھا کہ زبان سے ادا کرے خاموش ہو کر چلا گیا اور حضرت نے پھر نیت باندھ لی اور اسی سکون کے ساتھ تلاوت و نماز میں مشغول ہو گئے حتی کہ صبح صادق ہوئی اور

---

[1] اونٹ پر سواری کی عماری جو قیام میں نیچے رکھدی جاتی ہے۔ [2] حاجیوں کی سہولت کے لئے حکومت کی طرف سے اجرت پر حج کے اعمال ادا کرانے اور تمام ضروریات کو فراہم کرنے والے لوگ مقرر ہیں ان کو مطوف یا معلم کہتے ہیں اور سواری کے اونٹ والے جمالین ہیں۔ [3] سورج کے خوب روشن ہو جانے سے پہلے روانہ ہونا خلافِ سنت ہے۔ [4] سختی و تکلیف۔

حضرت نے باجماعت نماز پڑھی۔ بعد نماز مطوف و جمالین آئے اور جب کوہِ ثبیر پر شعاع شمس چمک اٹھی تو حضرت اپنے شغدف میں سوار ہو گئے۔ اب وہی حضرت تھے اور وہی مطوف و جمال، وہی پیارا اخلاص تھا اور وہی محبت کے ساتھ بات چیت کہ معمول ایسی حالت میں بھی قضا نہ ہوا اور وقت پر جو غصہ تھا وہ اسی وقت ختم بھی ہو لیا، جمال کی خاطر مدارات کرتے ہوئے دس بجے عرفات پہنچ لئے۔[1]

جہاز کے سفر میں معمولات پر پابندی

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ سب سے زیادہ تعب کا اثر مجھ پر جہاز کے سفر میں ہوتا ہے اور درحقیقت میں نے بھی دیکھا کہ جہاز کے لنگر اٹھاتے ہی حضرت کو تکیہ سے سر اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مجاہدہ و ریاضتِ باطنیہ اور تدریس و تالیف کے مشغلۂ علمیہ کے مسلسل پچاس سال کی محنتِ شاقہ نے آپ کے دماغ کو بالخصوص زیادہ ضعیف کر دیا تھا اور اس لئے جہاز کے حرکت کرتے ہی دورانِ سر میں آپ مبتلا ہو جاتے تھے۔ واقفِ حال ہونے کے سبب مجھے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاز پر پہنچ کر سب سے پہلے آپ کا بستر بچھا دوں باقی کام پیچھے ہوتے رہیں گے، بایں ہمہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے شب کے نوافل بھی بیٹھ کر پڑھے ہوں یا اپنی طویل تلاوت میں کمی کی ہو۔

جہاز میں سناٹا چھایا ہوا ہوتا اور چار طرف سے امتلا[2] و استفراغ کی پریشان کن آوازیں آتی رہتی تھیں، جہاز کے خلاصی اور خوگر ملازمین بھی چلتے ہوئے گردشِ جہاز کی وجہ سے مستانہ وار جھومتے اور گر گر پڑتے تھے مگر آپ پہاڑ بنے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں گھنٹہ سوا گھنٹہ اپنے مولا کے سامنے کھڑے ہو کر دو ڈھائی پارے پورے سکون کے ساتھ پورے کر لیا کرتے تھے۔

میں اپنا بستر اس نیت سے حضرت کے قریب ہی بچھایا کرتا کہ آخر شب میں وضو کے لئے پانی دے سکوں مگر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ دفعۃً آنکھ کھلی تو حضرت کو بستر پر موجود نہ پایا اور گھبرا کر اٹھا تو دیکھا کہ ڈولچی لئے ہوئے جہاز کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر سے پانی کھینچ رہے ہیں۔ شرم کے مارے ڈوب جاتا اور ڈولچی ہاتھ سے لے لیتا۔ مگر حضرت فرماتے تم کمزور ہو جہاز حرکت زیادہ کر رہا ہے ایسا نہ ہو کہ گر پڑو۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ نماز کا سلام پھیرتے ہی حضرت کو بیٹھنا دشوار ہو جاتا اور اس طرح تکیہ پر سر رکھ دیتے تھے گویا چکر آ گیا اور گر گئے مگر یہ ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ نفلیں بیٹھ کر بھی پڑھی ہوں یا پاروں کے معمول میں اس عذر کو دخیل سمجھ کر قصار[3] پر اکتفا کر لیا ہو۔

---

[1] منیٰ سے عرفات کو روانہ ہونا طلوعِ آفتاب کے بعد ہی سنت ہے سواری والے جلدی کرتے ہیں ترکِ سنت کرا دیتے ہیں۔ ان لفظوں میں صرف وقت بتایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں جو ایسے لفظ اشرق ثبیر کفار کے نقل ہیں ان سے شبہ نہ کیا جائے۔ (شرح الحدیث)
[2] طبیعت کا متلانا اور قے کرنا۔ [3] سورۂ لم یکن سے قل اعوذ برب الناس تک۔ (جمیل احمد)

جہاز جس وقت سقوطرہ میں پہنچا جہاں سمندر کی گہرائی حد[1] سے زیادہ ہے یا کسی دن سمندر میں تلاطم[2] ہوتا اور مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ مارنے والی موجیں جہاز کے ساتھ کھیل کرتیں تو جہاز پتہ کی طرح طولاً[3] وعرضاً دونوں رُخ ہنڈولے کی طرح ایسی عجیب حرکت کرتا کہ مشّاق چلنے والے بھی مخمور[4] مجبور کی طرح گر پڑتے تھے مگر ایسی حالت میں بھی زیادہ سے زیادہ حضرت کے معمولات پر اثر پڑا تو صرف اتنا کہ شاید ڈھائی تین پاروں کی جگہ ایک یا سوا پارہ پڑھ کر تکیہ پر سر رکھدیا اور باقی تلاوت لیٹے لیٹے پوری کرلی مگر اس کو ہمیشہ دل ترستا ہی رہا کہ کاش حضرت اپنی حالت پر ترس کھا کر کسی دن رخصت پر عمل فرمالیں اور مختصر نفلوں پر اکتفا فرماکر بیٹھ کر ہی ادا کرلیں مگر نہیں۔ عزیمت[5] کی مجسم تصویر تھی جو زبانِ حال یہ سبق پڑھا رہی تھی کہ رخصت[6] پر عمل کرنے والے تو ہزاروں دیکھ سکو گے مگر عزیمت کا پُتلہ ان کمزور ہڈیوں کے زیرِ زمین چھپ جانے کے بعد نظر آنا مشکل ہو جائے گا ؎

اے[7] دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی ــ بے زر و گنج بصد حشمتِ قاروں باشی

در[8] رہِ منزل لیلی کہ خطرہاست بجاں ــ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

لختِ جگر ہانی کی نزع کا وقت اور معمولات کی ادائیگی

آپ کی جوان لڑکی ہانی[9] مرحومہ تپِ دق میں مبتلا ہوئی اور جب اس کی زندگی سے یاس[9] ہوئی تو آپ اس کو انبہٹہ[10] لے گئے۔ قُبیل[10] رمضان مدرسہ کی چھٹیوں میں آپ وطن آئے تو اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا، مرحومہ کی دنیوی زندگی کی سب سے آخری رات آئی تو اس نے بھی محسوس کرلیا کہ اب دن کی دھوپ یا شب کی چھاؤں دیکھنا نصیب میں نہیں، اس لئے مرحومہ نے باپ سے خواہش کی کہ ابا آج آخری تکلیف اور اٹھالو اور یہ شب میرے پاس بیٹھ کر گذار دو کہ تمہارا چہرہ دیکھتی ہوئی رخصت ہو جاؤں۔ مرحومہ کا محبوب شوہر[ع] مجنوں ہوچکا اور اس کے بقیدِ حیات ہوتے ہوئے گم ہو جانے سے اس مرحومہ کے قلب پر ایسا صدمہ بیٹھا تھا کہ یہی بظاہر اس کے تپ[11] کہنہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہوا تھا، اس لئے حضرت کو اس لختِ جگر کے ساتھ محبت بھی زیادہ تھی، آپ کئی راتیں اس کی تیمار داری میں

---

[1] اور لوگوں کو چکر بہت آتے اور قے بہت ہوتی ہیں۔ [2] موجوں کا اٹھ اٹھ کر ہر چیز سے ٹکرانا۔ [3] لمبائی چوڑائی میں۔ [4] شرابی مدہوش۔ [5] اصل حکم پر عمل۔ [6] عذر میں آسانی کا حکم۔ [7] اے دل سب سے بہتر کام یہ ہے کہ گلرنگ شراب سے یعنی حبِ الٰہی سے تو مست ہو جائے اور بغیر سونے اور خزانے کے قارون کے وقار کا سو گنا وقار کے ساتھ تو ہو جائے۔ [8] لیلی یعنی محبوب کے راستے میں جان پر بہت خطرے ہیں قدم رکھتے ہی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں بن جاؤ ایسے ہی عشقِ الٰہی میں دیوانہ ہو جاؤ۔ [9] نا امیدی۔ [10] کچھ پہلے۔ [11] پرانا بخار یعنی دق۔ (جمیل احمد)

عـہ ام ہانی حضرت کی دوسری زوجہ محترمہ منیر النسا کے بطن سے بڑی لڑکی تھیں اور خط بہت صاف لکھتی تھیں۔

عـہ ان کا نام محمد یامین تھا قاضی کے محلہ میں رہتے تھے۔ (اخلاق احمد)

ایسی گذار چکے تھے کہ سونا برائے نام ملا تھا اور یہ تو وہ فیصلہ کن شب تھی جس کے متعلق حضرت بھی سمجھ چکے تھے کہ کل کا دن نورِ نظر کے مٹی میں چھپانے اور کفن و دفن میں مشغول ہونے کا ہے اس لئے ماں باپ دونوں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ نصف شب گذری تھی کہ سانس میں تغیر پیدا ہو گیا اور سکرات شروع ہو گئی۔ رات کا سناٹا تھا اور حضرت کے لئے یہ جانگداز نظارہ، یٰسین شریف پڑھتے تھے اور بیٹی پر دم کرتے جاتے تھے۔ اس حسرتناک منظر میں وہ وقت آ گیا جس میں حضرت کا اپنے مولیٰ کے سامنے حاضری دینے اور اس کے کلام پاک کے تین جزو اس کو سنانے کا معمول تھا اس لئے آپ بیوی سے یہ کہہ کر کہ تم ہانی کے سانس دیکھتی رہو میں چند نفلیں پڑھ لوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور وضو فرما کر اپنے اُس شغل میں لگ گئے جس کے پچاس برس سے عادی تھے۔ اس حالت میں بھی آپ محافظۂ[1] کلام اللہ کی عادت مستمرہ سے غافل نہ ہوئے اور وہی تعداد پوری فرمائی جس کی عادت تھی، ہاں ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور اہل سے پوچھتے تھے کہ کیا حال ہے اور جب یہ جواب سنتے کہ ابھی سانس باقی ہیں تو پھر نیت باندھ لیتے اور تلاوت شروع فرما دیتے تھے، آخر اِدھر آپ کا معمول ختم ہوا اور اُدھر مرحومہ کے سانس ختم ہوئے کہ سلام پھیرنے پر جب آپ نے پوچھا کیا حال ہے تو جواب سُنا کہ رخصت ہوئی اور اللہ کو پیاری ہوئی تب آپ اِنّا پڑھ کر جنازہ کے سرہانے آ بیٹھے اور اہل سے فرمایا کہ ابھی وقت باقی ہے نفلیں پڑھتا ہوں تو پڑھ لیں ؎

آنکس[2] کہ ترا شناخت جاں را چہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ[3] کنی ہر دو جہاں را بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

بندہ[4] محض عیادت کے خیال سے گھر سے چلا تھا مگر عصر کے وقت جب انبہٹہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرحومہ آخر شب میں رخصت ہوئی اور حضرت اس کو دفن فرما کر ابھی واپس ہوئے اور مسجد میں تشریف لے گئے ہیں۔ چنانچہ بندہ مسجد میں حاضر ہو کر حضرت سے ملا تو نہ حضرت کے چہرۂ انور پر حزن کا کوئی خاص اثر نمایاں تھا نہ بیداریٔ شب اور تعبِ یوم کا کوئی اضمحلال۔ حسب عادتِ شریفہ مسکرا کر چھاتی سے لگا لیا اور خندہ روئی سے باتیں کرنے لگے۔

نورِ نظر حافظ محمد ابراہیم کی تیمارداری اور معمولات کی ادائیگی

اسی طرح آپ کا اکلوتا جوان لڑکا حافظ ابراہیم مرحوم[5] جب مرض الموت میں

[1] قرآن مجید کو دل میں محفوظ کرنے کی جو دیرینہ عادت تھی۔ [2] جس نے آپ کو پہچانا وہ اپنی جان کو کیا کرے گا اور اہل خانہ و سامان کو کیا کریگا۔ [3] آپ دیوانہ بنا کے دونوں جہان بھی بخش دیں تو آپ کا دیوانہ جانوں کا کیا کرے گا۔ [4] مصنف مولانا عاشق الٰہی مرحوم (جمیل احمد)

[5] موصوف میرے والد اشفاق احمد صاحب حافظ صاحب مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مبتلا ہو کر سہارنپور آیا تو اس کو کوئی اندرونی تکلیف ایسی تھی جس کے سبب وہ لیٹ نہیں سکتا تھا، سات راتیں متواتر حضرت پر ایسی گذریں کہ دن بھر مدرسہ کے مشاغل سے فارغ ہو کر گھر میں جاتے تو پیچھے بیٹھکر اپنا سینہ مریض کا تکیہ بناتے اور اس کی کمر کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ جاتے۔ ماں سے جس نے دن بھر کا تعب اٹھایا تھا فرماتے جاؤ چارپائی پر ذرا کمر سیدھی کرلو۔ چنانچہ وہ لیٹ رہتیں مگر نیند کس کو آتی۔ پھر نصف شب گذرنے پر وہ آجاتیں اور حضرت سے کہتی تھیں کہ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو ذرا تم بھی آرام کرلو۔ چنانچہ وہ بیمار کو سہارا دے کر بیٹھ جاتیں اور چند منٹ کے لئے حضرت چارپائی پر لیٹ جاتے مگر اس حالت میں بھی حضرت کا تہجد اور تلاوت طویلہ کا معمول کبھی نہ چھوٹا اور اس وقت میں جبکہ ماں کا نمبر ہوتا آپ وقت معمول پر چارپائی سے اٹھ کر اپنے خدا کے سامنے حاضری دیا کرتے تھے۔

اس مرتبہ بھی بخیالِ عیادت حاضر ہوا تو اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ مرحوم دنیا سے رخصت ہو کر آج عصر کے وقت دفن ہو لیا۔ مدرسہ میں پہنچا تو نمازِ عشا ہو چکی تھی اور معلوم ہوا کہ حضرت نے عشا کی نماز باجماعت ادا فرما کر جب سلام پھیرا تو یوں فرمایا کہ سات شب متواتر جاگنے سے نیند کا اتنا خمار[1] کہ امام کے ساتھ رکوع و سجدہ تو کیا مگر معلوم نماز ہوئی یا نہیں کہ آخر رکعت کی مجھے خبر ہی نہیں ہے۔ یہ فرما کر فوراً مکان تشریف لے گئے اور سو گئے، بایں ہمہ آخر شب میں آپ کا معمول ہاتھ سے نہ گیا کہ صبح کو حسب عادت صبح صادق ہوتے ہی حضرت سنتِ فجر سے فارغ ہو کر مدرسہ میں آلئے اور مجھے دیکھتے ہی جواب سلام کے بعد معانقہ فرما کر سب سے پہلا لفظ یہ فرمایا کہ مجھے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز کیوں نہ دے لی[2]۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تشریف لیجا چکے تھے اور میں نے سن لیا تھا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور دونوں ریاست بھاولپور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ عید الفطر کی نماز ادا کرنے کے بعد تائے ابراہیم نے کسی ملاقاتی کے یہاں شیر کھایا بس اس کے بعد طبیعت خراب ہو گئی۔ بیماری کی شدت کو دیکھ کر والد صاحب ان کو فوراً سہارنپور لائے۔ انبالہ چھاؤنی سے میرے تایئے حکیم الطاف احمد آزاد بھی ساتھ ہو گئے تھے۔ تقریباً بارہ پندرہ روز تک علاج ہوتا رہا مگر افاقہ نہ ہوا۔ ان کے سینہ میں شدید تکلیف تھی۔ آخری دن ان کی صحت کے لئے مدرسہ میں بخاری شریف کا ختم کرایا گیا تھا تقریباً دس گیارہ بجے دن کو ان پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس وقت گھر کے سب عزیز اطراف میں جمع تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے سینہ پر اُن کی کمر کو سہارا دیئے بیٹھے تھے کہ دفعۃً آپ نے اور سب نے تلقین کے لئے کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا اور جب مرحوم نے آخری سانس ختم کیا تو حضرت کی زبان سے اپنے لخت جگر کے فراق میں بیقراری کے ساتھ یہ الفاظ نکلے "آہ ابراہیم تو نے کمر توڑ دی انا للہ وانا الیہ راجعون" اس کے بعد حضرت مدرسہ میں تشریف لے آئے اور جنازہ تیار ہونے تک صبر و استقامت کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے۔ تائے ابراہیم نے سنہ ۱۳۳۰ھ میں بعمر چالیس سال انتقال فرمایا۔ ڈاڑھی میں خضاب لگانے لگے تھے اور بسلسلۂ ملازمت پنجاب میں رہنے کی وجہ سے لباس پنجابی پہنتے تھے بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ (اخلاق احمد)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اگر نماز میں نیند آئی ہو کہ نماز کی ہیئت میں خلل نہ آئے تو نماز شرعی قاعدہ سے ہو جاتی ہے نہ ہونے کا اپنے کیف کے م م نہ ہونے پر تھا۔ [2] اللہ اللہ خدام پر شفقت۔ (جمیل احمد)

حضرت پر متواتر سات شب جاگنے کی وجہ سے نیند کا غلبہ زیادہ ہے ایسی حالت میں حضرت کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ سمجھی اور یہاں آرام سے لیٹ رہا۔ حضرت نے فرمایا ہاں خمار تو بہت تھا مگر کیا حرج تھا تیری آواز پر آجاتا اور پھر سو جاتا۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے ان عوارض و حوادث میں حضرت کی صرف استقامت[1] اور محافظہ کلام اللہ پر مواظبت[2] کا نمونہ دکھایا ہے جن کے پیش آنے پر اچھے اچھے حفاظ کو فرض نماز کا بھی ہوش نہیں رہتا چہ جائیکہ معمولِ تلاوت۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تلاوت ہی نہیں بلکہ ہر امر مستحب و مسنون، حتی کہ صف اول اور یمینِ[3] امام اور تحیۃ المسجد و نوافل قبل العصر و قبل العشاء تک امور میں حضرت کی مواظبت[4] واہتمام کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے تھے۔ برسوں جن حضرات کو خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ استعجاب کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ اللہ اللہ حضرت کے معمولاتِ وقتیہ میں ہم نے کبھی تخلف نہیں دیکھا۔

زمانے نے کروٹیں لیں گردشِ افلاک نے تغیرات ظاہر کئے موسم بدلے، عمر کے اوقات نے بچپن و جوانی اور کہولت[5] و بڑھاپے کی صورتیں پلٹیں سب کچھ ہوا مگر بر ہوا یا بحر اور حضر[6] ہوا یا سفر، ریل ہوئی یا جہاز اور اونٹ ہوئے یا بہلی،[7] عسر ہوا یا یسر اور صحت ہوئی یا مرض، کسی حال اور کسی نمط[8] حضرت قدس سرہ کے انضباط اوقات اور مواظبتِ معمولات میں تغیر نہ دیکھا۔ اس استقامت پر ہزاراں ہزار حسی کرامات قربان کہ اسی کو اہلِ دل نے فوق[10] الکرامۃ لکھا ہے۔

مدینہ کے سفر میں بخار کی حالت میں بھی معمولات پر عمل

میں نے تمامی اسفار میں کٹھن سفر یعنی مدینہ منورہ کے راستہ میں حضرت کو ایسا شدید بخار چڑھا ہوا دیکھا کہ بدن پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا مگر نماز باجماعت تو کیا قضا ہوتی تہامہ کی رات میں ذرا خنکی آئی تو بخار ہلکا ہو جاتا اور حضرت کا آخر شب کا معمول اس حالت میں بھی فوت نہ ہوتا تھا۔

جودھپور کا سفر

ایک مرتبہ سفر جودھپور میں بندہ ساتھ تھا اور حضرت مولانا تھانوی کا بعد عشاء وعظ ہوا جس سے ایک بجے فراغت ہوئی اور قیام گاہ پر پہنچ کر دو بج گئے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور صبح صادق میں اتنی دیر تھی جو معمولاً حضرت کی نوافل میں صرف ہوتی تھی کہ یا سو لیں یا قرآن مجید پڑھ لیں۔ سنگستانی گرمی کے سبب پتھر کے مکان میں دن کو بھی نیند آنا مشکل تھا اور

---

[1] دین کی ہر بات پر جار رہنا۔ [2] قرآن مجید کو محفوظ رکھنے پر ہمیشگی۔ [3] جماعت میں امام کے داہنے۔ [4] ہمیشگی [5] درمیانی عمر۔ [6] قیام کہ سفر نہ ہو۔ [7] بیلوں کی ایک سواری گاڑی ہوتی تھی۔ [8] تنگی یا فراغت [9] طریقہ۔ [10] کرامت سے اوپر جو بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے الاستقامۃ فوق الکرامۃ معمولات پر جار رہنا کراموں سے زیادہ ہے۔ (جمیل احمد)

اور اگلا سفر ابھی طویل باقی تھا اس دن البتہ حضرتؒ کو دیکھا کہ قیام گاہ پہنچکر فرمایا اب لیٹ کر اٹھنا مشکل ہے لاؤ نفلیں پڑھ لوں۔ پس تہجد تو قضا ہوا نہیں مگر جہانتک میرا اندازہ ہے نصف پارہ پڑھ کر سو گئے اور باقی تلاوت دن میں پوری فرمائی۔

دنیا میں سب کچھ دیکھا اور اپنی وضع کے پابند ایسے دیکھے جن کو نظیر بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے مگر معمولاتِ نفلیہ کا مجسمۂ استقامت ایک ہی دیکھا جس کی ظاہر بین کو اطلاع ہونے کی بھی کوئی صورت نہ تھی ؎

دلفریبانؔ نباتی ہمہ زیور بستند ۔۔۔ دلبر ماست کہ باحسنِ خداداد آمد

زیر بار اند درختاں کہ ثمرہا دارند ۔۔۔ اے خوشا سروکہ از بندِ غم آزاد آمد

رمضان المبارک میں حضرتؒ کے معمولات

محافظت کلام اللہ کا یہ معمول تو گیارہ مہینے کے لئے تھا مگر جب رمضان المبارک کا چاند نظر آجاتا جو کہ نزولِ قرآن کا مہینہ اور کثرتِ تلاوت کلام اللہ کے لئے مخصوص ہے تب تو آپ کی جدوجہد کی کوئی حد ہی نہ رہتی تھی۔ تراویح میں سوا پارہ سنانے کا کہ قرآن مجید کے ہر رکوع پر رکوع فرماتے اور بیس رکوع روزانہ کے حساب سے ستائیسویں شب کو ختم فرمادیا کرتے ہمیشہ آپ کا معمول رہا۔ مظاہرِ علوم کے مدرس بننے کے بعد آپ مسجدِ مدرسہ میں محراب سنانے کے پابند رہے اور دارالطلبہ بننے کے بعد دو سال وہاں کی مسجد میں محراب سنائیؔ۔ سننے والوں کا ہجوم زیادہ ہوتا اور مشتاق دور دور سے آتے بلکہ بعض حفاظ اپنا سنانا بند کرکے اقتدا کرتے تھے۔

آپ متوسط جہر کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف پڑھتے کہ ایک ایک حرف اچھی طرح سمجھ میں آتا تھا۔ چونکہ جوانی میں یاد کیا تھا اور نیز پڑھنے میں استغراق بھی ہوتا تھا اس لئے اٹکنے کی بھی نوبت ضرور آتی مگر غلط پڑھنے کی نوبت نہیں آتی تھی، دفعۃً زبان رک جاتی یا متشابہ لگتا تو بتلانے والے جیسا کہ رواج ہے جلدی سے بولتے اور کبھی غلط بھی بتادیتے تھے جس کو حضرت نہ لیتے اور خود سوچ کر دوبارہ صحیح بتانے والے کے بتانے پر آگے چلتے تھے۔ بایں ہمہ آپ پر کبھی ناگواری کا اثر نہ ہوتا بلکہ سلام پھیر کر تسلی کے طور پر فرمایا کرتے کہ "آخر جب حافظ بھولتا ہی تو سامع کو بھی بھولنا ضرور ہے اگر بھول کر کہیں غلط بتادیا تو تعجب ہی کیا ہے"۔

لہ نباتات چمن کے دل موہ لینے والے ہر طرح کی زیب و زینت باندھے ہوئے ہیں مگر ہمارا محبوب ہی کہ خداداد حسن کے ساتھ آیا ہے۔ ۲ بوجھ والے جھکے ہوتے ہیں وہ درخت جو پھل رکھتے ہیں سرو کتنا اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد سیدھا چلا جا رہا ہے ۳ درمیانی بلند آوازی۔ (جمیل احمد)

ع رمضان المبارک کا زمانہ کبھی کبھی حضرت اپنے وطن انبہٹہ میں گذارتے تھے۔ حضرت شاہ ابوالمعالی کی خانقاہ میں ایک وسیع مسجد واقع ہے اس مسجد میں نماز جمعہ و تراویح پڑھتے تھے اور عشرۂ آخر میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز حضرت کے عم زاد بھائی مولانا عبداللہ انصاری پڑھایا کرتے تھے اور تراویح میں قرآن شریف خود حضرت پڑھتے تھے۔ (اخلاق احمد)

محراب سُنانے کا معمول حضرت کا برسہا برس قائم رہا مگر عمر شریف جب ستر سال سے متجاوز ہوئی تو محراب سنانے کا تحمل دشوار ہوگیا اور حضرت فرمانے لگے کہ "رکوع کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے دوسری رکعت میں کھڑا نہ ہوسکوں گا۔ بہ ہمت کرکے کھڑا ہوجاتا ہوں آخر بیس رکعت اسی طرح پوری ہوتی ہیں کہ ہر رکعت میں گرجانے کا اندیشہ رہتا اور سجدہ سے اٹھ کر کھڑا ہونا پہاڑ پر چڑھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔" اس حالت میں بھی آپ دو سال نباہ گئے اور ہمت نہ ہارے، آخر جب قوت نے جواب ہی دیدیا تو محراب سنانا چھوٹ گیا مگر اس کے بدلے دوسرے سے سننے اور خالی اوقات میں خود تلاوت کرنے کا شغل بڑھ گیا۔

رمضان اور تلاوتِ قرآن ماہِ مبارک میں اول اشراق سے لے کر گیارہ بجے تک تلاوت فرماتے اور پھر بعد ظہر سوا پارہ کسی حافظ کو سناتے تھے۔ چند سال اجراڑہ کے حافظ[1] محمد حسین صاحب نے رمضان حضرت کی خدمت میں گذارا تو یہ سُننا ان کے متعلق رہا ورنہ مولانا محمد الیاس[2] یا مولوی زکریا[3] جو بھی نظر پڑتے ان کو سُناتے، کبھی دونوں کو جدا جدا سُناتے کہ اسی میں عصر کا وقت آجاتا ورنہ اکثر ایک کے سنانے پر اکتفا فرما کر یہی پارہ دوبارہ خود پڑھا کرتے تھے۔ فرض مغرب سے فارغ ہوکر اوابین میں سوا پارہ حسب معمول قدیم خود پڑھتے اور پھر ایک پارہ[ع] کسی کو سُناتے، اس کے بعد مکان میں کھانا تناول فرماتے اور عشا کی اذان پر تشریف لاکر تراویح میں محراب سُناتے تھے، اور جب محراب سنانا چھوٹ گیا تو صحیح اور صاف پڑھنے والے خوش الحان حافظ کا اقتدا فرماتے جن میں اکثر حافظ عبداللطیف[4] صاحب ہوا کرتے اور کبھی کبھی مولوی محمد الیاس صاحب۔ پھر حسب عادت صبح صادق سے دو گھنٹہ قبل اٹھ کر تہجد میں دو ڈھائی پارہ کی تلاوت فرماتے اور اگر اس وقت کے لئے کوئی سُنانے والا حسب پسند ہوتا تو خود پڑھنے کے بجائے اس کا اقتدا فرماتے۔ جب تک مولانا محمد یحییٰ[5] صاحب حیات رہے تو عشرۂ اخیرہ میں پورا قرآن مجید سنانا بحالتِ اعتکاف ان کے ذمہ رہا اور ان کے بعد مولوی زکریا صاحب یا حافظ عبداللطیف صاحب جن کو باہمت پایا ان کو لے لیا[6]۔

---

[1] حضرت قدس سرہ کے خلیفہ اجراڑہ ضلع میرٹھ انڈیا کے تھے۔ [2] حضرت کے خلیفہ اور تبلیغی جماعت جو ہندوستان پاکستان میں کام کررہی ہے اس کے بانی تھے۔ [3] مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث حضرت کے خلیفہ ہیں وہیں تشریف فرما ہیں جماعتِ تبلیغی کے سرپرست ہیں۔ [4] مظاہر علوم سہارنپور کے کامیاب ناظم اور حضرت اقدس کے داماد بھی تھے۔ پھر صاحبزادی صاحبہ کا جلد انتقال ہوگیا تھا دوسری اہلیہ سے ایک لڑکا دو لڑکیاں ہیں ایک صاحبزادی ڈھاکہ میں باقی ہندوستان میں ہیں۔
[5] حضرت اقدس کے خلیفہ حضرت گنگوہی کے منظور نظر شیخ الحدیث صاحب سہارنپور کے والد صاحب تھے۔ [6] اس میں کچھ سہو ہوا ہے حضرت شیخ الحدیث صاحب نے لکھا ہے کہ تہجد میں میرے والد صاحب کے سوا کسی کا نہیں سنا۔ اور حنفیہ کے نزدیک بلا تداعی یعنی دعوت عام کے بغیر دو تین تک کی جماعت جائز ہے زیادہ کی مکروہ ہے۔ (جمیل احمد)

[ع] کچھ سہو معلوم ہوتا ہے مغرب بعد سنانے کا معمول نہ تھا صرف ظہر بعد کا معمول تھا۔ (شیخ الحدیث)

رمضان میں اگر آپ کو سفر پیش آتا تو حافظ کو جن کے اقتدا میں آپ سننا شروع فرماتے اپنے ساتھ لیا کرتے تھے تاکہ ختم ناتمام نہ رہے اور سلسلہ ٹوٹ نہ جائے۔ غرض ہر مہینے پانچ چھ ختم کرنے کی آپ کی عادت گیارہ مہینے کی تھی تو ماہِ مبارک میں اس کا نصاب دو چند یا سہ چند ہو جایا کرتا تھا۔

اور آخر عمر شریف میں مدینہ منورہ پہنچ کر تو اس معمول میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا کہ ڈاک دسویں دن آتی تھی لہٰذا یہاں جو کثیر وقت روزانہ جواب خطوط میں صرف ہوا کرتا وہ یہاں تلاوت کے لئے مخصوص ہو چکا تھا، اور تعلیق[1] ختم ہونے کے بعد اس کا وقت بھی زیادہ تر تلاوت ہی میں صرف ہوتا کہ مکان کے اندر علیحدہ بیٹھ کر کبھی حفظ پڑھتے اور کبھی قرآن شریف دیکھ کر۔

مولانا سید احمد[2] صاحب اور مولوی زکریا صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حضرت تالیف شرح حدیث کی اس درجہ دماغی محنت کے بعد تلاوت کا اس ضعیفی میں طاقت سے بہت زیادہ بار اٹھا رہے ہیں عرض بھی کیا کہ حضرت دماغ کی بھی رعایت کی ضرورت ہے مگر حضرت بیساختہ فرمایا کرتے کہ "اب اس سے کام ہی کیا لینا باقی ہے جو رعایت کروں؟" ایک مرتبہ فرمایا کہ "ضعف کی وجہ سے حافظہ پر اثر پاتا ہوں اس لئے مجھے ڈر ہے کہیں کلام مجید نہ بھول جاؤں اس وجہ سے اس کا اہتمام کرتا ہوں"۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "دماغ چاہے جاوے یا رہے مگر کلام مجید نہیں چھوٹتا"۔ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو[3]   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اخیر عمر کا معمول

اور اس آخری رمضان کا تو پوچھنا ہی کیا جو عمر شریف کا آخری رمضان تھا کہ غذا بھی سادہ چاء کا ایک فنجان اور بمشکل آدھی چپاتی رہ گئی تھی۔ تلاوت وسماعت کا مجاہدہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ دیکھنے والے خدام اس ماہِ مبارک کا آخری ہونا سمجھ چکے تھے کہ یہ فرطِ شوق و غلبۂ اشتیاق یقیناً قربِ وصال اور لقاءِ رب کا مقدمہ ہے۔ یعنی اول صبح کو سوا پارہ حفظ سناتے اور پھر ظہر سے عصر تک مسلسل تلاوت کبھی دیکھ کر اور کبھی حفظ فرماتے۔ بعد مغرب اوابین میں سوا پارہ سناتے اور چونکہ ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا کہ کھڑے ہو کر نوافل کا پڑھنا بھی مشکل تھا اس لئے کبھی کھڑے ہو جاتے اور کبھی بیٹھ جاتے۔ پھر عشاء کی نماز حرم میں پڑھ کر مولانا سید احمد صاحب کے مدرسہ میں تشریف لاتے اور قاری محمد توفیق صاحب مدرس تجوید کے اقتدا میں تراویح پڑھتے کہ وہ نہایت اطمینان سے دو پارے پڑھتے جن میں عربی پانچ بج جاتے جو یہاں سوا بارہ بجنے کا وقت ہے اس کے بعد قریب

[1] یعنی ابوداؤد شریف کی شرح بذل المجہود کی تالیف مکمل ہو جانے کے بعد۔ [2] حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی کے بھائی اور مدرسہ شرعیہ کے مہتمم تھے۔ [3] زندہ رکھیں تو آپ کی عطا و بخشش ہے مار ڈالیں تو میں آپ پر فدا ہوں یہ جان آپ کی شیدا ہے جو آپ کریں آپ کی مرضی۔ (جمیل احمد)

چھ بجے عربی کے سوجاتے تھے۔[1]

مولوی زکریا صاحب کو حکم تھا کہ آٹھ بجے مجھے جگا دیا کرو۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ تمام رمضان میں صرف ایک یا دو دفعہ مجھے اس کی نوبت آئی کہ حضرت کی آنکھ اس سے قبل نہ کھلی ورنہ ہمیشہ جب آٹھ بجے پہنچا تو حضرت کو یا وضو فرماتے دیکھا یا استنجا کرتے ہوئے۔ چنانچہ حضرت دو پارے اس وقت نفلوں میں سنتے کہ حضرت کو امام نافع[2] کی قراءت کامل سننے کا شوق تھا اس لئے مدرسہ کے دو طالب علم ایک ایک پارہ اس قراءت کا سناتے تھے۔ آخری ۲۷ رمضان کی شب[3] میں حضرت کو بخار چڑھ آیا اور بدن میں خدر[4] کا اثر ہوا جس کا سلسلہ وصال تک چلا اور آپ اپنے محبوب لم یزل کے کلام پاک کی تلاوت و سماعت پر اپنی صحت و حیات کو نچھاور فرما کر بقیع الغرقد میں میٹھی نیند جا سوئے فاطاب اللہ ثراہ وجعل الجنة مثواہ۔[5]

سفرِ حجاز اور جہاز میں رمضان

اس سے قبل ۱۳۳۸ھ کے سفرِ حجاز میں چونکہ رمضان کا چاند جہاز ہی میں نظر آگیا تھا باوجود دورانِ سر اور غایتِ تعب کے آپ نے تراویح کا اہتمام فرمایا اور کلام مجید سننا اور سنانا شروع کر دیا، مولوی محمد زکریا صاحب ساتھ تھے، اول آٹھ رکعت میں حضرت نصف پارہ سناتے اور پھر بارہ رکعت میں مولوی زکریا صاحب پون پارہ سنایا کرتے تھے۔ ۱۱ رمضان المبارک کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے تو حضرت نے تراویح ایک قاری صاحب کے اقتدا میں پڑھیں اور اپنا کلام مجید نوافل میں ختم فرمایا۔ اس سفر میں جہاز سے جدہ اترنا عین مغرب کے وقت ہوا اور تکان کا یہ عالم تھا کہ تراویح کا تو کیا ذکر فرض نماز کا بھی کھڑے ہو کر پڑھنا مشکل تھا، مگر حضرت نے اس شب میں بھی کچھ تراویح کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر پڑھیں۔ اللہ رے ہمت، آپ کے کمالاتِ حسیہ کا نقشہ اتارنا ممکن مگر اس خداداد نعمت کو کن لفظوں میں ادا کروں جس کے کارناموں نے عقل کو حیران اور زبان کو گنگ بنا دیا ؎

گر مصور[6] صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

---

[1] عربی کے یعنی سوا تین بجے صبح یہاں کے۔ [2] سات متواتر قراءتوں میں سے ایک قراءت کے قاری امام نافع مدنی ہیں اور عام طور سے جو ہمارے یہاں قراءت ہے وہ امام عاصم کوفی کی ہے بروایت حفص ؒ کے۔ [3] پٹھوں کے سُن ہونے کا۔ [4] ۱۳۴۶ھ میں۔ [5] اللہ تعالیٰ ان کی مٹی کو پاکیزہ اور جنت کو ان کا ٹھکانا بنا دیں۔ [6] تصویر بنانے والا اس دلربا کی صورت کی تصویر تو کھینچ دیگا مگر میں حیران ہوں کہ اس کے ناز و انداز کی تصویر کیسے کھینچ دے گا۔ (جمیل احمد)

تدریس اور بیعت

اے[1] بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ۔۔۔ تا راہ بیں نباشی تو کے راہبر شوی
در مکتبِ حقائق و پیشِ ادیبِ عشق[2] ۔۔۔ ہاں اے پسر[3] بکوش کہ روزے پدر[4] شوی

۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء جبکہ آپ کی عمر انیس[19] سال تھی آپ کے تعلیم دینیات سے فراغ کا سال ہے جس کی خوشی میں آپ کے والد شاہ مجید علی صاحب نے تمام برادری کو اس طرح مدعو کیا جیسے تقریبات شادی و نکاح میں پکا جاتا ہے اور بڑی فراخدلی سے سب کو کھانا کھلایا۔

معین مدرسی کے عہدہ پر تقرر فارغ ہوتے ہی آپ مدرسہ مظاہر علوم میں معین المدرسین بنا دیئے گئے اور آپ کا درس شروع ہو گیا تھا کہ ایک زمانہ تھا جس میں پسر[3] بن کر آپ استاذ کے سامنے بیٹھا کرتے تھے اور اب بحمد اللہ وہ وقت آگیا کہ اسی مدرسہ میں آپ پدر[4] بن کر مسندِ درس پر بیٹھے اور ابتدائی کتابوں کے طلبہ آپ کے شاگرد بنے۔

ادب کی تحصیل کے لئے لاہور کا سفر مگر تحصیلِ ادب[5] کا شوق چونکہ آپ کو بے چین کئے ہوئے تھا اس لئے آپ لاہور چلے گئے۔

ترجمۂ قاموس سے ترجمہ و تالیف کا آغاز اور جب وہاں سے واپسی ہوئی تو آپ کے ماموں مولانا محمد یعقوب صاحب نے آپ کو دس روپے ماہوار پر قاموس[6] کا ترجمہ کرنے کے لئے منصوری پہاڑ پر بھیجدیا کہ کسی صاحب نے ترجمہ سے مناسبت رکھنے والے قابل عالم کی آپ سے درخواست کی تھی اور اس کے لئے آپ نے حضرت کا انتخاب فرمایا تھا۔

مدارسِ عربیہ میں منصبِ تدریس پر تقرر منصوری پر آپ کے قیام کو چند ماہ گذرے تھے کہ منگلور کے مدرسہ عربیہ میں مدرس کی طلب ہوئی اور آپ کو مدرسِ اول بنا کر وہاں بھیجدیا گیا۔ اس کے بعد آپ بھوپال، بہاولپور، بریلی اور دار العلوم دیوبند میں مدرس رہے جس کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا۔

---

[1] اے معرفت کے بے خبر کوشش کرتا کہ تو باخبر والا ہو جائے جب تک راہ کا دیکھ لینے والا نہ ہو جائے گا راہ پر لیجانے والا کب ہو سکتا ہے۔
[2] حقیقتوں کے مدرسہ میں اور ماہرِ عشق کے سامنے اے بیٹے کوشش خوب کرو تاکہ ایک دن تم باپ بن جاؤ۔
[3] لڑکا۔ [4] باپ۔ [5] فنِ ادب کا حاصل کرنا۔ [6] عربی لغت کی بڑی معتبر اور سخت عبارت کی کتاب ہے، اس کا مقدمہ بہت مشکل ہے۔ (جمیل احمد)

مظاہر علوم میں بعہدۂ صدر المدرسین

اور آخرکار ۱۳۱۴ھ میں جبکہ آپ کی عمر پینتالیس[۴۵] سال کی تھی چالیس[۴۰] روپے مشاہرہ پر صدر مدرس ہو کر مظاہر علوم سہارنپور میں تشریف لے آئے جس میں آپ نے پڑھا اور علمی نشو ونما پایا تھا، دلدادۂ باغبان بن کر اپنے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب کے لگائے ہوئے اس باغیچہ کو جس شیفتگی وعشق کے ساتھ آپ نے سینچا نمو لایا اور پانی پہنچایا ہے اس کا اظہار آج خود مدرسہ کی زبانِ حال کر رہی ہے ؎

بخدا[۱] کہ رشکم آید زدو چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

سلوک کی طرف رغبت

باوجودیکہ آپ درسِ نظامیہ کے تمامی علوم سے فارغ ہو چکے اور مسند درس پر بیٹھ چکے تھے مگر آپ کی فطرتِ سلیمہ مغز کے روغن اور بدن کی روح یعنی اس معرفتِ الٰہیہ کی جویاں تھی جو قال کو حال بنادے اور اس آبحیات کی پیاس تھی جو کشتِ زارِ ایمان کی آبیاری کرے اور اعمالِ جوارح[۲] کے ایک ایک دانہ کو ستر ستر ہزار بنا کر نکالے۔

غذا ہی ہے جس سے خون پیدا ہو کر حیات وقوتِ جسمانی مرتب ہوتی ہے مگر غذا کی رغبت وطبعی خواہش ایک دوسری چیز ہے کہ وہ نہ ہو تو جبر وقہر کے درجہ میں غذا کا استعمال چنداں مفید اور پائیدار نہیں ہوتا۔ ایک شخص کو معلوم ہے کہ زراعت کا یہ طریق ہے مگر اس کو کھیتی کرنے سے دلچسپی نہیں ہے لہذا یہ علم اس کے لئے کارآمد نہیں۔ اسی طرح علوم شرعیہ حصول نجاتِ اخروی کے لئے بمنزلہ شرط اور رکنِ اعظم ہیں مگر اس کے ساتھ ہی جب تک قلب میں آخرت کا یقین اور اس کی لذتوں کے حاصل کرنے کا شوق نہ ہو اس وقت تک اس علم پر بطیبِ[۳] خاطر عمل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احسان اُمت پر

پیغمبرؐ کے احسان امت پر دو طرح کے ہیں ایک یعلمھم[۴] الکتاب کہ وہ راستہ بتاتے اور طریقِ نجات سکھاتے تھے دوم یزکیھم[۵] کہ پاس بٹھا کر قلب میں ایک نور ڈالتے اور عمل کا ایک شوق جس کو دلچسپی کہنا چاہیئے پیدا کرتے تھے کہ عمل کے لئے محرک بن کر حاضر وغائب بحالتِ عسر ویسر ہر صورت میں بندۂ خدا اور مستقیم الحال[۶] بنائے رکھے۔ پس خاکی انڈا ہر چند کہ انڈا ہے مگر اس کے اندرون میں ایک نظر نہ آنے والی ایسی شے کی

---

[۱] خدا کی قسم اپنی دونوں روشن آنکھوں سے مجھ کو رشک آتا ہے کہ ایسے نازک چہرہ پر نظر کرنا ایک حسرت کی چیز ہے۔
[۲] ظاہری اعضاء کے اعمال وعبادات کے۔ [۳] خوش دلی سے اور گو گرانی کے ساتھ بھی عمل ہو تو مفید ہی ہے بلکہ زیادہ مفید کہ مشقت کا بھی ثواب ہوگا مگر دل نہ لگنے میں چھوٹ چھوٹ جانے کا خطرہ ہوتا اور پھر غفلت کا غلبہ ہو سکتا ہے مگر خوش دلی اور ذوق شوق سے کام عمدہ اور دوام کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے یہ طریقہ گو فرض وواجب نہیں مگر اعلیٰ درجہ کا مستحب ضرور ہے کہ بدعملی سے اور اس کے خطرے سے حفاظت اور عمل میں روح ودوام پیدا ہوتا ہے۔ [۴] لوگوں کو اللہ کی کتاب سکھاتے ہیں [۵] ان کو پاکیزہ بناتے ہیں برائیوں سے بچا کر بھلائیوں سے موصوف کرتے ہیں [۶] جس کی حالت دائمی ہو سنبھلنے کی ایک مثال ہو سب باتوں میں برابری نہیں۔ محمد جمیل احمد

کمی ہے جس کے سبب اس میں بچہ بننے کی قابلیت نہیں اور بقاءِ نسل و سلسلۂ تولید میں اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ پس آپ عالم تھے اور علم مورِث[1] اور عمل کو مورثِ حال بنانے کے خواہشمند تھے۔

تلاشِ شیخ

قدرت نے ولایتِ خاصہ آپ کے نصیب میں لکھی اور شیخِ وقت ہونا آپ کے لئے مقدر فرمایا تھا اس لئے اُس وقت جبکہ آپ منگلور میں مدرس تھے اس نُور کی طلب آپ کے قلب میں پیدا ہوئی جو حرص و ہوا کی ظلمت کو مٹائے اور ایمان میں وہ حلاوت ڈالے جس کے حاصل کرنے کا علمِ ظاہری وسیلہ اور آلہ ہے۔ اور یہ طلب اتنی بڑھی کہ راہبر کی تلاش میں آپ کا طائرِ خیال بار بار پرواز کرتا اور بے چینی کے ساتھ اس کا داعیہ پیدا ہوتا کہ جلد کسی اللہ والے کا دامن پکڑوں جو علمِ ظاہر کے مقصود تک پہنچائے اور طاعت و بندگی کا ذوق پیدا کرے کہ

گر ہوائے این سفر داری دِلا[2] — دامنِ رہبر بگیر و پس درآ
بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق[3] — عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق
گر تو خواہی خرمی دل زندگی[4] — بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی ست[5] — زندگی بے بندگی شرمندگی ست
جز خضوع و بندگی و اضطرار[6] — اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی[7] — کفر باشد نزدِ او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بَر[8] — مغز باید تا دہد دانہ شجر

تزکیۂ باطن کی اہمیت

دنیا اور دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے بنائی گئی ہے کہ ایک چیز بھی نہ ہو تو کسی نہ کسی انسانی ضرورت میں حرج ضرور واقع ہو جائے گا، مگر انسان دنیا کی کسی چیز کے لئے بھی نہیں بنایا گیا کہ انسان معدوم ہو جائے تو کسی چیز کا کوئی بھی حرج و نقصان نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اصطبل اور گھاس دانہ کا تمامی سامان گھوڑے کے لئے ہے مگر گھوڑا صرف آقا کی سواری کے لئے اسی طرح تمامی کائنات زمین و آسمان

[1] وارث بنانے والا یعنی ذریعہ۔ [2] اگر اے دل تو اس سفر (خدا تک پہنچنے) کی خواہش رکھتا ہے تو کسی راہبر (سچے پیر) کا دامن پکڑ لے اور پیچھے پیچھے چلا آ۔ [3] بغیر کسی ساتھی (سچے پیر) کے جو بھی عشق کے راستہ پر ہو لیا تو عمر گذر گئی اور عشق سے واقف ہی نہ ہو سکا۔ [4] اگر تم خوش و زندہ دلی (حقیقی) چاہتے ہو تو خدا کی بندگی کرو بندگی ہی بندگی [5] خدا کی بندگی کی وجہ سے ہی زندگی مقصود ہے بغیر بندگی کے زندگی آخرت کی شرمندگی ہی شرمندگی ہے۔ [6] سوائے پستی و بندگی و بیقراری کے اس بارگاہ میں کوئی چیز اعتبار نہیں رکھتی۔ [7] جو کوئی عشق میں کی زندگی پالیتا ہے اس کو بندگی کے سوا ہر چیز کفر سی ہو جاتی ہے یعنی نفرت۔ [8] ذوق شوق ضروری چاہئے تاکہ عبادتیں پھل دیں بیج میں گری چاہئے تاکہ درخت دانہ دے سکے۔ (جمیل احمد)

شجر و حجر، نباتات و جمادات سب انسان کی راحت کے لئے ہے اور انسان محض اپنے خالق برتر کی غلامی و عبادت کے لئے، مگر عبادت کے لئے ضرورت ہے دو چیز کی، ایک طریقِ[1] عبادت سے واقفیت جس کا نام علم دین ہے۔ دوم عبادت سے دلچسپی اور شوق و رغبت جس کا نام تزکیۂ[2] باطن اور عشق و محبت ہے۔ پس اول کا حصول بواسطہ درس و تدریس مدارسِ علمیہ میں ہوگا اور شریعت نام رکھا جائے گا، دوسرے کی تحصیل اہل اللہ کی جوتیاں اٹھانے سے خانقاہوں میں ہوگی جس کو طریقت کہا جائے گا اور وہی شریعت کی روح اور مغز اور اصل الاصول ہے کہ اس کے بغیر باوجود علم کے عمل ہی نہ ہو سکے گا یا ہوگا تو بار آور و مثمر نہ ہوگا اور بار آور[3] بھی ہوا تو بے مزہ اور عارضی و ناپائیدار ہوگا جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ علم بلکہ انسانی زندگی کا مقصود اعظم یہی تعلق[4] مع اللہ ہے جو محرک ہوتا ہے علم پر عمل کا اور احکم الحاکمین کی طاعت و عبادت کا۔

حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضری

اس مقصود کے حاصل کرنے کو حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ منبع البرکات سلطان العارفین مخدوم العالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے بہتر کون تھا کہ قطب الارشاد ہونا آپ کا عالم آشکارا ہو چکا اور اہل علم و بصیرت کی جماعت در جماعت دُور دُور سے آپ کی طرف کھچی چلی آتی تھی۔ آپ کا وطن گنگوہ سے پانچ ہی کوس تھا اور گنگوہ میں آپ کی سسرال بھی تھی کہ اکثر آپ یہاں آتے اور حضرت کی زیارت کیا کرتے تھے، آپ یہ بھی دیکھتے تھے کہ آپ کے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب جن کے تبحرِ[6] علم اور کمالاتِ قدسیہ کی ایک خاص عظمت آپ کے قلب میں جاگزیں تھی، گو عمر میں حضرت گنگوہی سے بڑے تھے مگر عقیدتمندانہ حاضرِ آستانہ ہوا کرتے اور بےاختیار حضرت کے پاؤں[7] پر بوسہ دے کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا کرتے تھے۔ حضرت امام ربانی شرماتے اور فرمایا کرتے کہ "آپ مجھے کیوں نادم بنایا کرتے ہیں، آپ تو مجھ سے بڑے ہیں اور آپ کا ادب و احترام مجھ پر ضروری ہے آپ ایسا کام نہ کیا کریں کہ مجھے شرم آتی ہے"۔ مگر حضرت مولانا محبت سے مجبور تھے پھر آپ کے شاگرد رشید مولوی خلیل احمد صاحب کے قلب میں حضرت گنگوہی کی جو بھی عظمت پیدا ہو وہ تھوڑی ہے ؎

---

[1] دل کی صفائی برائیوں سے علیحدگی اور بھلائیوں کا شوق۔ [2] پھل دار۔ [3] پھل لانے والا۔
[4] خدا سے لو لگنا تعلق شدید ہو جانا۔ [5] چھ میل جانب مشرق۔ [6] سمندر جیسا علم۔
[7] یعنی تواضع اور عاجزی کرتے نہ کہ واقعی بوسہ دیتے۔ گو بعض فقہا نے جائز کہا ہے مگر ہمارے بزرگوں نے اس سے بھی احتیاط کی ہے چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ جلد ص ۱۴۶ پر ہے اس کا کرنا اولیٰ نہیں ہے عوام فتنے میں پڑ جاتے ہیں۔
(جمیل احمد)

قافلہ[1] سالا ِ ما روشن ضمیر ۔۔۔ آں رشید احمد شہ برنا و پیر
قطبِ[2] عالم غوثِ دوراں بے مثال ۔۔۔ گنجِ عرفاں نورِ ایقاں خوش خصال
زندہ[3] دل زندہ نفس والاصفات ۔۔۔ تشنگانِ عشق را آبِ حیات
ہادیٔ[4] گم گشتگانِ راہِ حق ۔۔۔ حجتے بر خلق از رب الفلق
ذیلِ[5] او از فضل و امدادِ الہ ۔۔۔ طالباں را مے برد تا پیش گاہ
ظلِ[6] او زندہ کند مُردہ دلاں ۔۔۔ قلبِ او روشن کند قلبِ جہاں
بے[7] نیاز از خلق آں خادم نواز ۔۔۔ با خدا رازو نیاز و دلگداز
گر بگویم[8] تا قیامت نعتِ او ۔۔۔ ہیچ آں را مقطع و غایت مجو

اس لئے جس وقت بھی آپ کے دل کو ایک بے کلی محسوس ہوئی اور وہ ایسے راہبر کا جویاں ہوا جس کے ہاتھ میں ایمان کی باگ پکڑا نا صحیح ہو تو فوراً حضرت قدس سرہ کا تصور آتا اور آپ کے اضطراب میں سکون پیدا کر جاتا تھا، کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کے قلب میں شیخ بنانے کے لئے حضرت کے سوا کسی دوسرے کا خطرہ بھی گذرا ہو اور سچ یہ ہے کہ اسی توحیدِ[9] مطلب نے جو گویا آپ کے لئے فطرت تھی آپ کو اتنا خوش نصیب بنایا جس کی تمنا ہوتی ہے کہ کاش یہ نعمت ہم کو بھی نصیب ہو ذٰلک[10] فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

بیعت چنانچہ آپ نے اپنے ماموں[ع] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو کہ حضرت گنگوہی کے استاد زادہ تھے اور حضرت اُن کا بہت ہی لحاظ فرماتے تھے اس مقصود کا واسطہ بنایا اور لکھا کہ حضرت گنگوہی سے میری سفارش فرما دیجئے کہ مجھے بیعت کرلیں۔ مولانا نے امام ربانی کے نام خط تحریر فرماکر

---

[1] ہمارے قافلہ کا نورانی دل والا سردار وہ رشید احمد جوانوں بوڑھوں کے بادشاہ۔ [2] جہان کے قطب (جن پر احکام تکوینی یعنی اختیار انسانی سے باہر کا مدار ہوتا ہے) زمانہ کے غوث (وہ ولی جو دعا و تصرف سے سب کی مدد کرتا ہو) بے مثال معرفتِ الٰہی کا خزانہ یقین کے نور پاکیزہ عادات والے۔ [3] اللہ کی لگن سے زندہ دل زندہ روح والے بلند صفتوں والے عشق کے پیاسوں کے لئے آبِ حیات [4] حق کے راستے سے گم ہونے والوں کے لئے ہدایت بخش دن کو رات سے جدا کرنے کے رب کی طرف سے مخلوق پر ان کی دلیل جو حق کو باطل سے جدا کردے [5] ان کا دامن اللہ کی امداد و فضل سے طالب الوں کو بارگاہ الٰہی میں لیجاتا ہے۔ [6] ان کا سایہ مردہ دلوں کو زندہ کردیتا ہے ان کا دل سارے جہان کے دلوں کو روشن کر رہا ہے۔ [7] مخلوق سے بے نیاز مگر خادموں کو خوب نوازنے والے اور خدا کے ساتھ دل پگھلانے کے راز و نیاز والے [8] اگر میں قیامت تک بھی ان کی ثنا کرتا رہوں تو کچھ بھی اس کی حد و انتہا نہ تلاش کرو وہ ختم ہونے والی نہیں۔ [9] ایک کی طلب۔
[10] یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے دیدیتے ہیں۔ (جمیل احمد)

[ع] حضرت شیخ الحدیث صاحب نے لکھا ہے کہ تذکرۃ الرشید میں خود حضرت سہارنپوری کے لفظوں میں ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا واسطہ اختیار کیا تھا اس لئے یہاں کچھ سہو ہوا ہے اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو ممکن ہے دونوں سے سفارش کرائی ہو۔ (چشتی)

حضرتؒ کے پاس بھیجدیا اور وہ خط لے کر آپ گنگوہ حاضر ہوئے۔

حضرتؒ کی غیور طبیعت چونکہ وصول الی اللہ کی عظمت و شان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر جمی ہوئی تھی کہ جب تک طالب کے قلب میں سچی طلب نہ ہو اس وقت تک رسمی بیعت بے سود ہے اس لئے طلب کا امتحان فرمایا کرتے اور خداداد حذاقت سے باتوں باتوں میں پتہ چلا لیا کرتے تھے کہ بیعت کا نام مقصود ہے یا کام۔ لہذا آپ نے استاد زادہ کا خط پڑھ کر اس طرح رکھ دیا گویا کوئی چیز ہی نہیں اور استغنا کے ساتھ فرمایا کہ میاں تم پیرزادہ ہو خود پیر ہو تمہیں کسی کے مرید ہونے کی کیا ضرورت؟ مگر اللہ رے خلیل کی قابلیت کہ یہ سنکر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور عرض کیا کہ "حضرت کیسی پیرزادگی میں تو اس دربار کے کتوں کے برابر بھی نہیں۔ بیعت کا حاجتمند ہی نہیں بلکہ سرتاپا احتیاج ہوں اور چھاتی سے لگائیے یا دھکے دیجئے میں تو حضرت کا غلام بن چکا۔"

یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلنے تھے اور حضرت کے چہرہ پر انبساط کی لہر دوڑنی تھی کہ آپ نے فرمایا بس بس بہت اچھا اور اس کے بعد فوراً بیعت کر لیا ؎

طلبگار[1] باید صبور و حمول ‏ ‏ ‏ کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

غلام نواز آقا کی محبانہ کشش نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہی آپ کو محبوب بنالیا اور آپ یہ عہد کئے ہوئے گنگوہ سے رخصت ہوئے کہ حضرت نے جو کچھ ارشاد فرمایا یا آئندہ فرمائیں گے اس پر مرمٹوں گا اور جان کھپا دوں گا کہ طلب کا منتہا یہی ہے ؎

بحرے[2] است بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ‏ ‏ ‏ آنجا جز ایں کہ جاں بسپارند چارہ نیست

امام ربانی کا مرجع[3] علماء و صلحاء ہونا تو آپ عرصہ سے دیکھ رہے تھے اور آپ کا جامع شریعت و طریقت شیخ ہونا آپ کے لئے عین الیقین[4] بن چکا تھا مگر اب نفس کی بیع[5] تمام ہو جانے کے بعد تو آپ اپنے خریدار کے شیدا بن چکے تھے کہ آپ کا رُواں رُواں پکارتا تھا ؎

گنگوہ میں اک خدارسیدہ دیکھا ‏ ‏ ‏ اللہ کا برگزیدہ بندہ دیکھا

کیا وصف بیاں کروں میں اس کا ممتاز ‏ ‏ ‏ انسان کی شکل میں فرشتہ دیکھا

آپ کے قلب میں محبت کی ایک حرارت تھی جو رگ رگ میں پھیلتی جاتی اور اللہ جل جلالہٗ کی طرف

---

[1] طلب والا تو صبر و تحمل کرنے والا ہونا چاہئے کیونکہ میں نے کسی کیمیا والے کو اکتا جانے والا نہیں سنا۔ [2] عشق کا دریا تو ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں وہاں تو اس کے سوا کہ جان ہی سپرد کر دیں اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ [3] اہل علم و تقویٰ کے رجوع کی جگہ۔ [4] وہ یقین جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ [5] بیعت کر لینا اپنے نفس کو پیر کے ہاتھ بیعت کر دینا ہے کہ اب اس کی ہدایات پر ہی عمل ہوگا چاہے عقل میں آئیں یا نہ آئیں۔ (جمیل احمد)

توجہ کا ایک میلان تھا جو خون کے ساتھ ملا ہوا سارے بدن میں سرایت کر رہا تھا جس کی بے کیف لذت کے اظہار پر آپ کو قدرت نہ تھی اور اس خواہش میں کہ کاش تمامی امت محمدیہ اس مزہ سے آشنا ہو جائے آپ بزبانِ حال کہہ رہے تھے ؎

بازارِ عشق و شوقِ[1] محبت کے جاں فروش　　لپکیں کہ چل چلاؤ ہے دنیائے دوں[2] کا
سیکھیں طریق وصل و لقائے خدائے پاک　　دل بیچ کر خرید لیں سودا جنون کا

غرض آستانۂ گنگوہیہ سے آپ ایک لطیف روح لے کر واپس ہوئے کہ علمِ شریعت کے منتہی تھے اور علمِ طریقت کے مبتدی، مدرسہ عربیہ میں آپ مدرس تھے کہ طلبہ کو درس دیتے تھے اور مکتبِ معرفت کے آپ طالب علم تھے کہ خالقِ جل جلالہٗ کی عظمت و محبت کا سبق پڑھا کرتے تھے۔ دن بھر تشنگانِ علم کو فقہ و تفسیر کا سبق پڑھاتے اور شب کو ذکر الٰہی سے انس و التذاذ[3] حاصل کرتے اور سنسان گھڑیوں میں جبکہ دنیا پڑی سویا کرتی آپ اپنے مولیٰ کے ساتھ راز و نیاز[4] میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ آپ کے شاگردوں عزیزوں اور آنے جانے والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ آپ کس دھن میں لگے ہوئے اور کس سوز و گداز میں مبتلا ہیں ؎

نظر کو کیا خبر پردہ کے اندر دل لگی کیا ہے　　کوئی آزاد کیا جانے کسی دل کی لگی کیا ہے

منازلِ سلوک

اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ نے کس ترتیب سے سلوک طے کیا، شیخ کی طرف سے کیا کیا تعلیم ہوئی، کیا حالات گذرے اور راہِ طریقت قطع کرنے میں کیا کیا مناظر آپ کو پیش آئے بجز اس کے کہ حضرت نے ایک بار خود فرمایا "مجھے نہ زیادہ واردات پیش آئے اور نہ آخر تک میں سمجھا کہ نسبتِ سلسلہ کیا چیز ہے بس ایک حالت تھی جو گذر رہی تھی۔"

دستارِ خلافت اور خلافت نامہ

حتیٰ کہ ۱۲۹۷ھ[5] میں جب آپ دوسرے حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو حضرت امام ربانی نے مرشد العرب والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ شاہ صاحبؒ کی خدمت میں لکھا کہ "مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہوتے ہیں حضرت ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔" چنانچہ جب آپ حاضر ہوئے تو اعلیٰحضرت

---

۱ بلواز ۲ کمینی ۳ مزہ اور لذت حاصل کرنا۔　(جمیل احمد)

[4] مولانا محمد الیاس صاحب کی روایت ہے کہ حضرت تہجد کے اہتمام کی خاطر سوتے وقت دونوں قدم کے انگوٹھے باہم ملا کر باندھ لیا کرتے تھے کہ وہ بے اختیاری نیند تو آجاتی جس میں پھر کر ہوش بھی نہیں رہتا اور صحت کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے باقی وہ نیند جس میں کروٹ لینے یا پاؤں سمیٹنے اور پھیلانے کی نوبت آوے نہیں آتی تھی اور پھر بے کلی میں اٹھتے ہی بن پڑتی تھی۔ [5] بذل المجہود، ترجمۃ المؤلف اور تذکرۃ الرشید میں اس حج اور حصولِ خلافت کا سال ۱۲۹۶ھ لکھا گیا ہے مگر حضرت گنگوہی کے مکاتیب سے جو کہ حضرت کے نام بھاولپور سے جاتے رہے پتہ چلتا ہے کہ یہ سال آپ کے حج کا نہیں بلکہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء ہے۔　(مؤلف)

آپ کی باطنی کیفیت مشاہدہ فرما کر نہایت خوش ہوئے اور جب آپ رخصت ہونے لگے تو چھاتی سے لگایا اور اپنی دستارِ مبارک سر سے اتار کر آپ کے سر پر رکھدی، امامِ ربانی کے نام مبارکباد کا خط اور اور حضرت کے نام کا خلافت نامہ[1] مزین بمہر آپ کے حوالہ فرما کر رخصت کیا حضرت نے اس شاہی عطیہ کو ایک خاص احترام کے ساتھ قبول کیا اور دستارِ مبارک کو اسی بندش پر جو اعلیٰحضرت کی باندھی ہوئی تھی جگہ جگہ سوئی سے سی لیا کہ اس کے بل جدا نہ ہونے پائیں۔

خلافتِ ثانیہ اور جب ہندوستان پہنچ کر گنگوہ حاضر ہوئے تو اعلیٰحضرت کا والا نامہ پیش کر کے یہ دونوں عطیے بھی امامِ ربانی کے سامنے رکھدیئے۔ حضرت نے فرمایا مبارک ہو یہ تو اعلیٰحضرت کا عطیہ ہے۔ آپ نے عرض کیا کہ بندہ تو اس لائق نہیں یہ حضور کی بندہ نوازی ہے اور اور میرے لئے تو وہی مبارک ہے جو آنحضرت کی طرف سے عطا ہو۔ نیز یہ بھی عرض کیا کہ اجازت نامہ درحقیقت شہادت ہے کسی مسلمان کے ایمان کی، لہٰذا دو[2] مقبول شہادتیں ثبت ہوں گی تو ہر شخص کے نفسی نفسی پکارنے کے وقت بارگاہِ خدا میں پیش کر سکوں گا" حضرت امام ربانی آپ کے اس حسنِ ادب سے کہ اصل کمال یہی ہے بہت خوش ہوئے اور خلافت نامہ پر دستخط فرما کر مع دستار آپ کے حوالہ فرما دیا۔

شیخ کا ادب اس طرح پر جیسے آپ نے تکمیلِ علومِ شریعت کی دستارِ فضیلت حاصل کی تھی اسی طرح طریقِ سلوک طے فرما کر روحانی باپ اور جدِ امجد کے ہاتھوں سے دستارِ خلافت حاصل فرمائی اور اس نسبتِ احسانیہ سے مالامال ہوئے جس کا مشکوٰۃ[2] قلبِ رشیدی تھا اور جو سلسلۂ رشیدیہ کی شاخ بن کر سلسلۂ خلیلیہ چلنے کی بنیاد تھی مگر یہ آپ کا حسنِ ادب تھا کہ جب تک حضرت امامِ ربانی حیات رہے آپ نے کسی طالب کو خود بیعت کرنا پسند نہ فرمایا اور اگر کسی ضرورت اور اصرار پر اس کی نوبت بھی آئی تو آپ نے توبہ کرا کے یہ الفاظ کہلائے کہ "بیعت کرتا ہوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے خلیل احمد کے ہاتھ پر" ہاں حضرت امامِ ربانی کی وفات کے بعد آپ کا سلسلہ بڑھا اور اطرافِ ہند سے آگے نکل کر حجاز تک پہنچا کہ اہلِ حرمین شریفین نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

طریق و مراتب کا خلاصہ قلب میں کیفیاتِ حسنہ اور انوار و تجلیات کا ورود قدرت نے علاقۂ محبت کے ساتھ مربوط کیا ہے کہ اصل جاذب[3] کمالات مرید کا اپنے شیخ کے ساتھ وہ تعلق روحانی ہے جس کو حُبّ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور حدیث المرء[4] مع من احب میں

---

[1] اب حضرت کا سلسلہ بلاواسطہ بھی حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے ہوگیا۔ گو حضرت نے شجرہ میں حضرت گنگوہی کا ہی واسطہ برقرار رکھا کہ یہ بھی انہی کے طفیل تھا۔ [2] وہ طاق جس میں چراغ ہو یعنی نکل کر نور پھیلنے کی جگہ۔ [3] کمالاتِ باطنیہ کو کھینچ لینے والا۔ [4] انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت رکھتا ہے یعنی قیامت میں ان کے ساتھ ہوگا۔ (جمیل احمد)

اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، باقی اذکار و اشغال اور تعلیم کردہ اوراد و اعمال اس کے آلۂ کار بمنزلہ اوزار کے ہیں کہ ان کے بدون بھی چارہ نہیں۔ دیکھو ریل کا چلنا حقیقۃً اس بھاپ پر موقوف ہی جس کو گیس کہا جاتا ہے اور وہ جتنی قوی ہوگی اسی قدر انجن کی رفتار تیز اور قوی ہوگی کہ اس کے بغیر گاڑی ایک قدم بھی نہیں سرک سکتی۔ مگر با ایں ہمہ پٹڑی اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے بغیر رفتار مستقیم و معتاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر چونکہ عمل و مجاہدہ امر اختیاری اور کسبی[۱] ہے مگر حُب و اُنس اور ربط[۲] مع الشیخ امر غیر اختیاری اور محض وہبی امر ہے اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ جس کو جو کچھ بھی روحانی کمال نصیب ہوا وہ محض فضلِ خدا سے نصیب ہوا ہے نہ کہ کسب سے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ جو اس کے مقرر کردہ طریق پر چلتا اور مجاہدہ و ریاضت میں اپنے آپ کو ڈالتا ہے وہ اسی کو روحانی کیفیات بخشتا اور اپنے قرب کا مزہ چکھاتا ہے ورنہ اس کی غفلت و بے پروائی جو کہ اس کا امر اختیاری ہے اس کی محرومیت کا سبب بن جاتی ہے پس حضرتؒ کا مجاہدۂ عملیہ اتنا کثیر نہیں ہے جتنا آپ کے اکثر ہمعصروں کا، مگر وہبی امر یعنی حب مع الشیخ نے آپ کے تھوڑے عمل پر وہ ثمرہ مرتب کیا جو دوسروں کے کثیر پر بھی مرتب نہیں ہوا۔ اور یہی راز ہے امتِ محمدیہ کے اعمالِ قلیلہ پر اُن صلات و اجور کے مرتب کرنے میں جو دوسری امتوں کے اعمالِ کثیرہ پر بھی مرتب نہیں ہوئے کہ محبوبیت کے ساتھ نوازے ہوئے پیغمبر کے ساتھ محبت و عقیدت کا تعلق رکھنے والا لاغلام جذبۂ محبت کی وجہ سے انوارِ محمدیہ کا وہ انعکاس قبول کرے گا جس سے دوسرے قلوب محروم رہیں گے۔ پس اس وہبی امر اور عطار[۳] و فضل میں کسی کو اس سوال کا کیا موقع کہ فلاں پر کیوں فضل ہوا اور ہم پر وہ فضل کیوں نہ ہوا۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ[۴]۔

شیخ سے تعلق و محبت کا ثمرہ

حضرتؒ پر حق تعالیٰ شانہٗ کا خاص فضل تھا کہ بیعت ہوتے ہی آپ کے قلب میں حضرت گنگوہیؒ کی وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جس کو دنیا کی ہر مرغوب سے مرغوب چیز بلکہ ماں باپ کی محبت کے ساتھ بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی محبت مرقاۃ[۵] حبِ الٰہی کی پہلی سیڑھی تھی کہ اس کے بغیر منتہائے[۶] مراد کا حصول ناممکن ہے۔ پس یہی نہیں کہ آپ ذکر و شغل کی بابت شیخ سے پوچھیں یا دعا و توجہ ہی کی درخواست کر دیا کریں بلکہ آپ مجبور تھے کہ علومِ درسیہ میں جو کچھ اشکال پیش آئے وہ بھی باوجود استاذ کے موجود ہونے کے بے تکلف حضرتؒ ہی سے

---

[۱] کمانے یعنی کوشش کرنے سے حاصل ہونے والی چیز۔ [۲] پیرسے پیوست ہو جانا [۳] بلا اختیار کے حق تعالیٰ عطا وغیرہ ہے۔ [۴] یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ [۵] زینہ۔ [۶] آخری۔ (جمیل احمد)

پوچھیں اور اس طرح پوچھیں کہ شاگرد بعض دفعہ سوال پر سوال کرتا ہوا جھجکے مگر آپ رکاوٹ[۱] دل تنگی کا نام بھی نہ لیں۔ نیز معاد[۲] کے ساتھ معاش[۳] کے متعلق بھی ہر جزئی و کلی امر میں مشورہ باوجود والدین اور دیگر اعزہ واقارب کے حیات ہونے کے آپ ہی سے لیں اور اس طرح لیں کہ بیٹے کو اپنی ضیق[۴] بیان کرتے ہوئے باپ سے شرم آئے مگر آپ اس میں تامل یا تعویق[۵] کا خطرہ بھی نہ لائیں۔ بیعت کے بعد آپ کی ملازمت کا تعلق جہاں بھی ہوا وہ حضرت[۶] کے مشورہ ہی سے نہیں بلکہ گویا تجویز اور حکم سے ہوا اور جہاں بھی آپ جتنی مدت رہے حضرت کے ایما و اشارہ سے رہے کہ بیمار پڑے اور آب و ہوا ناموافق ہوئی تو روحانی باپ کو اطلاع ضروری مگر یہ وسوسہ بھی نہ ہوا کہ صریح حکم رضا آئے بغیر ترک ملازمت کا نام لیں۔ اسی طرح جب حضرت کا ایما کسی جگہ سے علیحدگی کا ہوا تو کبھی خطرہ بھی نہیں گذرا کہ ترک کی وجہ دوسروں کو کیا بتاؤں گا۔

چنانچہ بہاولپور میں آپ کو طرح طرح کی تنگیاں پیش آئیں مگر آپ نے جبراً وقہراً نہیں بلکہ طبع کے خلاف کو رضائے شیخ کی حلاوت سے موافقِ طبع بنا کر پورے گیارہ برس وہاں گذارے اور ترکِ ملازمت کا نام نہ لیا۔ اسی طرح جس وقت آپ کو حکم پہنچا کہ دیوبند چھوڑ کر مظاہرِ علوم سہارنپور میں جاؤ تو سب ہی کو حیرت تھی مگر آپ اس خوشی سے آئے جیسے مسافر اپنے گھر آتا ہے۔

یہ ربطِ قلب اور عظمت و محبتِ شیخ کی وہ وہبی عطا تھی جس نے معیت[۷] و مجانستِ تامہ[۸] پیدا کر کے اسی مخصوص نسبت سے آپ کو مالامال کیا جو قدرت نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو نصیب فرمائی تھی۔

رویا رمضان ۱۳۱۷ھ میں آپ نے بحالتِ اعتکاف خواب دیکھا کہ خربزہ تراش کر حضرت امام ربانی کو کھلا رہے ہیں اور لعاب جو اس کے کھانے میں حضرت کے دہن سے گر رہا ہے اس کو اپنی زبان پر لے رہے ہیں۔ حضرت کو خواب سنا کر جب تعبیر پوچھی تو حضرت مسکرائے اور فرمایا تم خود سمجھتے ہوگے آخر نسبت تو ایک ہی ہے۔

اسی طرح ایک بار کسی تذکرہ میں حضرت کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ جو میں وہی مولوی خلیل احمدؒ۔

دو خط جو حضرت امام ربانی نے آپ کے نام بہاولپور بھیجے اور تیسرا خط جو دیوبند آپ کے پاس بھیجا چونکہ اہلِ علم کے لئے نتائج مفیدہ پر مشتمل ہیں اس جگہ نقل کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ حضرت کو طریقِ معاش میں بھی عمل کے لئے اعلیٰحضرت کا ایما لینے کی کس[۹] درجہ کوشش رہتی تھی جو کہ ثمرہ ہے حُبّ و عظمتِ شیخ کا اور مفہوم ہے اس شعر کا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را ۔ تو دانی حساب کم و بیش را[۱۰]

---

[۱] آخرت کے معاملات [۲] دنیا کی زندگی کے معاملات۔ [۳] تنگی و تنگدلی [۴] دیر لگانا۔ [۵] ساتھ اور یک جنس ہونا پوری طرح کا یعنی کامل اتحاد۔ [۶] حالانکہ شیخ سے تعلق امور دین اور ان میں سے بھی اصلاح باطن کے لئے ہوتا ہے اور بظاہر امور دنیا یا علوم ظاہری کی بات بے محل معلوم ہوتی ہے مگر محبت کی شدت جو یگانگت پیدا کر دیتی ہے اس میں سب برمحل بن جاتا ہے [۷] میں نے تو اپنی کل جمع پونجی م

[۸] آپ کے سپرد کر دی اب کم زیادہ کا حساب آپ جانیں۔ (جمیل احمد)

مدرسۂ دینیات جس میں حضرت مدرس تھے جب کالج کے ماتحت ہوا اور علوم فلسفہ وہیئت داخل ہوئے تو آپ نے اعلیحضرت کو اطلاع دی اور جواب اس طرح آیا:۔

فلسفہ درس اور تاریخی تالیف کا حکم

مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا۔ مدرسہ کے حال سے البتہ تاسف ہونا چاہئے۔ بندہ کے نزدیک جب اس قدر مشقت اور خلافِ وضع تعلیم[1] سپرد کی جاتی ہے ترک کر دینا مناسب ہے۔ سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ جب اُن لوگوں کا اس میں دخل ہوا تو انجام کار جانے کیا کیا ترمیم[2] ہووے گی۔ اور جب اس قدر بارِ گراں سر پر رکھا گیا تو پھر سارے روز و شب شغل دنیا ہی دنیا کا ہوا۔ شغل باطن کو بالضرور نقصان ہوویگا۔ اس[3] کی کمی کے مقابلہ میں سب ہیچ ہے۔ اگرچہ تالیف تاریخ و سیر[4] بھی عمدہ ہی کام ہے مگر بوجہ دنیا اور مشقت مضر کے ساتھ ہے اور بے اختیاری کی صورت میں روز بروز ترقی ان خیالاتِ فاسدہ کی ہووے گی، ایسی حالت میں پسند[5] بندہ نہیں، رزق مقدر ہے۔

کتبِ فلسفہ میں عقائدِ فاسدہ

پھر تعلیم صدرا خود ناپسند ہے۔ انصاف کرنا چاہئے کہ اثباتِ ہیولیٰ[6] وصورت وابطال جزؤ[7] اور اقرار قدم ہیولیٰ وصورت سے کیا مطلب ہے؟ ابطالِ قیامت واقرار تعددِ[8] قدما و عدم[9] اختیار جل علاشانہ نہیں تو کیا ہے؟ ان عقائدِ فاسدہ کو منہ سے نکالنا موجبِ ظلمت ہے اور پھر دلائل سے ثابت کرکر طلبہ کو اس پر قائم کرنا اور شبہات کو دفع کرکے پختہ[10] کرنا ضروری ہے۔ گو دل میں عقیدہ نہیں مگر کفار کے عقیدہ کا اثبات ہے۔ اگر انجیل کی تعلیم پادریوں کے مدرسہ میں کرے اور عقیدہ بطلان تثلیث وغیرہ ہو تو کیوں بُرا جانتے ہیں؟ یہاں بھی وہی ہے پہلے[11] زمانے میں بضرورت ابطال مذہب فلاسفہ اور معتزلہ اس کو پڑھنے کی ضرورت تھی کہ مطلع ہو کر اس کے قواعد کے جواب دیویں، اب کیا ضرورت ہے؟ بالکل[12] غلط ہے سب حیلہ ہے۔ لہٰذا اس نوکری کو جائز نہیں جانتا ہوں۔ فقط

[1] دینی آدمی کے لئے دنیوی تعلیم۔ [2] مدار منتظم پر ہوتا ہے دنیا دار دنیا ہی کا کام بنا کر رکھے گا۔ [3] باطن کی ذرہ برابر کمی کے مقابلہ میں ساری دنیا ہیچ ہے۔ [4] جو دین والوں کی ہوں۔ [5] ملازمت کی مجبوری سے ترک نہ ہو سکے پر یہی راز ہے کہ علمائے دین نے تاریخ وسیر پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ [6] مادہ۔ [7] وہ ٹکڑا جس کے آگے ٹکڑے نہ ہو سکیں۔ [8] قدیم ہونا کبھی محدود نہ رہا ہو نہ آئندہ ہو۔ [10] کئی قدیم ماننا حالانکہ صرف ایک ذات خدا کی قدیم اور سب کچھ حادث یعنی عدم کے بعد پیدا کئے ہوئے ہیں۔ [11] کئی قدیم مانے گئے تو ان پر اختیارِ خداوندی نہ رہا اور خدا کو بے اختیار قرار دینا کفر ہے۔ [12] جو سبق کا مقصود ہے تو یہ کفر کو ثابت کرنا اور پختہ بنانا ہوا جیسے اگلی مثال میں ہے۔ [13] سوال یہ ہے کہ اسلاف نے آخران کتابوں کو داخل نصاب کیوں کیا یہ اس کا جواب ہے کہ وہ فلسفہ کا دور تھا اس کو توڑنا تھا۔ [14] کیا اب رد نہ کیا جائے، جواب اس وقت ضرورت تھی اب ضرورت نہیں اجازت نہیں اس پر قیاس کرنا غلط ہے حیلہ ہے۔ (جمیل احمد)

چنانچہ حضرتؒ ترک پر طیار ہو گئے مگر جب معلوم ہوا کہ حضرت کے سپرد صرف حدیث و تفسیر کے اسباق ہوں گے اور کالج کی ماتحتی محض ضابطہ کے درجہ میں ہے کہ اس کا کوئی اثر آپ کی نشست و برخاست پر بھی نہ پڑے گا تو آپ نے پھر حضرت کو اطلاع دی اور یہ جواب آیا۔

ملازمت کا معیار

مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آج آپ کا خط آیا اس میں دوسری صورت لکھی ہے۔ اب خلاصۃ الجواب یہ ہے کہ جب تک تم دیکھو کہ بالکل خلافِ شرع کام نہیں کرنا ہوتا اور طاقت کے قدر کام ہوتا ہے اور تمہارے شغل میں حرج بھی نہ ہووے تو ترک مت کرو۔ بلکہ اب میں تم کو اختیارِ کلی دیتا ہوں اور تمہاری رائے پر چھوڑتا ہوں مجھ سے استفسار کی بھی حاجت نہیں۔ جب تک تمہاری طبیعت چاہے کرو اور جب کوئی امرِ حارج[1] عارض ہو جاوے ترک کر دینا۔ غرض بندہ کی طرف سے تم اپنے امور اور مولوی نذیر احمد کے معاملہ میں مختار ہو، اگرچہ مشورہ کو منع نہیں کرتا مگر تم کو تکلیف تحریر ہوتی ہے اس لئے یہ لکھے دیتا ہوں لگے[2] علاقہ کا ترک اچھا نہیں ہوتا۔ معاش کی ضرورت میں پھر پریشانی ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں[3] کی ریاست کا ہر حال دوسری جگہ سے اچھا حال ہوتا ہے لہذا ترک کرنے میں جلدی مت کرنا اور مولوی نذیر احمد کے واسطے بھی ایسا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فقط۔

چنانچہ آپ رک گئے اور پھر چھ سال تک ترکِ ملازمت کا نام نہ لیا۔ اسی طرح جب آپ دار العلوم دیوبند میں مدرس دوم تھے تو دفعۃً حضرت کا والا نامہ آپ کے نام پہنچا۔

ازبندہ رشید احمد عفی عنہ۔ جناب مولوی خلیل احمد صاحب سلمہ۔ السلام علیکم۔ مدرسہ سہارنپور کی سرپرستی میرے ذمہ کی گئی اور بہ مجبوری[4] اس امرِ خیر کو گوارا کرنا پڑا۔ چونکہ ہر طرح اس مدرسہ کی نگرانی میرے ذمہ ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔

سنہ ۱۳۱۴ھ مظاہر علوم میں تدریس کے اعلیٰ منصب پر تقرر

اس وقت اُس کی بہبودی اِس ہی امر کو مقتضی ہے کہ آپ فوراً مدرسہ دینیہ سہارنپور کی مدرسی اعلیٰ قبول کر کے فوراً وہاں تشریف لے جائیں۔ اہلِ دیوبند کو آپ کی مفارقت اگرچہ گوارا نہیں مگر بمقتضائے وقت یہی ضروری ہے لہذا آپ اس کی تعمیل میں توقف نہ کریں۔ (مہر)

از گنگوہ سرائے۔ سہ شنبہ ۳ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۳۱۴ھ

---

[1] کر دین کی تعلیم ہو گی۔ [2] تنگی و تنگدلی میں ڈالنے والا۔ [3] کام لگا ہونا بھی حق تعالیٰ کا ایک فضل ہے بغیر دینی مجبوری کے اس کا ترک ناشکری ہے۔ [4] لگے کام کو نہ چھوڑنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ موجودہ باتوں سے سخت بن جاتی ہے اس لئے من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھا کہ جو دو مصیبتوں میں گھرا ہو وہ آسان کو اختیار کرے اور موجودہ دیکھی بھالی آسان ہے بہ نسبت نئی مصیبت کے۔ [5] تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت یا ریاست دوسروں سے افضل ہے۔ [6] مشاغل کثیرہ و ضعف کی مجبوری کا تقاضا تو نامنظور کرنے کا تھا مگر نیک کام کا صحیح انتظام جس میں بڑی مشقت ہوتی ہے کارِ خیر تھا اس کی مشقت کو گوارا کیا گیا۔ (جمیل احمد)

چنانچہ آپ فوراً سہارنپور آگئے اور پھر اس کو نہ چھوڑا یہانتک کہ خاکِ گور نے یثرب کی طرف کھینچا اور آپ اس کو اپنے معتمد خدام کے حوالہ فرما کر مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور وہیں کے ہو رہے۔

مُریدی کا نکتہ اور عمل

حضرت گنگوہیؒ نے ایک بار فرمایا تھا کہ مُرید بابِ افعال سے ہے جس کی ایک خاصیت سلب مادہ استقاق ہے لہذا مرید کے معنی ہیں مسلوب الارادہ۔ یعنی جو ہر امر میں اپنی باگ اپنے شیخ کو دے کر ذاتی ارادہ سے خالی ہو چکا ہو۔ حضرت نے بیعت ہو کر اس مضمون کا حق ادا کر دیا

۱۳۱۹ھ میں مظاہرِ علوم میں شورش

جس کے ثبوت میں مظاہرِ علوم کا وہ مشہور قصہ پیش کیا جا سکتا ہے جو ۱۹۰۳ء میں پیش آیا اور جو حضرت کی ارادت و غلامی کا ثبوت اور امام ربانی کی کھُلی کرامت کا نمونہ ہے کہ حضرت امام ربانی ممبرانِ مدرسہ کے استبداد پرستی سے استعفا دینے پر مجبور ہوئے مگر حضرت کو اجازت نہ دی کہ تعلق ملازمت قطع کریں۔ چنانچہ حضرت باوجودیکہ ممبرانِ مدرسہ کی نظروں میں خار بن کر کھٹکتے تھے ایسے جمے رہے کہ دیکھنے والے طعن کرتے اور غیرت دلاتے تھے کہ کیا دوسری جگہ نوکری نہیں ملتی جو اس ذلت کے ساتھ پڑے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ممبران نے کمیٹی کر کے آپ کو برخاست کر دیا، طلبہ اٹھالئے گئے، کتابیں لے لی گئیں اور مولوی عبدالعلی صاحب کو بُلوا لیا گیا کہ حضرت کی جگہ درس کی مسندِ صدارت پر اُن کو بٹھا دیا جائے مگر آپ اپنے شیخ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ جاؤں یا رہوں۔

حضرت گنگوہیؒ کی کرامت

اول حکم آیا کہ آنے کا قصد کرو، چنانچہ آپ نے اسباب اور اہل و عیال کو انبہٹہ بھیجدیا مگر فوراً ہی حضرت کا دوسرا حکم پہنچا کہ خود وہیں ٹھیرے رہو چنانچہ اسی مسرت کے ساتھ اس ظاہری ذلت کو عین عزت سمجھے ہوئے سہارنپور ٹھیرے رہے۔ حالانکہ آپ مدرسہ میں آنا تو کیا مدرسہ کی مسجد میں نماز بھی نہ پڑھ سکتے تھے اور قوی اندیشہ تھا کہ فسادِ عظیم ہو کر نوبت گرفتاری فریقین کی پہنچے، مگر آپ نے اپنی عزت آبرو اور جان سب کچھ شیخ پر نچھاور کر رکھی تھی۔ اس لئے نہ کسی ظاہری خوف کا آپ کو خدشہ تھا نہ لعن طعن اور سب و شتم کا ملال و خیال۔ آپ کا مطرحِ نظر[۲] صرف شیخ کا امتثال اور اشارہ پر چلنا تھا کہ ہو رہے گا جو کچھ ہونا ہوگا؎

عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا ۔۔۔ اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

قدرت کو منظور تھا کہ ہمیشہ کے لئے مدرسہ مظاہرِ علوم کو اہلِ دنیا کے استبداد سے سبکدوش فرمائے

---

[۱] ارادہ چھینا ہوا کہ کوئی ارادہ نہ رہے گو مقصود باطن ہے اس میں ارادہ ختم ہونا تھا مگر کمال یہ ہوگا کہ ظاہر میں بھی اور دنیوی امور میں بھی ختم ہو رہے۔ [۲] نظر پڑنے کی جگہ۔ (جمیل احمد) [۳] مطابق ۱۳۱۹ھ میں (شیخ الحدیث)

اس لئے غیب سے ایسے امر کا ظہور ہوا جس کا کسی کو خواب بھی نظر نہ آیا تھا۔ ممبرانِ مدرسہ وہ باوجاہت اور مقتدر ہستیاں تھیں جن کے سامنے مولوی حبیب احمد اور شیخ عزیز علی و مولوی مشتاق اصحاب ثلاثہ جو کہ حضرت کے حامی بنے ہوئے تھے اس سے زیادہ با اثر نہ تھے جتنی نقار خانہ میں طوطی کی آواز۔ مگر ان صاحبوں نے سینہ سپر ہو کر حضرت کو مدرسہ میں لا بٹھایا اور باہر چند نوجوانوں کو لاٹھیاں لے کر کھڑا کر دیا کہ کوئی مزاحم ہو تو سر پھوڑ دو۔ پولیس کو اطلاع ہوئی اور صاحب علی انسپکٹر جن کے تشدد کا چار طرف شہرہ تھا گار دلیکر موقع پر آپہنچے، ڈانٹا دھمکایا حاضرین کے بیان لئے اور رازِ رجا کر دیکھا کہ حضرت بیٹھے ہوئے باطمینان سبق پڑھا رہے ہیں۔ معلوم کیا کہ مدرسِ اوّل کو بلا وجہ معزول کرنے پر یہ شورش ہوئی ہے لہذا فریقین کو مجبور کیا کہ مصالحت کریں اور بالآخر نعیم اللہ خاں رئیس اور خود صاحب علی انسپکٹر کو حَکَم قرار دے کر ہر دو فریق نے ثالثی نامہ پر دستخط کر دیئے۔

ان کی تجویز جو عمر بھر کے لئے مدرسہ کو نااہلوں کے بارِ احسان سے سبکدوش کر گئی حضرت امام ربانی کی محض کرامت تھی جس کے متعلق ان صاحبوں کا خود بیان ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا اپنے اختیار سے نہیں لکھا بلکہ کوئی ہم سے لکھوا رہا تھا اور ہم اس کے لکھنے پر مجبور تھے اور وہ یہ ہے کہ مولوی خلیل احمد صاحب کی برخاستگی بلا وجہ ہے لہذا منسوخ۔

مظاہرِ علوم کے نئے سرپرست

اور ہماری رائے میں اس مدرسہ کے سرپرست مولوی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی اور مولوی عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی ہونے چاہئیں۔

یہ عجیب کرشمہ ہے کہ بحث تھی مدرس کی بجا یا بیجا علیحدگی پر اور ثالثی کی تجویز یہ ہوتی ہے کہ ممبرانِ سابق سب برخاست اور مدرسہ کا تمامی نظم و نسق آئندہ کے لئے حضرت مولانا گنگوہی کے غلامانِ خدا کے حوالہ۔ فریقین چونکہ ثالث کی تجویز پر رضامندی کی تحریر دے کر اپنے ہاتھ کٹا چکے تھے اس لئے یہ تجویز صاحب کلکٹر کی منظوری سے باضابطہ حکومت کا فیصلہ بن گئی اور تمامی رجسٹرہائے مدرسہ ممبران سے لیکر ۲۶ ذیقعدہ ۲۰ھ کو سرپرستانِ جدید کے حوالہ و سپرد کر دیئے گئے ؎

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر | توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

یہ نمونہ تھا دنیوی امور میں آپ کی بے نفسی کا۔

لہ اس دنیا میں کے کم حیثیت لوگوں کو تحقیر کے ساتھ مت دیکھو تم کو کیا خبر کہ اس غبار میں کوئی سوار بھی ہو۔ (جمیل احمد)

فقہ اور حدیث میں مجتہدانہ حذاقت

رہے امور دینیہ جس کے دو جزو ہیں ایک شریعت اور دوسرا طریقت، سو شریعت میں عمل کا درجہ تو بہت بالا ہے آپ کو چونکہ فقہ و حدیث سے طبعاً مناسبت تھی اور اسی کی تعلیم و تعلم میں آپ کو لطف آتا تھا، نیز ذکاوت آپ کی مادی شے تھی اور مجتہدانہ حذاقت[1] و فہم آپ کے خمیر میں پلائی گئی تھی اس لئے ہدایہ پر آپ کے شبہات پر شبہات جاتے اور جواب پر جواب آتے کہ جن کا نمونہ تذکرۃ الرشید میں ذکر ہو چکا ہے اور آپ کی اس مبحث میں ساری تحریرات کو جمع کیا جائے تو ضخیم کتاب بن جائے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ بس شبہات کے لئے آپ جیسا ذکی ہو اور جواب کے لئے امام ربانی جیسا فقیہ۔ کہ آخر حضرت قدس نے بھی ایک خط میں تحریر فرمایا کہ تم شبہات کیا کرتے ہو مسائل کی لم اور علت فقہیہ کی کرید کرتے ہو سو یہ کہاں تک سوجھے گی۔

اسی طرح حدیث کے متعلق اشکالات کی یہ حالت تھی کہ کوئی بے تکلف و جری شاگرد بھی اپنے علامہ استاذ سے اتنی کنج وکاؤ نہ کریگا جتنی آپ یگانگت کے تعلق سے دلبر بن کر برا بھلا سب کچھ اپنے شیخ سے پوچھنے کے عادی ہو گئے تھے، آپ کے ہم عصر علماء کو بھی آپ کی یہ خو معلوم ہو گئی تھی اور وہ نقل کے لئے آپ سے وہ تحریرات طلب کیا کرتے تھے جو لحاظ کی وجہ سے خود نہ پوچھ سکتے تھے۔

بخاری کی ایک حدیث پر شبہ اور اس کا جواب

ایک مرتبہ آپ نے بخاری کے قصۂ لدود[2] کی بابت جس میں تذکرہ ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض ذات الجنب سمجھ کر باوجود حضرت کے منع فرمانے کے اہل بیت نے لدود کیا یعنی عود ہندی کو زیت میں ملا کر ایک طرف منہ میں ٹپکایا حضرت نے مواخذہ فرمایا کہ باوجود میرے منع کرنے کے ایسا کیوں کیا؟ تو اہل بیت نے عذر کیا کہ مریض کو دوا گوارا نہیں ہوتی اس لئے حضور کے منع فرمانے کو ناگواری دوا پر حمل کر کے ایسا کر گذرے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا گھر میں کوئی نہ بچے گا جس کے لدود نہ کیا جائے بجز عباس کے کہ وہ لدود کے وقت موجود نہ تھے، چنانچہ حضرت کا ارشاد پورا ہو کر رہا کہ تمامی حاضرین بیت کو قبل از موت بادل ناخواستہ لدود کی نوبت پیش آئی۔

اس حدیث کی حضرت نے توجیہ دریافت کی اور شبہ لکھا کہ حضرت کی رؤف و رحیم ذات نے انتقام کیوں لیا اور امت کی غلط فہمی پر یہ سزا و بددعا کیوں دی؟ حضرت امام ربانی نے جواب تحریر فرمایا:

مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضکم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ اس وقت تو ہمت نہ شروح بخاری دیکھنے کی ہے اور نہ بظاہر توقع کہ شروح سے رفع اشکال ہو۔ بندہ جو توجیہ اس

---

[1] مہارت [2] جو کوئی دوا منہ کے ایک جانب میں ڈالی جائے (نبیل احمد)

مقام کی کرتا ہے یہ ہے کہ منع لدود لا امر اللہ تعالیٰ تھا[1] اور اصل امر رسول کی امر اللہ تعالیٰ ہی ہوتی ہے اس کے نہ ماننے میں ہتک حرمۃ اللہ تعالیٰ[2] تھا سو یہاں دو امر جمع ہوئے ہیں آپ کی تکلیف دہی دوا پلانے میں اور ہتک حرمۃ اللہ تعالیٰ[3] کہ امر رسول امر اللہ ہی ہوتا ہے پس آپ نے بوجہ امر ثانی کے انتقام لیا نہ بوجہ اپنی تکلیف کے۔ اسی واسطے بعد میں فرمایا کہ تم کو منع نہیں کیا تھا کہ مت کرو۔ تو معلوم ہوا کہ خلافِ امر کرنا موجب ہتکِ حرمت امر الرسول تھا کہ وہ ہتک امر اللہ تعالیٰ ہے اور یہ نہ فرمایا الماذ یتمونی (مجھے تکلیف کیوں دی) باقی اہلبیت کا کراہتِ مریض جاننا مفید نہیں کیونکہ ہتکِ حرمت[3] ہوچکا، اس فہم سے کیا فائدہ۔ یہ کوئی حد[4] نہیں تھی کہ شبہ سے دفع[5] ہوجاتا بلکہ انتقام ہے کہ خطا میں بھی انتقام لیا جاتا ہے کسی کی خطا اور قصد کچھ معتبر نہیں۔

یہ وہ ہے کہ بندہ اس مقام پر طلبہ سے بیان کرتا ہے اور طلبہ آج تک قبول کرتے رہے ہیں۔ مگر تم ماشاء اللہ ذکی آدمی ہو اگر کوئی شبہ خدشہ کرو گے تو پھر شاید شروح کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور اس سے انتقام الرجال من النساء او بالعکس[6] وغیرہ مسائل لازم آجاتے ہیں، نہ یہ کہ یہ واقعہ بھی انتقاماً لنفسہ[7] تھا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوبارہ شبہ اور جواب

چونکہ حضرت امام ربانی نے دوبارہ شبہ پیش کرنے کی گنجائش دی اس لئے اس کے جواب میں ایک طویل تحریر حضرت کی گنگوہ آئی جس میں اہلِ بیت کے فعل کو خطاءِ[8] اجتہادی اور قابلِ چشم پوشی قرار دیکر دیگر متعدد دلائل واستشہاد واقعات کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ انتقام اگر ہتکِ حرمۃ اللہ کی وجہ سے ہوتا تو حضرت عباسؓ کو معافی نہ ملتی کہ لدود کرانے والے وہی تھے، اور گو چچا تھے مگر شرعی حد سے معاف کرنا آنحضرتؐ کا شیوہ نہ تھا، لہٰذا اس کے مختصر وجامع جواب پر جو گنگوہ سے گیا اکتفا کرتا ہوں کہ اس سے ذی علم کو اشکالات کا پتہ چل جائے گا اور وہ یہ ہے:۔

مکتوب حضرت گنگوہیؒ

مولوی خلیل احمد صاحب سلمہ۔ بعد سلام مطالعہ فرمایند۔ آپ کا خط مشعر صحت مرض پہنچا مسرور کیا۔ بندہ کو چار روز سے بخار موسم تھا آج تخفیف ہے

---

[1] دوا ڈالنے کی ممانعت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے فرمائی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر کلمہ کی اصل اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہوتا ہے۔ [2] اللہ تعالیٰ کی بے حرمتی۔ [3] اللہ تعالیٰ کی بے حرمتی۔ [4] قرآنی مقررہ سزا جیسے زنا، چوری، تہمت لگانے کی سزا قرآن مجید میں ہے حدیث شریف میں ہے کہ اگر ثبوت میں شبہ ہوجائے تو حد جاری نہ کرو۔ [5] یعنی دفع۔ [6] بدلہ لینا مردوں کا عورتوں سے یا اس کا عکس کہ بدلہ عورتوں کا مردوں سے۔ [7] اپنی ذات کے لئے بدلہ لینے کا تھا۔ [8] وہ خطا ہے جو دو یا تین احتمالوں میں سے قرآن کے ایک احتمال کو بہت کوشش اور گہری نظر وتحقیق سے اختیار کیا جائے پھر وہ خطا ہی ثابت ہو تو حدیث میں خطاءِ اجتہادی پر بھی ایک ثواب وارد ہے اور درست اجتہاد پر دوہرا ثواب تو اس خطا پر جو اجتہادی تھی ایک ثواب ہونا تھا نہ کہ گرفت (جمیل احمد)

تو آپ کا جواب لکھتا ہوں۔ اجتہاد جیسا نص صریح کے مقابلہ میں درست نہیں ایسا ہی شارع علیہ السلام کے روبرو ممنوع ہے۔ جب مرض موت میں قرطاس[1] میں نزاع ہوئی تو قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استفھموہ[2] ولا ینبغی التنازع عند نبی اوکما قال کے یہی معنی تھے کہ کیوں رائے کو دخل دیتے ہو خود پوچھ لو۔ پس شارع منع فرما دے اور تاویل کراہۃ المریض کی جاوے اور استفسار نہ کریں اور اپنی رائے کو کراہت طبعی فخر عالم پر ترجیح دیویں یہ خطاء اجتہادی نہیں تھی بلکہ خطاء محض تھی۔ ایسے مخطی[3] کو ثواب واحد نہیں کیونکہ یہ محل جواز اجتہاد ہی نہیں تھا بلکہ خلاف ادب ہوا تھا اگرچہ محبت ہی کے سبب ہوا ہو سو اس کو اجتہاد کہنا سراسر بے موقع ہے۔ اور لا یصلین[4] میں شارع تشریف نہیں رکھتے تھے اور نص محتمل

[1] کاغذ لانے میں جیسے کہ مسلم ج ۲ ص۴۲ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف زیادہ ہوئی تو فرمایا کاغذ لادیں کچھ لکھ دوں کہ تم اس کے بعد راہ سے نہ ہٹو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ حضور پر تکلیف کا غلبہ ہے اور اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے اس پر کچھ گفتگو ہوئی تو حضرت عمرؓ وغیرہ نے کہا کہ نبی کے پاس بحث وجھگڑا نہیں ہونا چاہیے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلو۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ "حضورؐ سے دریافت کرلو" اسی لئے تھا کہ حضورؐ کے سامنے اجتہاد کرنا درست نہیں خود حضورؐ سے معلوم کرلو یعنی جیسے حضورؐ کے نہ ہونے کے وقت نص یعنی حضور کے ارشاد کے مقابل اجتہاد درست نہیں موجودگی میں بھی کہ نص معلوم ہوسکتی ہے درست نہیں لہٰذا جب اجتہاد درست نہیں تو خطا اجتہاد والی خطا نہیں ہوسکتی دوسری قسم کی ہی خطا ہے جس پر ثواب نہیں گرفت ہی ہونی چاہیے۔

[2] حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلو اور کسی نبی کے سامنے بحث اور جھگڑا مناسب نہیں یا اور جو لفظ ہوں۔

[3] ایسے خطا کرنے والے کو جس کی خطا اجتہاد کے جواز کے موقع پر نہیں اس کی خطا پر وہ ثواب جو اجتہاد کے موقع پر خطا ہونے سے ہوتا ہے نہیں ہوسکتا بلکہ یہ خطا خلاف ادب ہے یہاں ثواب نہیں گرفت ہونی چاہیے۔ جب نص کے ہوتے اجتہاد کی گنجائش نہیں تو اس خطا کو اجتہاد کہنا بے موقع ہوا۔

[4] بخاری ج ۲ ص۵۹۱ پر عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب سے واپس ہو رہے تھے فرمایا کوئی شخص عصر کی نماز بنی قریظہ کے سوا کہیں نہ پڑھے۔ راستہ میں عصر کا وقت ہوگیا بعض صحابہ نے کہا کہ ہم تو بنی قریظہ ہی میں پڑھیں گے اور بعض نے کہا کہ نماز پڑھتے ہیں حضور کی یہ مراد نہیں کہ وقت ہونے پر بھی نہ پڑھیں۔ جب حضور کے یہاں حاضر ہوئے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضورؐ نے کسی کو ملامت نہیں فرمائی۔ تو اب شبہ یہ تھا کہ اس میں صحابہ نے اجتہاد کیا کہ حضور کی مراد کیا تھی وقت سے پہلے بنی قریظہ پہنچ کر نماز پڑھنا اگر وقت آجائے تو درمیان میں پڑھ لینا یا یہ مراد تھی کہ وقت بھی درمیان میں آجائے تو بھی نماز بنی قریظہ ہی پہنچ کر پڑھیں کچھ نے ایک مراد پر عمل کیا کچھ نے دوسری پر دونوں نے اجتہاد کیا تو حضورؐ نے کسی کو غلطی پر نہیں قرار دیا نہ ملامت فرمائی تو یہاں بھی کسی نے لا دو کو مناسب سمجھا کسی نے نہیں، اجتہاد کیا تو غلطی پر مواخذہ نہ ہونا چاہیے۔ جواب یہ ارشاد ہے کہ سفر میں حضور تشریف فرما نہ تھے کہ حضورؐ سے دریافت کرلیا جاتا اس لئے اجتہاد کی گنجائش تھی کہ ارشاد مبارک دونوں مرادوں کا احتمال رکھتا تھا اور یہاں حضور تشریف فرما تھے یہاں اجتہاد کی گنجائش نہ تھی خود حضورؐ سے دریافت کرنا تھا ایسا نہیں ہوا تو یہ اجتہادی غلطی نہ ہوئی بے ادبی ہوئی اس پر گرفت ہونی تھی۔

دو معنوں کو تھی۔ لفظ ظاہر[1] نہی کی اور مقصود جلدی ہے، وہ محل اجتہاد تھا وہاں کوئی مانع اجتہاد نہ تھا دونوں نے شارع کا حکم ہی یقین کرکے عمل کیا تھا، اسی واسطے دونوں کی تصویب ہوئی۔ اِس میں اُس میں فرق بیّن ہے، وہاں صارف[2] نہی کا فعل الصلوات با وقاتہا[3] کا مضمون موجود تھا یہاں کراہت طبعی محض رائے تھی۔ آپ کا اِخبار کہ اس مرض سے نجات نہ ہووے گی گویا مانع علاج تھا اور خود علاج[4] مباح امر کہ توکل کامل کے خلاف تھا گویا عدم توکل کا مضمون ادا کرنا اور غیر حاصل فعل بجالانا خود اس رائے کا مانع موجود تھا۔ فَاَیْنَ هٰذَا مِنْ ذَالِکَ۔ اور ہتک حرمۃ اللہ[5] کے واسطے تعزیر کافی ہے۔ ایجاب قصاص تو ضرور نہیں۔ ترک حلق[6] و ترک نسخ حج میں صوم[7] وصال اور ترک گھاٹی احد میں آپ کا رنج و اظہارِ

[1] ظاہری لفظ راستہ میں پڑھنے کی ممانعت چاہتے تھے اور نماز میں مقصود جلدی پڑھنا ہونا جلدی پڑھنے کو چاہتا تھا دونوں کے مراد ہونے کا احتمال تھا۔ [2] ممانعت سے ہٹانے والا۔ [3] نمازوں کو وقت پر پڑھنا۔

[4] علاج ایک جائز کام تھا جو کہ پورے توکل کے یعنی ترک اسباب کے توکل کے خلاف تھا گو جائز تھا اور یہ ارشاد کہ اس مرض سے نجات ہوگی علاج دوا اسباب کے حاصل کرنے کا مانع تھا تو اب علاج کرنا اس بلا اسباب کامل توکل نہ ہونے کا مضمون ادا کرنا اور نہ ہونے والا کام کرنا تھا یہ اس علاج کی رائے کا مانع موجود تھا اس لئے یہ خلاف کرنا ہوا غلطی اور محض خطا ہوئی نماز والے قصے کو اس سے کیا نسبت۔

[5] حق تعالیٰ کی حرمت کی مخالفت کے بدلہ کے لئے معمولی سزا کافی تھی برابر کا بدلہ تو ضروری نہ تھا کیونکہ قصاص (برابر کا بدلہ) انسانی حقوق میں ہوتا ہے خدائی میں نہیں۔

[6] احرام کھول کر سر منڈانے کا ترک اور حج کو فسخ کرکے عمرہ نہ بنانا، بخاری ص۱۰۹۴ مسلم ج۱ ص۳۹۲ پر حدیث ہے کہ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم صحابہؓ نے خالص حج کا احرام بلا عمرہ باندھا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ذی الحجہ کو تشریف لائے جب ہم پہنچے حکم دیا کہ ہم احرام کھولدیں (یعنی صرف عمرہ کے بعد ہی کھولدیں اور اس حج کو عمرہ ہی قرار دیں جو زمانۂ جاہلیت کی رسم کو توڑتا تھا کہ وہ عمرہ ایام حج میں گناہ سمجھتے تھے) حکم دیا کہ حلال ہو جاؤ اور بیویوں سے بھی مل کرلو۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضور نے بیویوں سے ملنے کو واجب تو نہیں فرمایا حلال فرمادیا تھا۔ پھر حضور کو یہ اطلاع پہنچی کہ ہم لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں اور عرفات پہنچنے میں صرف پانچ دن باقی ہیں حضور نے بیویوں سے میل کی اجازت فرمادی ہے تو کیا ہم مذی ٹپکتے پہنچیں گے اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھنے والا سب سے زیادہ سچا سب سے زیادہ نیکی کرنے والا ہوں اگر میرے ساتھ ہدی کا جانور نہ ہوتا تو میں بھی احرام کھولدیتا جیسے تم کھول رہے ہو تو تم احرام کھولدو۔ اگر مجھ پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی جواب معلوم ہوئی (کہ تم لوگ تردد کروگے) تو میں ہدی کا جانور ساتھ نہ لاتا۔ پھر ہم سب نے احرام کھولدیئے اور حضور کی اطاعت کی۔

اس پر سوال یہ ہے کہ باوجود حضور کے ارشاد کے احرام نہ کھولنا اور اس میں تردد کرنا ایک اجتہادی غلطی تھی حضور نے اس پر کوئی دار و گیر نہیں فرمائی صاف فرمادیا نہ انتقام لیا نہ تعزیر جاری فرمائی تو یہیں بھی اجتہادی غلطی پر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں رنج فرمانا اور ناخوشی ظاہر فرمانا تو موجود ہے یہی دار و گیر ہے کہ فرمادیا میں زیادہ ڈرنے والا سچ بولنے والا اور نیکی کرنے والا ہوں اگر ہدی میرے ساتھ نہ ہوتی تو یہی کرتا اور پہلے سے معلوم ہوتا کہ تم یہ خیال کروگے تو ہدی ساتھ نہ لاتا۔

[7] ایک روزہ کے بعد بلا افطار کئے دوسرا روزہ رکھنا بخاری ص۲۶۳ مسلم ج۱ ص۳۵۱ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال کی ممانعت فرمائی تو لوگوں نے عرض کیا حضور آپ تو صوم وصال (روزہ پر روزہ بلا افطار) رکھتے ہیں فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں میں تو کھلایا پلایا جاتا ہوں (یعنی جنت کی چیزیں جن سے روزہ نہیں جاتا یا محبت الٰہی سے غذا ملتی ہے) (باقی بر صفحہ آئندہ)

ناخوشی خود منقول ہے مگر نہ معلوم آپ کو کیوں غفلت ہوئی۔ پھر یہ کہ انتقام[۱] لحرمۃ اللہ لینے کو کہاں سے لازم ہے کہ انتقام لحرمۃ اللہ کو ترک بھی نہیں کرتے تھے، حدیث سے اتنا ہی ثابت ہے کہ اپنے واسطے انتقام نہیں لیتے تھے اور ہتک حرمۃ اللہ کے واسطے لیتے تھے، نہ یہ کہ ہتک حرمۃ اللہ میں ترک ہرگز نہیں کرتے تھے، سو یہ نقض سرے ہی سے مرفوع ہے۔ معہذا ذوالخویصرہ[۲] پر غصہ کرنا خود تعزیر ہے اور تعزیر بقدر عصیاں کے ہے۔ حضرت عباسؓ[۳] کا صائم ہونا مانع لدود کا تھا ناخوشی خود ظاہر ہو چکی تھی۔ اور معاف کرنا بھی منع نہیں تھا۔ اور کبرا کو قلیل تنبیہ بھی کافی ہوتی ہے بہر حال یہ سب شبہات غیر محل ہیں فقط

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) سوال یہ ہے کہ باوجود منع کرنے کے پھر جو صحابہؓ نے بلا افطار روزہ پر روزہ کا قصد کیا تھا اور حضور کے فعل کو دلیل بنایا تھا یہ بھی اجتہادی خطا تھی حضورؐ نے اس پر گرفت نہیں فرمائی تو یہاں بھی نہ ہونی چاہئے تھی۔ جواب یہ ہے کہ یہاں ناگواری و ناخوشی کا اظہار فرمایا ہے کہ تم میری طرح نہیں ہو سکتے۔

۵۸ غزوۂ احد میں متعینہ صحابہؓ کا گھاٹی کو چھوڑ دینا۔ بخاری ۴۲۶ و ۵۷۹ پر حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جبیر کو پچاس پیدل حضرات پر حاکم بنا کر ایک گھاٹی پر مقرر فرمایا اور فرما دیا تھا اگر تم یہ بھی دیکھ لو کہ ہماری لاشوں کو پرندے نوچ رہے ہیں تو بھی اپنی اس جگہ سے نہ ہٹنا جب تک میں ہی پیام نہ بھیجوں۔ اور اگر تم دیکھو کہ ہم کافروں کو شکست دیدی اور ان کو روند ڈالا تب بھی جگہ سے نہ ہٹنا جب تک میں پیام نہ بھیجوں۔ حضورؐ نے ان کو شکست دیدی تو حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھیوں نے کہا اے قوم غنیمت حاصل کرو غنیمت حاصل کرو، تمہارے ساتھیوں نے ان پر غلبہ پالیا ہے اب کیا انتظار کر رہے ہو، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے کہا کیا تم بھول گئے حضورؐ نے کیا فرمایا تھا، بولے واللہ ہم ساتھیوں کے ساتھ لگیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے (یہ سمجھا کہ حضور کا ارشاد جنگ کے آثار چڑھاؤ پر تھا اور اب تو جنگ ختم ہو چکی دشمن بھاگ چکا مال غنیمت جمع کرنے کا وقت آگیا) جب یہ لوگ ادھر آئے ان کے منہ اوپر سے ہٹا دیئے گئے تو شکست خوردہ بن گئے۔

اس پر سوال یہ ہے کہ یہ بھی اجتہادی خطا تھی حضورؐ نے نہ سزا دی نہ گرفت فرمائی تو ایسے ہی یہاں بھی ہونا تھا۔ جواب یہ فرمایا کہ وہاں بھی حضورؐ کے رنج اور ناخوشی کا اظہار منقول ہے اور تعزیر کے لئے صورت معین نہیں ہوتی جو امام نے مناسب قرار دیا وہی ان کی تعزیر تھی۔ اور آیتوں میں بھی اس پر گرفت نازل ہوئی تھی۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [۱] دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضورؐ نے ان واقعات میں انتقام یا تعزیر نہیں فرمائی تو بات یہ ہے کہ حکم الٰہی کی بے حرمتی پر انتقام کے لئے یہ تو لازم نہیں کہ ہمیشہ انتقام لیا کریں کبھی ترک نہ فرمایا کریں۔ حدیثوں سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے انتقام نہیں لیا کرتے تھے اور خدائی حکم کی بے حرمتی پر لے لیتے تھے یہ تو لازم نہیں آتا کہ خدائی حکم کی بے حرمتی کے انتقام کو کبھی بھی ترک نہ فرماتے تھے یہاں ترک فرمایا ہو تو کوئی اشکال نہیں یہ اشکال رفع ہے۔ یہ حدیث بخاری ۵۰۳ مسلم ج ۲ ص ۲۵۶ پر ہے کہ اپنے لئے انتقام نہیں لیتے تھے خدائی حکم کی بے حرمتی پر لے لیتے تھے۔

[۲] بخاری ۵۰۹ و ۱۰۲۳ پر ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور کچھ تقسیم فرما رہے تھے کہ عبداللہ ذوالخویصرہ تمیمی آیا اور بولا اے رسول اللہ انصاف کیجئے فرمایا تجھے ہلاکت ہو اور کون انصاف کرے گا اگر میں ہی انصاف نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا اجازت ہو کہ میں اس کی گردن مار دوں فرمایا اس کو چھوڑ دو اس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں گے کہ تم میں کوئی ایک اپنی نماز کو اس کی نماز سے اپنے روزہ کو اس کے روزہ سے حقیر سمجھا کرے گا مگر وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار میں سے نکل جاتا ہے کہ خون لگا ہوا نہیں لگتا

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

حق تعالیٰ حضرتؒ کی قبر نور سے بھر دے کہ اس تعلق مع الشیخ سے خود بھی مستفید اور مالا مال ہوئے اور مراسلاتِ علمیہ چھوڑ کر پس ماندگان کو اُن لطائف و نکاتِ عجیبہ سے بہرہ مند بنایا جو شروح اور کتب سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

تحریر مذکور میں ایک دقیق بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی اُمتی سے اگر بہ تقاضائے محبت بھی ایسا فعل صادر ہوگا جو شارع علیہ السلام کی طبعی خواہش کے خلاف ہو تو استحقاقِ سزا سے نہ بچے گا کہ اہلِ بیت کا لدود کرنا ظاہر ہے کہ غایتِ محبت اور بنا بر حضرت کے سایۂ عاطفت قائم رہنے کے شوق میں ہوا، مگر محض اس وجہ سے کہ اس میں محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ طبیعت اور روش کی رعایت قائم نہ رہی سببِ عتاب بلکہ موجبِ انتقام ہوگیا، پھر بعد میں آنے والی امت کا کیا پوچھنا کہ کتنا ہی دعوائے محبت کریں مگر حضرت عائشہؓ و حفصہؓ و میمونہؓ جیسی جاں نثار بیبیوں کی محبت کا لاکھواں حصہ بھی نہیں لا سکتے۔ اور یہی وہ آخری سبق تھا جو معلمِ خلق و راہبرِ عالم کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت عملاً پڑھانے کی ضرورت تھی کہ عشاق و محبین کو جادۂ اعتدال کی تعلیم دیں اور بتائیں کہ محبت معتبرہ و ناجیہ[1] صرف وہی ہے جو تعمیلِ حکم کی مجسم تصویر ہو اور جس میں محبوب کے طریقِ عمل اور طرزِ طبیعت سے ذرہ برابر بھی غفلت نہ ہونے پائے۔ یہ بھی اکابرامت کی رعایت کہئے یا شفقتِ محمدیہ کہ منشاءِ فعل یعنی تقاضائے محبت کی رعایت فرما کر انتقام لے لیا کہ دنیوی تکلیف بمقابلہ سزائے آخرت کے بہت آسان اور یہ تبادلہ[2] حق تعالیٰ کا بڑا فضل و انعام ہے ورنہ مخالفتِ امرالرسول کی سزا آخرت میں وہ دیتا جس نے اپنے محبوب کی طبیعت کو اپنی رضا کا سانچہ بنا کر بھیجا ہے کیونکہ کسی کو حق نہ تھا کہ محبوب رسولؐ کو چھوڑ کر اپنی محبت کے تقاضائے نفس کو متبوع[3] بنائے۔

طریقت

دوسرا جزو طریقت ہے سو اس کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ طالب سالک کا شیخ کے زیر حکم اور مسلوب[4] الارادہ ہونا ایسا ضروری ہے جیسا حیاتِ بدنی کے لئے غذا اور چراغ کے لئے تیل ؎

بمے[5] سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید   که سالک بے خبر نبود زراه و رسم منزلہا

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) سوال یہ تھا کہ حضور نے انتقام نہیں لیا تعزیر نہیں فرمائی۔ جواب یہ ہوا کہ یہ غصہ ہی تعزیر ہے سزا بقدرِ گناہ ہی ہوتی ہے ـــــ [3] سوال یہ تھا کہ حضرت عباسؓ خود اس کے محرک تھے ان کو کیوں لدود سے مستثنیٰ فرمایا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ وہ روزہ دار تھے مگر شرح بخاری کا جواب یہ ہے کہ عمل کے وقت وہ موجود نہ تھے اسلئے مستثنیٰ قرار دیئے گو مشورہ کے محرک ہی تھے۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [1] نجات دینے والی۔ [2] بدلہ کرانا۔ [3] اس کی پیروی کرے۔ [4] ارادہ چھینا ہوا کہ کوئی ارادہ نہ رکھتا [5] اگر مرشد کامل کہے تو شراب سے جانماز کو رنگ دو کیونکہ راہ کو جاننے والا راہ اور نشانِ منزل سے بے خبر نہیں ہوتا۔

(جمیل احمد)

حضرت گنگوہی کے مکاتیب

اس مبحث میں حضرت امام ربانی کے بارہ مکاتیب تذکرۃ الرشید کے حصۂ سوم مکاتیب رشیدیہ میں درج کرچکا ہوں اور صرف پانچ مکاتیب یہاں نقل کرتا ہوں جو حضرت کے نام بھاولپور گئے اور حضرتؒ کے پاس تبرکاً اس ذخیرہ میں موجود تھے جو حضرتؒ نے بکمال شفقت مجھ ناچیز کو عطا فرمادیا تھا حضرتؒ کے حالاتِ قلبیہ کا اندازہ کرنے کے علاوہ ان مکاتیب میں عام سالکین کے لئے بھی خاص نفع ہے اس لئے ان کو بجنسہ نقل کرنا مناسب سمجھا اور وہ یہ ہیں ؛۔

مقصود وغیر مقصود

(۱) مولوی خلیل احمد صاحب مدشوقکم[1] الی اصلہ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ اپنی عافیت پر شکر حق تعالیٰ کا کرتا ہوں۔ تمہاری صحت سے اطمینان ہوئی۔ سب امور دین و دنیا رضاءِ حق تعالیٰ پر موقوف ہیں۔ اپنی طرف سے سعی کرتے رہنا کام بندہ کا ہے اور ثمرات و مواہب[2] عطا فرمانا اختیار مولیٰ تعالیٰ شانہ ہے کسی کے اختیار میں نہیں، ذکر پختہ کرنے میں ساعی رہو اور نور منبسط[3] جو محسوس ہوا اس کو بغور ملاحظہ رکھنا چاہئے یہانتک کہ جملہ اشیاء میں ساری[4] معلوم ہونے لگے دفع کرنا نہیں چاہئے۔ فقط

(۲) عنایت فرمایم مولوی خلیل احمد صاحب دام مجدہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ بخیریت ہوں۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا، آثارِ ذکر مبارک ہوں اور حق تعالیٰ ترقی عطا فرمائے۔ مقصود ذکر سے حضور مسمیٰ[5] ہے جسقدر حضور ہو بہتر ہے اور ذکرِ قلبی وہ ہے کہ بدون لفظ اسم کے ذات مسمیٰ کی طرف خیال ہو جیسا کہ غیبوبۃ[6] ولد میں مثلاً بدون تصور اسمِ ذات[7] کے ولد کی طرف دھیان ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ولد میں صورت بھی غالب اوقات مدنظر ہوتی ہے اور یہاں چونکہ شکل و صورت سے برارت ہے لہٰذا نفس مسمیٰ کا خیال ہے۔ اس خیال میں اگر کوئی وضع و شکل مدنظر قلب ہو لاحول سے دفع کرنا چاہئے کہ ذاتِ حق تعالیٰ نفسِ وجود ہے نہ قیود زائد سے

دور[8] بینان بارگاہِ الست　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

سوائے اس کے جو کچھ ہے سب مخلوقات و حادث ہے اور غیر ہے نہ عین، بہرحال جو کچھ ہے وہ عنایت محض ہے اس کا شکر ضروری ہے۔ فقط۔ مولوی عبدالرحمٰن جیسے رفیق ہمدم کا فوت ہونا البتہ موجبِ حسرت ہے مگر کیا کیجئے اپنے اختیار میں کچھ نہیں حق تعالیٰ ہم کو بھی باایمان لے جاوے۔ آمین۔

---

[1] دراز کیا جائے تمہارا شوق شوق کی اصل تک۔ [2] عطایا۔ [3] پھیلنے والا۔ [4] جاری و سرایت کرنے والا۔ [5] ذات کہ جس کا وہ نام ہے جو ذکر میں لیا جاتا ہے۔ [6] بیٹے کے سامنے نہ ہونے میں۔ [7] بلا ذات کے نام کی صورت کے وہ ذہن میں ہوتا ہے [8] عہدِ الست کے دور تک نظر رکھنے والے بھی اس کے سوا کوئی خیال نہیں لے جاسکے کہ بس وہ ہیں۔ (جمیل احمد)

شاہ عبدالغنیؒ اور میاں امین الدین کا انتقال

عبداللہ مستان کا بھی انتقال ہوا، اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ ۵ محرم کو جناب شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس عالم سے رحلت فرما ہوگئے۔ ایک فرزند ہفت ماہہ چھوڑا حق تعالیٰ ان کو بھی جوارِ رحمت میں قرب دیوے۔ اور میاں امین الدین صاحب ماموں مولوی محمد قاسم صاحب کے بھی جو سرہند میں تھے فوت ہوئے۔

کیا عجب ہے کہ وہ دخان[1] آندھی جو میاں ظہور احمد نے خواب میں دیکھا نمونہ اس ہی حشر کا ہو، یا اور آفات ہیں کہ عالم میں قیامت خیز فتن سے پیدا ہوتے ہیں، اس سے نجات بجز اس کے شریعتِ مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے التجا اور تمسک کیا جاوے اور کچھ نہیں۔ یہ ہی تعبیر خواب ہے۔ دلائل کا پڑھنا بہتر ہے التزام کرلو۔ فقط۔

(۳) مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا حضور مسمی اور اس کے شکر کے عجز سے بہت بہت فرحت ہوئی الحمد للہ علی ذٰلک۔ آدمی اگر ہر بُن[2] مو ہزار ہا ہزار زبان ہو جاوے اور مدتِ دنیا ایک ادنیٰ نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے نہیں ہو سکتا بلکہ ہر قصدِ شکر بھی ایک نعمتِ[3] عظمیٰ ہے دو بالا مرہونِ منن کبریٰ ہو جاتا ہے۔ وہ کون ہے کہ توفیقِ حضور کا شکر تلفین کر سکے ہاں عجز عن ادائے[4] شکر کو اگر بجائے شکر قبول فرمالیویں تو بندہ نوازی سے کیا بعید ہے کہ ایسے نالایق بے بس کو ایسے منعم صمد[5] سے معاملہ ہوا۔ بجز اس کے کہ ہمہ تن[6] فنا اپنے کردار سے ہو کر پانی ہو جاوے اور شرم اپنے قصور اور اس کے نعمار[7] سے خاک بن جاوے اور کیا کر سکتا ہے۔ بارے شکر ہے کہ آپ کو یہ مقام عطا ہوا، اس کا نام یادداشت باصطلاح حضراتِ نقشبندیہ ہے۔ اب اس یادداشت کے ساتھ حیا، مالکِ حقیقی کی ہونی ضرور ہے کہ جیسا ہم اپنے کسی بڑے مربی منعم ذی جاہ کے سامنے کوئی سبک حرکت خلافِ رضا نہیں کر سکتے ایسا ہی معاملہ خلوت میں اپنے اُس حاضر ناظر مولیٰ سے ہونا چاہئے تاکہ حضور مسمی کا مصداق پورا ہو جاوے کہ اپنی ہر ہر حرکت کو پیش نظر اُس مالک تعالیٰ شانہٗ جان کر بمیزان[8] شرع کہ قانونِ رضا ہے ناپ تول کر دھیان رہے، اب یہ مراقبہ دائمی کرنا چاہئے۔

---

[1] دھواں۔ [2] بال کی جڑ۔ [3] دوگنا بڑے احسانات کے تحت رہن ہوتا ہے ایک خود نعمت ایک قصد شکر کی توفیق [4] ادائے شکر سے عاجز ہونے کو۔ [5] انعامات کرنے والے بے نیاز۔ [6] اپنے فعل سے بالکل بے خیال ہو کر احسان کی خجالت سے پانی پانی ہو جائے [7] انعام عظیم اور اپنی کوتاہی سے۔ [8] شریعت کی ترازو سے کیونکہ وہی رضائے حق کا قانون ہے۔ (جمیل احمد)

احسان کی حقیقت الغرض ہر کام کو بحضور ذات تصور کرنا اور اس کا مرضی وغیر مرضی دریافت کر کے ترک و عمل کرنا چاہئے اور اس کا ہی نام احسان[1] ہے وفقنا اللہ[2]۔ اور اس عاجز کو بھی بدعاء خیر یاد دلانا کہ مجھ کو بھی یہ امر نصیب ہو۔ ہیہات عمر خرابی میں گذری اور اصل مقصود میسر نہ آیا، ہاں احباب کا حسن ظن اگر کارگر ہو جائے تو انا عند ظن عبدی بی[3] کا البتہ امیدوار ہوں درباب نکاح[4] کیا مشورہ دوں۔ اپنے دل کی عزم تو یہ ہے کہ تجرد[5] کی برابر کسی شے میں راحت نہیں مگر حوائج ضروریہ میں نکاح بھی ہے۔ ایک حاجت کے واسطے صدہا خدشات اٹھانے پڑتے ہیں اگر اس حاجت کا تقاضا نہ ہو تو تجرد سے بہتر تاہل کو نہیں جانتا ہوں مگر ہاں اگر اہل[6] نیت تکثیر امت کا خیال کر کے کرے تو دوسری بات ہے لہذا اس امر میں صاف قطعی بات کچھ نہیں لکھ سکتا ہوں تم اپنے حال سے مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ قیام گنگوہ کے باب میں جو آپ کی خوشی مجھ کو کیا عذر ہے زیادہ کیا کہوں، اس میں مجھ کو کوئی حرج نہیں آپ کے زعم میں اگر آپ کا فائدہ ہے تو بہتر ہے جواب والدین میں بھی اگر مناسب ہو تا رمضان توقف لکھ دو اور اپنے حال کو خوب غور سے دریافت کر لو۔ فقط

تصوّف کی بنیاد (۴) حامداً و مصلیاً۔ از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ برادرم مولوی خلیل احمد صاحب دام برکاتہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ[8] فرمایند۔ نامۂ سامی رسید بجوابش دیر شد کہ فرصت نداشتم معاف فرمایند۔ درباب شغل نگارش فرمودہ اند۔ مگر یا اصل ذکر یادداشت

---

[1] عبادت کو عمدہ کرنا۔ [2] ہم سب کو اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔ [3] میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس ہوں جو میرے ساتھ وہ رکھے حدیث قدسی۔ [4] دوسرے نکاح کے بارہ میں۔ [5] خالی رہنا بلا نکاح کے لئے اہل یعنی بیوی والا ہونا کہ سنت ادا ہونے کی اور ضرورت نہیں۔ [6] بیوی۔

[8] مطالعہ فرمائیں کہ خط بلند قدر پہنچا اس کے جواب میں دیر ہو گئی کیونکہ فرصت نہ پائی معاف کریں۔ شغل کے بارے میں تحریر فرمایا ہے تو میرے مکرم اصل ذکر تو یادداشت کو کہتے ہیں کہ بدون حرف و آواز کے کسی چیز کی یاد دل کے لئے لازمی چیز بن جائے، جیسے دوست دوست کو دور ہونے کی حالت میں یاد رکھتا ہے۔ اور ابتدائے تخلیق میں حق تعالیٰ شانہ کے تو اصل محبوب ہیں اسی ذکر کو انسان کے دل میں رکھ دیا ہے۔ مگر انسان اس جہان میں زید و عمر میں مشغول ہو گیا اور اس محبوب کو بھول گیا۔ مشائخ نے اسی ذکر کے اعادہ کے لئے چند تدبیریں تجویز کی ہیں لہذا یہ جو اول میں ذکر زبانی کی تلقین یا لطائف سے کسی ذکر کی حرکت پیدا کرتے ہیں اس سے مقصود ہی یادداشت ہے تاکہ یہ اس کا ذریعہ بن جائے۔

اس کے بعد میں اصل بات لکھتا ہوں کہ آں عزیز کو اول میں نے تین ذکر بتائے تھے ایک اسم ذات کا پاس انفاس (کہ سانس لینے میں ذرا سی حرکت پیدا کرے لفظ اللہ اور واپس کرنے میں ھو پیدا کریں) دوسرا اسم ذات کا ذکر کے وقت دل کو حرکت میں لانا۔ تیسرا ایک ضرب والا اسم ذات زبان سے اس تصور کے ساتھ کہ اسم ذات کے ساتھ ایک نور منھ سے نکل کر تمام بدن کو احاطہ میں لے لیتا ہے تو اب ذکر پاس انفاس میں اتنا تصور زیادہ کر لیں کہ اسم ذات کے ساتھ سانس کے اندر جانے کے وقت ھوالباطن (ر باطن میں ہے) تصور فرمائیں اور سانس باہر نکلنے کے وقت ھوالظاہر تصور میں لائیں (باقی برصفحہ آئندہ)

راگویند کہ بدون حرف وصوت یا دچیزے ملازم قلب گردد چنانچہ دوست دوست را درحال غیبوبۃ یاد می آرد، ودراصل فطرۃ ہمیں ذکر مالک حقیقی تعالیٰ شانہ کہ اصل محبوب است بدل آدمی نہادہ اند۔ مگر بشر دریں عالم بزید وعمرو مشغول شد وآں محبوب را فراموش ساخت۔ مشایخ برائے اعادہ آں ذکر حیلہا انگیختہ اند پس انچہ اولاً ذکر زبانی تلقین می فرمایند یا بلطائف حرکت ذکرے پیدا می نمایند مقصود ازاں ہموں یادداشت است کہ ایں وسیلہ آں گردد۔

بعد ازیں اصل مطلب می نویسم کہ آں عزیز را سہ ذکر اولاً گفتہ بودم یکے پاس انفاس اسم ذات دویم تحریک قلب بذکر اسم ذات، سیوم یکضربی اسم ذات زبانی بملاحظہ اینکہ نورے با اسم ذات از دہن برآمدہ محیط بدن می شود۔ پس در ذکر پاس انفاس ایں قدر ملاحظہ افزایند کہ بوقت دخول نفس با اسم ذات ھوالباطن تصور فرمایند وبوقتِ خروج نفس با ہوھوالظاہر ملاحظہ آرند۔ گویا ایں تصور با ذکر پیدا آید کہ ذاتِ پاک موجود حقیقی تعالیٰ شانہ در ظاہر وباطن ذاکر موجود بالذات است، اگرچہ

(بقیہ از صفحۂ گذشتہ) گویا ذکر کے ساتھ ساتھ یہ تصور پیدا ہو کہ موجودِ حقیقی تعالیٰ شانہ کی ذات پاک ذکر کرنے والے کے ظاہر وباطن میں خود موجود ہے۔ اگرچہ یہ تصور اول اول خلوت میں قائم ہوگا مگر بار بار کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ بے تکلف جاری ہوجائے گا۔ اور ذکر جہر کے وقت اتنا زیادہ کرلیں کہ بجائے اس تصور کے کہ بجائے نور کے احاطہ کرنے کے خود ذات پاک صاحب ذکر کی ذکر کرنے والے کا احاطہ کئے ہوئے ہے صاحبِ ذکر خود موجود ہیں۔

اور لطائف کا ذکر اگر ترک فرمادیا ہے تو کچھ حاجت بھی نہیں اور اگر اس کا خیال باقی ہو تو اس تصور کے قائم ہوجانے کے بعد دیکھ لیا جائے گا اب تو اس کے وقت میں فوراً اس قدر خیال فرمالیا کریں کہ صاحبِ ذکر تعالیٰ کی ذات دل میں موجود ہے تھا۔ خوب سمجھ کر غور فرماکر مشغول ہوں اور سب کو صاحبِ ذکر کی حقیقی ذات پر بھروسہ کرکے اور انہی کی ذات پاک کی پناہ لے کر عاجزی ونیازمندی سے بجالائیں اور ذکر کی توفیق کو اگرچہ ایک لحظہ کی ہی پائیں محض ذات صاحب ذکر تعالیٰ شانہ کی عنایت وفضل جانیں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے اوپر احسان قرار دے کر بہت بہت شکر ادا فرمائیں۔ کیونکہ ذکر تو ان کی ولایت کا پروانہ ہے جس کو اپنے ذکر کی توفیق عطا فرماتے ہیں اپنی ولایت کا پروانہ اس کے سپرد فرماتے ہیں۔ ذکر کرنے والے کو حق تعالیٰ کا محض اسقدر لطف جو فاذکرونی اذکرکم (تو تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا) ہے انعام فرمایا ہے اپنے فخر کے لئے بہت ہی زیادہ ہے کہ یہ گوشت کا ناپاک لوتھڑا اس پاک بارگاہ کی یاد کی ہوئی چیز بن گیا۔ ذکر کرنے والا اور کیا چاہتا ہے اور کون ثمرہ اس سے بڑھ کر ہوسکتا ہے ہاں ذکرتہ فی ملاءٍ (حدیث) کہ جب بندہ میرا ذکر مجمع میں کرتا ہے تو میں اس کا مجمع میں ذکر کرتا ہوں) میں اور ذکرتہ فی نفسی (جب بندہ دل دل میں مجھے یاد کرتا ہے میں دل میں یاد کرتا ہوں) میں بہت ہی بڑا فرق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دل کی یاد کی ترقی میں دوڑ لگائے اور اس ترقی میں اسی اپنے مولیٰ سے مدد طلب کرے کہ فرمایا ہے ففروا الی اللہ (اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ) اور حضورؐ نے فرمایا لاملجأ من اللہ الا الیہ (اور اللہ تعالیٰ سے پناہ لینے کی کوئی جگہ نہیں سوائے انہی کی ذات کے) اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اسقدر کو بھی اپنے تنگ حوصلہ سے بعید شمار کرتا ہوں کہ یہ سب قلم سے رکھتا ہوں نہ کہ دل سے اللہ تعالیٰ مجھ کو اور تم کو یہ اپنے فضل عطا فرمائیں۔ اور ان چند فقروں کو تصوف وطریقت کی بنیاد تصور فرمائیں۔

ایں تصور اول بخلوت قائم خواہد گشت مگر بعد مزاولت بے تکلف جاری خواہد شد انشاء اللہ تعالیٰ۔ و بوقت ذکر جہر ایں قدر افزایند کہ بجائے نور محیط خود ذات پاک مذکور محیط ذاکر است و مذکور موجود است۔

وذکر لطائف اگر ترک فرمودہ اند حاجت ندارد۔ و اگر خیال آں باقی است بعد قیام ایں تصور دیدہ خواہد شد۔ اکنوں فقط بوقتِ آں اگر ایں قدر خیال فرمایند کہ مذکور مسمی بدل موجود است فقط۔ خوب فہمیدہ و غور فرمودہ مشغول شوند و ہمہ را بر مذکور حقیقی اعتماد فرمودہ والتجا بذاتِ پاکِ او آوردہ بعجز و نیاز بجا آرند و توفیق ذکر اگرچہ یک لحظہ یابند محض عنایت و فضل مذکور تعالیٰ شانہ پنداشتہ۔ منت آں تعالیٰ بر خود نہادہ شکرہا فرمایند کہ ذکر منشور ولایت است۔ ہر کرا توفیق ذکر خود می دہند نامۂ ولایت خود بدو می سپارند ذاکر را محض ایں قدر لطف حق تعالیٰ کہ فاذکرونی اذکرکم افادہ فرمود بفخرِ خویش بس است کہ ایں مضغۂ ناپاک مذکورِ آں پاک جناب گردید دیگر چہ می خواہد کدامے ثمرہ ازیں فایق باشد۔ آرے در ذکرتہ فی ملاء و ذکرتہ فی نفسی فرقے است بس بعید کہ تا امکان در ترقی ذکرتہ فی نفسی پوید۔ و دریں ترقی استغاثہ از ہموں مولائے خویش جوید کہ ففروا الی اللہ ولا ملجأ من اللہ الا الی اللہ فرمودہ اند۔ زیادہ ازیں تاب تحریر ندارم و ایں قدر راہم از حوصلۂ تنگِ خود بعید می شمارم کہ ایں جملہ از قلم دارم نہ بدل۔ رزقنی اللہ تعالیٰ وایاکم بمنہ۔ و ایں چند فقرہ را اسّ تصوف و طریقہ تصور فرمایند۔ والسّلام۔

تفرقہ و خطرہ کا فرق[1]

(۵) مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا۔ یہاں سب طرح خیریت و شکر ہے۔ تفرقہ یہ ہے کہ آدمی جس کام میں مشغول ہووے کوئی شے آکر اُس شغل سے غافل کر دیوے دوسری شے میں مشغول بنا دیوے، جیسا ابتدا میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ذکر شروع ہوتا ہے گاہ حضورِ ذکر رہے گا[2] گاہ حضور خلافِ ذکر۔ اور خطرہ یہ کہ دوسری شے کا خیال اگر آوے تو اصل شغل کی طرف سے غفلت نہ ہووے، جیسا مثلاً آدمی اپنے وجود کو جانتا ہے اور باوجود اس علم کے علوم و خطرات دیگر اشیاء کے بھی دل میں اور نظر میں آتے ہیں مگر اصل علم خود زائل نہیں ہوتا۔

اس سے صاف روشن ہو جاتا ہے کہ نفس کو آنِ واحد میں[3] التفات اشیاء متعددہ کی طرف ہو سکتا ہے تو غرض حضور کے ساتھ خطرہ ہو سکتا ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ آبِ رواں پر خس و خاشاک بھی ہوتے ہیں مگر روانگی آب کو مانع نہیں۔ اور تفرقہ حضور کے ساتھ نہیں ہو سکتا کہ حضور میں جب تفرقہ آیا حضور بند ہو کر غیبوبہ ہو گئی گویا کہ آب رواں کو کسی حاجز[4] نے روک دیا۔

---

[1] ذکر و شغل کے تفرقہ یعنی خلل اور خطرہ یعنی وسوسہ کی تعریف فرق اور اثرات۔ [2] دل میں ذکر ہی ذکر کا قائم ہونا۔ [3] ایک جزو وقت میں کئی چیزوں کی طرف توجہ۔ [4] روکنے والی چیز۔ (جمیل احمد)

یہ سب بندۂ عاجز کی باتیں زبانی جمع خرچ ہے، مضامین علمی ہیں، عمل سے بے بہرہ ہوں، حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے یہ حضور عطا فرمایا ہے مُلہِمِ[1] غیبی سے اس کا منتظر ہوں کہ الدال علی الخیر کفاعلہ[2] فرمایا ہے۔ باشد[3] کہ اہل خیر کی برکات سے کچھ حصہ مل جاوے ورنہ آنم کہ دانم[4]۔ تمہارے لیے حسنِ ظن سے اندیشۂ ندامتِ عقبیٰ[5] بھی ہوتا ہے اور انا عند ظن عبدی بی[6] سے توقع بھی بندھ جاتی ہے فقط۔

تجدیدِ بیعت کا شوق

ایک مرتبہ آپ کو بخار شدید ہوا اور اس تکلیف میں حضور کے اندر ترقی کے ساتھ صوتِ انحد[7] محسوس ہوئی جس کو آپ نے گنگوہ تحریر کیا اور جواب نہ آیا تو ادب کے ساتھ یاددہانی کی اور اسی کے ساتھ دوبارہ توبہ و تجدیدِ بیعت کا شوق ظاہر کیا۔ پھر جواب نہ آیا تو پریشانی و حزن ظاہر فرمایا اور آخر حضرت امام ربانی کا یہ جواب آیا۔

اطلاقِ حضور کا مفہوم

مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ تین خط آپ کے پہنچے۔ اول خط جو آیا تو بسبب شدتِ بخار و ارزہ کے ہمت تحریرِ جواب نہ پائی۔ آپ نے اپنے بخار کا حال لکھا تھا اور اس میں ترقی حضور اور حصول صوت انحد کا ذکر تھا۔ ترقی حضور البتہ موجبِ سرور ہے اور صوت انحد کوئی ضروری بات نہیں۔ اگر حضور کو مفید ہووے تو مضائقہ نہیں ورنہ حاجت نہیں۔ آج تک نہ مجھ کو نجات بخار سے ہوئی نہ مسعود محمود اور ان کی والدہ کو مگر ہاں اسقدر شدت نہیں اور سب کا حال ایسا ہی ہے کہ بخار سے بالکل فراغت نہیں ہوئی۔ اطلاقِ[8] حضور کے یہ معنی ہیں کہ نفسِ حضور خالی از لحاظ معیت یا احاطہ یا اور کسی صفت سے ہووے کہ اس کے ساتھ کوئی ملاحظہ نہ رہے۔ مگر اطلاقِ[9] حضور کی حاجت نہیں بلکہ لحاظ صمدیت[10] اس کے ساتھ کہا تھا کہ کرنا تلموجب مزید محبت بارگاہ پاک ہووے۔ آپ تجدید بیعت کو لکھتے ہیں۔ بیعت کے لفظ سے نادم ہوتا ہوں۔ میں قابلِ بیعت نہیں آپ کو خود سے بہتر جانتا ہوں۔ ہر صورت میں بیعت حُسنِ[11] عقیدتِ مرید ہوتی ہے المرء[12] مع من احب مگر خیر آپ کے خیال کا چارہ نہیں آپ کی درخواست بعد ندامت قبول[13] کرتا ہوں۔

---

[1] غیب سے دل میں ڈالنے والی ذات حق تعالیٰ سے۔ [2] نیکی کا رستہ بتانے والا بھی کرنے والے کی طرح ہے برابر ثواب ملتا ہے۔ [3] ہو سکتا ہے۔ [4] میں وہ ہوں کہ خود جانتا ہوں۔ [5] آخرت کی شرمندگی کا اندیشہ کہ آپ ایسا سمجھیں اور وہاں کچھ نہ نکلوں۔ [6] حدیثِ قدسی۔ میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں جو مجھ سے رکھے کہ آپ ان کے بندہ ہیں ممکن ہے آپ کے گمان کے موافق بنا دیں۔ [7] سلطان الاذکار کی ایک قسم ہے عام لوگوں کے کام کی بات نہیں۔ [8] حضور کا یعنی حق تعالیٰ کے تصور کا مطلق ہونا جس کے ساتھ کسی خاص کیفیت کا لحاظ نہ ہو۔ [9] مطلق ہونا حاصل ہونے کو خط میں حضرت امام ربانی سے دریافت کیا ہوگا۔ [10] بے نیازی کہ سب ان کے محتاج ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں۔ [11] اصل بیعت مرید کی عقیدت کا حسن خوبی ہوتا ہے وہ آپ کو حاصل ہے۔ [12] انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرے یعنی قیامت میں۔ [13] خط سے بھی بیعت درست ہے کہ معاہدہ و محبت کا یہ بھی ذریعہ ہے (جمیل احمد)

شجرہ بندہ نے وہ شجرہ بھی دیکھا ہے جو امام ربانی نے بعد اخذ بیعت حضرت کو مرحمت فرمایا کہ بسم اللہ کے بعد سبحانک[1] اللھم وبحمدک اسئلک باسمک اللہ الاعظم وبجاہ سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ علی ہذا تمام اسماء اولیاء خاندان چشتیہ صابریہ کے آخر حضرت نے قلمی تحریر فرمایا وبجاہ سیدنا ومرشدنا وہادینا الحافظ الحاج امداد اللہ تھانوی۔ ارحم[2] العبد الضعیف رشید احمد چشتی گنگوہی واخی العزیز مولوی خلیل احمد انبہٹوی۔ پھر دعائیہ رباعی کے بعد یہ مطبوعہ عبارت ہے:
وارزقہما[3] محبتک ومعرفتک وحظا وافرا من برکاتھم وکمالاتھم وزدھما ذوقا وشوقا الی لقائک یا ارحم الراحمین وصلے اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

شاہا[4] ز کرم بر من درویش نگر   بر حال من خستہ و دل ریش نگر
ہر[5] چند نیم لایق بخشایش تو   بر من منگر بر کرم خویش نگر

یہ اُن شجرات میں سے تھا جو اعلیحضرت[6] نے مکہ مکرمہ سے گنگوہ بھیجے تھے کہ امام ربانی اپنے متوسلین کو نام لکھ کر عطا فرمائیں۔ چنانچہ حضرت قدس سرہ نے اس کو تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑا اور جب چوتھے حج کو تشریف لیجانے لگے تو مکاتیب متبرکہ کے ساتھ بندہ کو عطا فرمایا تھا کہ حفاظت سے رکھوں۔ مگر بندہ نے اپنے کو حق حفاظت سے عاجز پاکر واپسی کے بعد حضرت کے حوالہ کر دیئے تھے اور اب حضرت کے نواس داماد مولوی مسعود[7] علی خاں کے پاس محفوظ ہیں۔

بچپن کی بیعت حضرت کے والد ماجد شاہ مجید علی صاحبؒ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بیعت تھے اور ایک مرتبہ طفولیت میں حضرت کو بھی اپنے والد کے ساتھ کاندھلہ جاکر

---

[1] پاک ہیں آپ اے اللہ اور پاکی بیان کرتا ہوں میں آپ کی حمد کے ساتھ میں آپ سے آپ کے اسم اعظم لفظ اللہ کے واسطے سے اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت واسطہ سے سوال کرتا ہوں۔ اسی طرح تمام بزرگوں کے نام۔ [2] بندۂ ضعیف رشید احمد چشتی گنگوہی پر اور میرے عزیز بھائی مولوی خلیل احمد انبہٹوی پر رحم فرمائے۔ [3] اور ان دونوں کو اپنی محبت ومعرفت اور ان سب بزرگوں کی کرامات وکمالات کا حصہ عطا فرمائے اور دونوں کو اپنی ملاقات کا ذوق وشوق عطا فرمائے۔ [4] اے بادشاہ اپنے کرم سے مجھ درویش پر نظر فرمایئے مجھ خستہ وزخمی دل کے حال پر بھی نظر فرمایئے۔ [5] بیشک میں آپ کی بخشش کے لائق نہیں ہوں مگر مجھ کو نہ دیکھئے اپنے کرم پر نظر فرمایئے
[6] حضرت حاجی امداد اللہ صاحب۔ [7] حال مقیم ڈیرہ غازی خاں۔ (جمیل احمد)

ع [7] مولوی مسعود علی خاں کا دوسرا نام سلطان مسعود ہے۔ حضرت کی زوجہ محترمہ منیر النساء کے حقیقی بھانجے ہیں راجوپور تحصیل دیوبند اُن کا وطن ہے۔ مولوی مسعود، مولوی نذیر اور احقر ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں حضرت کے یہاں رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ دوپہر کو مدرسہ قدیم کی شمالی جانب گیند بلا کھیلا کرتے تھے حضرتؒ اکثر دار الطلبہ سے آتے ہوئے ہمیں کھیلتا دیکھتے اور مسکراتے ہوئے گذر جاتے مولوی مسعود کی شادی حضرت کی نواسی عطیہ سے ہوئی اور مولوی نذیر کی شادی حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کی صاحبزادی منیبہ سے ہوئی بحمد اللہ یہ سب بقید حیات ہیں۔ (اخلاق احمد)

حضرت مولانا کی زیارت اور محض برکت کے لئے بیعت کرنے کا اتفاق ہوا کہ اس وقت آپ بیعت کی حقیقت و مقصود کو بھی نہ سمجھتے تھے۔ مگر اس برائے نام بیعت کی عظمت بھی آپ کے قلب میں اس قدر تھی کہ جب بھی آپ کاندھلہ تشریف لے گئے تو حضرت مولانا کی صاحبزادی بی امۃ الرحمٰن کی خدمت میں ان کے مکان پر ضرور حاضر ہوئے اور دیر تک مستفیدانہ و معتقدانہ طریق پر بیٹھے۔

امی بی

بی امۃ الرحمٰن جن کو امی کے لقب سے پکارا جاتا تھا مولانا محمد یحییٰ صاحب و مولانا محمد الیاس صاحب کی حقیقی نانی ہوتی تھیں جن کا چند سال ہوئے حال ہی میں وصال ہوا ہے۔ مرحومہ اپنے شیدائے سنت باپ کی مجسم یادگار اور اپنے خدا کی اتنی عبادت گذار تھیں کہ ضروریاتِ بشریہ کے سوا وہ ہمہ وقت نوافل و اذکار اور تلاوتِ قرآن و تسبیح و تہلیل میں گذرتا تھا۔ ان کے معمولات و وظائف معلوم کرنے کا تو اتفاق نہیں ہوا صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ ہر وقت اپنے مصلے پر بیٹھی ذکر و تلاوت میں مشغول رہتی تھیں کہ کسی سے بات کرنا بھی ان کو گراں گزرتا تھا۔ کھانا جب طیار ہو جاتا تھا تو ماما کھانا برتن میں لا کر ان کے پاس رکھ جاتی تھی کہ جب فرصت پائیں کھالیں اور جب برتن خالی دیکھے تو اٹھا کر لے جائے۔

شیخ الحدیث سہارنپور کی دادی صاحبہ

مگر ہاں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کی بیٹی یعنی اپنی والدہ کے معمولات ایک مرتبہ بیان فرمائے جن کو سن کر میں تو حیران رہ گیا کہ عورت تو عورت ہی ہے اگر باہمت مرد بھی سال دو سال اس کا نباہ کر لے تو بڑی مردانگی ہے۔ پھر صاحبِ اولاد عورت اور امورِ خانگی کی سرپرست منتظمہ کا آخر عمر تک اس پر مواظبت کرنا تو استقامت کا بڑا نمونہ ہے جس سے نہ دیکھنے والوں کو ان کے نانا مظفر حسین صاحب کی استقامت و عبادت و زہد و قناعت اور خوف و خشیہ کا پتہ چلتا ہے۔ اور وہ معمولات روزمرہ کے یہ ہیں۔ درود شریف پانچ ہزار،

۱؎ حضرت شیخ الحدیث صاحب سے جو نواسے کے بیٹے ہیں دریافت کیا تو لکھا کہ معمولات کی تفاصیل تو معلوم نہیں البتہ اتنی بات دیکھی تھی اور بڑوں سے سنی تھی کہ ان کی نماز اتنی طویل ہوتی تھی کہ ابتدائے وقت سے انتہا تک پوری ہوتی تھی۔ اذان کے متصل الوضو پھر زوال کی نماز پھر ظہر کی سنتیں پھر فرض پھر بعد کی نماز اتنی طویل ہوتی تھی کہ عصر کا وقت قریب ہو جاتا تھا جو اسی طرح اصفرار (سورج کی زردی کے قریب) تک پہنچ جاتی تھی اور مغرب عشا تک اور عشا نصف میل تک اور تہجد کا سلسلہ قبیل (کچھ قبل) طلوع صبح صادق تک۔ چچا جان (حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ حضرت گنگوہی کی نماز کی جھلک امی بی کی نماز میں آتی تھی۔ پھر جس کوٹھری میں ان کا قیام تھا ان کے انتقال کے بعد عرصہ تک اس میں سے خوشبو آتی رہی۔

احقر جمیل احمد تھانوی کو بھی قرابت کے سلسلہ سے ایک بار ان کی خدمت میں حاضری میسر ہوئی ہے۔ دعا کے لفظ دل کی گہرائی سے معلوم ہوئے۔ ان کی صحبت کی برکت سے ہماری اس نواح کی عزیز مستورات میں دین کا بڑا چرچا، تہجد، صلوۃ التسبیح، ہر وقت ہاتھ میں تسبیح رہنا اور مسواک کا معمول وہیں نظر آیا تھا۔

(جمیل احمد)

اسم ذات اللہ پانچ ہزار۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انیس سو، یا مُغنی گیارہ سو۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ گیارہ سو۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ گیارہ سو۔ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بارہ سو۔ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ دو سو۔ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل پانچ سو۔ سُبْحَانَ اللّٰہ دو سو۔ الحمد للّٰہ دو سو۔ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ دو سو۔ اَللّٰہُ اَکْبَر دو سو۔ استغفار پانچ سو۔ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہ سو۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل سو۔ رَبِّ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ سو۔ رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ سو۔ اور لَااِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ سو مرتبہ۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک منزل روزانہ تلاوت کا معمول تھا کہ حافظِ قرآن تھیں اور مانع نسوانی حایل نہ ہوتا تو ہر ہفتہ پورا قرآن مجید ختم کرلیتی تھیں فرحمہا اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا محمد یحییٰ سے تعلقِ خاطر

مولوی محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی کے ساتھ حضرت کو محبت کا جو بے نظیر تعلق تھا وہ دیکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ وطن چھوڑ کر حضرت امام ربانی کی خدمت میں محبوب اور پیشکار بارگاہ بن کر بارہ سال رہے اور وصال کے بعد حضرت سے تجدید بیعت فرمائی کہ مجاز طریقت بنے[1] اور ان کی وجہ سے ان کے بھائی مولوی محمد الیاس صاحب اور صاحبزادہ مولانا محمد زکریا صاحب بھی حضرتؒ کے ایسے لاڈلے رہے کہ صلبی اولاد کی ان کے مقابلے پر کوئی حقیقت نہ تھی نیز کاندھلہ کے مولانا محمد جلیل صاحب وحافظ ریاض الاسلام وغیرہ کو حضرت کے ساتھ مریدانہ و محبانہ خاص تعلق تھا اس لئے حضرت کو کاندھلہ تشریف لانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ مگر کتنا ہی وقت کم کیوں نہ ہو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ بی امّی کے پاس حاضر ہوئے بغیر کاندھلہ سے چلے گئے ہوں۔ آپ بڑے اہتمام سے جاتے اور پردہ ڈلوا کر دیر تک مکان میں بیٹھتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "آج مولوی زکریا اور مولوی الیاس کہدیں کہ ہماری وجہ سے کاندھلہ کے ساتھ تعلقات ہیں، میرا تعلق تو اس گھرانے کے ساتھ بچپن سے ہے کہ مجھے لڑکپن میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی زیارت اور بیعت ہوئی ہے۔

— بی امّی کی عمر طویل ہوئی اور انھوں نے نواسوں کی اولاد کو بھی دیکھا۔ اخیر عمر میں بصارت اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھیں اور مرض الموت میں تین سال کامل صاحب فراش رہیں مگر نہ قلبی ولسانی ذکر اللہ میں فرق آیا اور نہ صبر و رضا[2] بر قضا میں کمی لاحق ہوئی۔ جس مریض کو تین سال مرض اسہال میں اس طرح گذریں کہ کروٹ بدلنا بھی دشوار ہو اس کے متعلق یہ خیال بے موقع نہ تھا کہ بستر کی بدبو دھوبی کے یہاں بھی نہ جائے گی۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ غسل کے لئے چارپائی سے اُتارنے پر پوتڑے نکالے گئے جو نیچے رکھدیئے جاتے تھے تو ان میں بدبو کی جگہ خوشبو اور ایسی نرالی مہک پھوٹتی تھی کہ ایک دوسرے کو

[1] دونوں خلیفہ بنے۔ [2] حق تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہنا چاہیے اس میں راحت معلوم ہو یا تکلیف۔ (جمیل احمد)

سنگھاتا اور ہر مرد و عورت تعجب کرتا تھا چنانچہ بغیر دُھلوائے اُن کو تبرک بنا کر رکھ لیا گیا۔

ہر چند کہ عدمِ بلوغ کی بیعت محض حصولِ برکت کے لئے ہوتی ہے مگر جس درجہ کی بھی ہو چونکہ حضرت کو اس سلسلہ سے روحانی وابستگی ہوئی اس لئے مولانا مظفر حسین صاحب کے مختصر حالات جو مرحوم کے پر نواسہ مولوی احتشام الحسن سلمہ نے قلمبند کر کے بھیجے ہیں بجنسہٖ درج کرتا ہوں۔

مولانا مظفر حسین صاحب

حضرت مولانا مولوی مظفر حسین صاحبؒ مولانا محمود بخش صاحبؒ کے صاحبزادے اور حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کے بھتیجے تھے، آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے مولوی مظفر حسین صاحب بن مولوی محمود بخش بن مولوی حکیم شیخ الاسلام بن حکیم قطب الدین بن شیخ عبد القادر بن شیخ محمد شریف بن مولوی محمد اشرف بن جمال محمد شاہ بن بابن بن بہاء الدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

ابتدائی تعلیم حضرت مفتی صاحبؒ سے حاصل کی لیکن تعلیم پوری نہ فرمانے پائے تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس دارِ فانی سے دار البقا کی جانب رحلت فرمائی اس لئے بقیہ تعلیم ظاہری و باطنی دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے پوری فرمائی جو کہ شاہ عبد العزیزؒ کے نواسے اور شاگردِ رشید تھے۔

مولانا مظفر حسینؒ کا کمالِ زہد

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مہاجر مکیؒ سے بھی شدید تعلق تھا اور آپ انھیں سے مرید بھی تھے، سلسلۂ درس و تدریس نہ تھا، ایک سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں اور کبھی کبھی مستورات میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک گاڑھے کا کرتہ پاجامہ نیلی لنگی[1] یہ آپ کا لباس تھا۔ میری دادی صاحبہ یعنی صاحبزادی صاحبہ حضرت مولانا صاحبؒ فرماتی تھیں کہ ایک بار میں نے موٹی ململ کا کرتہ حضرت کے لئے سیا، اول تو زیب تن فرمانے سے انکار کیا بعد میں میری خوشنودی کو پہنا مگر جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً اتار دیا اور فرمایا کہ میرے گاڑھے کا کرتہ دیدو اس میں عجب پیدا ہوتا ہے۔ سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے پیدل سفر کرتے تھے[2]۔ اور سامانِ سفر لوٹا، لنگی، لکڑی، مشکیزہ ہوتا تھا۔ جہاں شام ہو جاتی تھی وہیں شب بسر فرمایا کرتے تھے۔

ایک ہندو کا قبولِ اسلام

ایک مرتبہ شام ایک ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے کوئی مسلمان نہ تھا، وہاں والوں سے کہا کہ رات کو رہنے کے لئے

---

[1] یعنی تہبند۔ [2] اس میں بھی عُجب یعنی خود پسندی محسوس فرمائی ہوگی، بہت لطیف الحساس تھا اور فکرِ آخرت شدید تھا۔ زجیل احمد

کوئی جگہ بتادو تو ایک شخص نے گاؤں کے باہر کولھو پر بتادیا۔ آپ کے پاس روٹی تھی اس کو نوش فرمایا اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام کے لئے جنگل میں آیا تو حضرت کو قرآن پڑھتے سُنا۔ تمام شب بیتابی سے گذاری اور صبح کو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ رات جو تو پڑھ رہا تھا وہ جلدی سے مجھے بھی پڑھادے اس کے بعد آپ کو گھر لے گیا اور وہاں اس کے بچے بیوی وغیرہ سب مسلمان ہو گئے۔

ایک خاں صاحب کا تائب ہونا

ایک مرتبہ آپ کا جلال آباد یا شاملی گذر ہوا ایک مسجد ویران پڑی تھی وہاں نماز کے لئے تشریف لاکر پانی کھینچا وضو کیا مسجد میں جھاڑو دی بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اس نے کہا کہ جی سامنے خانصاحب کا مکان ہے جو شرابی اور رنڈی باز ہیں اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں، آپ اُن خانصاحب کے پاس تشریف لے گئے تو رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی اور نشہ میں مست تھے، آپ نے خاں صاحب سے فرمایا کہ بھائی خاں صاحب اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور مسجد آباد ہو جائے گی۔ خانصاحب نے کہا کہ میرے سے وضو نہیں ہوتی اور نہ یہ دو بری عادت چھوٹتی ہیں آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی[1] پڑھ لیا کرو اور شراب بھی پی لیا کرو۔ اس پر اُس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو نماز پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے اور کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدہ میں خوب روئے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت آپ سے دو ایسی بات سرزد ہوئیں جو کبھی نہیں ہوئیں۔ اول یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دیدی۔ دوسرے یہ کہ[2] آپ سجدہ میں بہت روئے۔ فرمایا کہ "سجدہ میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت کھڑا تو میں نے کر دیا اب دل تیرے ہاتھ میں ہے"۔

ان خانصاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا اپنا عہد یاد آیا پھر خیال آیا کہ آج پہلا روز ہے لاؤ غسل کر لیں کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ غسل کیا پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی بعد نماز باغ کو چلے گئے عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی۔ بعد مغرب گھر پہنچے تو طوائف موجود تھیں۔ اول کھانا کھانے گھر میں گئے بیوی پر جو نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے، ان کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے اور آج تک نہ کبھی بیوی کے پاس گئے اور نہ اس کی صورت دیکھی تھی فوراً باہر آئے

---

[1] جن صاحب تصرف بزرگ کو یہ بھروسہ ہوتا ہے کہ یہ شخص بے قاعدہ نہیں رہ سکتا قاعدہ میں آکر رہے گا ان کو ایسی شرط منظور کر لینا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا کیونکہ واقع میں وہ شرط ہوتی ہی نہیں اس سے ضد ٹوٹ جاتی ہے اور آگے ان کا تصرف مجبور کر دیتا ہے کہ قاعدے میں سب کام کرے جیسے کہ یہاں ایسا ہی ہوا اس لئے یہ حرام کو حلال کرنا نہیں ہوتا مگر دوسروں کو اس کی نقل درست نہیں ہوگی۔ [2] دوسری بات کی وجہ نہیں بتائی کہ تصرف کا اظہار پسند نہ تھا اس کے نتیجے سامنے آگئے۔

(جمیل احمد)

رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا اور خادم سے کہا کہ بستر گھر میں بھیج دو۔ سنا ہے کہ ان خاں صاحب کی پچیس سال تک کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی۔

ایک اور خاں صاحب

ایسے ہی ایک مرتبہ گڑھی پختہ تشریف لے گئے، ایک خاں صاحب سے نماز کے لئے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور وضو سے یہ اُتر جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بغیر وضو پڑھ لیا کرو۔ خاں صاحب نے کچھ روز بغیر وضو نماز پڑھی پھر خیال آیا کہ ایک مولوی کے کہنے سے تو نے بغیر وضو نماز پڑھنی شروع کر دی اور اللہ و رسول کے حکم سے باوضو نماز نہیں پڑھی جاتی۔ اس کے بعد ہمیشہ باوضو نماز پڑھنے لگے۔

سات حج پیدل اور ایک عجیب واقعہ

آپ نے سات حج کئے اور پیدل۔ ایک مرتبہ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے پانی پت سے چل کر شب کو کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں قیام فرمایا اور اخیر شب میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے رات کو سرائے کی مسجد میں چوری ہو گئی۔ بھٹیاری نے کہا کہ ایک شخص مسجد میں ٹھیرا تھا اور صبح ہی چلا گیا ضرور وہی چور ہے۔ لوگ تعاقب کے لئے آئے اور جھنجانہ کے قریب آ کر پکڑ لیا اور کہا کہ تھانہ چلو۔ آپ نے فرمایا کہ جھنجانہ کے تھانہ میں نہ لے چلو اور کہیں چلو۔ اس پر ان لوگوں کو اور بھی شبہ ہوا اور وہ جھنجانہ ہی کے تھانہ میں لے گئے اور ایک سپاہی کے حوالہ کر دیا جس نے حوالات میں آپ کو بند کر دیا۔ تھوڑی دیر میں قصبہ کے لوگوں نے دیکھا اور تمام قصبہ میں شور ہو گیا۔ عوام بہت مشتعل ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ تھانہ دار کی بدمعاشی ہے اس کی جان کے درپے ہو گئے، تھانہ کو لوٹنا چاہتے تھے۔

تھانہ دار خواجہ احمد حسن تھے جو میرے دادا مرحوم کے دوست تھے اور مولوی صاحب سے خوب واقف تھے۔ بہت مشکل سے جان بچا کر تھانہ آئے اور مولوی صاحب کو حوالات سے نکالا اور واقعہ کی تحقیق کی۔ پھر لوگ اس پانی پت والے آدمی کی جان کے درپے ہو گئے جو آپ کو پکڑ کر لایا تھا۔ آپ نے خواجہ احمد حسن سے فرمایا کہ اس کی جان کے تم ذمہ دار ہو، اس کے ساتھ دو تین آدمی کر دو جو اس کو بخیریت پانی پت پہنچا دیں۔

ایک مسافر کا سامان اپنے سر پر اٹھانا

ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لا رہے تھے ایک شخص مل گیا اس سے دریافت فرمایا کہ کہاں جاؤ گے؟ اس نے جواب دیا کہ کاندھلہ مولوی مظفر حسین کے پاس۔ اس کے پاس سامان تھا اور آپ خالی ہاتھ تھے آپ نے اس سے سامان لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ کاندھلہ آ کر جب اُسے معلوم ہوا کہ یہی مولوی صاحب ہیں تو بہت پشیمان ہوا۔ آپ نے

فرمایا کہ "اس میں حرج کیا تھا میں خالی ہاتھ تھا اور تم بوجھ لئے ہوئے آرہے تھے"۔

مشتبہ مال سے طبعی تنفر

آپ محتاط بہت زیادہ تھے کبھی مشتبہ[1] مال نہ کھاتے تھے اگر بھولے سے یا غلطی سے کھالیتے تو فوراً قے ہوجاتی تھی۔

زمانہ طالب علمی کا قصہ ہے کہ آپ نے کئی سال روٹی سالن سے نہیں کھائی۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ دہلی کے اکثر سالنوں میں کھٹائی پڑتی ہے اور آموں کی بیع ناجائز طریق پر ہوتی ہے[2] اس لئے میں سالن نہیں کھاتا۔ آپ بجز اپنے گھر کے اور کسی کے یہاں دعوت وغیرہ میں تشریف نہ لیجاتے[3] تھے۔ ابتداءً قاضی جی اور متولی جی کے یہاں کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے۔ قاضی جی اور متولی جی کے والد کے انتقال کے بعد ان کے یہاں بھی کھانا کھانا چھوڑدیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر شروع کردیا اور بغیر بلائے خود تشریف لے گئے دریافت کرنے پر فرمایا کہ پہلے تم نابالغ[4] تھے اس لئے میں تمہارے مال سے پرہیز کرتا تھا۔ اب تم بالغ ہوگئے اس لئے مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

فیرنی کھانے سے قے ہوگئی

ایک مرتبہ مولوی نورالحسن صاحب کے پاس تشریف لے گئے انھوں نے کچھ دام اپنے صاحبزادہ مولوی محمد ابراہیم کو دیئے کہ خود جاکر ان کا سامان کھانے کے لئے لاویں تاکہ کچھ گڑبڑ نہ ہو، کھانا طیار ہوا اس میں فیرنی بھی تھی جس کے کھاتے ہی قے ہوگئی۔ مولوی نورالحسن صاحب بہت پریشان ہوئے، تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ جو دودھ مولوی محمد ابراہیم صاحب لائے تھے وہ گرگیا تھا پھر دودھ باورچی حلوائی کے یہاں سے دار[5] میں لے آیا تھا۔

انکساری اور خدمتِ خلق

بہت زائد منکسر المزاج تھے، ہر ایک کام خود کیا کرتے تھے بلکہ دوسروں کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ عادت شریفہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے ان میں تشریف لے جاتے۔ اگر کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا تو پوچھ کر وہ لادیتے، پیسہ اس زمانے میں کم تھا جو شئے آتی تھی وہ غلہ کی آتی تھی، آپ غلہ کبھی کرتہ کے پلہ میں لے جاتے اور کبھی لنگی[6] میں۔

---

[1] جس کے حلال ہونے میں شبہ بھی ہو، اور حرام تو درکنار۔ [2] پھل کے قابلِ استعمال ہونے سے پہلے باغ کی بہار فروخت کرنا جائز نہیں مگر لوگ عام طور سے پہلے فروخت کردیتے ہیں یہ حضرت کی احتیاط تھی ورنہ جس پھل کے متعلق معلوم ہوجائے تو اس کا استعمال گناہ ہے نہ معلوم ہو تو گناہ نہیں اور ہر پھل کی تحقیق بھی واجب نہیں اسی طرح تمام چیزوں کا حال ہے کھانے کی ہوں یا استعمال کی چنانچہ آجکل ہر چیز کی بیع میں ناجائز طریقے سُنے جاتے ہیں مگر اس قاعدہ پر عمل ضروری ہے۔ [3] شبہ کی چیزوں سے بچنے کے لئے۔ [4] نابالغ کا مال مفت دینا لینا جائز نہیں، ولی کو بھی اس کا اختیار نہیں نہ صدقہ خیرات کرنا جائز ہے۔ [5] رعیت کے حق میں بغیر پیسوں کے۔ [6] تہبند جو الگ ہمراہ ہوتا تھا۔ (جمیل احمد)

ایک دفعہ رامپور تشریف لے گئے۔ ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ میرا خاوند مجھے خرچ نہیں بھیجتا۔ آپ نے اس کا پتہ دریافت فرمایا اور وہاں سے فیروزپور تشریف لے گئے اور اس کے خاوند کو تلاش کر کے ہدایت کی کہ آئندہ خرچ ہمیشہ بھیجا کرو۔

نکاحِ بیوگان کیلئے عملی مثال

بیوہ کے نکاح کو سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آپ کو فکر ہوئی کہ اس رسم کو توڑنا چاہئے۔ اسی فکر میں تھے کہ مولوی ابوالقاسم صاحب صاحبزادہ حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کو اولاً ترجمۂ قرآن شریف پڑھنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے ترجمہ شروع کیا پھر ایک موقع پر انھیں نکاح ثانی کی ترغیب دی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہوگی اس پر انھوں نے کہا کہ اگر تم نکاح کرو تو میں تیار ہوں مگر میں اور تم دونوں مارے جائیں گے۔ آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا اور پھر اقرار فرمالیا اور ایک موقعہ پر دو چار آدمیوں کے سامنے مخفی طور سے نکاح ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد حمل ٹھیر گیا، کسی کو نکاح کی خبر نہ تھی ہر جگہ زنا کا شور مچ گیا۔ تھانہ بھون والے چڑھ آئے۔ لڑکی والے کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کوئی شخص مولوی مظفر حسین صاحب کا سر اتار کر لاوے گا اس کو ایکہزار روپیہ ملے گا۔ آپ کاندھلہ سے دہلی تشریف لے گئے۔

اتفاق کی بات کہ ان کی والدہ سخت علیل ہوگئیں قاضی صاحب یعنی ان کے والد بہت پریشان ہوئے ہر قسم کا علاج کیا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب بالکل مایوس ہوگئے تو ایک فقیر ملا اور کہا کہ حافظ ضامن صاحب سے کہلادو کہ اچھی ہو جا پھر اچھے ہونے کا میں ذمہ دار ہوں۔ سب لوگ حافظ صاحب کے سر ہوگئے۔ قضیانی حافظ صاحب کی بہن تھیں[1]، بہت اصرار پر آپ نے فرمایا کہ کاندھلہ سے اپنی لڑکی بی رحمت کو بلالو تب کہوں گا۔ اول تو بہت پس و پیش ہوئی بعد میں مجبوراً بُلانا پڑا۔ اُن کے پہنچتے ہی خود بخود صحت[2] شروع ہوگئی۔ اب مولوی مظفر حسین صاحب بھی دہلی سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔

کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی۔ آپ نے اُنھیں اہل السنت والجماعت ہونے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا اگر نکاح کریں تو میں توبہ کرلوں گی۔ آپ نے منظور فرمالیا، یہ بھی بیوہ تھیں۔ انھوں نے کہا کہ جب موقع ہوگا میں خط لکھوں گی تم آکر لے جانا۔ محرم کے موقعہ پر جب سب عورتیں قصبہ سے باہر تعزیے دیکھنے گئیں تو ان کا پرچہ مولوی صاحب کے پاس آیا جس میں یہ نشان تھا × آپ نے میرے دادا

---

[1] قاضی صاحب کی اہلیہ ان بیوہ کی والدہ۔ [2] شاید مولانا کی کرامت ہو کہ مخالفت سے بیماری ہوئی موافقت سے صحت۔ (جمیل احمد)

مولوی محمد صادق[1] صاحب اور چند آدمیوں کو ڈولی لے کر کیرانہ بھیجا اور یہ رات کو گیارہ بجے کیرانہ جاکر ان کو لے آئے جب کیرانہ والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے تعاقب کیا، یہاں سے بھی ان کی اعانت کو لوگ گئے مگر مولوی محمد صادق ان کے ہاتھ نہ آئے اور بخیر کاندھلہ پہنچ گئے۔ ان محترمہ نے حضرت کو بہت تکالیف پہنچائیں مگر آپ سب سہتے تھے، اکثر رات کو دروازہ بند کرلیا کرتی تھیں اور حضرت دروازہ کے باہر لنگی بچھاکر نماز میں وہ وقت گذارا کرتے تھے۔ ایک رات کے تین حصے[2] فرمایا کرتے تھے اول حصہ میں دوسری بیوی کو جو بیوہ[3] تھیں ترجمہ قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے، دوسرے میں صاحبزادیوں کو ترجمہ پڑھایا کرتے تھے۔ تیسرا حصہ کیرانہ والی بیوی کا تھا جس میں ان کے یہاں جاکر تہجد پڑھا کرتے تھے۔

چھٹا حج اور مدینہ طیبہ میں وفات

آپ نے چھ حج پیدل کئے جس میں ایک مولوی محمد یعقوب[4] صاحب کے ساتھ اور ایک ہمراہ اہل وعیال۔ بعد میں مولوی محمد یعقوب صاحب کا خط آیا کہ تم یہاں چلے آؤ۔ اس خط کو مولوی[5] نورالحسن صاحب نے چھپالیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو فوراً روانہ بیت اللہ ہوگئے۔ یہ روانگی ۲۳ رجادی الثانیہ روز شنبہ ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ ابھی مکہ مکرمہ نہ پہنچے تھے کہ اسہال کا مرض لاحق ہوگیا۔ مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ مدینہ منورہ موت آوے مگر بظاہر اب میری موت کا وقت قریب آگیا آپ مراقبہ کیجئے۔ انھوں نے مراقبہ کے بعد فرمایا کہ نہیں آپ مدینہ منورہ پہنچ جائیں گے۔ کچھ روز کے بعد آپ اچھے ہوگئے اور اگلے ہی روز مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے مدینہ منورہ پہنچنے میں ایک منزل باقی تھی کہ آپ پھر بیمار ہوگئے اور ۱۰ر محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ رمئی یوم جمعہ ۱۸۶۶ء کو انتقال فرمایا اور نزدیک قبر حضرت عثمانؓ مدفون ہوئے۔ کرتہ، پاجامہ، لنگی، لوٹہ، مشکیزہ آپ نے چھوڑا جسب وصیت لوٹہ اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کردیا گیا، لنگی مریدین میں تقسیم کردی گئی اور کرتہ پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیجدیا جس میں پاجامہ معتقدین میں تقسیم کردیا گیا اور کرتہ مبارک موجود ہے فقط

محبتِ شیخ

محبت ایک مخفی چیز ہے جس کی اطلاع دوسروں کو صرف اس کے اثرات وثمرات سے ہوسکتی ہے کہ محبوب کی اتنی عظمت قلب میں ہو کہ حاضر وغائب ہر حال اس کا لحاظ مساوی رہے۔ پس حضرت کے قلب میں اپنے شیخ امام ربانی کی جو محبت تھی اس کی حقیقت بجز اللہ عالم الغیب کے کسی کو معلوم نہیں ہاں اس کے اثرات جو کبھی کبھی کسی واقعہ پر ظاہر ہوتے تھے ان پر حیرت ہوا کرتی اور وہ متوسلین کو عملی سبق

[1] یہ صاحب حضرت مولانا صاحب کے داماد اور امی بی کے شوہر تھے۔ اور مسافت بھی دس میل تھی۔ [2] سب کی رضامندی سے۔ [3] مولانا ابوالقاسم کی بیوہ۔ [4] مولانا مظفر حسین صاحب کے شیخ مہاجر کی۔ [5] یہ حضرت مفتی صاحب کے پوتے اور مولانا مظفر حسین صاحب کے بھتیجے تھے لہذا دونوں چچا بھتیجے تھے ان کو خطرہ ہوا کہ شیخ کا خط دیکھتے ہی روانہ ہوجائیں گے۔
(شیخ الحدیث)

پڑھایا کرتے تھے کہ روحانی برکات حاصل کرتا ہوں تو اللہ سے دعا کرو کہ ایسا تعلق مع الشیخ نصیب ہو جائے۔

شیخ کی رحلت پر حضرت کی کیفیت

حضرت امام ربانیؒ کے وصال پر بندہ بھی حضرت کے پاس گنگوہ حاضر تھا۔ ہر چند کہ اس سانحۂ عظمیٰ پر آپ صبر و رضا کی مجسم تصویر تھے مگر ایسے مبہوت کہ گویا آپ کا بال بال چشمِ گریاں بنا ہوا ہے۔ حضرت کا جنازہ سہ دری میں تھا اور آپ خانقاہ[1] میں ایک سکوت طویل کے ساتھ ایک طرف بیٹھے ہوئے چپکے چپکے تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے اور غلبۂ حزن میں جب کوئی آنسو آنکھ سہار نہ سکتی تو کنارۂ چادر سے آپ پونچھ لیتے تھے۔ وصال کے بعد حضرت کے متوسلین جب آپ کی طرف بالطبع رجوع ہوئے تو آپ کی عجیب کیفیت تھی نہ ان کو چھوڑتے بن پڑتا تھا کہ چھوٹے بھائی تھے اور شفقت کے محتاج اور نہ ان کی یہ درخواست آپ کو شیخ کی یاد تازہ کر کے رُلائے اور بے چین کیے بغیر رہتی تھی۔ مولوی عبد العلیم خان بھونگامی نے جب اس قسم کی درخواست حادثہ کے قریب ہی آپ کی خدمت میں بھیجی تو دیر کے بعد حضرتؒ کا یہ جواب آیا۔

مکتوب گرامی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ عرصہ دو ماہ کا ہوا کہ گرامی نامہ صادر ہوا تھا سخت ندامت ہے کہ اس کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ زمانہ سفر قریب تھا اور طبع مضمحل تھی، پھر کچھ علیل رہا۔ بالجملہ بسبب وجوہات جواب نہ لکھ سکا۔ جس تعلق سے آپ نے خط لکھا اسی تعلق کے واسطہ سے میں مستدعی ہوں کہ معاف فرماویں گے۔ آپ نے ذکر کے بارے میں مشورہ فرمایا میں کس قابل ہوں کہ مشورہ دوں۔ خدام حضرت میں مجھ روسیاہ سے زیادہ کوئی بھی نالائق نہ ہوگا۔ بتیس[۳۲] سال کا عرصہ حضور کی خدمت و حیات کا گذرا اور کچھ نہ کیا، کیا خبر تھی کہ یہ روزِ سیاہ دیکھنا پڑے گا۔ کیا معلوم تھا کہ حضرت عالمِ قدس کو رخصت ہو جائیں گے اور میں تبہ کار آپ کے بعد دنیا میں بیٹھا رہوں گا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ وصبر جمیل۔

بالجملہ حیران ہوں کہ کیا عرض کروں پھر اگر عرض نہ کروں تو کیوں کر عرض نہ کروں، تعلقات سے کیوں کر قطع نظر کروں۔ ذکر کے بارے میں جہاں تک اس وقت میرے خیال میں ہے کہ ذکرِ جہر[3] آپ کو زیادہ نافع ہے گو اس قدر نہ ہو کہ موجبِ تکلیف ہو۔ علاوہ اس کے ذکرِ خفی کرنا بھی مضائقہ نہیں، اس وقت معذور ہوں تعین نہیں کر سکتا بوقت ملاقات مفصل عرض کروں گا۔ والسلام

خلیل احمد عفی عنہ از سہارنپور سہ شنبہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۶ء

---

[1] روتی آنکھ۔ [2] حضرت شاہ عبد القدوس کی خانقاہ جو قریب بھی تھی۔ [3] ذکر جہر یعنی بلند آواز سے کرنا اس شرط سے جائز ہے کہ کسی کی نیند اور نماز میں خلل نہ ہو اور مشقت تک نہ پہنچے مولانا عبد الحی لکھنوی کا عربی رسالہ اس کی تحقیق میں ہے نام سباحۃ الفکر ہے۔ (جمیل احمد)

دوسرے خط میں یہ حزن وغم بے اختیار بزبانِ قلم ان لفظوں میں ظاہر ہوا۔

مکتوب مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ مع استفتا پہنچا۔ جواب ارسالِ خدمت ہے۔ باقی امور کا کیا جواب دوں بجز اس کے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت نے کمر توڑ دی ہیں تو دل سے کہتا ہوں ؎

سُنے کون ہائے صدائے دل ملے کس سے آہ شفائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم خدام کارہ ہیں یا ناکارہ آپ اور تمام خدام حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم ہیں انشاء اللہ کسی کام سے عذر نہیں فقط۔ خلیل احمد عفی عنہ

شیخ کے متعلقین سے محبت حضرت کے متوسلین کو جس طرح آپ نے یتیم اور چھوٹا بھائی سمجھ کر آغوشِ شفقت میں لیا اور چھاتی سے لگایا اسی طرح حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے متعلقین اور رشتہ داروں کو اپنے خون شریک عزیزوں سے زیادہ پیارا اور محبوب سمجھا۔ صاحبزادہ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب مدظلہم کسی مریض کا علاج کرنے سہارنپور تشریف لاتے تو حضرت خادمانہ طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ مؤدبانہ درخواست کی کہ مہمانی قبول فرمادیں اور مدرسہ کو قیام سے نوازیں۔ صاحبزادہ صاحب نے منظور فرمالیا تو حضرت کو اتنی خوشی ہوئی کہ عرصہ تک اپنے مخلصین سے بے اختیار فرمایا کرتے کہ صاحبزادہ صاحب نے بندہ کی درخواست قبول فرماکر شرفِ میزبانی بخشا۔

حضرت گنگوہیؒ کی صاحبزادی کا احترام صاحبزادی صاحبہ سے حضرت کو خصوصی تعلق تھا کہ ماشاء اللہ ہر قسم کے کمالات روحانیہ سے مالامال ہونے کے باوجود وہ حضرت کو پیر کی جگہ سمجھتی تھیں اور حضرت اُن کو اپنی بڑی بہن سمجھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ مستورات نے حضرت سے بیعت کی تو مخدومہ صاحبزادی صاحبہ نے بھی رومال تھام لیا اور بیعت ہوگئیں کہ اس وقت حضرت کو علم بھی نہیں ہوا مگر باوجود اس کے حضرتؒ ان کی اس درجہ عزت فرمایا کرتے تھے کہ ماں زندہ ہوتیں تو بس اس سے زیادہ نہ کرسکتے، وہ سہارنپور تشریف لاتیں تو حضرت مدرسہ سے فارغ ہوتے ہی باہتمام مکان پر جاتے اور جب تک مخدومہ کا قیام رہتا حضرت پر مسرت کا وہ عالم طاری رہتا گویا حضرت امام ربانی تشریف لے آئے گھر بار سب ان پر چھوڑ کر مطمئن ہوجاتے اور کوئی بات اہل کی طرف سے حضرت سے دریافت بھی کی جاتی تو بے ساختہ فرماتے "بہن تشریف رکھتی ہیں ان سے پوچھو اور جو وہ فرمائیں وہ کرو کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھ سے کسی بات کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حضرتؒ[1] مخدومہ سفرِ حج کو تشریف لے گئیں تو دہلی تک حضرت نے مشایعت فرمائی اور پھر اتفاق سے حضرت بھی شریکِ حج ہوگئے تو مکہ مکرمہ پہنچکر مخدومہ کی تمامی ضروریات

[1] حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اپنے ذمہ رکھکر مدنی سفر میں خادمیت کا وہ حق ادا کیا کہ خود شغدف اٹھا کر اونٹ پر لادتے اور سیڑھی پکڑ کر مخدومہ کو سوار کراتے اور جب تک وہ بآرام سوار نہ ہو جاتیں حضرت اپنے اونٹ پر سوار نہ ہوتے تھے۔

شیخ کے ہمشیرزادے کی دلجوئی

حضرت امام ربانی کے ہمشیرزادہ مولوی محمد ابراہیم صاحب ایک بار اپنے لڑکے کو مدرسہ میں داخل کرنے کے لئے سہارنپور لائے جو ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے اور قواعد مدرسہ کی رُو سے ان کے وظیفہ کا مدرسہ متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ تشریف لائے تو حضرت نے جنگیر ہو کر غایتِ احترام کے ساتھ ان کو بٹھایا اور لڑکے کو مہتمم[1] صاحب کے پاس بھیجدیا کہ داخلِ مدرسہ کر لیا جائے مہتمم صاحب نے درخواست پر جواب[2] لکھدیا کہ قواعد مدرسہ کے خلاف ہے اور وظیفہ مدرسہ سے نہیں دیا جاسکتا حضرت چُپ تھے کہ نہ مدرسہ کا قاعدہ کسی کی رعایت میں توڑا جا سکے اور نہ ہمشیرزادہ شیخ کی صعوبتِ سفر اور خواہش سے چشم پوشی کی جا سکے۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب کو مہتمم صاحب کا یہ روکھا جواب ناگوار گذرا اور یہ دیکھ کر کہ پھر حضرتؒ نے بھی اس کی تردید نہ کی زیادہ غصہ آیا کہ واپسی پر آمادہ ہو گئے اور حضرت سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے میں پنجاب جانے والی اسی گاڑی سے جاؤں گا۔ حضرت خود ہی پریشانی و فکر میں تھے۔ شیخ کے بھانجے کا رنج و غصہ دیکھ کر اور پریشان ہوئے۔ آخر یہ فرما کر کہ مولانا ابھی گاڑی میں دیر ہے ذرا مجھے اجازت دیجئے کہ مکان پر ہو آؤں۔ غرض مکان پر جا کر کھانا طیار ہونے کا تقاضا کیا اور پھر خدا جانے کہاں تشریف لے گئے۔ کچھ دیر بعد خوشی خوشی مدرسہ میں آئے اور اسی درخواست کی پشت پر یہ لکھ کر کہ صہ[3] مرسلہ پیشگی جمع کر کے میری ذمہ داری پر طالب علم مذکور کو مدرسہ میں داخل کر لیجئے۔ درخواست اور روپیہ لڑکے ہی کے ہاتھ مہتمم صاحب کو بھیجدیا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک واقعہ احقر کا چشم دید ہے کہ مغرب کی اذان ہو چکی تھی جماعت تیار تھی کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ حضرت صاحبزادی صاحبہ تشریف لائی ہیں اور ان کی گاڑی کا پہیا نالی میں گر گیا۔ حضرت فوراً ننگے پاؤں دوڑ پڑے سب لوگ بھی دوڑے تو حضرت خود گاڑی کو اٹھا رہے تھے حالانکہ عمر مبارک ۷۰۔۸۰ کے درمیان تھی مگر جوانوں کی طرح لگ رہے تھے جب اور لوگ بھی پہنچ گئے گاڑی نکل آئی تب سب نے آکر جماعت کی۔ مسجد کے قریب ہی کا قصہ تھا وقت نماز کا شروع ہی ہوا تھا وہ سراسیمگی کی حالت بھی عجیب ظاہر ہو رہی تھی۔ (جمیل احمد)

(حاشیہ صفحہ ھذا) [1] مہتمم صاحب کی دیانت اور ناظم مدرسہ کی بھی رعایت نہ کرنا قابل قدر ہے۔ [3] پانچ روپے۔ (جمیل احمد)

[2] یہ مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرت سہارنپوری کے ہمدرس مولانا محمد مظہر رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ تھے۔ علم فرائض کے ماہر اور تقوی، دیانت اور سادگی میں صحابہ کرام کا نمونہ تھے۔ مدرسہ کے کاغذ کا ذرا سا ٹکڑا تک ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ ساری عمر مدرسہ کی خدمت میں نہایت قلیل تنخواہ پر گزار دی۔ چھوٹا قد، دبلا جسم، سانولا رنگ، سر پر کپڑے کی ٹوپی یا سادہ عمامہ، ہاتھ میں چھتری لئے قاضی کے محلہ کی طرف سے کوٹ قلعہ (جہاں مظاہر علوم واقع ہے) گرمی، سردی، برسات میں دن میں چند دفعہ کی آمد و رفت کا معمول تھا۔ عصر کی نماز بالعموم مہتمم صاحب ہی پڑھایا کرتے تھے۔ مسکرا کر دھیمی آواز میں بات کرتے کبھی غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔

(اخلاق احمد)

اور مولوی ابراہیم صاحب سے فرمایا کہ حضرت آپ تو میرے آقا کے ہمشیر زادہ ہیں اس کوچہ کا تو کُتّا بھی اگر آئے تو اس کے لئے آنکھوں کا فرش کردوں میں تو پریشان تھا کہ آپ کو راضی کرنے کی کیا صورت کروں سو خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے انتظام فرمادیا۔ اطمینان رکھئے عزیز کا خرچ خوراک ہر مہینہ مدرسہ میں داخل ہوتا رہے گا اور اب عرض ہے کہ کھانا طیار ہے دل چاہے کچھ قیام فرمائیں ورنہ کھانا کھا کر اسٹیشن تشریف لے جاویں۔ مولوی ابراہیم صاحب لکھتے ہیں کہ اس وقت میں سمجھا کہ شیخ کی محبت و عظمت کیا چیز ہوتی اور آپ کو قدرت نے اس کا حظ وافر کتنا عطا فرمایا ہے۔

الحاصل لڑکپن کی برائے نام بیعت کا جب یہ احترام تھا کہ آپ حضرت امّی مرحومہ کی آستانہ بوسی کو فخر سمجھتے اور ان کے نواسوں مولانا محمد یحییٰ صاحب و مولانا محمد الیاس صاحب کو اپنی اولاد سے زیادہ پیارا سمجھتے رہے تو آستانہ گنگوہیہ کی عظمت کا کیا پوچھنا کہ جو کچھ بھی آپ کو ملا وہ اسی دربار دُربار[2] سے ملا۔ آپ کا رُواں رُواں اپنے محسن و مربی شیخ کا ممنونِ احسان اور گویا بزبانِ حال اس شعر کا درد رکھتا تھا ؎

باغباں خانہ ات آباد ثناخوانِ توام چوں صبا بادفروشِ گل ریحان توام[3]

میں نے حضرت امام ربانی کے خطوط جو بہاولپور بریلی وغیرہ حضرت کے نام گئے دیکھے ہیں کہ سب بیرنگ ہیں اور کسی پر بھی ٹکٹ نہیں، یہ صرف اس لئے کہ گو محصول دو چند دینا پڑے مگر شیخ کی تحریر جو گویا سونے کا پترہ ہے دوسرے کے ہاتھ نہ پڑے اور بحفاظت آپ ہی کو پہنچے، اور جب آپ سہارنپور چلے آئے کہ گنگوہ کا دروازہ تھا تب تو گنگوہ جانے والا کوئی شخص بھی ایسا نہ چھوڑا جس کے ہاتھ عریضہ اور زبانی سلام غلامانہ نہ پہنچایا ہو۔

گنگوہ اس وقت میں مرجع خلائق بنا ہوا تھا اور آپ کا دل چاہتا تھا کہ آستانۂ شیخ پر حاضر ہونے والے آتے اور جاتے آپ ہی کے پاس ٹھیریں۔ ادھر اعلیٰحضرت کو آپ کے ساتھ محبت زیادہ تھی کہ جو مہمان براہِ سہارنپور آتا اس سے پوچھا کرتے کہ خلیل احمد اچھی طرح ہیں اور اُن سے مل کر بھی آئے یا نہیں؟ اس لئے ہر چند کہ مدرسہ شہر کے ایک گوشہ میں تھا مگر حضرت کے خاص متوسلین اہتمام کرکے مدرسہ آتے اور حضرتؒ ہی کے پاس قیام کرتے تھے مدرسہ سے اس وقت حضرت کو للعہ[4] ماہوار ملتے تھے اور فتوحات و نذر و ہدایا کا سلسلہ بھی نہ تھا۔ اکثر حضرت بسلسلۂ مہمانداری مقروض رہتے اور تنگی کے ساتھ گذر کیا کرتے مگر برادرانِ طریقت کی مدارات سے آپ کے قلب کو جو فرحت پہنچتی تھی وہ ہر فکر و عسر[5] کو داب لیتی تھی۔

---

[1] بلکہ مدرسہ کے قانون کو صدا انصاف و دیانت پر رکھنا اور شیخ کی محبت و عظمت بھی کامل طور پر رکھنا کس طرح ہوتا ہے۔ [2] موتی برسانے والا۔ [3] اے باغبان تیرا گھر آباد رہے میں تو تیری تعریف کرنے والا ہوں صبا ہوا کی طرح تیری پھلواریوں کی خوشبو دوسروں تک پہنچانے والا ہوں۔ [5] تنگی و تنگدستی۔ (جمیل احمد)

مہمانوں کی خاطرداری

گنگوہ سہارنپور سے بائیس[22] میل تھا اس لئے دن کو یا رات کو گنگوہ سے آنے والے مدرسہ میں اکثر بغیر اطلاع اور ناوقت آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ آپ ان کے لئے کھانا لینے گھر میں گئے تو معلوم ہوا کہ بی بی بچوں سے زائد نہیں ہے اور نہ گھر میں آٹا دال ہے کہ پکا لیا جائے مگر گھر والے بھی آخر آپ ہی کے گھر والے تھے اس لئے سارا کھانا باہر مہمانوں کے لئے آ جاتا اور بی بی اور دونوں لڑکیاں صرف پانی پی کر سو جایا کرتی تھیں اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں دلداری کے لئے مہمانوں کے ساتھ بیٹھ تو جاتا تھا مگر یہ خیال آتا کہ بچیوں نے کچھ کھایا نہیں اس لئے میں بھی بھوکا اٹھ جاتا تھا باایں ہمہ گنگوہی مہمانوں سے دل تنگی کا تو کیا ذکر آپ کے اصرار اور مخلصانہ محبت کی وجہ سے مہمانوں کا آنا دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ اگر کوئی بالا بالا چلا جاتا تو آپ کو رنج ہوتا اور شکوہ فرمایا کرتے کہ مجھ سے مل کر کیوں نہ گئے۔ پھر کھانا ہی نہیں بلکہ مہمانوں کی ہر ضرورت کا پورا کرنا آپ اپنا فرض سمجھتے حتیٰ کہ ان کی روانگی ناوقت ہوتی تو لاٹھی لیکر ان کے ساتھ چلتے کہ راستہ میں کتا بلی پریشان نہ کرے۔

ایک مرتبہ بندہ کو صبح کی نماز کے وقت جانے والی ریل پر سوار ہونا تھا تو حضرت قبل فجر لاٹھی لیکر تشریف لے آئے اور ہر چند بندہ نے اصرار کیا کہ حضرت تکلیف نہ فرمائیں مگر حضرت نے نہ مانا اور یہ فرما کر کہ باتیں کرتا چلوں گا ذرا دل بہلا رہے گا اور دونوں کی نماز بھی باجماعت ہو جائے گی ساتھ ہو لئے۔ سپاہیانہ انداز پر لاٹھی ہلاتے ہوئے اسٹیشن پر آئے وہاں دونوں نے جماعت کر کے نماز پڑھی اور جب میں ریل میں بیٹھ گیا تب حضرت پیدل ہی مدرسہ واپس ہوئے ؎

پائے در زنجیر پیشِ دوستاں[1] — بہ کہ بابیگانگاں در بوستاں

نکاح اور اولاد

حضرت قدس سرہٗ کا رشتۂ مصاہرت[2] قصبۂ گنگوہ کے انصاری خاندان سے وابستہ ہے کہ شاہ حسن عسکری شہیدؒ کی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دو صاحبزادیاں تھیں، ایک حضرت کے عم بزرگوار شاہ حبیب محمد صاحب کو منسوب ہوئیں جو کہ مولانا صدیق احمد صاحب کی والدہ تھیں، اور دوسری صاحبزادی جن کا نام الٰہی بیگم تھا گنگوہ میں شاہ عبدالرحمٰن بن مولانا شاہ حبیب اللہ گنگوہی سے بیاہی گئیں۔ شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں ایک حضرت مولانا حکیم اسمٰعیل صاحب گنگوہی کے نکاح میں آئیں اور

---

[1] دوستوں کے سامنے پیروں کا زنجیروں میں ہونا بھی اس سے بہتر ہے کہ بیگانوں کے ساتھ باغوں میں ہوں۔ [2] نکاح کے تعلق کا۔ (جمیل احمد)

ان کے بطن سے فخرِ خاندان مولانا مولوی حکیم سعید احمد صاحب تولد ہوئے جو آج[1] اپنے باپ کے ہر امر میں سچے جانشین اور بمبئی کے مشہور طبیب ہیں۔ دوسری صاحبزادی کا شاہ محمد صادق صاحب سجادہ نشین انبہٹہ سے رشتہ ہوا اور تیسری صاحبزادی جن کا نام انبیا بیگم تھا حضرت قدس سرہ کے نکاح میں آئیں۔ ان بہنوں کے دو بھائی تھے، شاہ مظہر حسین اور مولانا حکیم فخر الحسن صاحب کہ ثانی الذکر کی یادگار حضرت مولانا حافظ فیض الحسن صاحب مدظلہ ہیں[2] جن کا شمار حضرت قدس سرہ کے خلفا میں ہے اور اپنے موقع پر تذکرہ ہوگا۔

گنگوہ میں عقد نکاح

۱۲۸۹ھ میں جبکہ حضرت قدس سرہ کی عمر کا اکیسواں سال شروع تھا اور آپ تعلیم سے فارغ ہوکر ملازم ہوچکے تھے۔ لڑکی والوں کا آپ کے والدین پر تقاضا ہوا کہ عقد نکاح سے فراغ پاؤ چنانچہ تاریخ مقرر ہوگئی اور بارہ چودہ اعزا کی بہت مختصر و سادہ برات چار پانچ بہل میں سوار ہوکر انبہٹہ سے گنگوہ روانہ ہوئی حضرت امام ربانی قدس سرہ نے خطبۂ نکاح پڑھ کر ڈھائی ہزار روپیہ مہر قرار دے کر اپنے روحانی بیٹے کا عقد کیا۔

حضرت کی اولاد

۱۲۹۰ھ میں حق تعالیٰ نے آپ کو فرزند عطا فرمایا جن کا نام محمد ابراہیم[3] رکھا گیا اور دو نام تاریخی تجویز ہوئے ظفر علی اور ناظر الحق۔ ڈھائی سال بعد شروع ۱۲۹۳ھ میں لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام منیر النساء[ع] رکھا گیا۔

اہلیہ کی وفات

اور ان کے ڈھائی سال بعد ۲ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی مگر بحکم قضا و قدر یہ ولادت ماں اور بیٹی دونوں کے لئے عالمِ آخرت کا بلاوا تھی کہ صرف تین دن زندہ رہ کر اول معصومہ نے دنیا کو الوداع کہا اور اسی روز والدۂ محترمہ بسوئے عالمِ آخرت روانہ ہوگئیں: فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] انتقال ہوچکا ہے ایک بیٹے بمبئی میں اور دو کراچی میں مطب کر رہے ہیں۔ [2] وفات پاچکے ہیں کانپور میں قیام رہا۔ اصول الشاشی حسامی، مسلم الثبوت پر حاشیے ہیں جو ان کی یادگار ہیں۔ [3] جوانی میں وفات پائی۔ [4] عمر طبعی پر وفات ہوئی اور ان کی صرف ایک صاحبزادی ہیں اہلیہ مولانا سلطان مسعود قاری ڈیرہ غازی خاں میں قیام ہے۔ (جمیل احمد)

[ع] جب حضرتؒ کی دوسری شادی حاجی نظام الدین کی دختر منیر النساء سے ہوئی تو نام میں اس طرح فرق ہوا کہ حضرت کی بیٹی منیر النساء منّی کے نام سے پکاری جاتی تھیں اور زوجۂ محترمہ منیرؔ کہلاتی تھیں۔ پھوپھی منّی میرے والد صاحب مرحوم کی ماموں زاد بہن تھیں ان کو اپنی پھوپھی اور ان کی اولاد سے بیحد محبت تھی اپنے بھائی حافظ محمد ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد جب ڈیرہ غازی خاں سے سہارنپور آئیں تو نہایت بے قرار تھیں ان کے ایصال ثواب کے لئے تقریباً ایک مہینے تک یہ انتظام کیا کہ روزانہ دودھ جلیبی میرے ہاتھ منگوائیں اور میرے ہی ذریعہ سے کسی طالب علم کے پاس بھجوا دیتی تھیں۔ اس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا۔ (اخلاق احمد)

مصیبت کا راز دنیا عجیب گھر ہے کہ غمی اور خوشی توام[1] اور انقلاب احوال اس کے لئے لازم ہے۔ قدرت کے یہی تصرفات جو حوادث و واقعات کہلاتے ہیں انسان کے ضبط و استقلال کی کسوٹی اور مسلمان کے تعلق مع اللہ اور ایمان بالغیب کا امتحان بنتے ہیں کہ انسان کی ابناء جنس کے ساتھ محبت بھی فطری بات ہے اور کوئی اس کی تبدیلی میں کوشش بھی کرے تو شریعت اس کو ممنوع وحرام قرار دیکر مجبور کرتی ہے کہ قدرت کا مقابلہ کر کے فرعون نہ بنو۔ بااین ہمہ شریعت چاہتی ہے کہ ان تمامی تعلقات کی فنائیت و انقطاع کو ہر لحہ یاد رکھو تاکہ حی وقیوم خدا کے ساتھ انس و محبت کے تعلق کا مقابلہ نہ کر سکیں اور صبر و رضا کی مضبوط رسی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ یہی حوادث اور محبوب چیزوں کا فراق قلب میں وہ شکستگی پیدا کرتا ہے جو نفس امارہ کی شوکت کو مضمحل اور عالم آخرت سے غفلت ونسیان کو زائل کرتا ہے اس لئے یوں بھی حق تعالیٰ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے کہ جو کیفیت مستحسنہ ہزاراں ہزار برس کے مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی وہ حوادث پر صبر اور تصرفاتِ الٰہیہ پر رضا وتسلیم کے صلہ میں ایک لمحہ کے اندر نصیب ہوجاتی ہے ؎

صوفی[2] نہ شود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اس لئے حضرت کے لئے جس طرح اتباعاً للسنہ[3] حق تعالیٰ نے یہ مقدر فرمایا تھا کہ بی بی کے ساتھ کمال انس و محبت ہو کہ عفت و پاک نظری کے لئے لازمۂ بشریت ہے اسی طرح یہ بھی آپ کی پیدائش کے قبل طے فرمادیا تھا کہ اس کی دنیوی مفارقت وموت کا صدمہ بھی آپ کو پیش آئے اور ابتداء سلوک میں مجاہدۂ عظمیٰ کے قائم مقام بن کر آپ کی لطیف کو درجۂ علیا پر پہنچائے۔ لہذا جو پیش آنا تھا وہ پیش آیا کہ پانچ سال کے اندر وصال و فراق اور لقاء وجدائی کے دونوں منظر آپ کی نظر کے سامنے گذر لئے۔ نکاح بھی ہوگیا اور لڑکا و لڑکی بھی پیدا ہولئے اور وہ عفت مآب خاتون جس کا وجود آپ کے لئے طبعی سکون وانس کا سبب تھا انہیں کی زمین میں مستور بھی ہوگئی ؎

حال[4] دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ گفت یا خوابے است یا بادے است یا افسانۂ

باز گفتم[5] حال آنکس گو کہ دل در وے ببست گفت یا غولے است یا دیوے است یا دیوانۂ

بی بی، بچے، والدین، برادران اور اقارب واحباب کے تمامی تعلقات کی نوعیت جدا اور ہر ایک کی مفارقت و

---

[1] ساتھ ساتھ دراصل وہ دو بچے جو ایک حمل سے پیدا ہوں۔ [2] صوفی صاف دل نہیں ہوسکتا جبتک (محبتِ الٰہی کا) جام نہ پی لے، بہت سفر کی ضرورت ہے تاکہ کچا پکا بن جائے۔ یعنی حالات دیرپا ہو کر مقامات بن جائیں۔ [3] سنت نبوی کی پیروی کے لئے۔
[4] میں نے ایک عقلمند سے دنیا کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ یا ایک خواب ہے یا ایک ہوا کا جھونکا ہے یا ایک افسانہ ہے [5] پھر میں نے اس شخص کا حال پوچھا جس نے اس میں دل لگالیا تو اس نے کہا یا ایک بھوت ہے یا دیو یا ایک دیوانہ ہے۔ (جمیل احمد)

موت کا صدمہ ایک نرالا طریق رکھتا ہے جس کی بنا پر رحمٰن و رحیم خدا نے ہر ایک پر صبر کا ثمرہ بھی جدا اور اجر و ثواب کی نوعیت بھی علیحدہ مرتب فرمائی ہے پس آپ کی شانِ خُلت[1] جس نے بلا قصد و ارادہ آپ کے کنبہ کو ظہور آثار سے بہت پہلے آپ کا نام خلیل احمد رکھنے پر مجبور کیا تھا اس کو مقتضی تھی کہ ایک وقت میں مونسہ و غمگسار بی بی اور نیز نورِ نظر و لختِ جگر بچہ کی مفارقت پر آپ کی تسلیم و رضا کا امتحان لیا جائے۔

بچی اور بیوی کا انتقال

اس لئے تین ہی دن میں دونوں سانحے پیش آئے اور حق تعالیٰ کے اس فضل و کرم نے جو ہمیشہ اپنے مقبول بندوں کا حامی و پشت پناہ بن کر خود ہی امتحان لیتا اور خود ہی ان کو سنبھالنا تعلیم دیتا، رہبری فرماتا اور کامیاب بناتا ہے، آپ کو بھی سنبھالا کہ رضا برقضا میں فرق نہ آنے پایا ؎

ذوقے[2] چناں ندارد بے دوست زندگانی   بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

اِدھر نوزائیدہ شیرخوار بچی کی موت طبعاً موجبِ حزن[3] ضرور ہوئی کہ ثمرۃ الفؤاد[4] رخصت ہوا مگر قلباً سبب طمانیت ہوئی کہ وسیلۂ مغفرت[5] اور ذخیرۂ آخرت بنی۔ اُدھر مجسم صلاح و اطاعت بی بی کا فراق جس کے ساتھ محبت نے ایک خاص شغف و غلبہ لے لیا تھا دوسرے نوع کے صدمہ و حزن کا سبب بنا، مگر ساتھ ہی یہ مسرت ملی ہوئی تھی کہ مرضِ احتباس[6] میں مرنا شہادت ہے اور وہ نفوس جن کو آج یا کل آخر ایک دن دنیا کا چھوڑنا ضروری ہے زہے نصیب کہ آخرت کی کٹھن منزل کو بسہولت طے کر جائیں اور ایسے زمانہ میں کہ شہادتِ کبریٰ[7] کا حصول دشوار ہے شہادتِ صغریٰ[8] حاصل کر کے اپنے رب سے جا ملیں۔ متواتر و ملحق دو قسم کے انتہائی دو صدموں پر آپ نہایت محزون و مغموم ہوئے اور کیوں نہ ہوتے کہ آخر بشر تھے اور بشر بھی متبع سنت رقیق القلب۔

قطعہ تاریخ وفات اہلیہ

چنانچہ آپ کی قلمی بیاض میں آپ کے ہاتھ کی لکھی ایک تحریر اور بی بی کی تاریخِ وفات میں آپ کے تصنیف کئے ہوئے دو شعر ملے جو آپ کے اس رنج و غم اور ساتھ ہی صبر و استرجاعِ[9] مسنون کا پتہ دیتے ہیں جس کو کوئی دیکھنے والا دیکھ نہ سکا تھا اور وہ یہ ہے:۔

۱؎ خلیل یعنی خدا کے دوست ہونے کی شان۔ ۲؎ کچھ ایسا ذوق نہیں رکھ سکتی ہے بغیر دوست کے زندگی، بے دوست کے زندگی کوئی ایسا ذوق نہیں رکھ سکتی۔ ۳؎ غم کا سبب۔ ۴؎ دل کا پھل۔ ۵؎ کیونکہ حدیث میں ہے جس کا بچہ مر جائے وہ جنت میں لے جائے گا۔ ۶؎ بچہ کے بعد کے خون کا بند ہو جانا، حکمی شہادت میں سے ہے۔ ۷؎ جہاد میں شہید ہونا ۸؎ حکمی شہادت جو حدیثوں میں ہے۔ ۹؎ اِنّا لِلّٰہ پڑھنا۔

(جمیل احمد)

تاریخ پنجم ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ والدہ برخوردار ابراہیم بمرض احتباس نفاس بجوار رحمت حق پیوست۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اجل[1] کردہ جانانہ را منفصل
شدم از وفور الم[2] مضمحل

خلیل[3] از غمش گشت غمگین وگفت
بتاریخ او "داغ بر جانِ دل"
۱۲ ۹ ۵

ہر چند کہ آپ شاعر نہ تھے اور ان دو اشعار کے سوا کبھی آپ کی تصنیف کا کوئی شعر دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا مگر کسی حادثہ کا طبعی تاثر بسا اوقات قوت وغلبہ پا کر وہ کام لے لیتا ہے جس کا دوسرے وقت میں تصور مشکل ہوتا ہے اس لئے آپ کی ذہین و ذکی طبیعت نے بی بی کی وفات پر یہ اشعار موزوں کرا دیئے جس کا مادۂ تاریخ تعمیہ وتخرجہ[4] کے بغیر بلا کمی وبیشی یک حرف داغ بر جان دل شاعرانہ مذاق سے بھی ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

رضا اور غم کی شرعی صورت چونکہ صبر و رضا کی حقیقت یہ ہے کہ صدمہ کا اثر ضرور ہو کہ انسان ہے پتھر یا دیوار نہیں مگر حکم الٰہی سے غفلت اور حد شریعت سے تجاوز کسی امر میں بھی ہونے نہ پائے۔ اس لئے آپ اگر بی بی کی مفارقت پر محزون تھے جس کے صدمہ کو اس کی دو یادگاریں ہر وقت یاد دلاتی تھیں جن میں ایک کی عمر پانچ سال کی تھی اور دوسری کی عمر ڈھائی سال کی۔ تو اس کے ساتھ ہی آپ ان کی پرورش کے لئے ہر اس صورت کے لئے طیار تھے جو غیب سے ظاہر ہو۔

۱۲۹۶ھ میں نکاح ثانی چنانچہ مرحومہ کی وفات کو ایک سال نہ گذرا تھا کہ آپ کے والدین نے جن کا سایۂ عاطفت آپ کے سر پر اسوقت تک قائم تھا آپ کے عقد ثانی کی تجویز کی اور آپ اس پر بھی اسی طرح راضی ہوئے جس طرح عقد اول پر راضی ہوئے تھے کہ؎

بدرد[5] وصاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

۱۲۹۶ھ میں آپ کا دوسرا نکاح انبہٹہ میں حاجی نظام الدین صاحب کی لڑکی مسماۃ منیر النساء کے ساتھ ... ہزار مہر پر منعقد ہوا جس کو انھوں نے چند ہی روز بعد معاف فرما دیا تھا۔ ممدوحہ کا پہلا نکاح شیخ سراج الدین مرحوم سے ہوا تھا اور قلیل عرصہ میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو شیخ وقت کی زوجیت کا احترام نصیب فرمایا

---

[1] بچہ کے بعد کے خون کے رک جانے کی بیماری میں حق تعالیٰ کی رحمت کے پناہ میں جا ملیں۔ [2] موت نے محبوب کو جدا کر دیا تو میں غم کی زیادتی سے ... ہو گیا۔ [3] خلیل اس کے غم سے غمگین ہوا اور اس کی تاریخ میں یہ کہا کہ دل کی روح پر داغ لگ گیا۔ [4] اگر تاریخ نکالنے میں ایک دو عدد کم رہ جائیں تو کسی لطیف اشارہ سے اس کو شامل کرانا تعمیہ ہے اور زیادہ کو نکالنا تخرجہ ہے وہ تاریخ عمدہ ہے جس میں کمی بیشی نہ کرنی پڑے اور پھر ... بھی [5] تلچھٹ اور صاف کا تم کو اختیار نہیں بس پی جاؤ کہ ہمارے ساقی نے جیسی بھی انڈیل دی ہے وہ لطف ہی لطف ہے (جمیل احمد)

اور طرفین سے اس اتباعِ سنت کا ظہور ہوا جس میں موجودہ اور آئندہ بہت کچھ مجاہدے پیش آئے اور ہر ہر قدم پر اثبات و استقلال کے کارنامے ترقیاتِ مراتب کا سبب بنے۔ ممدوحہ بحمد اللہ مدینہ منورہ میں بقیدِ حیات مقیم ہیں[1] اور دعا ہے کہ تا دیر بعافیت جسمانیہ و روحانیہ قائم رہیں کہ بڑی خوبیوں والی خاتون ہیں یہ نکاح حضرت گنگوہی کے مشورہ سے ہوا کہ حضرت کے والد نے کنبہ کی پانچ لڑکیوں کے نام لکھ کر حضرت کی خدمت میں گنگوہ بھیجدیئے کہ ان میں جس کو انتخاب فرماویں وہاں سلسلۂ جنبانی کی جاوے۔

پہلی اولاد کی تربیت مرحومہ کے انتقال پر دونوں بے ماں کے بچے اپنی نادی کی تربیت میں آئے مگر ان کے لئے یہ سایہ بھی تادیر قائم رہنا مقدر نہ تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا تو لڑکے کو آپ کے چچازاد بھائی مولوی انوار احمد اپنے ساتھ تھانہ بھون لے گئے[2] اور قرآن شریف شروع کرا دیا۔ لڑکی جو اپنے بھائی سے ڈھائی سال چھوٹی تھیں زیادہ تر اپنی نانی کے پاس گنگوہ رہیں اور کچھ مدت اپنی پھوپھی کے پاس اور کبھی انبہٹہ آکر اپنی ماندر کے پاس رہتی تھیں، مگر جہاں بھی رہتیں حضرت ان کی خور و نوش کا اہتمام فرماتے اور ضروریات کے قابل خرچ اپنی استطاعت کے موافق پہنچاتے رہتے تھے حتیٰ کہ ان کی عمر پندرہ سال کی ہوئی۔

صاحبزادی کا نکاح اور حضرت نے اپنے چچازاد بھائی محمد نقی بن محمد علی کے صاحبزادے مولوی محمد ایوب صاحب کے ساتھ اکتوبر ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الاول ۱۳۰۹ھ میں نہایت سادہ طریق پر ان کا عقد کر دیا کہ رسوماتِ مروجہ میں کوئی رسم عمل میں نہ آئی۔

مولوی محمد ایوب وکیل ڈیرہ غازیخاں مولوی محمد ایوب صاحب[عہ] حضرتؒ کے ہمجد تھے اور مکان سے دیوار بہ دیوار۔ اول ابتدائی کتابوں سے فارغ ہو کر عربی شروع کی اور ڈھائی سال مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں تعلیم پاتے رہے۔ اکتوبر ۱۳۸۶ھ میں بھاولپور چلے گئے اور آخر ۱۲ مئی ۱۸۹۱ء کو لاہور کے اورنٹیل کالج میں داخل ہو کر علومِ مشرقیہ کے امتحانات کی سند حاصل کرنے میں لگ گئے ۱۸۹۶ء میں کئی امتحانات کی ڈگریاں حاصل کر کے مختار کاری کا امتحان دیدیا اور اب ڈیرہ غازیخاں میں وکالت[عہ] کر رہے ہیں۔ صاحبزادی

---

[1] تصنیف کے وقت حیات تھیں بہت تھوڑے عرصہ بعد مدینہ منورہ میں وفات ہوگئی تھی اُن سے تین لڑکیاں ہوئی تھیں جو بلا اولاد جوانی میں وفات پاگئیں۔ [2] مولانا اس وقت خانقاہ امدادیہ میں مدرس تھے۔ (جمیل احمد)

عہ میں نے سنا ہے حجامت کے وقت حجام قینچی سے ناک کے بال لے رہا تھا اتفاق سے قینچی نوک سے ناک کے اندر زخم ہو گیا جو اتنا بڑھا کہ اسی کی تکلیف سے موصوف نے انتقال فرمایا۔ عہ بھاولپور میں حضرت کے پاس زیر تعلیم رہے اور لاہور میں علوم مشرقیہ اور قانون کے امتحانات دینے میں مولوی ایوب اور حضرت کے چھوٹے بھائی مولوی رشید احمد ساتھ ساتھ رہے تھے مولوی ایوب صاحب ڈیرہ غازی خاں میں اور ان کی زوجہ محترمہ پھوپھی منی انبہٹہ میں انتقال کر چکی ہیں۔ (اخلاق احمد)

صاحبہ کی اولاد ہوئی مگر آٹھ مہینے سے زیادہ کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔

حضرت کی نواسی عطیہ البتہ ۴ اگست ۱۹۰۹ء کو جو لڑکی پیدا ہوئی اور عطیہ نام رکھا گیا وہ بحمد اللہ زندہ اور مولوی مسعود علی راجپوری سلمہ کے نکاح میں آکر اس وقت دو بچوں کی ماں ہے[1]، حق تعالیٰ حضرت صاحبزادی صاحبہ کی عمر و صلاح میں برکت بخشے کہ اس وقت حضرت کا سلسلۃ الانساب انھیں سے چل رہا ہے[2] ورنہ حضرت کی باقی تمام اولاد حضرت کی حیات میں دنیا سے رخصت ہو چکی اور لاولد یا صاحبِ اولاد ہو کر مع اپنی اولاد کے سب یکے بعد دیگرے عالمِ آخرت کو سدھار چکے۔

صاحبزادہ حافظ محمد ابراہیم مرحوم والدۂ عطیہ چونکہ زیادہ تر نانی کے پاس رہیں اور بے ماں ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار ہوا اس لئے قرآن شریف پڑھنے کی نوبت نہیں آئی مگر صاحبِ اولاد ہونے کے بعد اس طرف توجہ کی اور قرآن شریف پڑھا۔ البتہ محمد ابراہیم چونکہ مردانہ تربیت میں تھے اس لئے اول قرآن شریف حفظ کیا اور اس کے بعد ان کو حضرت نے اپنے ساتھ لے لیا کہ بریلی و دیوبند کے قیام میں وہ حضرت کے ساتھ رہے اور عربی شروع کرا دی۔ ہر چند کہ حضرت نے بہت کوشش کی کہ تکمیل ہو جائے مگر مقدر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے حافظ ابراہیم کا دل پڑھنے سے اُچٹ گیا اور مشکوٰۃ شریف و شرح وقایہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

انبہٹہ میں انجینرنگ کالج آخر حاجی محمد اعلیٰ انبہٹوی[ع] نے جن کے قلب میں مسلمان بچوں کی بے علمی و بے ہنری کا ایک خاص درد تھا پنشن لینے کے بعد جب وطن میں نقشہ نویسی کا مدرسہ کھولا تو حافظ ابراہیم بھی اس میں داخل ہو گئے اور فارغ ہو کر فاضلکا میں اپنے بہنوئی مولوی محمد ایوب صاحب کی سعی سے ۳۰ مشاہرہ پر محکمۂ نہر میں ملازم ہو گئے اور چند روز بعد داروغۂ نہر ہو کر للغہ ماہوار پر فیروز پور چلے گئے۔ ان کی پہلی شادی مئی ۱۸۹۷ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ میں حضرت کے چچا زاد بھائی مولانا صدیق احمد صاحب کی صاحبزادی صفیہ خاتون[ع] سے ہوئی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تب دوسرا نکاح ۱۳۲۹ھ میں منشی محمد شفیع[س] صاحب

---

[1] پھر پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا اولاد ہی جواب بھی ہے تین لڑکیاں اور لڑکا صاحب اولاد ہو چکے ہیں۔ [2] ممکن ہے حق تعالیٰ کو اس سنت کا اتباع بخشنا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا سلسلہ بھی سب سے پہلی بیوی کی بیٹی سے چلا ہے اور باقی سے نہ چل سکا۔ (جمیل احمد)

[ع] انبہٹہ میں دو محمد اعلیٰ مشہور تھے ایک حاجی محمد اعلیٰ دوسرے منشی محمد اعلیٰ۔ منشی محمد اعلیٰ نے ہی نقشہ نویسی کا مدرسہ کھولا تھا اسی مدرسہ سے بہت سے مسلمان نوجوانوں نے فائدہ اٹھایا اس مدرسہ کی سند گورنمنٹ میں تسلیم کی جاتی تھی۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب اور میرے والد اشفاق احمد صاحب نے اسی مدرسہ میں فن نقشہ نویسی سیکھا تھا اور سب اوورسیر در درسری کے عہدوں پر برسرکار رہے تھے منشی صاحب مرحوم نے طویل عمر پائی آخر عمر میں زیادہ تر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ [ع] صفیہ خاتون کی زندگی میں حافظ کا دوسرا عقد ہوا تھا مگر رخصتی نہیں ہوئی اس عقد کے چھ ماہ بعد صفیہ ہیضہ سے انتقال کر گئیں اور ڈیڑھ سال بعد رخصتی ہوئی۔ [س] منشی محمد شفیع مرحوم شاہ زاہد حسین رئیس ہٹہ کے یہاں ملازم تھے جب منشی صاحب ضعیف ہو گئے تو شاہ صاحب نے ان کی پنشن مقرر کر دی تھی

(اخلاق احمد)

نانوتوی کی دختر سے ہوا۔ مگر اس عقد کے کچھ ہی مدت بعد صفیہ خاتون کا انتقال ہوگیا اور پھر چند ماہ بعد سنہ ۱۳۰۳ھ میں بعمر ۴۰ سال خود حافظ ابراہیم مرحوم نے دنیا کو الوداع کہہ دیا اور اس طرح پر حضرت کی نرینہ اولاد کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

اولاد پر شفقت

حضرت کو اپنی اولاد سے خاص شفقت تھی[1] خصوصاً لڑکی سے کہ ان کی ذرا ذرا بات کا خیال رکھتے تھے۔ وہ خود فرماتی ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میرے سر میں کیڑے پڑ گئے تھے اور میں کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی تھی۔ حضرت پیار چمکار کر مجھے اپنی گود میں لٹا لیا کرتے اور سر منڈواتے اور کیڑے نکالا کرتے تھے۔ کوئی دوسرا میرے سر کو ہاتھ لگاتا تو میں بے چین ہوجایا کرتی مگر حضرت جب اپنے ہاتھ سے نکالتے تو مجھے تکلیف نہ ہوتی بلکہ آرام ملا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ میرے کپڑے نہیں بنے، میں تنہا کوٹھے کے اندر جاکر پلنگ پر لیٹ رہی اور کہنے لگی (گمیاں آگئیں پاءے سب پھٹ گئے) گرمیاں آگئیں اور پاجامے سب پھٹ گئے۔ حضرت نے کہیں یہ لفظ سن پائے اور اسی وقت بازار جاکر کپڑا خریدا اور میرے کپڑے بنوائے۔

مرحومہ کے اعزہ سے تعلق

حضرت کو اپنی مرحومہ اہل کے انتقال کے بعد ان کے اعزہ کی دلدہی کا[2] بہت زیادہ خیال رہتا اور آپ جب گنگوہ حاضر ہوتے تو اپنی خوشدامن کی خدمت میں بھی ضرور جایا کرتے تھے۔ مولوی فاروق احمد صاحب[3] لکھتے ہیں کہ حضرت کی خوشدامن میرے والد مولانا صدیق احمد صاحب کی حقیقی خالہ تھیں مگر مجھے معلوم نہ تھا کیونکہ حضرت کی اہل کے انتقال پر میں پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ لڑکپن میں مجھے حضرت کے ساتھ گنگوہ جانے کا اتفاق ہوا تو حضرت اپنی خوشدامن کے پاس تشریف لے گئے۔ واپسی میں مجھ سے دریافت فرمایا میاں فاروق تمہاری دادی صاحبہ نے مجھ سے پردہ کیوں نہیں کیا؟ میں چپ ہو رہا تب حضرت نے فرمایا کہ ابراہیم کی والدہ ان کی بیٹی تھیں۔

اہلیہ ثانیہ سے اولاد

موجودہ اہل سے حضرت کی تین لڑکیاں ہوئیں جن میں چھوٹی لڑکی جس کا نام زبیدہ رکھا گیا تھا چار ہی سال کی عمر میں مبتلائے ہیضہ ہوکر دنیا سے رخصت ہوئی، ہاں دو لڑکیاں ام ہانی اور سلمیٰ جوان اور صاحب اولاد ہوئیں۔

ام ہانی کا انتقال

ام ہانی کا میاں محمد یامین سے عقد ہوا مگر کچھ ایسا نسوانی مرض لاحق ہوا کہ جو بچہ پیدا ہوتا وہ مردہ چوہے کی طرح ایسا پیدا ہوتا تھا گویا رحم مادر میں کسی نے شکنجہ میں کس دیا

---

[1] بچوں سے محبت اور شفقت سنت ہے اور پھر یہ امانت الٰہیہ ہیں جو تربیت کے واسطے دی گئی ہیں کوتاہی پر باز پرس ہوگی اولاد مملوک نہیں ہوتی خدائی امانت ہے۔ [2] یہ بھی اتباع سنت تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں ورشتے والیوں کا بہت خیال رکھا کرتے۔
[3] سابق شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بھاولپور۔ (جمیل احمد)

چند سال بعد شوہر دفعۃً مجنوں ہوگیا اور اس صابرہ عفیفہ لڑکی کو طرح طرح کی جسمانی و روحانی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ آخر اندر ہی اندر حزن و غم سے گھٹ کر دق ہوگئی اور ۲۶ رشعبان ۲۹ھ مطابق ۲۱ راگست ۱۱ء کو انبہٹہ میں انتقال ہوگیا۔

سلمٰی کا انتقال دوسری لڑکی سلمٰی کا عقد مولانا حافظ عبداللطیف صاحب[1] سے ہوا جو اس وقت حضرت کے قائم مقام ناظم مدرسہ مظاہر علوم ہیں مگر وہ بھی طرح طرح کے امراض کا شکار رہی اور آخر گلے میں انجیر نکلے جن کا یکے بعد دیگرے دو مرتبہ لدھیانہ لیجا کر اپریشن کرایا گیا مگر آخر اس کو بھی دق لاحق ہوئی اور چند ماہ کی ایک بچی خدیجہ نام چھوڑ کر وہ بڑی بہن سے پہلے ہی ربیع الثانی ۲۸ھ مطابق ۱۰ رجون ۱۰ء میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ تین مہینے بعد ۷ ار رجب ۲۸ھ کو معصومہ خدیجہ نے بھی ماں کا ساتھ دیا۔

اور اس طرح پر تین سال میں جوان اولاد کے متواتر تین صدمے حضرت کو لاحق ہوئے کہ سب سے پہلے سلمٰی نے بعمر بائیس سال انتقال کیا اور اگلے سال ام ہانی رخصت ہو کر انبہٹہ میں مدفون ہوئی اور تیسرے سال سب سے بڑے اور اکلوتے لڑکے حافظ ابراہیم مرحوم نے سہارنپور کے گورستان کو اپنا مدفن بنایا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

روحانی اولاد اس صلہ میں کہ آپ کی نسبی اولاد دنیا سے اٹھی حق تعالیٰ نے آپ کی روحانی اولاد کو بیش از بیش بنا دیا کہ آپ کا روحانی علمی و عملی فیضان اور شریعت و طریقت کے مستفیدین تلامذہ و مریدین ہزارہا کی تعداد میں شرقاً و غرباً پھیلے جو آپ کے مبارک نام اور آپ کی پاکیزہ مرشدانہ سوانح کو قیامت تک یاد رکھیں گے ؎

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو یہ ہی کہ دو پشت چار پشت

---

[1] مولانا حافظ عبداللطیف صاحب مولانا جمعیت علی صاحب پروفیسر بہاولپور کالج کے فرزند اور مولانا ثابت علی صاحب مدرس مظاہر علوم کے بھتیجے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت اور حسن سیرت سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ حضرت نے دامادی سے نوازا، ہمیشہ مدرسہ کی علمی اور انتظامی خدمات میں حضرتؒ کے دست راست رہے۔ اپنے دور نظامت میں حافظ صاحبؒ نے مدرسہ کو نمایاں ترقی دی۔ پور قاضی ضلع مظفر نگر آپ کا وطن تھا ـــــ میں وفات پائی۔

(اخلاق احمد)

سفرِ حج وزیارتِ بلدۃ الرسولؐ

ملازمتِ بھوپال

۱۲۹۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ باجازت امام ربانی مدرس ہوکر بھوپال تشریف لے گئے جس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ مولانا جمال الدین مدار المہام شوہر والیہ ریاست سکندر جہاں بیگم حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے اور چاہتے تھے کہ استاد زادہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو تین سو روپیہ ماہوار پر ریاست میں بلاکر حق خادمیت ادا کریں۔ مگر مولانا مرحوم اس وقت اکابرِ ملت کی تجویز سے دار العلوم دیوبند میں ۳۰ روپے ماہوار پر مدرس اول ہوچکے اور اجمیر کی یکصد روپیہ ماہوار کی ملازمت اور بریلی کی انسپکٹری مدارس کو خیر باد کہہ کر اس فقیرانہ مخلصانہ درسگاہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف فرماچکے تھے اس لئے آپ نے بھوپال جانے سے انکار کردیا اور مولوی جمال الدین صاحب کو لکھا الا حاجۃ فی نفس یعقوب الا تضاھا[1] یعقوب کی دلی حاجت جو کچھ تھی وہ پوری ہوچکی کہ بقدرِ ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہوگئی لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں۔

مدار المہام جب آنحضرت کی طرف سے مایوس ہوئے تو اسی پر اکتفا کیا کہ اپنی تجویز سے کسی ہونہار عالم کو بھیجدیں۔ مولانا انوار احمد صاحب کا بیان ہے کہ غالباً حضرت کے بھوپال جانے کی یہی تقریب ہوئی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنے بھانجے کا انتخاب فرمایا اور حضرت قدس سرہٗ نے اپنے مرشد و مربی روحانی حضرت امام ربانی سے اجازت لے کر ۵۰ روپے ماہوار پر بھوپال کا سفر اختیار کیا۔

ہر چند کہ آپ کا قیام اور خورونوش کا انتظام مدار المہام کی کوٹھی میں تھا جس کا نام موتی محل تھا مگر آپ کو اُن اضلاع کا چھوڑنا جن میں انوار و تجلیات کی موسلا دھار بارش برستی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے تھے بہت ہی شاق ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی آب وہوا نے ناموافقت کی کہ صحت درست نہ رہی اس لئے آپ گھبرائے اور حضرتؒ سے اجازت چاہی کہ مستعفی ہوکر وطن آجاویں۔ ادھر حضرت امام ربانی کو بھی دل سے پسند نہ تھا کہ اپنے خواص کو اپنے سے اتنا دور رکھیں کہ ایک بار آنے میں چار دن کا وقت اور چالیس روپیہ کا خرچ ہو اس لئے فوراً یہ جواب لکھا۔

---

[1] یہ آیت نہیں ہے آیت کی طرف بعض لفظوں سے اشارہ ہے آیت یوں ہے الاحاجۃ فی نفس یعقوب قضاھا کہ بیٹوں کا متفرق دروازوں سے داخل ہونا اللہ سے کچھ درجہ میں بھی بے پروا نہیں کرسکتا تھا سوائے ایک حاجت کے جو یعقوب علیہ السلام کے دل میں تھی اسے پورا کردیا۔ (جمیل احمد)

مکتوب حضرت گنگوہیؒ برادرم مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہم بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آج خط آیا حال معلوم ہوا۔ درصورتیکہ ہوا وہاں کی آپ کو موافق نہیں تو ترک وہاں کا ضروری ہے کہ اس جگہ کا کہ ہوا ناموافق ہو ترک کرنا بحکم حدیث ثابت ہے۔ مگر چونکہ معاش کا قصہ نازک ہے لہذا جب تک دوسری جگہ سامان نہ ہو جائے ترک مناسب نہیں۔ اس واسطے چندے قیام وہاں کا مناسب ہے۔ مرادآباد میں آپ کی طلب بہت رہی۔ اب وہاں مولوی عبدالحق پوری آگئے ہیں مگر جیسا چاہئے ویسا کام ان سے نہیں ہوتا۔ اگر مناسب ہوا وہاں یا دوسری جگہ کہ تدبیر اس کی کرتا ہوں تجویز ہو کر مطلع کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ فقط ۱۸ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ روز جمعہ۔

پہلا سفر حج ۱۲۹۳ھ اس حکم کی تعمیل میں حضرت قدس سرہٗ بھوپال میں ٹھیرے رہے حتیٰ کہ موسم حج آیا اور بماہِ شوال آپ کو اپنے نواحِ وطن سے کچھ لوگوں کے ارادۂ سفرِ حج کی اطلاع ملی۔ ہر چند کہ آپ غیر مستطیع تھے اور آپ پر حج فرض نہ تھا لیکن صفائیش دل میں زیارتِ بیت اللہ و بیت الرسول کا فطری طور پر شوق رکھتے تھے اور مشتاقانِ سفرِ عرب کی خبر سُن کر اس میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اس لئے آپ کے قلب میں اس کا داعیہ ہوا کہ کاش امسال مجھے بھی حج نصیب ہو اور کسی طرح میں بھی حرمین شریفین کی حاضری سے بہرہ یاب ہو جاؤں۔ چنانچہ آپ نے اول اپنے آقائے روحانی کو لکھا اور پھر دنیوی آقا کی خدمت میں درخواست دی کہ دارالاقبال ریاست بھوپال کا طریقِ عمل یہ ہے کہ جو ملازم حج کو جائے اس کو رخصت بلا وضع اور ان چند ماہ سفر کی تنخواہ پیشگی دیدی جاتی ہے لہذا آپ بھی عنایت فرماویں تاکہ میں حج کر آؤں"۔

چونکہ آپ کی ملازمت سرکاری ملازمت نہ تھی اس لئے رئیس نے قانون ریاست کا تحمل تو نہ کیا مگر کچھ تنخواہ پیشگی دے کر رخصت منظور کر لی۔ آپ ناکافی روپیہ لیکر وطن آئے مگر حصولِ رخصت میں دیر ہوئی تو آکر دیکھا کہ جانے والے حجاج جا چکے اور اب آپ تنہا ہیں کہ سفر کرنا چاہیں تو اکیلے جائیں۔ تنہائی و ناتجربہ کاری اور طوالتِ سفر آپ کو پریشان ضرور کرتی تھی مگر آپ کا شوق اور آپ کا توکل آپ کے قدم کو آگے بڑھا رہا تھا اس لئے آپ نے ہمت نہ ہاری اور آپ اپنے مرشد اور والدین سے اجازت لے کر دو سالہ لڑکے اور اہلیہ بچی کو اللہ کے سپرد کر کے وطن سے تنہا روانہ ہو گئے۔

بمبئی پہنچکر آپ کو معلوم ہوا کہ تمامی احباب پہلے جہاز میں سوار ہو چکے اور اب بحری سفر بھی تنہا کرنا پڑے گا۔ اس پر بھی آپ ہراساں نہ ہوئے اور جانے والے جہاز کا ٹکٹ خرید کر سوار ہو گئے۔

بحری جہاز کا سفر اپنے اس سفر کا ایک بار آپ نے خود تذکرہ فرمایا کہ جہاز بندر سے چلا تو مجھے دورانِ سر شروع ہوا اور پورے تین دن چکر اور قے میں گذر گئے کہ کھانے کی خواہش بھی نہ ہوئی مگر چوتھے دن جب ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو بھوک معلوم ہوئی اور میں نے ایک دیگچی میں مونگ کی کھچڑی نکال کر پکنے کے لئے چولھے پر رکھی۔ پکانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، دیکھا تو پانی اوپر آگیا اور دال گل گئی مگر چاول جوں کے توں، نمک اس قدر تیز کہ منھ تک نہ لی جائی جا سکے، خاموش ہو کر اپنی جگہ آبیٹھا اور دیگچی کو ایک طرف رکھ دیا۔

بھوپال کے قریب کے ایک نواب صاحب بھی اسی جہاز میں حج کو جارہے تھے (جن کا نام آپ نے لیا مگر مجھے یاد نہیں رہا) میری عمر کا اس وقت چوبیسواں[۲۴] سال اور شباب کا زمانہ تھا اتفاق سے ان کا اس طرف گذر ہوا اور مجھ پر نظر پڑی تو پوچھنے لگے صاحبزادے تمہارے ساتھ کون ہے؟ میں نے برجستہ جواب دیا کہ اللہ۔ یہ سن کر وہ خاموش چلے گئے اور اپنی جگہ پہنچ کر مجھے بلایا۔ میں گیا تو انھوں نے میری دعوت کی اور فرمایا کہ صاحبزادے تم کھانا ہمارے ہی ساتھ کھایا کرو۔ میں نے کہا کہ یوں تو کھاتے ہوئے شرم آتی ہے ہاں کوئی خدمت مجھ سے لیجئے تو انکار نہیں۔ وہ ذرا سوچے اور پھر مجھ سے پوچھا کہ تم کو لکھنا آتا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں آتا ہے اور لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا میرا خط دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور کسی کتاب کا مسودہ ان کے ساتھ تھا اس کو خوشخط نقل کرنے کے لئے میرے حوالہ کر دیا۔ میں نے روزانہ کی کارگذاری صفحات کی تعداد میں مقرر[۱] کر لی اور کھانا ان کے ساتھ کھانے لگا۔ خالی بیٹھنے کا مشغلہ بھی مجھے ہاتھ آگیا اور پکانے کی مصیبت سے بھی نجات مل گئی۔

چند روز بعد جدہ کا بندر نظر آیا اور میں نے نواب صاحب سے کہا کہ یہاں کشتیوں کے ملاح اسباب کی چھین جھپٹ میں بہت پریشان کرتے ہیں اور اسباب ضائع ہو جاتا ہے لہذا یہاں کا انتظام میرے سپرد کر دیجئے۔ چنانچہ اول میں نے سارے اسباب کو یکجا کرایا اور ملازمین کو اس کے چار طرف کھڑا کر دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیں۔ میں نے اپنا مختصر سامان بھی اسی میں شامل کر دیا اور چونکہ مجھے عربی آتی تھی اس لئے ملاحوں کے جہاز پر حملہ کرتے وقت میں نے علیحدہ جا کر ایک ملاح سے عربی میں باتیں کر کے پوری کشتی کا کرایہ طے کر لیا اور اس کو اسباب دکھا کر ملازمین سے جو اسباب کا احاطہ کئے کھڑے تھے کہدیا کہ عدد شمار کر کر کے اس کو دیدو اور اس کے علاوہ کسی کو پاس نہ آنے دو۔ چنانچہ اول سارا اسباب بحفاظت تمام کشتی میں پہنچ گیا اور پھر ہم سب اطمینان سے جہاز سے اُتر کر اسی کشتی میں آبیٹھے۔

---

[۱] کہ جب تک وقت یا کام مقرر نہ ہو معاملہ صحیح نہیں ہوتا۔ (جمیل احمد)

نواب صاحب میرے حسن انتظام پر بہت مسرور اور ممنون ہوئے کیونکہ دوسرے حجاج کی پریشانیاں اور نقصان دیکھ رہے تھے کہ چار طرف گمشدگی اسباب کا شور مچ رہا تھا مسافر بلبلا رہے ہیں۔ جدہ شہر میں داخل ہو کر میں نے اصل مسودہ اور اس کی خوشخط نقل نواب صاحب کو پیش کر کے اجازت چاہی کہ مجھے آزاد فرما دیں ہر چند نواب صاحب نے اصرار کیا کہ میں تم کو تا واپسی وطن علیحدہ نہیں کر سکتا مگر میں نے کہا کہ یہاں میں نوکری کے لئے نہیں آیا، اللہ کے گھر حاضر ہو کر بھی بندگانِ خدا کا غلام بنا رہا تو حاضری کا لطف ہی کیا ملا۔ چونکہ دروازہ پر پہنچ لیا ہوں اس لئے اب تو کوئی صورت ہی نہیں کہ تعمیل ارشاد کر سکوں۔

غرض نواب صاحب سے رخصت ہو کر اونٹ پر تنہا سوار ہو کر چل دیا اور مکہ مکرمہ میں تو گویا میرا گھر تھا کہ اعلیحضرت حاجی صاحب تشریف رکھتے تھے اس لئے سیدھا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور دونوں وقت پکی پکائی کھانے لگا۔ سارا وقت حرم شریف میں اعلیحضرت کے پاس گذارتا اور اطمینان کے ساتھ طواف اور نماز میں مشغول رہتا۔

مدینۃ الرسول کی کشش

حج سے فارغ ہو کر قافلہ کے مدینہ منورہ چلنے کا وقت آیا اور چار طرف یہ افواہ پھیلی کہ راستہ مامون نہیں اور جان و مال ہر قسم کا خطرہ ہے تو اعلیحضرت حاجی صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ "مولوی خلیل احمد کہو کیا ارادہ ہے، سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستہ میں امن نہیں ہے اور اس لئے حجاج بکثرت واپس وطن جا رہے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا قصد تو مدینہ طیبہ کا پختہ ہے کہ موت کے لئے جو وقت مقرر و مقدر ہو چکا وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا اور اس راستے میں آجائے تو زہے نصیب کہ مسلمان ہوا اور چاہئے کیا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے یہاں تک پہنچا دیا۔ اب اگر موت کے ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑوں تو مجھ سے زیادہ بدنصیب کون۔"

یہ سن کر اعلیحضرت کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا اور فرمایا بس بس۔ تمہارے لئے یہی رائے ہے کہ ضرور جاؤ اور انشاء اللہ تعالیٰ پہنچو گے۔" چنانچہ میں حضرت سے رخصت ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہوا اور جس طمانیت و راحت کے ساتھ پہنچا وہ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ تقریباً دو ہفتہ حاضر آستانہ رہا اور پھر بخیریت تمام وطن پہنچ کر حضرت امام ربانی کا قدمبوس ہوا۔

مدرسہ اسلامیہ سکندرآباد میں تقرر

سفر حج سے واپس آکر حضرت نے بھوپال کا ارادہ نہیں کیا کہ وہاں کی آب و ہوا ناموافق تھی اور مرشد سے بُعد جسمانی بھی زیادہ تھا۔ لہذا چند روز وطن میں رہ کر آپ بماہ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ سکندرآباد ضلع بلند شہر کے مدرسہ اسلامیہ واقع جامع مسجد میں مدرس ہو کر چلے گئے مگر وہاں بعض بدعتین مخالف اور برسرِ پرخاش ہو گئے جس کی اطلاع آپ نے حضرت

امام ربانی کو دی اور ترکِ تعلق کا قصد کیا مگر حضرت نے آپ کو روکا اور یہ خط بھیجا۔

مکتوب حضرت گنگوہی رح مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے نامہ نے ورود کیا حال معلوم ہوا۔ قصۂ جدید سے کچھ آپ وحشت نہ کریں۔ عالم میں مخالف و موافق دونوں ہوتے ہیں آپ اپنا کام کئے جاویں۔ اگر مخالف برسر پرخاش ہیں موافق برسر نگہداشت ہیں، جب تک ہو اپنی طرف سے ترک مت کرو۔ ہدیہ اطفال کا اور ہدیہ ورثہ اطفال کا لینا جائز ہے کچھ اندیشہ نہیں۔ پہلے خط میں لکھنا سہو ہوا تھا فقط۔ مگر اس شکایت کی رفع اور تکذیب میر قادر علی سے اگر مناسب ہو کسی کی زبانی کرادیجو گو نافع نہ ہو۔ اپنی طرف سے سب کو راضی رکھنا بہتر ہے شاید کچھ نافع ہوجائے: قال اللہ تعالیٰ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ الخ مگر اس فرقہ کا راضی ہونا متوقع نہیں خصوصاً جب واعظ اُن کے ترغیب دینے والے دورہ کرتے ہوں۔ فقط والسلام۔ روز جمعہ ۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۲۹۴ھ (۲۹ر جون ۱۸۷۷ء)

آپ نے تعمیل حکم شیخ میں ارادۂ واپسی فسخ کیا اور رفق و نرمی کا برتاؤ فرماکر تدریس میں مشغول رہے مگر اہلِ سکندرآباد کے لئے آپ کے فیوض سے مستفید ہونا مقدر نہ تھا اس لئے ایسی صورتیں پیش آئیں کہ آپ وہاں نہ رہ سکے اور آخر باجازت امام ربانی آپ وہاں سے مستعفی ہوکر وطن چلے آئے۔

جماعتِ اہل اللہ کا سفرِ حج ۱۲۹۴ھ بماہِ شوال بزرگانِ ہندوستان کے اس قافلہ نے بیت اللہ کا قصد کیا جس کی نظیر نہ گذشتہ زمانہ میں نظر آئی نہ آئندہ نظر آنے کی توقع کہ فلکِ ہدایت کے نیرین حضرت امامِ ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما سالارِ قافلہ ہوئے اور صدہا مسلمان جنھوں نے بھی اس مقدس قافلہ کی اطلاع پائی ساتھ ہوگئے۔ حضرت کے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب اور آپ کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول و مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسۂ دیوبند و مولانا محمود حسن صاحب بھی ہمراہ ہوئے اور گویا ہندوستان اہل اللہ سے خالی ہوگیا۔ ہرچند کہ حضرت بھی تڑپے کہ حزب اللہ کی ہمرکابی نصیب ہو مگر آپ کو سفر حج سے واپس ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے اور زادِ راہ کا انتظام نہ ہوسکنے کی وجہ سے حضرت امام ربانی نے آپ کو اجازت نہ دی تھی۔ اس لئے آپ راضی برضا ہوکر بیٹھ رہے اور یہ سال آپ کا بحالتِ حزنِ مفارقت شیوخ وطن ہی میں گذرا کہ آپ کہیں ملازمت پر نہ جاسکے۔

---

۱ حق تعالیٰ۔ ۲ کہ وہ بھی والدین کا ہی ہوتا ہے واسطہ بچے بن جاتے ہیں۔ ۳ تو اللہ ہی کی رحمت کی وجہ سے تم ان کیلئے نرم ہوگئے ہو۔ ۴ ان کی رضامندی مقصود نہیں طریقہ صحیحہ مقصود ہے۔ ۵ حق تعالیٰ کی مرضی پر راضی ہوکر کہ ان کی مرضی ہوتی تو سامان جیسا ہوجاتا جب نہیں ہوا تو مرضی بھی نہیں ہوئی۔ (جمیل احمد)

ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں یہ حضرات واپس ہندوستان آئے اور وہ انوار وتجلیات جن کے سمندر پار جانے سے ہندوستان میں اندھیرا چھا گیا تھا دوبارہ نظر آئیں اور ضلع سہارنپور گویا از سر نو آباد ہوا۔

دوبارہ ملازمت بھاولپور مولوی شمس الدین صاحب چیف جج بھاولپور نے دیوبند حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک قابل مدرس کی طلب کے متعلق درخواست بھیجی جس میں بہت کچھ اوصاف کی قید تھی کہ نوجوان ہو، نہایت ذکی ہو، ہر فن میں متبحر اور وجیہ ہو، خلیق و منتظم ہو کہ طلبہ کا اتالیق بن سکے، اپنے علم پر عامل اور مجسم صلاح ہو کہ صورت سے نیک روی کا سبق لیا جاسکے وغیرہ وغیرہ مگر چونکہ حضرت مخدوم سفر حج میں تشریف لے گئے تھے اس لئے جب ۹۵ھ میں واپس تشریف لاکر مدرسہ کا کام سنبھالا تو اس درخواست کو بھی دیکھا اور حضرت کو تجویز فرمایا کہ بھاولپور تشریف لے جاویں۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عذر بھی کیا کہ جن شرائط کا مدرس ان کو درکار ہے مجھ میں مطلقاً نہیں پائی جاتیں۔ مگر حضرت مولانا نے فرمایا میاں رہنے بھی دو لکھنے والے یوں ہی لکھا کرتے ہیں اور اہل علم اپنے کو یوں ہی سمجھا کرتے ہیں۔ تم کو اپنی ناقابلیتی یہیں نظر آتی ہے کہ سر پر بڑے موجود ہیں۔ باہر جاکر دیکھو گے تو اتنا بھی کسی کو نہ پاؤ گے۔ اس وحشت کو دور کرو اور اللہ کا نام لیکر چلے جاؤ۔ بالآخر حضرت مولانا اور حضرت امام ربانی کی رائے متفق ہوگئی اور میں ۳۰ روپیہ ماہوار پر مدرس ہوکر بھاولپور چلا گیا۔

حضرت کا دوسرا حج ۱۲۹۷ھ اخیر سال ۵ ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کو آپ کی اہلیہ کا بمرض احتباس انتقال ہوا اور آپ بھاولپور سے وطن آئے مگر چند روز قیام فرماکر بچوں کی تربیت کا انتظام کرکے واپس تشریف لے گئے۔ اسی قیام بھاولپور میں آپ کو دوسرے حج کا اتفاق ہوا جس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ مولوی شمس الدین صاحب نے حج کا ارادہ فرمایا اور اپنے ساتھ آپ کو بھی لیجانا چاہا کہ ان کے بچوں کی تعلیم آپ کے متعلق تھی اور آپ کا قیام بھی انہیں کے مکان پر تھا جس کی وجہ سے اُن کو آپ کے ساتھ ایک خاص اُنسیت تھی اور آپ سے بہتر رفیق جو باقاعدہ ادائے مناسک کرادے دوسرا مل بھی نہیں سکتا تھا۔

اِدھر آپ کے کانوں میں یہ خبر پہنچی کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور مولانا محمد یعقوب صاحب امسال پھر حج کا ارادہ فرمارہے ہیں چونکہ پہلے سفر میں حرمانِ ہمرکابی کا قلق آپ کے دل پر تھا اس لئے آپ کو مولوی شمس الدین صاحب کی یہ درخواست نعمتِ الٰہیہ معلوم ہوئی اور آپ نے اپنا شوق اور مفصل حال امام ربانی کو لکھ کر حکم قطعی طلب کیا جس کے جواب میں حضرت کا بماہِ شعبان ۱۲۹۶ھ یہ خط پہنچا۔

مکتوب حضرت گنگوہیؒ

عنایت فرمائم مولوی خلیل احمد صاحب دام فیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا۔ سر میں چونکہ ضعف بہت ہو گیا ہے لہٰذا وہ کیفیت بھی کم[1] میں کمی پذیر ہے کہ اب دس بجے سے بارہ بجے تک رہتی ہے۔ بہرحال اب مرض قریب ازالہ کے ہے مطمئن رہیں۔ مولوی شمس الدین کے حال و مزاج پر جو آپ کو طمانیت ہے اور بظن غالب وہ ایسے ہی ہیں تو ان کے ساتھ جانے میں کیا اندیشہ ہے۔ بندہ کی رائے ہے کہ آپ قصد فرماویں۔ مگر تاہم کچھ استقدار خرچ اپنے پاس رہنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ کوئی صورت دیگر پیش آجاوے تو احتیاج نہ پڑے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کفیل حجاج فوت ہو گیا یا مزاج کی مخالفت پیش آئی جس سے افتراق ہوا تو ایسی صورت میں بہت پریشانی ہوتی ہے اور یہ سب تدبیر ظاہر ہے کہ جس کا استعمال ممنوع[2] نہیں ورنہ ہوتا وہی ہے جو رضاء تعالیٰ شانہٗ ہے۔ اب بندہ کا حال سنو کہ فرض[3] نہیں کہ خواہ مخواہ بے کلی ہووے۔ ہاں بھلے کام کی دل میں خواہش ہے لیکن ضعفِ جسم سے ضعفِ ہمت بھی ہے اسواسطے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر اس وقت پر ہمت ہو جاوے اور ساماں بھی مقدر ہووے تو کیا عجب ہے ورنہ کچھ صورت نہیں۔ لہٰذا اس وقت تک عزم نہیں۔ غلط افواہ مشہور ہے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب کا عزم مجھ کو معلوم نہیں۔ ہاں تمہاری والدہ و ہمشیرہ اور اہلیہ مولوی صاحب مرحوم سنا ہے کہ جزماً عازم ہیں۔ نقصان مالی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو اور بہت کچھ دیوے گا مگر سارق کو برا نہ کہا جاوے تو بہتر ہے کہ پورا اجر ملے۔

مکتوب حضرت گنگوہیؒ بنام نذیر احمد

مولوی نذیر احمد[4] صاحب۔ السلام علیکم۔ جو کلمات کہ اندازہ سے بڑھ جاویں اس کا کہنا اور لکھنا گو تمہاری عقیدت سے ہو مگر مجھ کو موجب ندامت کا ہوتا ہے۔ مولوی خلیل احمد کو بھی القاب اعلیٰ لکھنے سے چند بار منع کیا ہے۔ بہتر کلمات تو وہ ہیں جو اپنی قدر کے موافق ہوویں۔ مشہور یہاں یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد اپنی والدہ کے ساتھ حج کو جاویں گے مولوی محمد یعقوب صاحب کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ یکم شعبان یہاں بھی بروز شنبہ ہی قرار پائی۔ یہاں بارش بکثرت ہے۔ فقط

رشید احمد

---

[1] کمیت و مقدار۔ [2] نہ توکل کے خلاف ہے کہ ذرائع کے بعد توکل رہتا ہے اور محض احتیاط ہے بدگمانی نہیں کہ منع ہو۔ [3] حج اب فرض نہیں پہلے ادا ہو چکا۔ (جمیل احمد)

[4] مولوی نذیر احمد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے منجھلے بھائی تھے میں نے اپنی دادی مرحومہ سے سنا ہے کہ وہ بہت حسین اور خوشخطی کے ماہر تھے میں نے اپنی بڑی ہمشیرہ سے سنا ہے کہ موصوف بنیتِ ہجرت مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں انتقال فرمایا اس کے بعد ان کی بیوی دادی امۃ الرحیم وطن واپس آگئیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی صرف ایک بیٹی تھیں جن کا نام فاطمہ تھا تقسیم کے بعد کراچی میں اپنی چھوٹی لڑکی حمیدہ اور داماد عزیز الحق کے پاس رہتی تھیں وہیں انتقال فرمایا۔ (اخلاق احمد)

اس والانامہ سے آپ کو امید بندھی کہ والدہ وہمشیرہ اوران کے ساتھ محرم بن کر آپ کے بھائی مولوی نذیر احمد ضرور جائیں گے اور امام ربانی کی تشریف بری بھی متوقع ہے اور غیب سے سامان ہوا کہ مولوی شمس الدین تمام اخراجات کے کفیل ہورہے ہیں لہذا آپ نے سفر بیت اللہ کا قصد کرلیا اور اپنی جگہ امام ربانی کے بھانجے مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کو تجویز کرکے ان کو بھی بلالیا اور اس تمنا وشوق کے پے درپے عرائض بھیجنے لگے کہ کاش حضرت کا عزم پختہ ہوجائے اور ہمرکابی نصیب ہو مگر افسوس کہ آپ کے لئے حج مقدر تھا لیکن شیخ کی معیتِ سفر اب بھی مقدر نہ تھی کہ حضرت نے اپنے فسخ عزم کی عین اس وقت جبکہ سارا سامانِ سفر درست ہوگیا اس طرح اطلاع دی۔

مکتوب حضرت گنگوہی مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کے خطوط نتری[۱] پہنچے اور آخر خط سے مع الخیر پہنچنا عزیزم مولوی الطاف الرحمٰن کا بھی معلوم ہوا۔ یہاں ہر طرح خیریت ہے اور اپنا حال بھی بدستور ہے۔

اگرچہ پہلے عزم سفر میں تردد شک کے درجہ کا تھا مگر اب اپنی کیفیت غالبہ[۲] پر غلبہ عدم سفر کا معلوم ہوتا ہے۔ تجربہ یوں معلوم ہوا کہ اگر دوپہر کو قیلولہ نہ ہووے تو کلفت رہتی ہے۔ اگر غذائے ناموافق کا اتفاق ہوتا ہے تو اگلے روز تک اس کا اثر رہتا ہے اور جو شب کو جاگنا ہوجاتا ہے تو درد سر ہونے لگتا ہے۔ ایسا ہی تھوڑے سے تغیر میں طبع متغیر ومکدر ہوجاتی ہے۔ سوایسی حالت میں صعوبتِ سفر کا تحمل بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اب غالب عدم حضور خدمت حضرت مرشدنا فہم میں آرہا ہے۔ ادھر سب دوست خیر خواہ مشورۂ اقامت دے رہے ہیں شیخ عبد العزیز خاں ہنوز مریض ہیں ان میں بھی ہمتِ سفر نہ رہی تو بہر حال اب اپنا فسخ عزم ظاہر کرکے اسقدر لکھتا ہوں کہ بدعا خیر مجھ کو بھی یاد کرنا مواقع اجابت میں اگر یاد آجاؤں اور حضرت مرشدنا سے جو جو کیفیات مشہور ومسموع تم کو ہوئیں بیان کرکے عذر حاضر نہ ہونے کا کردینا۔ اگر زندگی رہی تو سال آئندہ دیکھئے کیا پیش آوے، مقدر سے سب مجبور ہیں، تدبیر کی کیا پیش رفت[۳] ہوتی ہے۔ فقط والسلام۔ مولوی الطاف الرحمٰن کو سلام وتحیات پہنچے۔ مولوی شمس الدین صاحب کو بھی سلام علیک فرماویں۔

رخصت کی منظوری چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۸۰ء مطابق ۲۵ شوال ۱۲۹۷ھ سے آپ کی رخصت سفر حج محسوب ہوئی اور مولوی الطاف الرحمٰن صاحب نے آپ کی جگہ کام کیا مگر مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کو حضرت امام ربانی کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ وہ اس مفارقتِ بعیدہ کو گوارہ نہ کرسکے اور ایک مہینہ بمشکل نباہ کر گنگوہ چلے آئے۔ اس وقت امام ربانی نے مولانا انوار احمد صاحب انبہٹوی کو ان کی جگہ بھاولپور

---

[۱] پے درپے [۲] جو غالب آرہی ہے۔ [۳] آگے چلتی ہے۔ (جمیل احمد)

بھیجدیا حتی کہ پانچ ماہ بعد مارچ ۱۸۸۱ء میں حضرت عرب سے واپس بہاولپور اپنی جگہ تشریف لائے اور مولوی انوار احمد صاحب کو وطن رخصت کیا۔

مبارک سفر یہی وہ مبارک سفر ہے جس میں اعلیحضرت[1] قدس سرہٗ کا خلافت نامہ آپ کو ملا اور عمامہ مطہرہ فرقِ اقدس پر رکھا گیا کہ ہر دو عطیہ آپ نے اپنے مرشد مطلع کے سامنے رکھدیئے اور پھر جب وہ حضرت کی طرف سے عطا قرار پائے تو ان کو سر آنکھوں پر رکھ لیا۔

قیامِ بہاولپور اور مناظرہ

مولوی شمس الدین صاحب چیف جج بہاولپور ایک علم دوست اور دینیات سے مناسبت رکھنے والے شخص تھے جو اپنے بچوں کو علوم دینیہ کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ چونکہ وسیع النظر اور سمجھدار شخص تھے اس لئے قابل معلم کی طلب میں دار العلوم دیوبند کی طرف رجوع کیا کیونکہ سمجھتے تھے کہ دعوے کرنے والے ہر جگہ مل سکتے ہیں مگر کام کرنے والا عالم و معلم بجز ضلع سہارنپور کے اور کہیں ملنا دشوار ہے چنانچہ حضرت قدس سرہٗ ۱۲۹۹ھ میں بہاولپور روانہ ہوئے اور جج صاحب کے مکان پر پہنچ کر ابھی اسباب بھی ٹھکانے سے نہ رکھا تھا کہ جج صاحب سے ملاقات کی اور انھوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمانے اور آپ کی ذکاوت جانچنے کے لئے علمی سوالات شروع کر دیئے۔

حضرتؒ نے ایک بار خود فرمایا کہ سوالات تفسیر اور قرآن کے متعلق تھے چنانچہ میں جواب دیتا رہا مگر جب میں نے دیکھا کہ سوالات سے کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوٹتا تو میں نے بھی دو آیتیں قرآن مجید کی پیش کیں کہ ان کا باہمی تعارض رفع ہونے کی کیا صورت ہے؟ بس میرا سوال کرنا تھا کہ جج صاحب نے پہلو بدلا اور علمی سوالات چھوڑ کر میرے حالات دریافت کرنے لگے اور اس کے بعد مجھے قیام کی جگہ بتا کر ساری ضروریات کا انتظام کر دیا۔ میں ان کے بچوں کو پڑھاتا رہا مگر ریاست کے ایسے ہی قصے ہوتے ہیں کچھ دنوں بعد مولوی شمس الدین صاحب برخاست ہو گئے اور میری تنخواہ عـ۲ کر دی۔ پردیس میں اتنی قلیل تنخواہ پر رہنا بھی مشکل تھا مگر مروّت تقاضا بھی نہ کرتی تھی کہ زیادہ کا مطالبہ کروں یا کمی پر چھوڑ کر چلا آؤں۔

---

[1] حضرت حاجی صاحب۔ [2] مانگ یعنی سر۔ (جمیل احمد)

نواب بھاولپور کی والدہ کا انتقال اور مدرسہ عربیہ کا قیام

اتفاق سے فرمانروائے بھاولپور نواب صادق محمد خاں صاحب عباسی چہارم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے ایصالِ ثواب کی غرض سے چند مدارس دینیہ ریاست کی طرف سے جاری کئے گئے جن میں ایک مدرسہ خاص بھاولپور میں[1] کھولا گیا اور باقی مدارس ڈیرہ اور چاچڑان چشتیاں اور احمد پور وغیرہ میں۔ بھاولپور کے مدرسہ کے لئے کوئی عمارت مقرر نہ تھی اس لئے مولوی محمد حسن صاحب وزیر ریاست نے اس مدرسہ کے لئے مولوی شمس الدین صاحب کا مکان ہی تجویز کر کے میرا تقرر ۲۰ مشاہرہ پر کر دیا کہ مدرسہ کے ساتھ جج صاحب کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہے اور اُن کے ۱۰ ملا کر میری تنخواہ کے ۳۰ پورے ہو جائیں مگر چند ماہ بعد جج صاحب ۱۰ ماہوار بھی نہ دے سکے اور اس وقت وزیر صاحب نے کہ مجھ پر خاص نظر رکھتے تھے میری تنخواہ مدرسہ سے ۳۰ کر دی۔

۱۸۷۹ء سے بھاولپور میں ملازمت کا آغاز

آخر ۱۸۷۹ء میں نواب صادق محمد خاں صاحب کو اختیارات حکمرانی عطا ہوئے اور اس موقع پر دربار مسند نشینی کی یادگار میں لاٹ صاحب کے نام پر جنھوں نے بھاولپور آکر فرمانروا کے اختیارات کا اعلان کیا صادق ایجرٹن سکول کھولا گیا اور اس سکول کے متعلق شعبۂ دینیات قائم رہا کہ یہ مدارس ایصالِ ثواب بھی اسی کے ماتحت بنا دیئے گئے اور اس طرح یہ ان مدارس کا زمام نظم ریاست کے سر رشتۂ تعلیم کے ہاتھ میں چلا گیا چنانچہ اس وقت سے حضرت کا تعلقِ ملازمت باقاعدہ ریاست سے متعلق ہوا۔

افسر مدارس کے عہدہ تک ترقی اور گیارہ سال بعد بھاولپور سے ترکِ تعلق

اور اول آپ ۳۰ ماہوار پر صدر مدرس دینیات رہے اس کے بعد جون ۱۸۸۱ء میں ترقی ہوئی اور ۵۰ ماہوار پر افسر مدارس دینیات مقرر ہو گئے پھر اسی کے فرائض انجام دیتے رہے حتیٰ کہ گیارہ سال پورے ہونے پر جولائی ۱۸۸۹ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ میں آپ نے بھاولپور چھوڑ دیا اور حضرت امام ربانی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ کے بعد مولوی نور الدین مرحوم کا اس جگہ ۳ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو تقرر ہوا۔ یہی مدرسۂ دینیات ہے جس میں اس وقت آپ کے بھتیجے مولانا فاروق احمد صاحب سلمہ خلف مولانا صدیق احمد صاحب[2]

---

[1] جس کا نام بعد میں جامعۂ عباسیہ ہو گیا۔ (جمیل احمد)

[2] مولانا فاروق احمد صاحب مدظلہ میرے والد کے ماموں زاد بھائی ہیں میں ۱۹۱۶ء میں بھاولپور پہنچا تو مولانا نے مجھے مدرسۂ دینیات میں داخل فرمایا اور خورونوش و رہائش کا انتظام بورڈنگ میں کیا اس وقت بورڈنگ میں دس طالب علم رکھے جاتے تھے مولوی عبد القیوم صاحب بورڈنگ کے نگراں تھے بعد نماز فجر جامع مسجد میں درس ترجمۂ قرآن بھی دیتے تھے۔ مولانا کے علاوہ مولوی سید احمد صاحب اور مولوی حمد الدین بھی مدرس تھے اور ریاضی پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر صاحب مقرر تھے۔ (اخلاق احمد)

بعہدہ شیخ الحدیث فائز ہیں حضرت کے قیام بھاولپور کے متعلق حضرت کے ایک مخلص شاگرد رشید مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عزیز بھاولپوری نے مختصر حالات قلمبند فرما کر بھیجے ہیں جن کو بجنسہ درج کرنا مناسب معلوم ہوا۔

قیام بھاولپور کے اجمالی حالات

(رقم زدۂ ذلّہ[1] ربائے خوان خلیل خاکسار محمد عزیز الرحمٰن عزیز بھاولپوری)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں جس طرح منطق وکلام کے علوم عقلیہ کی تعلیم ہوتی تھی اسی طرح فقہ اور حدیث اور تفسیر کا درس مکمل ہوتا تھا۔ نصاب تعلیم دینی وہی نظامی نصاب تھا جو اُن دنوں تمام ہندوستان کے اعلیٰ مدارس میں رائج تھا۔ حضرت جس شفقت اور محبت کے ساتھ طلبہ کی تعلیم میں مصروف ہوتے تھے اس کا اندازہ کچھ وہی خوش نصیب کرسکتے ہیں جن کو اُس درس میں شمولیت کا شرف حاصل رہ چکا ہو۔

راقم کو بھی یہ عزت حاصل ہوئی ہے میں دیکھتا تھا کہ پروانوں کی طرح طلبہ حضرت کے شیدا تھے بعض طلبہ تو تمام وقتِ تعلیم تک درس میں موجود رہتے اور جو سبق بھی پڑھایا جاتا وہ اس میں شامل ہوجاتے[2] ان کا منشا صرف آپ کے فیضِ صحبت اور تربیتِ عام حاصل کرنے کا ہوتا تھا۔

درسِ حدیث

زیادہ تر حضرت کا وقت درسِ حدیث میں صرف ہوتا تھا اور حضرت کو ہزاروں حدیثیں اور بالعموم صحاح کے احادیث کی سندات تک برزبان یاد تھیں اور کسی مسئلہ کے متعلق حضرت اپنے حافظہ سے تمام علمی اور مذہبی معلومات کو یکجا بیان فرمادیتے تھے اور یہ ایک خاص ملکہ تھا جو حضرت علیہ الرحمۃ کو قدرت نے عطا فرمایا تھا۔

عوام پر بزرگی و تقدس کا اثر

عوام پر حضرت کے تقدس کا اسقدر اثر ہوتا تھا کہ بے ساختہ تعظیم کے لئے مجبور ہوجاتے تھے۔ مجھے کئی دفعہ حضرت کے ساتھ بازار میں سے گذرنے کا اتفاق ہوا تھا مسلمانوں کا کیا ذکر ہے ہندو دکاندار بھی حضرت کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوکر سلام کرتے تھے جس محلہ میں حضرت کا قیام رہتا اس محلہ کے پیر و برنا چھوٹے بڑے سب پابند صوم و صلوۃ ہوجاتے۔ اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے عبادات اور معاملات کے مسائل محلہ کے ناخواندہ لوگ بھی صحت کے ساتھ بتلاسکتے تھے۔

محلہ کی جس مسجد شریف میں نماز ادا فرماتے تھے اس میں محلہ کے بوڑھے بوڑھے آدمی بھی تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مجھے حاجی لدھا صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک ستر سالہ نیلگر میاں ولی محمد صاحب مرحوم

[1] خلیل کے خوان کے ریزے چننے والا۔ میزبانی کی ابتدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ہوئی۔ میزبانی میں خوان اور ریزے ہوتے ہیں اس مناسبت سے یہ لفظ لایا گیا ہے۔ [2] اپنے سبق کے علاوہ دوسرے سبقوں میں بھی شریک رہتے تھے۔ (جمیل احمد)

۔۔ اپنی توتلی زبان سے سورۃ عَبَسَ وَتَوَلّٰی کا تلاوت کرنا اس وقت بھی دل آویز تصور میں آرہا ہے۔
میاں اللہ دسایا صاحب ٹھٹھار اس وقت بھی قریب نوّے سال کی عمر میں موجود ہیں جنھوں نے اذان ۔۔ صحتِ الفاظ کا ایسا سچا سبق حضرت علیہ الرحمۃ سے سیکھا تھا کہ اس وقت تک وہ ان کے الطاف و مکارم ۔۔ تذکرے سے رطب اللسان ہیں۔

۔۔ بہاولپور کی علمی استفادے سے محرومی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہاولپور میں اگرچہ اشاعتِ علمِ دین میں ہمہ تن مصروف رہے لیکن اہلِ بہاولپور کی کم فہمی اور ۔۔ کے جذبات کو ہمیشہ لاعلاج مرض ظاہر فرماتے رہے اور اس لحاظ سے حضرت کی طبیعت کبھی مطمئن نہ ہوئی۔ بالعموم یہ فرمایا کرتے کہ اہلِ بہاولپور کو میری علمی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی رغبت نہیں ہے ۔۔ بعض اوقات تو ہمدردی کے رنگ میں مایوسی کا اظہار اس طرح بھی فرمایا کرتے تھے کہ بہاولپور میں علمِ دین کا ۔۔ ہونا کسی شخص کی قسمت میں نہیں معلوم ہوتا۔

۔۔ اس دور کے تلامذہ

حضرت کے دس سالہ قیام بہاولپور میں اگرچہ بہت لوگوں نے درس کا استفادہ کیا لیکن آج تک آپ کے کسی شاگرد نے مشغلِ علم کو روشن رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی اور کوئی دینی مدرسہ کامیاب نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی حضرت کی پیشین گوئی کا نتیجہ ہے۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست میں مولوی احمد دین، قاضی غوث بخش، مولوی محمد محسن، سید عبداللہ شاہ، مولوی فیض احمد، مولوی سراج احمد علوی، مولوی سراج الدین احمد پوری، مولوی شمس الدین احمد پوری، سید فتح شاہ سکنہ ڈیرہ غازی خاں، اخوند گل محمد افغان، مولوی کریم بخش۔ سید زمان شاہ خیرپوری، مولوی خیر محمد جلد ساز، سید عالم شاہ اور مولوی احمد بخش پنشنر سپرنٹنڈنٹ توشہ خانہ وغیرہم کے نام لئے جا سکتے ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان متبحر بزرگوں میں سے کسی ایک نے بھی درس کا شغل اختیار فرمایا ہو۔

اس مختصر فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی شہرتِ علمی اور کشش روحانی کے سلسلہ میں افغانستان و ڈیرہ غازی خاں تک کے لوگ بھی بہاولپور میں جمع ہو گئے تھے۔ مولوی احمد دین، سید زمان شاہ، سید عالم شاہ اور مولوی احمد بخش اس وقت بھی زندہ موجود ہیں۔

اخلاق و عادات

اخلاق و عادات کے متعلق مجھے اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت کا تمام زندگی کا مقصد اشاعت و تعلیم اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھا اگر کسی شخص کو کسی فعل یا ترکِ فعل کے متعلق کوئی حدیث یاد نہ ہو تو وہ حضرت کے عمل کو دیکھ کر حدیث کا مضمون حاصل کر سکتا تھا۔

بہاولپور کے بوڑھے بوڑھے نیک دل اہلِ بصیرت مسلمان اس وقت تک یہ کلمات دہراتے ہیں کہ حضرت کے عہدِ مبارک میں دینداری اور اسلام کے صحیح مسلک پر چلنے کا پورا موقعہ اور اسوۂ حسنہ موجود تھا اس کے بعد پھر وہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ایجرٹن سکول ترقی کرتے کرتے کالج بن گیا اور مدرسۂ دینیات کو بھی ترقی کے منظر نصیب ہوئے۔ کوشش کی گئی کہ حضرت تعلیم کے وقت کرسی پر تشریف رکھا کریں، اور طلبہ بنچوں پر بیٹھ کر پڑھیں مگر حضرت نے اس امر کو گوارا نہ فرمایا اور وہی مؤدبانہ طریق برابر جاری رکھا جو علماء سلف کا رائج تھا۔

ایک دفعہ بہاولپور کے ایک افسر انہار نے حضرت کی مع خدام افطاری کے لئے دعوت کی اور اس موقعہ پر صاحبِ دعوت نے تمام اعیان و ارکینِ ریاست کو بھی مدعو کیا۔ چار اور فواکہ جمع کئے اور کرسیوں پر نشست کا انتظام تھا، کھانے پینے کا تمام سامان میزوں پر سجا ہوا تھا۔ اکثر مدعو شدہ اصحاب اور ارکین آچکے تھے اور اپنے اپنے موقعہ پر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت تشریف لائے۔ انتظامِ نشست کو دیکھ کر ایک طرف دری پر بیٹھ گئے جو زمین پر بچھی ہوئی تھی اور فرمایا کہ اسلام میں کھانے پینے کا طریق یہی ہے کہ فرش پر بیٹھ کر کھایا جائے، میز و کرسی کی ضرورت نہیں۔ پھر کس کی ہمت تھی کہ کرسی پر بیٹھا رہے۔ لہٰذا تمام صاحبان حضرت کے گرد آبیٹھے اور ایک خلافِ سنت فعل سے حضرت کے عمل نے سب کو محفوظ کر لیا۔

حضرتؒ کو اپنے شاگردوں اور ارادت مند عزیزوں کا ہر جگہ خیال رہتا تھا۔ آخری ایام میں جبکہ حضرت مدینہ طیبہ میں تھے تو وہاں سے بھی اس ناچیز غلام اور دامن گرفتہ کو خاص محبت ناموں سے یاد فرمایا اور ارشاداتِ روحانی سے ممتاز فرماتے رہتے تھے۔ فقط۔

فقیہ بہاولپور کا استفسار اور مولانا کا جواب (از مولانا فاروق احمد صاحب انبہٹوی)۔ مولوی نظام الدین صاحب ایک عالم فقیہ بہاولپور میں مشہور تھے۔ حضرت کی علمیت و ذکاوت کا شہرہ سُن کر ایک مرتبہ شرح وقایہ لے کر آئے اور کہا کہ مجھے استفادہ کے طور پر کچھ دریافت کرنا ہے اور شرح وقایہ کھول کر ایک جگہ ترکیب دریافت کی اور دوسری جگہ شبہۃ الفعل اور شبہۃ المحل کے متعلق دریافت کیا کہ اول الذکر کا کیوں نا اعتبار کیا اور ثانی الذکر کو معتبر کیوں مانا؟

حضرت فرماتے تھے کہ اس سے قبل نہ میں نے دونوں کا فرق معلوم کرنے کی طرف توجہ کی تھی اور

۱؎ پھل۔ ۲؎ اس عبارت کو بہاولپور کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں کاتب کی غلطی ہوگی کہ کسی اور جگہ کی عبارت یہاں لکھدی۔ حضرت مولانا مصنف کتاب کی عادت تھی کہ پرچوں پر لکھ لکھ کر مضمون کاتب کو دیتے اور فرماتے کہ اس کو فلاں جگہ لکھنا غالباً اس نے غلطی سے یہاں لکھدیا مگر بات تو فائدہ سے خالی نہیں گو ترتیب نہ ہو اور گو مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کی تحریر کا جزنہ ہو۔ (جمیل احمد)

نہ شرح وقایہ پڑھائی تھی۔اس لئے ذرا تأمل کیا اور پھران کو جواب دیا کہ فعل حدوث پر دلالت کرتا ہے اور محل استقرار پر۔لہٰذا شبہ محل کا اعتبار ہوا اور شبہ فعل کا اعتبار نہیں ہوا۔اس کے بعد مجھے فکر ہوئی کہ نہ معلوم جواب درست ہے یا غلط، اس لئے مولوی شمس الدین صاحب کے کتب خانہ میں کہ ان کو ہر فن کی کتب جمع رکھنے کا شوق تھا شرح وقایہ کے متعدد حواشی تلاش کئے اور ایک حاشیہ میں بعینہٖ یہی جواب نکل آیا جو میں نے دیا تھا۔"

موصوف کے متعلق مولوی نظام الدین کا تجربہ

مولوی نظام الدین صاحب سے آپ کی علمی استعداد کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمانے لگے علم تو بہت زیادہ نہیں کہ ابھی نوعمر ہیں مگر تیز اور سمجھدار البتہ بہت ہیں۔

وضعداری

حضرت اپنے طرز اسلاف اور وضعداری میں نہایت پختہ تھے کہ کوئی بڑی سے بڑی ہستی آپ کو روک نہ سکتی تھی چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب شعبۂ دینیات کا تعلق ایجرٹن کالج سے ہوا تو تعلیم کے لئے کالجوں کے دستور کے موافق میزیں اور کرسیاں بچھائی گئیں مگر حضرتؒ نے اس کو قبول نہ کیا اور صاف انکار کردیا کہ شعبۂ دینیات پرنسپل کی ماتحتی میں ہو اس سے مجھے بحث نہیں۔مگر پڑھانے کے لئے مجھے کرسی پر اور پڑھنے کے لئے طلبہ کو بنچوں پر بیٹھنے کے لئے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔اسی وقت آپ کے لئے درسگاہ میں دری کا فرش اور اس پر قالین بچھایا گیا اور آپ بطریق اسلاف اس پر بیٹھکر درس دیتے رہے۔

لارڈ ڈفرن کی آمد اور مولانا سے سوال

ایک مرتبہ لارڈ ڈفرن کالج دیکھنے آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ یہاں عربی مدرسہ بھی ہے۔چونکہ اس کو عربی سے دلچسپی تھی اس لئے حضرت کے کمرہ کی طرف بھی آیا۔وہاں دری کا فرش تھا اور کسی نے کہدیا تھا کہ یہاں مذہبی تعلیم ہوتی ہے اس لئے جوتے پہن کر اندر جانا منع ہے۔لہٰذا دروازہ پر کھڑا ہوگیا۔حضرت دروازہ تک تشریف لائے[1] اور باتیں ہونے لگیں۔اخیر میں اس نے پوچھا کہ آپ نے کہاں[2] تعلیم پائی ہے؟ یہ سوال کچھ انوکھے طرز پر تھا جو حضرتؒ کو

[1] تاکہ مہمان کا اکرام بھی ہوسکے اور اس کی مجبوری یا وقت کی رعایت بھی ہوسکے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کافر مہمانوں کے ساتھ مدارات برتی ہے اور وہ غالباً بند جوتوں کی وجہ سے اندر نہ جاتا ہوگا۔ [2] یہ سوال عام طور سے کیا جاتا ہی مگر بے ناموزوں کہ اس وقت تو دیکھنا موجودہ قابلیت کا ہے نہ کہ کسی مدرسکی فراغت کا اگر مشہور مدرسہ سے فراغت کے بعد بھی استعداد نہ ہو تو بیکار اور معمولی مدرسہ سے فراغت پر کثرت مطالعہ سے استعداد زیادہ ہو تو کارآمد ہے مگر بہت لوگوں کی عقل ڈگری سے آگے نہیں بڑھتی۔دوسری بات ایک چال بھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سے اسلامیت کے فنا کرنے کا جو منصوبہ جدید تعلیم کے نام سے بنایا تھا اس کو صرف دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہمخیال مدرسوں نے محسوس کرکے اس کی مخالفت شروع کی تھی تو مقصد اس انگریز کا یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ہمارے منصوبہ کے مخالف سے فراغت حاصل کی ہے یا موافق سے اور اس طرح گویا دیوبند کی ایک تحقیر کی تھی یہ بات ناگوار ہونے کی تھی اب حکومت کے رعب سے جواب ہی نہ دیتا تھا یا گول مول دیتا تھا مگر یہاں رعب کہاں تھا اس کی بات کی تہ کو سمجھ کر جرأت و ہمت سے صاف م حق جواب دیا اور حضرت کے صدق و حقانیت کا ہی رعب پڑا کہ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ (جمیل احمد)

ناگوار گذرا۔ اور مدرسۂ دیوبند اس وقت گورنمنٹ کی نظروں میں ایک خاص رنگ رکھتا تھا اس لئے غصہ کی وجہ سے آپ کی آواز بھرّا گئی اور آپ نے جوش کے ساتھ فرمایا کہ "میرا سلسلۂ تلمذ دیوبند کے ساتھ وابستہ ہے"۔

مولوی احمد الدین صاحب حضرت کے پُرانے شاگرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں اس وقت ضلع ڈیرہ غازیخان میں پڑھا کرتا تھا کہ حضرت کے تبحر علمی کی شہرت سُنی اور اس لئے میں حدیث شریف حضرت سے پڑھنے کیلئے بہاولپور آیا۔ اس وقت آپ کے متعلقہ اسباق میں جلالین شریف ترمذی شریف اور توضیح تلویح تھی۔ چنانچہ حاضرِ خدمت ہوا اور شرفِ تلمذ سے بہرہ یاب ہوا۔ اِنہی کا بیان ہے ایک بار حدیث کا سبق ہو رہا تھا کہ آپ پر غنودگی طاری ہوئی جو دیر تک رہی۔ طلبہ کی خاصی تعداد موجود تھی سب کو نا وقت نیند کا تعجب بھی ہوا مگر تھوڑی دیر بعد حضرتؒ بیدار ہوئے اور فرمایا الحمد للہ اس وقت دربارِ نبوی میں حاضر تھا اور دیر تک باتیں ہوئیں مسائلِ حدیث شریف پیش تھے۔

ایک شیعہ کی مذہبی چھیڑ چھاڑ

مدرسۂ دینیات جس کے آپ صدر مدرس تھے جب ریاست سرشتۂ تعلیم کی ماتحتی میں آگیا تو اتفاق سے ایک شیعہ مذہب سید چراغ شاہ آپ کے افسر ہوئے اور چونکہ اپنے آپ کو مذہبی امور کا واقف و متبحر سمجھے ہوئے تھے اس لئے جب حضرت مدرسہ کے کسی کام کی خاطر اُن کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ مذہبی قصہ چھیڑ کے اہلِ سنت پر اعتراضات شروع کر دیتے اور حضرت ان کو جواب دیتے رہتے تھے۔ جب حضرت نے دیکھا کہ ان کی عادت ہی یہ ہوگئی تو بعض لوگوں کی معرفت آپ نے اُن سے کہلایا کہ میرا آپ کا معاملہ ہے افسری اور ماتحتی کا اور میں دینی معاملہ میں آپ کی رعایت نہ کروں گا اس لئے بہتر ہے کہ آپ اس معاملہ میں گفتگو نہ فرمایا کریں۔ لیکن انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور آخر آپ نے میر ابراہیم علی صاحب وزیرِ اعظم کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ وزیر صاحب نے وجہ دریافت کی تو آپ نے صاف کہدیا کہ سید چراغ شاہ صاحب مذہبی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتے اور مجھے ان کی افسری کے سبب ضروریاتِ مدرسہ کے لئے ان کے پاس جانا ضرور۔ پس جواب دوں تو اُن کی طرف سے مضرتِ دنیا کا اندیشہ اور جواب نہ دوں تو دینی نقصان اور منصب کے خلاف۔ اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ عزت آبرو کے ساتھ علیحدگی اختیار کروں"۔

وزیر صاحب نے آپ کو چراغ شاہ کی ماتحتی سے نکال لیا اور استعفیٰ نامنظور کرکے آپ کو اپنے کام پر بحال رکھا۔ اس طرح پر آپ تعلیم کے مشغلہ میں مطمئن و دل نہاد[1] ہوگئے۔ مگر چراغ شاہ کو آپ سے دشمنی بڑھ گئی اور وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہنے لگے +

[1] دل رکھنے والے دل بستہ۔ (جمیل احمد)

ہدایات الرشید کی وجہ تالیف

ادھر چونکہ مذہبی چھیڑ چھاڑ سے آپ کی تیز طبیعت اس طرف متوجہ ہو چکی تھی لہذا آپ نے خارج وقت میں کتب شیعہ کا مطالعہ شروع کر دیا اور پھر ردِ شیعہ میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام "ہدایات الرشید"[1] رکھ کر طبع اور شائع کر دیا کہ چراغ شاہ بھی اس کو دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ یہ بے نظیر کتاب اس مبحث میں حضرتؒ کی بہترین یادگار اور اس کی چٹکیاں لینے والی دلچسپ عبارت آپ کی نوجوان طبیعت کا مجسمہ ہے جو اس وقت نایاب ہے اور قیمتاً اس کا کوئی نسخہ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔

شرعی حکم کے اظہار میں رُو و رعایت سے انکار

اسی اثناء میں ایک اور واقعہ پیش آگیا کہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے پیر صاحب نے اپنے مرید کی بیوی کو گھر میں رکھ لیا اور اس کا مقدمہ انھیں ڈائرکٹر کی عدالت میں گیا کہ وہ چیف جج بھی تھے۔ مسل برائے تحقیقات و حکم شرعی مدرسہ دینیات میں حضرت کے پاس بھیجدی گئی اور وہ پیر صاحب اس زعم میں کہ مجوزاً انکا مرید اور حضرت کا افسر ہے خود حضرت کے پاس آئے اور دوسروں کو سفارشی بھی لائے کہ ان کے جاہ کا لحاظ بھی رکھا جائے۔ مگر حضرتؒ نے اس معاملہ میں گفتگو ہی کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تحقیق کے بعد جو حکم شرعی ذہن میں آوے گا اس کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شرعی ذمہ داری ہے اور اس میں کسی کی رعایت و جنبہ داری حرام ہے۔ اس پر پیر صاحب بہت ناراض ہوئے اور جج صاحب سے طرح طرح کی شکایات کر کے ان کو بھڑکایا۔

بدعتیوں کے رد میں حضرت کی ایک تالیف براہین قاطعہ

ابھی یہ شورش فرو نہ ہوئی تھی کہ ایک اور فتنہ کھڑا ہوا کہ حضرت تعطیل رمضان میں وطن گئے ہوئے تھے آپ کے پیچھے براہین قاطعہ[3] یہاں پہنچی اور گھاس میں چنگاری کا کام دے گئی۔ دشمنوں کو آپ کے خلاف شور مچانے کا موقع ملا اور عوام و خواص میں طرح طرح کی بدگوئی و عناد کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ بالآخر فرمانروائے بہاولپور کی خدمت میں بھی یہ عرضداشت پیش کر کے کہ مولوی خلیل احمد بددین اور کافر ہے اور براہین میں حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ کاذب کہتا ہے اس پر آمادہ کیا کہ ان مسائل میں مولوی خلیل احمد صاحب سے مناظرہ کرایا جائے۔ چنانچہ حضرت کو ریاست کی طرف سے ایام تعطیل ہی میں دعوتِ مناظرہ دی گئی اور بذریعہ رجسٹری شدہ خط آپ کو جلد بہاولپور بلایا گیا۔

---

[1] شیخ کے نام پر کتاب کا نام ہے اور کتاب بہت ہی بے مثال ہے کاش کوئی اس کو طبع کرے۔ [2] جس کو فیصلہ کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔

[3] یہ کتاب ایک بدعتی عالم مولوی عبدالسمیع کی کتاب انوار ساطعہ کا جواب ہے اور ان کی تمام غلط دلیلوں کا ہر مسئلہ میں نہایت ہی کافی شافی لاجواب جواب ہے مطالعہ کے لائق ہے۔ (جمیل احمد)

گنگوہ سے جو علماء آئے اُن کے نام

مشورہ کے لئے حضرت گنگوہ حاضر ہوئے اور آخر یہ طے پایا کہ یہاں سے مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی، مولانا عبدالحق صاحب پوری اور مولوی محمد مراد صاحب وغیرہ کو ساتھ لیکر بھاولپور جانا اور مناظرہ ضرور کرنا چاہئے کہ انشاء اللہ فتح اہل حق کی ہے۔ چنانچہ آپ ان حضرات کو ساتھ لیکر روانہ ہوئے اور جس وقت ملتان پہنچے کہ اس وقت بھاولپور کا یہی راستہ تھا تو بعض لوگ بھاولپور کے ملے اور انھوں نے ڈرایا کہ نواب بھاولپور با اختیار فرمانروا ہیں اور ان کو ایسا اشتعال ہے کہ انھوں نے طے کرلیا ہے کہ ان ہندوستانی مولویوں کو توپ سے اڑادیا جائے۔ یہ سُن کر اول تو باقتضاء بشریت کچھ اضطراب ہوا مگر آخر یہی قرار پایا کہ شہید ہونا اس سے بہتر ہے کہ اظہارِ حق سے فرار کرنے والے کہلائیں۔ لہٰذا حسبنا اللہ ونعم الوکیل[1] کہہ کر آگے روانہ ہوگئے اور بھاولپور پہنچکر نواب صاحب کو اطلاع دیدی کہ ہم مناظرہ کے لئے آگئے ہیں اور ہر طرح مستعد و طیار ہیں۔

بدعتیوں سے مناظرہ

چنانچہ ۶ جون ۱۸۸۹ء مطابق ۶ شوال ۱۳۰۶ھ کو نواب صاحب کی کوٹھی میں اول تحریری اور پھر تقریری مناظرہ چار دن ہوا اور نواب صاحب کے پیر غلام فرید صاحب حَکَم قرار پائے۔ مناظرہ کی مفصل روداد ایک مستقل کتاب ہو جائے گی اور یہاں سوانح حضرت میں صرف کلی درجہ میں وہ دلیرانہ طرز ظاہر کرنا ہے جس کی وجہ سے آپ سید المناظرین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لئے اخبار نظام الملک مرادآباد مطبوعہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ کی وہ تحریر شائع کرتا ہوں جو ایک مصنف شریک مناظرہ نے مولوی غلام دستگیر قصوری کی اس تحریر کے جواب میں شائع کی جس کی سرخی یہ تھی ؎

خلیل احمد خدا را گفت کاذب[2]   دلیل آورد از خلف المواعید

اور بجائے اس کے کہ حکم کی طرف سے باقاعدہ فیصلہ جو تحریر و تقریر فریقین سے منقح ہوا شائع ہوتا یا اُدھر کے تحریری و تقریری دلائل کا جواب بحوالہ کتبِ معتبرہ دیا جاتا۔ ساری تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی بھی جو کہ مشہور و معروف وہابی اور رئیس غیر مقلدین[3] ہے یہی کہتا ہے اور مولوی خلیل احمد اس کا چیلا ہے لہٰذا کافر

۱؎ ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہیں اور وہ بہت اچھے ذمہ دار ہیں۔ ۲؎ خلیل احمد نے خدا کو جھوٹا کہا اور دلیل لایا وعدوں کے خلاف کرنے مگر یہ سب جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کذب پر قدرت ہے یا نہیں حضرت اور تمام علماء دیوبند قادر مانتے ہیں مگر اس کے عیب ہونے کی وجہ سے اس کا صادر ہونا محال قرار دیتے ہیں۔ بدعتی لوگ خدائے تعالیٰ کو اس پر قادر نہیں مانتے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کون ایسا مسلمان ہو سکتا ہے جو خدائے تعالیٰ کی قدرت کو محدود قرار دے اور اس کا تعلق صدق یا کذب سے نہ قرار دیکر اس بارہ میں معطل قرار دیدے مگر آجکل لوگ ناعاقبت اندیشی سے کام لیتے اور قادر مطلق کو غیر قادر بنانے جاتے ہیں۔

۳؎ حالانکہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید بالکل حنفی تھے البتہ رفع یدین کے ثبوت پر ایک رسالہ لکھدینے سے بہت سے اہلحدیث اور بہت سے بدعتیوں کو یہ غلط گمان ہوگیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ بعض حنفیوں نے اہل حدیث یعنی غیر مقلدین زمانہ کو زنانی برصفحہ آئندہ

اور وہابی ہے"۔ اس تحریر پر طلبہ کے اور نام کے مولویوں اور مساجد کے اماموں اور واعظوں کے دستخط کرادیئے تھے جس سے عوام سمجھیں کہ ریاست کے سارے مولوی تکفیر پر متفق ہیں۔

اس تحریر ذیل سے فہیم شخص مسائل مختلف فیہا[1] کی ابحاثِ فریقین کو بالاجمال سمجھ سکتا ہے کہ مباحثہ مسائل خلف وعید بشریتِ[2] حضور علیہ الصلوۃ والسلام، وسعتِ علم ملک الموت وشیطان۔ مجلس میلاد[3] مروجہ اور رسم[4] فاتحہ مروجہ کے متعلق تھا جن کی تفصیل براہین قاطعہ میں مذکور ہوئی ہے۔

تحریری مناظرہ مولانا صدیق احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب تحریری مناظرہ کے لئے سوالات ہمارے پاس آئے تو ہم نے ایک ایک سوال بانٹ لیا اور اعلمیت[5] کا مسئلہ میرے حصہ میں آیا جس وقت ہمارے جوابات گئے اور فریق ثانی کے علماء نے دیکھے تو ہم نے وہیں کے معتبر آدمیوں سے سنا کہ کہتے تھے جوابات بہت زور کے اور کافی شافی ہیں لہٰذا مناظرہ کا رُخ بدلنا اور تحریری کو تقریری بنانا چاہیئے کہ رعبِ حکومت مانعِ تکلم ہو اور تقریری میں بھی صرف امکانِ کذب کو لیا جائے کہ اس میں گنجائش ہے اور عوام کے بھڑکنے کا بھی اچھا موقع ہے۔

تقریری مناظرہ چنانچہ ۱۸؍جون سہ شنبہ کو اُسی کوٹھی پر ارکینِ سلطنت اور خواصِ ملک جمع ہوئے اور غلام دستگیر نے اپنی بلا بیچارے سلطان محمود کے سر ڈال دی کہ صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک مولانا خلیل احمد صاحب کی وہ شیرانہ گفتگو ہوئی جس کو سن کر سارے حکام اور وکیل دبیر سب بھی دنگ ہوگئے چنانچہ تحریر ذیل میں سب بالاجمال مذکور ہے۔

روئیداد مناظرہ (ضمیمہ اخبار نظام الملک مراد آباد مطبوعہ ۲۵؍اگست ۱۸۸۹ء از م، ن، شریکِ جلسہ)

غلام دستگیر ار کافرم[6] خواند — چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلماں[7] گفتمش اندر مکافات — دروغے را جزا باشد دروغے

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) رفع یدین پر کافر کہنا شروع کردیا تھا اور یہ سخت ترین غلطی تھی بڑی گمراہی تھی کہ جب حدیثوں میں حضور کا یہ فعل موجود ہے گو ہماری تحقیق میں منسوخ ہے اس پر عمل کرنے والوں کو کافر کہنا کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ امام احمدؒ امام مالکؒ اور ان کے تمام پیروؤں کو کافر کہنا معمولی بات نہ تھی۔ ائمہ مجتہدین میں سے سب کا استدلال قرآن وحدیث سے اپنی تحقیق میں قوی طریقہ سے ہے اختلاف راجح ومرجوح کا ہے اگر حنفی کبھی رفع یدین کرے گا تو کوئی اس کی نماز کو فاسد نہیں کہہ سکتا اگر شافعی ترکِ رفع سے نماز ادا کرے گا تو کوئی شافعی اس کو فاسد نہیں کہہ سکتا یہ اختلاف حق وباطل کا اختلاف نہیں ہے ترجیح کا اختلاف ہے اس لئے اصلاح کامل کیلئے شاہ صاحب نے علمی طور سے تو رفع یدین پر رسالہ لکھا اور عملی طور سے گاہ گاہ رفع یدین بھی کیا۔ پروپیگنڈا والوں کو ایک غلط راستہ مل گیا۔ ان کو وہابی کہنا ایک تہمت عظیم ہے۔ وہابی عبدالوہاب نجدی کے پیروکار تھے جو اپنے سوا کسی کو مسلمان نہیں کہتے تھے۔ اب کوئی وہابی ہے ہی نہیں نجدی بھی وہابی نہیں ہیں مگر پروپیگنڈہ والوں نے لفظ وہابی کو ایٹم بم بنالیا ہے۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) [1] اختلافی مسائل۔ [2] سب سے زیادہ عالم ہونا کہ حضور سب سے زیادہ عالم ہیں مگر عالم الغیب نہیں۔ [3] بات کرنے میں روک

[6] اگر غلام دستگیر نے مجھے کافر کہا تو جھوٹ کے چراغ کو فروغ نہیں ہوتا۔ [7] میں نے اس کے بدلے میں اس کو مسلمان ہی کہا کہ جھوٹ کا بدلہ جھوٹ ہی مناسب ہے۔
(جمیل احمد)

حامداً و مصلیاً اُن حضرات کی خدمات میں جن کو فہم و انصافِ خداداد سے حصہ ملا ہے عرض ہے کہ فتویٰ مندرجہ صادق الاخبار بہاولپور مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۸۸۹ء جس کے سوال و جواب کی تالیف مولوی غلام دستگیر قصوری کے فہم و قلم سے ہوئی ہے آپ صاحبوں نے بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا اور اس کی صحت و غلطی پر اطلاع پائی ہوگی لیکن چونکہ میں مولانا مولوی خلیل احمد صاحب کا ہم عقیدہ اور بہاولپور کے مناظرہ میں شریک تھا اس لئے مختصراً میری بھی گذارش سُن لیجئے۔

خلاصہ مضمونِ فتویٰ یہ ہے: "خلیل احمد اور اس کے ہمعقیدہ اہل سنت سے نہیں فرقہ وہابیہ اسمٰعیلیہ سخت بے ادبوں سے ہیں جن سے ہندوستان وغیرہ میں غیر مقلد اور نیچری شاخیں نکلی ہیں اہلِ اسلام اہلِ سنت و جماعت کو اُن سے اجتناب واجب ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ جب ہم عقائد اہل اسلام اہل سنت پر ثابت القدم راسخ الجنان[1] ہیں اور نہایت وثوق اور اُن پختہ دلائل سے ثابت کرتے ہیں جن کی مخالفین میں سے کوئی تردید نہیں کر سکتا کہ ہمارے اعتقادات سراسر مطابق اعتقاداتِ اہلِ سنت ہیں تو ہم کو اس کی کچھ شکایت نہیں کہ مولوی غلام دستگیر اور اُن کے اَتباع[2] ہم کو اہل سنت سے خارج بتلائیں یا کافر فرمائیں۔ کیونکہ اول تو یہ سنتِ قدیمہ ہے کہ اہلِ حق اور اہل اللہ کے اس قسم کے لوگ دشمن ہوا ہی کرتے ہیں اور حق کہنے والوں کو بُرا کہا ہی کرتے ہیں، یہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ علماءِ ربانیین کی فہرست ہاتھ میں لیکر اول سے آخر تک دیکھ جاؤ کوئی ایسا نہ نکلے گا جو اُن کی زبانِ طعن اور سہامِ لعن[3] سے بچا ہو۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم بلکہ جملہ صحابہ و اہلبیت و ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خیال کر لیجئے اور دیکھئے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسے لوگوں کی طعن و ملامت اور لعن و مذمت سے محفوظ رہا ہے؟

ائمہ مجتہدین کے ساتھ ان لوگوں کی زبان نے کیا کیا کچھ سلوک کئے۔ خصوصاً امام الائمہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو کیا کچھ سب و شتم کیا۔ اولیاءِ امت کی کہاں تک نوبت پہنچائی، جس نے زبان سے کچھ حق نکالا جھٹ اس کی تکفیر کی۔ شیخ محی الدین ابن عربی اور امام غزالی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور ابومدین مغربی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا حال دیکھئے کہ ان کی کہاں تک توہین و تکفیر کی۔ محدثینِ امت کو دیکھ لیجئے ان کے ساتھ انھوں نے کیا مہربانیاں فرمائیں۔ امام بخاری کے ساتھ کیا کیا، نسائی کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔

ان سب کو رہنے دو، انبیاء صلوات اللہ علیہم کے حالات کو دیکھ لو کہ ان کے ساتھ انھوں نے کیا کیا؟

---

[1] دل جمعی۔ [2] پیروکار۔ [3] لعنت کے تیروں سے۔ (جمیل احمد)

خبر کیوں جاتے ہو حضرت فخرِ عالم سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی حال احادیث میں ٹٹول کر دیکھ لو اور نہیں تو قرآن شریف میں ہی تلاوت فرما لو۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ [۱] اور نوا ور خدائے تعالیٰ سے بھی تو نہ چوکے۔

پھر اگر ہماری حق گوئی اور اتباعِ سنتِ نبوی پر انھوں نے ہم کو بھی کچھ فرمایا تو ہم کو ہرگز کچھ شکایت نہیں بلکہ ہمارا فخر ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے آبا معنوی کی میراث ملی اور ہمارے مخالفوں نے اپنے آبائے روحانی کی ارث کو اختیار کیا ع میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔[۲]

الحمد للہ ثم الحمد للہ رضینا قسمۃ الجبار فینا۔[۳] دوسرے یہ کہ بحکم احادیثِ صحیحہ ثابت ہے کہ یہ کلمہ[۴] یہ کلمہ ہے جو قائل کی طرف ہی عود کیا کرتا ہے جبکہ وہ شخص جس کے حق میں کہا گیا ہو اس کا مستحق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہے فقد باء بہ احدھما۔[۵] اور بحمد اللہ تعالیٰ نہ جماعت اہلِ سنت وجماعت سے ہم جدا ہیں نہ دائرۂ اسلام سے خارج۔ اور نہ ہمارا کوئی عقیدہ عقائد اہلِ سنت کے خلاف۔ تو یہ سب سبّ وشتم[۶] اور تضلیل وتکفیر مولوی غلام دستگیر کی طرف ہی لوٹتی ہے اور بموجب حدیثِ صحیح کے وہی اس تمام طعن ولعن کا مورد قرار پاتا ہے نہ ہم۔

تیسرے یہ کہ اس تکفیر وتضلیل میں تمام متکلمین اور سب فقہاء ومحدثین جو عموم[۷] قدرت باری تعالیٰ کے قائل ہیں شامل ہوئے۔ پس جب ہم اُن کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں تو اگر وہ بھی گمراہی میں پڑے ہیں تو ہم بھی سہی، مرگِ انبوہ جشنے دارد[۸]" تو جب غلام دستگیر نے سب اکابر اہلِ سنت کو اہلِ سنت سے خارج کر دیا تو اس اہلسنت

---

[۱] اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن بنائے ہیں انسانی شیطان اور جنی شیطان بعض بعض کے دل میں ملمع کاری کے قول اور دھوکے ڈالتے رہتے ہیں اور اگر آپ کے رب چاہتے تو وہ ایسا نہ کر سکتے تو تم چھوڑ دو ان کو ان کے جھوٹ تہمتیں باندھنے کو۔ یعنی اس میں بھی حکمت ہے کہ مخالف اور دشمن ہوا کریں ورنہ ان کا کمال کیسے چمکے۔ [۲] اگر باپ کی میراث چاہتے ہو تو باپ کا علم سیکھو۔ [۳] اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر جو ہم میں فرمائی ہے ہم بالکل راضی ہیں کہ ہم کو ہمارے بزرگان کی پڑی ملی اُن کو ان کے بڑوں کی پیروی ملی۔ [۴] کافر کہنا کسی کو حدیث میں ہے کہ جب کسی کو کوئی کافر کہتا ہے تو دونوں میں سے ایک کفر کے ساتھ لوٹتا ہے اگر وہ واقعی کافر تھا تو وہ ورنہ کہنے والا اس لفظ کے ساتھ لوٹتا ہے۔

[۵] لوٹے گا اس کے ساتھ ان دونوں میں سے ایک۔ [۶] بُرا کہنا گالیاں دینا اور گمراہ یا کافر قرار دینا۔

[۷] اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عام ہونا۔ ہر ہر چیز پر اُن کو قدرت حاصل ہے چھوٹی ہو یا بڑی اچھی ہو یا بُری مگر بُری کا صدور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ ہر نقص وعیب سے پاک ہیں، تو سچ پر قدرت ہے اور جھوٹ پر بھی مگر جھوٹ صادر نہ ہوگا کہ یہ عیب ونقص ہے حق تعالیٰ ان سے پاک ہیں۔

[۸] ایک گروہ کے گروہ کا مرنا بھی ایک جشن رکھتا ہے۔

ہونے سے جس کو غلام دستگیر تسنن[1] کہتا ہے ہم بھی تحاشی کرتے ہیں۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مفتی کون؟ غلام دستگیر، اور مسئلہ کونسا؟ عموم قدرت باری تعالیٰ۔ سبحان اللہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ خدا کی قدرت کہ مسئلہ قدرت میں اور غلام دستگیر ہماری تکفیر کرے۔ قیامت آئے جب وہ موٹے موٹے اور ظاہر ظاہر مسائل سمجھنے سے عاجز ہے تو ایسے باریک مسائل میں اس کی فہم نارسا کیونکر رسائی پا سکتی ہے۔

یہ غلام دستگیر وہی غلام دستگیر ہے جو چند روز ہوئے ریاست بھاولپور کی میونسپل کمیٹی میں محرر تھا، آج آپ علامۃ الدھر بن بیٹھے، اس کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ ایسی ہی چالاکیوں سے کارروائی کیا کرتا ہے جو علماء کی شان کے علاوہ عوام اراذل سے بھی نہایت بعید ہیں۔

مناظرۂ بھاولپور کا صحیح صحیح قصہ جو ایک بڑے مجمع کثیر اور جم غفیر میں ہوا اول ان معتبر لوگوں سے سُن لیجئے جو اس میں شریک تھے اور دیکھئے کہ اس میں ان حضرت کی کیسی گت ہوئی پھر اس فتوے کو جو صادق الاخبار میں درج کرایا ہے اس کے مطابق کیجئے،[2] آپ کی ایمانداری واضح ہو جائے گی۔

مناظرۂ بھاولپور کا حال اس وقت مجملاً اور مختصراً عرض کرتا ہوں: مولانا خلیل احمد صاحب وسط رمضان سخت موسم گرمی میں نہایت عجلت اور تقاضا کے ساتھ بتحریک غلام دستگیر مناظرہ کے لئے بھاولپور بذریعہ تار برقی و خط رجسٹری طلب ہوئے۔ ۲۱ رمضان کو مع رفقا وہاں پہنچے، وہاں پہنچنے پر جوش مناظرہ تو فرو ہوا لیکن غلام دستگیر اور اس کے رفقا کی آتشِ عناد نے دوسری طرح اشتعال پایا۔ جب ان مکر اور حیلوں میں ناکامیابی رہی تو ۳ شوال کو پہلا جلسۂ مناظرہ جناب میاں صاحب میاں غلام فرید صاحب مرشد حضور سرکار عالی دام اقبالہ وملکہ کی کوٹھی میں منعقد ہوا۔

شرائطِ مناظرہ تمام ارکینِ ریاست جمع ہوئے فریقین بالمقابل بیٹھے۔ ہماری طرف سے شرائطِ مناظرہ پیش ہوئیں، کل تیرہ[3] شرطیں تھیں۔ منجملہ ان کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین کی تقریریں قلمبند ہوں۔ جو مجلس میں بالاتفاق منظور ہوئی، اور ایک یہ بھی شرط تھی کہ جو منصف اور حَکَم مقرر ہو وہ علوم عقلیہ ونقلیہ فرعیہ[4] واصلیہ میں مزاولت[5] تامہ رکھتا ہو اور اس پر فرض ہوگا کہ فریقین کے دلائل پر بدلائل شرعیہ فیصلہ لکھے جس فریق کے دعوے یا دلیل کی تصحیح کرے بدلائل کرے اور جس کی تغلیط کرے بدلائل تغلیط کرے۔ بلا دلیل اس کا قول ہرگز قبول نہ ہوگا۔

---

[1] اہل سنت ہونا۔ [2] ہدایت کرتے ہیں؛ خدا کی شان تو دیکھو کو کلچڑی کنجی۔ حضور بلبل شیدا کرے نواسنجی ÷ جو لوگ بے اصل بے ثبوت باتوں کے پیرو کار ہیں ان کو کہا جاتا ہے اہل سنت، اور جن کا ہر قول وفعل سنتِ نبوی کے موافق وہ اہلِ سنت سے خارج کہلائیں، کیا بدعت کا نام سنت ہوتا ہے۔ جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں۔ [3] غلام دستگیر کی۔ [4] عملی اور عقیدوں کے علوم فقہ وکلام۔ [5] لین دین میں، ہمیشگی یعنی درس تدریس یا تالیف وغیرہ میں مسلسل مشغولی۔ (جمیل احمد)

غلام دستگیر کہتا تھا کہ جناب میاں صاحب منصف وحکم ہیں اس شرط کی کیا حاجت ہے، کیا تم پیر صاحب[1] کے حکم ہونے سے منکر ہو؟[2] مولانا خلیل احمد صاحب کہتے تھے کہ ہم کو پیر صاحب کے ادنیٰ خادم کا منصف ہونا قبول ہے مگر بشرطیکہ فیصلہ بدلائلِ شرعیہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس موقع میں تو پیر صاحب کی منصفی پر اس قدر زور ڈالتے ہو اور ان مسائل میں جن میں تم خود میاں صاحب کے مخالف ہو اُن میں جناب میاں صاحب کی منصفی کو منظور نہیں کرتے۔

تحریری مناظرہ اور سات اعتراضات

بعد شرائط غلام دستگیر نے تحریری مناظرہ کو مناسب وقت سمجھ کر سات اعتراضات پیش کئے جو ساڑھے آٹھ ورق پر لکھے ہوئے تھے اور چاہا کہ مجلس میں پڑھ کر سنائے۔[2]

مولانا نے کہا کہ مجلس وعظ نہیں ہے مجلسِ مناظرہ ہے، مناظرہ تحریری ہوگا یا تقریری۔ اگر تحریری مناظرہ ہے تو اسی مجلس میں وقتِ مقرر پر تحریری سوال وجواب کیجئے، اور زبانی ہے تو زبانی سوال کیجئے زبانی جواب لیجئے۔ اس سے تو غلام دستگیر نے انکار کیا اور پڑھ کر سنانے[3] پر اصرار کیا۔ آخر مولانا نے کہا اچھا اگر آپ سناتے ہیں تو ہم کو اجازت ہو کہ ہم اعتراض کریں گے، اس کو بھی منظور نہ کیا۔ مولانا نے کہا کہ اس صورت میں ہمارا بیٹھنا فضول ہے[4] چنانچہ اراکین نے اس کو منظور فرمایا اور کہا کہ آپ جائیں بعد میں آپ کے پاس بھیج دیئے جائیں گے۔ آپ چار روز میں جواب لکھدیں۔ مولانا نے یہ قبول کیا اور کہا کہ مجلس میں ہمارے جواب بھی اسی طرح سنائے جائیں گے، اس کو اراکین نے قبول فرمایا اور ہم چلے آئے۔

چار روز کے عرصہ میں اجمالی اور تفصیلی جوابات لکھے، مجموعہ کی تعداد تقریباً ساڑھے[5] پندرہ جز تھی۔ پانچویں روز دوسرا جلسہ منعقد ہوا۔ چونکہ تفصیلی جوابات زیادہ بسیط تھے[6] اس لئے اراکین نے اجمالی جوابات کو سننا قبول کیا۔

---

[1] کتنی معقول شرط تھی کہ فیصلہ کرنے والا وہ ہو جو ان علمی باتوں کو سمجھ بھی سکے فیصلہ بھی کر سکے۔ اس پر کسی معین شخص کا اصرار اندرونی راز کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عنوان تو پیر صاحب اور بادشاہ دونوں کو برانگیختہ کرنے کا تھا جو علمی کم مایگی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔
[2] منشا کھلا ہوا تھا کہ اس طرح اعتراضات نواب کے سامنے آجائیں پھر انتشار پھیلا کر جوابات کسی کو نہ سننے دیں۔
[3] مناظرہ تو ہوتا یہی ہے کہ ایک کہے پھر دوسرا جواب دے پھر پہلا اس کا جواب دے پھر وہ جواب الجواب، اگر تحریری ہو تو تحریروں میں اور تقریری ہو تو تقریروں میں یا زبانی۔ اس سے انکار کرنا تو مناظرہ سے گریز کرنا ہوا۔ اور سنا کر پھر درہم برہم کرنا بھی مناظرہ سے انحراف ہے اور عاجز ہونے کا اعتراف۔ [4] گویا یہ مطلب ہوا کہ وہ تقریریں غلط سلط جھوٹ بہتان بے دلیل جو چاہیں کہدیں اس پر کوئی نہ بول سکے اور گالیاں تک سنا کرے پھر جلسہ درہم برہم کرکے یکطرفہ بات لوگوں کے سامنے رہنے دی جائے تو یہ مناظرہ سے گریز نہیں تو کیا ہے۔ [5] تقریباً ۲۴۸ صفحے۔ [6] لمبے اور تفصیلی تھے۔ ضروری بات تو یہ تھی کہ جیسے پہلی تقریریں مفصل سنی تھیں جوابات بھی تفصیلی سُنے جاتے تا کہ حق ناحق معلوم ہو سکتا ان کو اجمالی پیش کرنے کی اجازت دینا مناظرہ سے انحراف اور ایک طرح کی جانبداری ہے مگر اہلِ حق نے انتہا تک پہنچانے کے لئے اس کو بھی مان لیا۔ (جمیل احمد)

لیکن غلام دستگیر مجلس میں نہیں آیا اور عذر کیا کہ جب انھوں نے ہمارے سوالات نہیں سُنے تو ہم ان کے جوابات نہیں سُنتے. مولانا نے کہا کہ ہم نے تو اس لئے نہیں سُنے تھے کہ ہم کو اعتراض کرنے کی اجازت نہ تھی جب ہم آپ کو اعتراض کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو ان کو اب کیا عذر ہے۔ اراکین نے بھی اس پر بہت زور دیا کہ غلام دستگیر مجلس میں شریک ہو مگر غلام دستگیر ایسے کاہے کو تھے، مجلس میں نہ آئے پر نہ آئے۔ مگر مولانا نے اپنا اجمالی جواب مجلس میں خوب دھڑلے کے ساتھ پڑھ کر سنایا اور بعد اختتام پکار کر کہہ دیا کہ جس کا دل چاہے اس پر اعتراض کرے ہم جواب دیں گے۔

علماء نواحِ بہاولپور غلام دستگیر کے معاونین مولوی عبد الرشید، مولوی غلام نبی، مولوی سلطان محمود، مولوی الٰہ بخش وغیرہم سب شریکِ جلسہ تھے مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ بعض اراکین کی طرف سے اصرار ہوا کہ یہ جوابات میاں صاحب کے حوالہ کر دو۔ چونکہ وہ صرف مسودہ تھا اس لئے مولانا نے یہ کہا کہ تاوقتیکہ ہم اس کی نقل نہ کر لیں اس کو ہم نہیں دے سکتے۔ اور بڑی خیر ہوئی کہ وہ تحریر نہیں دی تھی ورنہ زبانی مناظرہ کے اوراق کی طرح اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے اور بجز افسوس کے کچھ نہ ہاتھ آتا۔

غرض اس وقت مولانا اپنی تحریروں کو سنانے کے بعد واپس لیکر چلے آئے اور پانچ روز کی مہلت اراکین نے عنایت کی کہ اس عرصہ میں نقل کر کے جوابات دیدو۔ چھٹے روز جواب نقل بھیجدیئے۔

اب غلام دستگیر نے سوچا کہ معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ اس تحریر طویل الذیل کا سمجھنا اور جواب لکھنا تو درکنار اس کا اول سے آخر تک پڑھنا ہی دشوار ہے۔ آٹھ ورق پر سوال تو کتنے ایام کی جانکاہی میں کمیٹی کر کے لکھے تھے پھر اس تحریر کے جواب کے لئے تو مہینوں کا عرصہ درکار ہے اس لئے دوسری چال چلے اور زبانی مناظرہ[2] ٹھہرایا۔ مولانا نے بلا اصرار قبول کیا۔

زبانی مناظرہ

تیسرا جلسہ زبانی مناظرہ کے لئے منعقد ہوا۔ تمام اراکین جناب میاں صاحب کی کوٹھی میں جمع ہوئے، فریقین بالمقابل بٹھادئے گئے۔ فریقین کی تقریریں لکھنے کے واسطے بمنظوری اراکین مولوی عبد المالک صاحب مدرس کالج بہاولپور مقرر ہوئے۔ مولانا نے مولوی غلام دستگیر سے کہا کہ سوال کیجئے، تو کہتے کیا ہیں کہ مجھ کو تو جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب میں

---

[1] جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ [2] اس میں اپنی نجات دیکھی کہ کوئی بات تحریر میں مضبوط نہ ہوگی جس سے چاہے انکار جس سے چاہے اقرار کر سکیں گے اور لوگوں کو دھوکا دینے کا راستہ نکل آئے گا۔ چرب زبانی اور یکطرفہ بیانات سے اپنی شکست کو چھپانا بلکہ فتح کے نام سے پیش کرنا ممکن ہوگا اور ممکن ہے ایسا ہی کیا گیا بھی ہو جیسے کہ ان صاحبوں کا ہر جگہ یہی معمول ہوتا ہے۔

کچھ نہیں کہتا۔ ہاں مولوی سلطان محمود[4] کچھ سوال کریں گے"

معلوم ہوا کہ اب غلام دستگیر میدانِ مناظرہ سے بلطائف الحیل گریز کیا چاہتا ہے اس لئے مولانا نے کہا کہ اصل متخاصمین[5] میں اور آپ ہیں۔ میں صرف آپ کے سوال کا جواب دونگا دوسرے کسی کے سوال کا میں جواب نہیں دونگا۔ اگر آپ کے معاونین میں سے کوئی سوال کرے گا تو میرے رفقا میں سے اس کا کوئی جواب دیگا۔ ہاں اگر مولوی غلام دستگیر اقرار کرلے کہ میں سوال کرنے سے عاجز ہوں تو پھر جس کا دل چاہے سوال کرے میں ہی جواب دونگا اس پر بہت کچھ جھلائے تو سہی، خیال بھی کیا کہ اب بھی شاید کچھ غیرت آجائے گی اور سوال کرے گا مگر توبہ توبہ سوال کے نام سے اس کا مرغِ روح ہوا ہوا جاتا تھا کبھی کہتا تھا کہ حضرت میاں صاحب کا ارشاد ہو تو سوال کروں کبھی بدحواسی میں کہتا تھا کہ مولوی سلطان محمود صاحب ارشاد فرمائیں تو سوال کروں۔ اور اکین اس کے اس گریز واغماض سے زچ پچ تھے۔

آخر جب تمام اہلِ حل وعقد نے اس کو مجبور کیا تو قہر درویش بجانِ درویش سوال کے لئے تہیہ کرنے لگا۔ پہلے کچھ دیر تک دعا مانگی (شاید جان بچنے کیلئے ہوگی) حق کے غلبہ کی دعا پر تو ہم نے بھی آمین کہی۔

مولوی عبداللہ ٹونکی اور مولانا محمود حسن صاحب کے مناظرہ کا تذکرہ

پھر بستہ کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور اس مناظرہ کی بابت اعتراض کیا جو لاہور میں ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۰۶ھ کو مولوی عبداللہ ٹونکی مدرس یونیورسٹی کے ساتھ مولانا محمود حسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا ہوا تھا جس کا صحیح خلاصہ یہ تھا کہ مسئلہ امکانِ کذب[6] کی بابت مولوی عبداللہ سے تذکرہ ہوا انھوں نے کہا میرے نزدیک اس کا قائل دائرہ اہلِ سنت سے خارج ہے۔ دلیل طلب کی گئی تو شرح مواقف کا حوالہ دیا جو بحث صفتِ کلام باری میں مذکور ہے اس پر کچھ امتناع[8] بالذات اور بالغیر کی بابت ذکر چھڑا تو اس پر

---

[1] یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ خود ہی بجائے تحریری کے زبانی مناظرہ پر زور دیا اور جب اس کا وقت آیا تو تحریر پر حوالہ کردیا اور کنارہ کش ہوگئے۔ اگر تحریری مناظرہ پسند تھا تو اس کو تبدیل کیوں کرایا اور اگر وہ ناپسند تھا زبانی پسند تھا تو بجائے زبانی کے اس پر حوالہ کرنا کیسا۔ آخر ان قلابازیوں میں راز کیا ہے اس پر بھی تو غور کرنا چاہئے۔

[2] مناظرہ کرنے والے ایک ایک صاحب اصل تھے اور باقی ان کے ساتھی تھے اصل کا مقابلہ اصل سے اور ساتھی کا ساتھی سے ہوتا تھا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اصل مناظر تھے تو اُدھر مولوی غلام دستگیر اصل تھے خود گریز کرنا اور ساتھیوں کو پھانسنا انصاف کی بات نہ تھی ہر ایک کو حق تھا کہ میں اصل مناظر ہوں اصل سے ہی مناظرہ کروں گا کم درجے والے سے مناظرہ اس کی شان کے خلاف ہوتا ہے ہاں اگر مناظر صاحب عاجز ہوا اصل ہونے سے استعفا دیدے تو پھر بعد والا ساتھی اصل بن سکتا ہے طریقہ یوں ہے اس لئے دوسرے مولانا خود کے عاجز ہوکر استعفا دینے کے مرادف ہوا۔ [3] مقابلہ اور جھگڑے والے۔

[4] جھوٹ کا کہہ سکنا ذات باری سے ممکن ہے یا نہیں یعنی اس پر قدرت ہے یا نہیں۔

[5] خود بخود محال ہونا اور کسی دوسری بات کے لازم آنے سے اس کا محال ہونا کہ کذب خود بخود محال ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مولوی عبداللہ نے کہا کہ مجھ کو مناظرہ منظور نہیں ہے۔ تب یہ کہا گیا کہ یہ محض تحقیقِ مسئلہ ہے اور مناظرہ نہیں اس سے آپ ناخوش نہ ہوں اور یہ کہا گیا کہ خود شارح مواقف امکانِ کذب کی تصریح کر دے تب بھی آپ قبول کریں گے؟ اس کو تسلیم کیا۔ چنانچہ شرح مواقف کی عبارت صفحہ ۷۰۹ کی ان کو دکھائی گئی، اس کو دیر تک دیکھا کئے۔ دیکھکر مطلق اس میں چون و چرا نہ کی اور اس کو قبول کر لیا۔ اور کوئی عبارت کسی کتاب مسلم الثبوت وغیرہ کی اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کی بلکہ سوائے شرح مواقف کے ذکر کے اور نام تک بھی کسی کتاب کا نہیں آیا۔ اس کی بابت غلام دستگیر نے اپنے سوالات میں غالباً لکھا تھا کہ مولوی عبداللہ نے مسلم الثبوت کی عبارت پیش کر کے خلیل احمد وغیرہ کو ساکت کر دیا۔ اس پر مولانا نے تفصیلی جوابات میں لکھا تھا کہ یہ محض خلافِ واقع اور جھوٹ ہے۔

مولوی غلام دستگیر کے مولانا سہارنپوری پر دو اعتراض

اس جلسہ میں غلام دستگیر نے مولوی عبداللہ کے دو خط نکالے اور دیر تک پڑھتے رہے اور کہا کہ دیکھو جناب مفتی عبداللہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں تو میری طرف جھوٹ کو نسبت کرنا خلیل احمد کا محض جھوٹ اور خیانت ہے حالانکہ یہ نہ سمجھے کہ اس صورت[۱] میں کذب ان کے مقتدا مولوی عبداللہ کی طرف منسوب ہوگا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تفصیلی جوابات میں تحفۂ اثنا عشریہ کی عبارت کی نقل میں غلطی کاتب سے نیست کی جگہ است لکھا گیا تھا تو اس پر تحفۂ اثنا عشریہ نکالکر دکھلایا کہ دیکھئے خلیل احمد نے نقل میں خیانت[۲] کی۔ ان دونوں اعتراضوں کے بیان میں ایک بڑا وقت صرف کیا جس سے تمام اراکین اور سب حضارِ مجلس مکدر و منغض[۳] ہوئے اور چیف جج صاحب نے غلام دستگیر کو فرمایا بھی کہ اصل مسئلہ میں سوال کرنا تھا، کوئی حدیث کوئی ناسخ کوئی منسوخ بیان کرنا تھا۔ اس کے بعد مولوی غلام دستگیر صاحب کی زبان شریف سے مناظرہ کی بابت کچھ نہ نکلا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو قدرت میں نہ ہوا اور ہر شئے پر خدائے تعالیٰ کی قدرت نہ رہی اور اگر کسی لازم آنے والی بات کی وجہ سے محال ہے تو خود تو ممکن ہوا تحت القدرت ہوا۔ دوسری وجہ سے نقص وعیب کا محال لازم آتا ہے محال ہوا اسی کو امکان کذب کہتے ہیں کہ کذب ممکن تو ہے مگر ہوگا نہیں کہ عیب ونقص ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [۱] کیونکہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ کہا تھا کہ خلاف واقع اور جھوٹ ہے۔ جھوٹ کس کا ہے یہ نہیں فرمایا تھا۔ اگر غلام دستگیر صاحب اپنا نہیں تسلیم کرتے تو مولوی عبداللہ کا ہوگا۔ مقتدا یا استاد کے ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنا ہی تسلیم کر لیتے ان کو جھوٹ سے بچا لیتے اور اگر دونوں کو بری کرنا تھا تو ثبوت اس کا لازم تھا کہ واقعی پیش کیا تھا یا اب پیش کر دیتے ورنہ دونوں میں سے ایک کا جھوٹ تو ثابت ہوا۔

[۲] لیکن آگے پیچھے کی عبارت سے تو صحیح لفظ معلوم ہو رہا ہے کاتب کی غلطی سے مصنف پر الزام درست نہیں۔

[۳] تنگ دل۔

مولانا کی طرف سے عام چیلنج

جب مولانا نے دیکھا کہ تمام اراکین منقبض ہوئے تو تھوڑا سا اور غلام دستگیر سے بابت سوال تقاضا کرکے اور نابدروازہ پہنچا کر اور اس کا عجز واشگاف کرکے کہا کہ خیر اب میں کہتا ہوں کہ جو شخص سوال کریگا میں اس کا جواب دونگا۔

چنانچہ مولوی سلطان محمود ساکن تلیہڑی مناظرہ کے لئے منتخب ہوئے اور مناظرہ کے لئے بالمقابل بیٹھے۔ یہاں سے بانتظام جناب مرزا جندودہ خاں صاحب مشیر مال حال مولوی عبدالمالک نے تقریریں لکھنی شروع کیں۔

سلطان محمود نے سوال کیا کہ خداوند تعالیٰ کی نسبت اتصاف[1] امکان کذب کے ساتھ آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

مولانا نے کہا کہ ممتنع[2] بالذات۔

سلطان محمود نے کہا یہ آپ کی تحریر کے مخالف ہے۔

مولانا نے کہا ہرگز نہیں ہے آپ نے ہماری تحریر کو سمجھا نہیں۔

سلطان محمود نے کہا تشریح کیجئے۔

مولانا نے کہا کہ صدق اور کذب صفت[3] کلام ہے اور کلام باری تعالیٰ نفسی[4] ہے اور لفظی۔ نفسی جو صفت قدیمہ ہے اس میں کذب ممتنع بالذات ہے اور کلام لفظی میں ممکن[5] بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ آپ کا کیا عقیدہ؟ کہا ممتنع بالذات۔

طرفین سے دلیل کا مطالبہ ہوا۔ سلطان محمود تو اپنے اثبات مدعا کے لئے کیا دلیل بیان کرتے۔ مولانا نے آیت ولو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیرًا الخ پڑھی جس کی تفسیر میں امام رازی نے تفسیر کبیر میں خدا تعالیٰ

---

[1] جھوٹ کے ممکن ہونے کے ساتھ صفت والا ہونا۔ [2] خود بخود محال بلا کسی دوسری برائی کا ذریعہ ہے۔

[3] کلام ہی صادق یا کاذب یعنی واقع کے موافق یا مخالف ہوتا ہے۔ صاحب کلام کو جو صادق یا کاذب کہہ دیتے ہیں وہ مجازاً اس کے کلام کے واسطے سے کہدیتے ہیں ورنہ وہ واقع کے موافق و مخالف نہیں ہوتا واقع کی نقل نہیں ہوتا واقعہ کی نقل تو کلام ہی ہے۔

[4] انسان لفظوں کو لفظوں کا جامہ پہنانے سے پہلے دماغ میں بہت کچھ عبارت بنالیتا ہے وہ تو کلام نفسی ہے کیونکہ ابھی لفظ نہیں ہیں لفظ تو زبان سے نکلنے والی چیزیں ہیں پھر اس دماغی عبارت کو لفظوں میں لاتا ہے یہ کلام لفظی ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں بھی لفظوں کے جامہ سے پہلے جو عبارت ہے وہ کلام نفسی ہے اور لفظوں میں کلام لفظی مگر انسان حادث اس کا علم حادث اس کا یہ دماغی کلام بھی حادث، بلکہ بعض دفعہ رفتہ رفتہ بنتا اور لفظوں میں ڈھلتا ہے دوسرے انسانی حصولی ہے کہ لفظوں کی صورتوں سے ذہن میں عبارت بناتا ہے حضوری یعنی بلاواسطہ لفظوں کی صورتوں کے نہیں جیسے انسان اپنے موجود ہونے کا علم بلا لفظوں کی صورتوں کے ہوتا ہے جو حضوری ہے وہ ایسا نہیں اور حق کا علم سب حضوری ہے وہاں لفظوں کی صورتوں کا دخل نہیں ہے اور پھر ہمیشہ سے ہمیشہ ہے اس لئے وہ ذات پاک کی ایک صفت ہے ہمیشہ سے ہمیشہ کے لئے ہے قدیم ہے وہ کلام نفسی ہے پھر لفظوں کو اس کے موافق کیا جاتا ہے لفظ حادث ہیں کلام لفظی حادث ہے۔ اب کلام نفسی قدیم ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کی قدرت مثل[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی ہے اور پھر لکھا ہے کہ خلاف معلوم اور خلاف[2] اخبار مقدور ہے جو کہ مستلزم[3] امکانِ کذب کو ہے۔

سلطان محمود نے کہا کہ لَو فرض[4] کے واسطے ہے اور فرض محالات کا بھی جائز ہے مولانا نے کہا کہ میرا استدلال لَو سے نہیں ہے بلکہ مشیت[5] سے ہے۔ سلطان محمود نے کہا قدرت[6] اوصاف مشترکہ میں مراد ہے اور اوصاف[7] خاصہ میں مثل پر قدرت نہیں ہے۔ مولانا نے کہا کہ آدم میں وصفِ اولیت[8] خاص ہے اور شیطان میں بدترین ہونا وصف خاص ہے تو ان کے مثل پر بھی[9] قدرت نہیں۔ اسی طرح ہر ایک فرد کی شل[10] پر قدرت نہیں؟ تو کہا ہاں۔

مفتی صدرالدین کے رسالہ کا حوالہ

اور دوسرے امر کا معارضہ کبیر کی دوسری عبارت سے کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ خلاف[11] معلوم اور خلافِ اخبار غیر مقدور ہے۔ اس کا جواب مولانا نے پیشوائے غلام دستگیر مفتی صدرالدین مرحوم کے رسالہ اثبات امکان[12] نظیر فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کیا جس کو بہت کتب کلامیہ سے نقل کیا تھا کہ خلافِ معلوم اور خلاف اخبار مقدور ہے۔ اور یہ بھی غالباً اسی جلسہ میں کہا گیا کہ اگر خلافِ علم مقدور نہ ہو تو لازم آوے کہ معاذ اللہ خدائے تعالیٰ کو کسی چیز پر قدرت نہ ہو کیونکہ موجودات اور معدومات ممکنہ کا وجود و عدم ایک وقتِ معلوم تک ہے اس سے پیشتر نہ موجود کا معدوم کرنا اور نہ معدوم کا موجود کرنا مقدور[13] ہو۔ تعالیٰ[14] عن ذالک

مکتوبات شیخ یحییٰ منیری رح کا حوالہ

اور نیز عبارت مکتوبات شیخ یحییٰ منیری کی کہ انبیاء کے دوزخ میں ڈالنے پر قدرت[15] میں لکھی ہے پڑھ کر سنائی۔ شاید غلام دستگیر

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) تو اس کا واقعہ کے خلاف ہونا خود محال ہے کہ اس کا تکلم ابدی و قدیم اور صفت ہے اس کا خلاف واقع ہونا تو تکلم نفسی ہو جاتا ہے یہ منقولہ محال ہے اور لفظوں کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے لفظوں کا جب تک کلام نفسی کا ان سے تعلق نہ ہو خلاف واقع ہونا ممکن ہے اور جب کلام نفسی کا ان سے تعلق ہو جائے گا اب وہ کلام لفظی بن جائیگا اب اس کا تکلم ہو جائیگا تو کلام نفسی کا اس سے تعلق تحت قدرت ہے مگر ہو گا نہیں کیونکہ اس سے عیب لازم آتا ہے عیب کی وجہ سے محال ہو گا نہ کہ خود — ۵ خود محال ۔ ۶ خود ممکن کسی دوسری بات کی وجہ سے محال ۔ ۷ اور اگر ہم چاہتے تو ہر آبادی میں ایک نبی بھیج دیتے ۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [1] حضور کا مثل یعنی ایسا نبی ۔ [2] معلوم اور خبر کا خلاف تحت قدرت ۔ [3] جو کذب کے تحت قدرت اور ممکن ہونے کو لازم بناتا ہے ۔ [4] تسلیم کرنے کے لئے ۔ [5] چاہیے کہ حضور کا مثل چاہے کے تحت تو ہوا یعنی تحت قدرت ہے ۔ [6] ان اوصاف مثل ہونے پر قدرت مراد ہے جو سب میں مشترک ہوں ۔ [7] جو حضور کے خاص اوصاف میں ان پر نہیں ان کا مثل نہیں ۔ [8] سب سے اول ہونا ۔ [9] تو کیا ان خاص پر قدرت نہیں ۔ [10] اس کی خاص خاص صفتوں کے ساتھ کیا قدرت نہیں جس کو کوئی نہیں کہہ سکتا ۔ [11] معلوم و خبر کا خلاف قدرت رب سے باہر ہے ۔ [12] حضور کی نظیر و مثل کے ممکن ہونے کو ثابت کرنا ۔ [13] تحتِ قدرت ۔ [14] اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہیں ۔ [15] کہ یہ بھی قدرت میں مگر حسب وعدہ ایسا نہ کریں گے تو یہ بھی خود محال نہیں وعدہ کے خلاف ہونے سے نہ ہو گا ۔

چوتھا جلسہ

تیسرے روز پھر چوتھا جلسہ منعقد ہوا۔ چونکہ سلطان محمود پہلے مناظرہ کا ڈھنگ دیکھ چکا تھا اس لئے اس روز اس نے چاہا کہ بحث کو بدلے مگر خلاف داب مناظرہ چلنے نہ دیا گیا اور گو تیسرے جلسہ کے خاتمہ پر سلطان محمود پر جواب دہی باقی رہی تھی تو آج اس پر جواب دینا لازم تھا۔

مولانا نے از سرِ نو دلائل پیش کئے

مگر مولانا نے شرعاً اثباتِ مدعا کے لئے از سرِ نو دلائل پیش کئے اور وہ کل تین دلیلیں تھیں۔

پہلی دلیل یہ تھی کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کلام نفسی میں کذب ممتنع بالذات ہے لیکن کلام لفظی میں ممکن بالذات ہے کیونکہ کلام لفظی وہ ہے جو مرکب الفاظ سے ہو اور جو مرکب الفاظ سے ہو وہ حادث ہے اور جو حادث ہے وہ ممکن ہے اور جو ممکن ہے وہ بحکم آیت اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر[1] داخل تحت قدرت ہے، تو کلام لفظی باقسامہ[2] داخل تحتِ قدرت ہے پھر ہر ایک مقدمہ کا ثبوت شرح عقائد نسفی سے کردیا۔

اس دلیل کو سن کر جو کیفیت سلطان محمود اور اس کے رفقاء غلام دستگیر وغیرہ کی ہوئی تھی وہ قابل دید تھی۔ بہر کیف اس کے جواب میں ساکت محض ہوئے اور اس دلیل کو کسی طرح نہیں توڑ سکے آخر اکر یہ کہا کہ ہم شکل اول نہیں جانتے امکانِ کذب کو کسی کتاب سے ثابت کیجئے۔

پھر چیلنج

مولانا نے چند بار پکار کر یہ بھی کہدیا کہ اگر آپ صاحبوں میں سے کوئی میری دلیل کے کسی مقدمہ کو باطل کردیں گے تو میں اپنی دلیل سے دست بردار ہو جاؤنگا مگر کوئی کچھ نہ بولا

فریقِ ثانی کی بدحواسی

دوسری دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ[3] اب ہم پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو اس کے خلاف پر قدرت ہے کہ نہیں؟ وہ مشرک کو بخش سکتا ہے یا نہیں؟ جناب میاں صاحب نے فرمایا ہاں بخش سکتا ہے تو مولانا نے کہا کہ یہی امکانِ کذب[4] ہے۔ اس پر سلطان محمود اور غلام دستگیر باتفاق بولے کہ خدا تعالیٰ مشرک کو نہیں بخش سکتا اور غلام دستگیر نے جلدی سے جلالین منگائی اور ادھر ادھر لوٹ پوٹ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور کتاب

---

[1] شروع ہی ہیں۔ [1] بیشک اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قدرت والے ہیں اور شئے وہ ہے جس پر مشیت وارد ہو وہ ہر ممکن ہے۔ [2] سب قسموں کے ساتھ صادق بھی کاذب بھی۔ [3] بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشیں گے اس کو کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے۔ [4] کہ جو فرمایا ہے کہ نہ بخشیں گے اس کے خلاف یعنی بخش دینا قدرت میں تو ہے مگر وعدہ کی وجہ سے نہ بخشیں گے تو بخشا خود تو ممکن ہو ممکن بالذات اور وعدہ کی وجہ سے منع ہو۔

رکھدی۔ مولانا نے کتب کلامیہ سے مشرک کی مغفرت کا مقدور[۱] ہونا ثابت کر دیا۔ آخر جب کچھ بن نہ پڑا تو گھبرا کر کہنے لگے کہ اس سے آپ نے فعل[۲] میں کذب ثابت کیا اور دعویٰ اثبات کذب فی القول تھا۔ مولانا نے کہا سبحان اللہ میں تو اس قول انّ[۳] اللہ لا یغفر ان یشرک بہ۔ میں جو کہ جملۂ خبریہ ہے کہہ رہا ہوں۔ کہنے لگے نہیں صاحب آپ تو کذب فی الفعل ثابت کرتے ہیں۔

اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے جواب کس حالت میں آدمی سے صادر ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہا کہ امکانِ کذب کتاب سے ثابت کیجئے۔

جب مولانا دو قوی دلیلوں سے اپنا مدعا ثابت کر چکے تھے تو اب ان پر لازم نہ تھا کہ موافق فرمائش[۴] کے بھی ثابت کرتے مگر شروعًا[۵] یہ خیال کہ آپ کے دل میں حسرتِ اعتراض باقی نہ رہ جائے اس لئے اس کو منظور کر کے تیسری دلیل شرح مواقف سے پیش کی یعنی وہ عبارت جو ۷۰۹ مطبوعہ نول کشور پر مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شارح معتزلہ و خوارج[۶] کی طرف سے اعتراض کرتا ہے کہ امکانِ[۷] کذب فی الخبر اور خُلف فی الوعید لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔ پھر اس کا جواب دیتا ہے قلنا[۸] لا نسلم استحالتہ کیف و ہما من الممکنات التی یشملہا قدرۃ اللہ تعالیٰ یعنی ہم اس کا استحالہ[۹] تسلیم نہیں کرتے کیونکہ کذب فی الخبر اور خلف فی الوعید اُن ممکنات سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی قدرت شامل ہے۔

اس کے جواب میں سلطان محمود نے دو کتابوں کی عبارتیں پیش کیں جن کو وہ شرح عقائد جلالی اور اس کا حاشیہ ابوالحسن شہید کہتے تھے۔ غالبًا ان کا مضمون یہ تھا کہ کذب[۱۰] نقص ہے اور نقص خدا پر محال ہے تو قول سید شریف ممنوع ہے۔

مولانا نے کہا کہ اولًا یہ اعتراض سید شریف پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ سید شریف بحثِ کلام میں تصریح کر چکے ہیں کہ قبح فی الفعل[۱۱] جس سے معتزلہ اس کے امتناع پر استدلال کرتے ہیں اور نقص فی الفعل میں کچھ فرق نہیں ہے تو نقص فی الفعل سے اہل سنت کا اس کے امتناع پر استدلال کرنا[۱۲] اصول اہل سنت کے خلاف ہے۔ دوسرے

---

[۱] قدرت کے تحت ہونا۔ [۲] کرنے میں اور گفتگو ہے کہنے میں۔ [۳] کہتے میں اور اس کا خلاف کہتے کا ہی تو خلاف ہوا۔ [۴] کیونکہ دلیل ہونی چاہئے کوئی ہو نہ کہ فرمائشی دلیل۔ [۵] شروع میں۔ [۶] معتزلہ وہ فرقہ جو عقل کو شرع سے مقدم رکھتا اور خوارج وہ فرقہ جو حضرت علیؓ کی مخالفت کرتا تھا۔ [۷] کہ خبر میں کذب کا ممکن ہونا اور اطلاع عذاب میں خلاف کا ممکن ہونا لازم آتا ہے۔ [۸] ہم تسلیم نہیں کرتے کہ یہ محال ہے کیسے محال ہو سکتا ہے حالانکہ دونوں باتیں ان ممکن باتوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی قدرت شامل ہے۔ [۹] محال ہونا۔ [۱۰] صدورِ کذب نہ کہ قدرتِ کذب بلکہ قدرت کا نہ ہونا تو نقص ہے۔ انسان میں زنا کی قدرت ہونا نقص یا جرم نہیں اس کا صادر ہونا نقص و جرم ہے بلکہ قدرت نہ ہونا ہی نقص ہے۔ [۱۱] کام میں برائی جو کہ معتزلہ برے کام کا خالق خدا کو نہیں سمجھتے حالانکہ برا اس کا صدور ہے نہ کہ پیدا کرنا امتحان کے لئے پیدا کرنا حکمت ہے۔ م

م [۱۲] جب قبح و نقص یکساں ہیں تو نقص سے منع پر دلیل لینا معتزلہ کا سا کام اہل سنت کے اصول کے خلاف ہے۔

باہم مطابقت بھی ہوسکتی ہے کہ دوانی[۱] کا قول کلام نفسی پر محمول ہے اور سید شریف کا قول کلام[۲] لفظی پر۔

جہانتک میرا حافظہ شہادت دیتا ہے اس تقریر کا کوئی جواب ان کی طرف سے نہیں دیا گیا۔ یہانتک فریقین کی تقریریں قلمبند ہوتی رہیں۔ چونکہ بارہ[۱۲] بجے کا وقت آگیا تھا اراکین نے اُٹھنا چاہا، اٹھتے اٹھتے سلطان محمود نے اعتراض چہارم کی تقریر کی لیکن وہ لکھی نہیں گئی کیونکہ وہ محض غل اور شور میں ہوئی تھی چند منٹ ہوکر مجلس برخاست ہوئی اور پھر کوئی مناظرہ نہیں ہوا۔

یہ مجملاً بہاولپور کے مناظرہ کا قصہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ ہم بعد میں جوابات اجمالی اور تفصیلی بھی شائع کریں گے لیکن یہ بلفظہ مناظرہ جس طرح تحریر ہوا تھا اس لئے ہم نہیں لکھ سکے کہ جو مناظرہ مولوی عبدالمالک صاحب لکھتے تھے ہم نے اس کی نقل لینے کی درخواست بخدمت جناب میر ابراہیم علی صاحب و جناب سید غلام مرتضیٰ شاہ صاحب کی تھی اور انھوں نے ہم کو اس کی نقل کی اجازت دیدی تھی اور وہ کاغذات سرکاری طور پر بتوسط جناب مرزا جندوڈہ خاں صاحب جناب میاں صاحب کی خدمت میں محفوظ رہتے تھے اور جناب سید غلام مرتضیٰ شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ کل صبح کو کسی کو بھیجدینا نقل کرکے لے جائیگا۔

دوسرے روز مولانا خود مع چند طلبہ دولت خانہ پر بخدمت جناب شاہ صاحب گئے اور نقل کیلئے کہا۔ جناب شاہ صاحب نے براہِ مہربانی اسی وقت آدمی بھیجکر جناب میاں صاحب کے ایک خلیفہ کو بلایا اور کاغذاتِ مناظرہ کے لانے کے واسطے حکم کیا۔ چنانچہ وہ گیا اور واپس آکر یہ جواب لایا کہ جناب میاں صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں خلیل احمد کا آدمی[۳] لکھتا تھا اسی کے پاس ہوں گے۔" میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا واقعی یہ میانصاحب کا ہی جواب ہے بلکہ کچھ عجب نہیں یہ بیچ میں حضرت غلام دستگیر ہی کی کارروائی ہو۔ بہرکیف اس وقت سے مایوسی ہوئی کہ وہ تحریرات غائب غلہ ہوئیں ہمارے ہاتھ نہ آئیں گی۔ تو اب ہم کو شکر کا بڑا موقعہ ہے کہ بدون نقل جوابات اجمالی اور تفصیلی حوالہ نہیں کردئے گئے تھے ورنہ وہ بھی اسی طرح غائب غلہ ہوتے لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ مولوی عبدالمالک نے سرکاری طور پر مناظرہ کو لکھا تھا جس کے منتظم جناب مرزا جندوڈہ خاں صاحب تھے۔ پھر اگر وہ خود ہی اس کو شائع کردیں تو بہتر ہے تاکہ تمام ہندوستان میں ہر ایک کو معلوم تو ہوجائے کہ حقیقت کس کی جانب ہے اور مناظرہ میں غلبہ کس کو ہے؟ مگر جس میں ان کی مغلوبیت ثابت ہو اس کو تو وہ کیوں کر

---

[۱] جلال الدین دوانی صاحب شرح عقائد جلالی کا محال کہنا۔ [۲] ممکن تحت قدرت ہونا لفظی پر ہو۔

[۳] حالانکہ لکھنے والے عبدالمالک تھے جو تمام اراکین کی منظوری سے منتخب ہوئے تھے۔

شائع کرسکتے ہیں۔ لیکن الحمد للہ اہلِ عقل کے نزدیک اس کا چھپالینا اور غائب کردینا بہ نسبت اظہار کے زیادہ صریح دلیل مغلوب ہونے کی ہے لوکانوا یعقلون[1]۔ یہی وجہ ہوئی کہ غلام دستگیر نے صادق الاخبار میں کیفیتِ مناظرہ کا نام تک نہ لیا اور نتیجہ مباحثہ کے نام سے فتویٰ شائع کرایا۔ چہ خوش۔ کجا مباحثہ، کجا یہ فتویٰ، کجا اس کا نتیجہ مباحثہ ہونا، کجا اظہارِ حق؟ عجب امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی انمل ہے ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا[2] ۔۔۔ الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

یہ خیال کیا ہوگا کہ ان کے دلائل کا جواب جن کے مقابلہ میں سرمجلس جواب نہیں آیا تھا اس موقع پر بھی نہ بن پڑے گا تو اب مناظرہ کا ذکر کرنا اپنے مدعا میں کھنڈت ڈالنا ہے اسلئے اس کا نام ہی نہ لو۔

رہا یہ کہ اگر یہ فتویٰ جس پر جناب میاں صاحب کی تصدیق ہے اگر بالفرض ان کی طرف سے ہی سمجھا جائے اور خیال کیا جائے کہ یہ ان کی طرف سے فیصلہ ہے تو تاوقتیکہ یہ فیصلہ حسب شرائط بدلائلِ صحیحہ مدلل نہ ہوا اور تمام دلائل کا مفصل جواب نہ ہو ہرگز قابلِ اعتبار کے فیصلہ نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ خود دلائل مرقومہ غلط ہوں[3]۔ اس صورت میں میاں صاحب کی تصدیق کافی نہیں۔ کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جناب میاں صاحب کو دھوکہ دیکر دستخط کرالئے گئے۔ سوالات میں طرح طرح کی چالاکیاں کی ہیں، دلائل میں بہت کچھ خرافات بھری ہے پہلی دلیل جو تمام مسائل میں جاری کی یہ ہے کہ یہ مسئلہ موافق بیان مولوی اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کے ہے یہ خود واہیات اور پوچ[3] ہے۔ ان کی موافقت و مخالفت کو بطلان و حقیقت میں کچھ دخل نہیں ہے وہ خدا کے بھی وحدہ لاشریک لہٗ ہونے کے قائل ہیں تو اس کا بھی انکار کیجئے۔ چوری و شراب خواری و جہل و ظلم سے معارضہ بھی کم فہمی سے ناشی[4] ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ غلام دستگیر کے نزدیک خدا کی قدرت کا بندہ کی قدرت سے زائد ہونا اور خدا کے مقدورات کا بندہ کے مقدورات سے زائد ہونا ضروری نہیں حالانکہ یہ کُلیہ مسلّمہ[5] اہلِ کلام ہے جو مقدور العبد ہے وہ مقدور اللہ ہے۔ اگر اس کا انکار کرتے ہو تو خود اہلِ سنت سے خارج ہو۔ ہم تحقیقی جواب دیتے مگر خوفِ طوالت سے ترک کرتے ہیں اور صاحب معتقد المنتقد نے جو یہ خرافات بکی کہ قال کبیرہم کذب ہو اتصافہ سبحانہ بہذہ النقیصۃ لیس محالاً بالذات[6]

---

[1] اگر وہ سمجھتے ہوتے۔ [2] کیا اچھا کہا ہے سعدی نے زلیخا میں الا یا آخر تک۔ خبردار اے ساقی جام کا دور چلا اور دیدے۔ یہ مصرع حافظ شیرازی کا اور یوسف زلیخا کتاب مولانا جامی کی۔ اس میں کہنے والا بتایا شیخ سعدی کو۔ ایسی بے جوڑ باتیں بیان ہوئیں۔ [3] کہ جو کچھ وہ کہیں وہ صحیح ہی نہ ہو۔ [4] پیدا۔

[5] یہ کلی قاعدہ علم کلام کا تسلیم کیا ہوا ہے کہ جو کچھ بندہ کی قدرت میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بھی قدرت میں ہے۔

[6] ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ان تینوں کے بڑے نے کیا ہے کذب ہے یہ تو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اور اس نقص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا موصوف ہونا محال بالذات نہیں۔

محض افترا[1]، وکم فہمی ہے۔ ہرگز کوئی اتصاف[2] بالنقصیہ کا قائل نہیں ہوا۔ من[3] ادعی فعلیہ البیان۔ شرح فقہ اکبر کی عبارت ومنہا[4] لا یوصف اللہ تعالیٰ بالقدرۃ علی الظلم الخ ثبوت مدعا میں بے سمجھی پر دال ہے ظلم کا تحقق خدا تعالیٰ کے حق میں ممکن نہیں۔ تو عقلاً محال ہوا تو اس کا امکان بھی عقلاً ممتنع ہوا۔ لیکن کذب[5] کا محال عقلی ہونا ممتنع ہے بلکہ وہ محال شرعی ہے اور محالِ شرعی کے امکان کو محالِ عقلی کہنا بجز غلام دستگیر جیسے علامۃ الدہر کے کسی دوسرے عاقل کا تو کام نہیں ہے۔ لیجئے آپ کے دلائل کی توڑ کی تمام ہوئی اب کہئے اہلِ سنت سے تم خارج ہو یا ہم؟ انصاف کی آنکھیں اگر ہوں تو ذرا غور کر دیکھو۔

غلام دستگیر کے مقتدا مولوی مفتی صدر الدین اور امام رازی وغیرہ امکان[6] نظیر فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل ہیں۔ کیوں صاحب پھر وہ بھی اہلِ سنت سے خارج ہیں۔ مماثلت[7] نفس بشریت کی تردید میں تفسیر کبیر کی عبارت سے استدلال سراسر خبط ہے۔ کبیر کی عبارت ہمارے ہرگز مخالف نہیں۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ تواضعاً[8] ارشاد فرمایا ایں ہمہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نفس بشریت میں مماثلت ہے، کیونکہ بالاتفاق انسان اور بشر کلی[9] متواطی ہے اور جزئیات میں عوارض[10] کا فرق یقیناً ہے۔ انبیاء تو انبیاء ہیں عوام میں بھی باعتبار عوارض زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کوئی عورت، کوئی مرد، کوئی صاحب خصال حمیدہ، کوئی صاحب اوصافِ ذمیمہ، کوئی اندھا عین جان گونگا، کوئی بینا مرد شجاع بلیغ، کوئی ولی اللہ، کوئی کافر لیکن یہ فرق عوارض نفس[11] انسانیت میں برابر ہے کوئی بے وقوف سے بیوقوف بھی خلل[12] انداز نہیں سمجھا اور اس کو کلی مشکک[13] نہیں کہتا۔ چنانچہ اگر ولی اللہ کافر کو کہے کہ میں تجھ جیسا ہوں یا بینا اندھے کو کہے یا جبان[14] شجاع کو کہے یا مرد عورت کو کہے تو باعتبار نفس بشریت کے واقعیت پر محمول ہوگا اور باعتبار عوارض کے تواضع پر۔ پس آپ نے ہمارا مطلب نہیں سمجھا اور نہ تفسیر کبیر کا ہی مطلب سمجھا۔

اسی طرح تیسرے جواب میں بھی تنقیصِ شان حضرت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف نسبت کرنا

---

[1] تہمت۔ [2] نقص کے صفت ہونے۔ [3] جو دعویٰ کرے اس کے ذمہ ثبوت ہے۔

[4] انہی میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم پر قدرت ہونے کے ساتھ موصوف نہیں کئے جاسکتے۔

[5] وہ تو عقلی محال ہے اور کذب شرعی محال ہے، دونوں میں فرق ہے ایک کرنا درست نہیں اور جو شرعی محال ہوگا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس پر قدرت تو ہے مگر شرعی حکم اور عیب کی وجہ سے صادر نہیں ہو سکتا یہی ممتنع بالغیر ہوتا ہے۔

[6] حضورؐ کے مثل کے ممکن ہونے کے۔ [7] مثل ہونا محض بشر ہونے میں ہے اس کی تردید کے لئے تفسیر کی عبارت۔

[8] کہ حضورؐ نے تواضع میں برابر فرمایا۔ [9] وہ لفظ جو بہت پر صادق آسکے مگر سب میں بلا تفاوت ہی ہو۔

[10] حقیقت سے باہر کی پیش آنے والی باتیں۔ [11] یہ پیش آنے والی مختلف باتیں انسان ہونے میں برابر رکھتی ہیں۔

[12] اس فرق کو انسان ہونے میں خلل ڈالنے والا۔ [13] وہ لفظ جو بہت پر صادق آتا ہو مگر ایک میں کم ایک میں زائد ہو جیسے سفیدی پانی پر اور موتی پر۔ [14] بزدل۔

جہالت ہے۔ ہمارے کلام اور ہمارے اعتقاد میں افضلیت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم جمیع مخلوقات سے ثابت و متحقق ہے لیکن ہاں ہم حضرت کو حق تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک نہیں کرتے اور بعلم محیط[1] عالم الغیب نہیں جانتے۔ اگر اس لئے ہم اہل سنت سے خارج ہیں تو ایسا[2] اہلِ سنت ہونا غلام دستگیر اور اس کے رفقا کو ہی نصیب رہے ؎

کارِ شیطاں[3] میکند نامش ولی   گر ولی اینست لعنت بر ولی

خود آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتا کہ غیر کو خدا تعالیٰ کی صفت میں شریک کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی تنقیص شان نہ ہوتی؟ مگر مبتدعین زمانہ کے نزدیک خدا تعالیٰ کی تنقیص کچھ بری نہ ہو۔

علاوہ ازیں یہ غلام دستگیر اپنے سوالات میں امکانِ کذب کو مورد[4] لعنت اللہ علی الکاذبین کا قرار دیتا ہے جس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ تمام انبیاء، تمام اولیاء، تمام شہدا تمام اقطاب و ابدال بلکہ خود بھی مورد لعنت اللہ علی الکاذبین کے ہیں۔ تو کیا سب کو ملعون بتانا تنقیص اور توہین شانِ رفیع ان کی نہیں ہے۔

غلام دستگیر کے پیر و مرشد[5] مولوی غلام محی الدین صاحب اپنے حلیہ میں فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک کو اک جانور کی گردن کے مماثل و مشابہ فرماتے ہیں "بنوع گردن آہو مثال" تو پھر تمہارے پیر نے بھی توہین و تنقیص شان کی۔ ان کو بھی اہل سنت سے نکالو۔

چوتھے اور پانچویں اور چھٹے[6] جوابات میں نہ ہمارا مدعا صحیح نقل کیا نہ کوئی دلیل ذکر کی تو ان کا اس موقع پر ذکر کرنا خود لغو ہے۔ مگر اسقدر لکھنا ضرور ہے کہ عموماً مجلس میلاد مبارک کی حرمت کو ہماری طرف نسبت کرنا محض جھوٹ اور افترا[7] اور بہتان ہے۔ باقی جن امور محدثہ[8] کو ہم نے ناجائز کہا ہے اگر کچھ حوصلہ ہے تو ان کا استحسان ثابت کرے۔

پھر کالم صفحہ ۴ سطر ۶ میں لکھتا ہے (ناحق ان کی غیبت اور بہتان پر کمر باندھ لی) اسی صفحہ کے اسی کالم کی سطر ۲۳ و ۲۴ میں لکھتا ہے (اور ان کی غیبت اور بہتان بندی کریں) لفظ غیبت سے تو معلوم[9] ہوتا ہے کہ یہ عیوب ان میں موجود ہیں، اور بہتان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عیوب ان میں موجود نہیں

[1] ازل سے ابد تک ہر بات کے لئے عالم الغیب نہیں کہ یہ صفتِ باری ہے۔ [2] کہ خدائی صفت غیر میں ثابت کرنے لگیں [3] کام تو شیطان کا کرتا ہے نام اس کا ہو ولی اگر یہی ولی ہوتا ہے تو اس ولی پر لعنت۔ [4] جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کے وعدہ کرنے کا موقع۔ [5] اگرچہ غلام دستگیر ہمارے بزرگوں کا نام بے ادبی سے لے مگر ہم اس کے جواب میں اس کے بزرگوں کو بے ادبی سے انشاء اللہ یاد نہ کریں گے بشرطیکہ غلام دستگیر حد سے نہ بڑھا۔ [6] ہر قسم کی۔ [7] تہمت۔ [8] نئے ایجاد کئے ہوئے۔ [9] جیسے حدیث میں ہے کہ غیبت کے بیان پر ایک صحابی نے پوچھا اگر اس میں وہ بات ہو تو حضور نے فرمایا جب ہی تو غیبت ہے نہ ہو تو تم نے بہتان باندھا۔

پس اگر ان عیوب کو ان میں جانتے ہو مگر غیبت سمجھ کر ان کا ذکر منع کہتے ہو تو تمہارے تمام محدثین پر یہ اعتراض ہے ورنہ غیبت کہنا غلط ہے اور اگر بعض کی نسبت غیبت اور بعض اخیر کی نسبت بہتان کہنا مراد ہے تو ذرا تفصیل فرمائیے کہ کون سے عیوب کی نسبت غیبت ہے اور کون سے کی نسبت بہتان۔ پھر باایں ہمہ روایات[1] کا اعتراض قائم۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ماشاءاللہ بڑے عالم ہیں غیبت اور بہتان کو عجب نہیں ایک ہی سمجھے ہوں اور عطف تفسیری ہو۔

بدعتی فتوے کے علما

پھر اب ذرا ان لوگوں کا حال بھی سن لیں جن کو غلام دستگیر نے عوام کے فریب دینے کے لئے علما ظاہر کیا اور اُن کے اس فتوے پر دستخط کرالئے۔ اول جناب میاں صاحب کہ بچپن میں کچھ کتابیں صرف و نحو کی پڑھی تھیں پھر فقیری کی طرف متوجہ ہوئے اب محض خاندانی درویش ہیں مولوی عبدالرشید بسبب شدتِ ضعف اور کثرتِ امراض کے ان کی فہم ہی سلیم نہیں پھر مسائل دقیقہ معقولیہ و کلامیہ سے محض ناآشنا۔ میاں نبی بخش اویسی کہ عربی عبارت تک نہیں پڑھ سکتے۔ میاں احمد دین اویسی نے ابتدا میں ناقص طالب علمی کی تھی اب وہ سالہا سال سے نہ رہی۔ محمود اویسی، محمد دین، یہ دونوں چھوٹے بھائی میاں احمد دین کے ہیں۔ یہ بیچارے طلبہ کی بھی شمار میں بمشکل ہو سکتے ہیں غلام نبی یہ مولوی عبدالرشید سے بھی بدرجہا کم ہیں۔ حافظ غلام مصطفےٰ خان، غلام دستگیر کے پیر بھائی خضر صورت مگر منیہ اور قدوری سے زیادہ نہیں جانتے اور معتبر ذریعہ سے سُنا گیا تھا کہ اپنے صاحبزادہ کی رعایت میں جھوٹی شہادت دلوانے تک پر آمادہ تھے۔ حکیم عبدالحق پیر فرتوت بجز طبابت کے علوم معقولیہ و دینیہ سے اجنبی۔ قادر بخش واعظ، علوم عربیہ سے جاہل محض اور اس پر طماع و لالچی۔ غوث بخش سراج احمد۔ سید زماں شاہ، انھوں نے بخوفِ جبر و اکراہ دستخط کئے۔ جب دیکھا کہ مولوی گل محمد اور سید علی اور شاہ عالم نکالے گئے۔ پھر تحقیقاتِ مسائل دقیقہ میں ان کی استعداد ناکافی۔ غلام احمد، عزیزالدین گھڑی ساز، محمد امین فارسی خواں کہ ان کی استعداد عربی ہرگز ایسی نہیں جو کتاب سے ایسے مسائل سمجھ سکیں۔

یہ حال ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اس پر دستخط کئے ہیں اگر کسی کو شک ہو تو ان کا حال دیکھ لے۔

کیا بہاولپور میں علما نہیں

میں حیران ہوں کہ مولویوں کا تمام خاندان باقی تھا۔ نور احمد، سعید اللہ فیض احمد، فضل احمد، سعید اللہ۔ کریم اللہ۔ اِدھر مفتیوں کا خاندان اُدھر محمد امین کا خاندان، حکیم عبدالحق کا خاندان ان سب کے دستخط کیوں نہ کرالئے اور زیادہ وثوق و اعتبار

[1] ضعیف موضوع کا اور راویوں کے حالات کا نقص و عیب ظاہر کیا ہے جیسے وہاں دین کو مستحکم کرنے کے لئے درست ہے یہاں بھی درست ہے کہ دین کو غلطیوں سے غلطیوں اور غلطی کرنے والوں کی نشاندہی کر کے پاک صاف کرنا ضروری ہے۔

بڑھتا۔ بلکہ جب دستخط کے واسطے علم شرط نہیں رہا تو دستخط کنندوں کی مستورات کے دستخط کیوں نہ کرالئے؟

یہ اس غلام دستگیر کی ہمیشہ کی چالاکی ہے کہ دھوکہ دہی کے واسطے ایسا کیا کرتا ہے۔ پھر اس میں تو ایک یہ بھی کاریگری کی ہے کہ بعض دستخطوں میں جعل اور تحریف بھی ہوئی ہے۔ مثلاً سنا ہے سراج احمد نے لکھا تھا میں بسبب کثرتِ مشاغل کتب متعلقہ مسائل متنازع فیہا[1] کو نہیں دیکھ سکا۔ چونکہ معاملہ دین نازک ہے لہذا مجملاً لکھتا ہوں کہ جس شخص کے عقائد مخالف[2] عقائد اہلِ سنت کے ہیں وہ مذہب باطل پر ہے (العبد سراج احمد) پس یہ حال اس کے فتوے کا ہے اور یہ کیفیت اس کے تصدیق کنندوں کی ہے۔ پھر اس بے دینی کو حج بیت اللہ کی برابر بلکہ راجح کہتا ہے۔ ہاں اس وجہ سے تو بیشک حج بیت اللہ پر راجح ہے کہ سو روپے کی رقم ہاتھ لگ گئی۔ یہ نعمت نو لاکھ حج مبرور سے بھی اس کے نزدیک بڑھ کر ہوگی اس پر وہ مثل صادق آئی ربح[3] الدنیا وخسر الاٰخرۃ۔ سبحانک وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک۔ اس تحریر میں ہم نے بہت سے مدارج[4] کا مجمل بیان کیا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ کسی وقت ہم اس کو تفصیل سے ظاہر کریں گے بلکہ عجب نہیں یہ مسئلہ پولیٹکل ہو جائے اور غلام دستگیر ہم کو مجبور کرے کہ ہم گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کریں۔ فقط۔

فنِ مناظرہ میں یدِطولیٰ

فنِ مناظرہ بالخصوص ردِّ روافض و ردِّ بدعات میں حضرت کو یدِطولیٰ تھا۔ آپ کی عادت نہ تھی کہ خود مناظرہ کی دعوت دیں یا چھیڑ چھاڑ کریں مگر جب دوسرے فریق کی طرف سے زور دیا جاتا تو اس وقت آپ شیر بن کر سامنے آتے اور مخالف کو جھوٹوں بھی یہ کہنے کا موقع نہ دیتے کہ مناظرہ سے بھاگ گئے۔ فریقِ مخالف نے آپ کی ضروریاتِ وقتیہ اور تنگی و دشواری حالات ٹٹول ٹٹول کر اس کی تدبیر کی کہ اس وقت آپ مناظرہ نہ کرسکیں گے اور ہمیں فرار کا الزام لگا کر اپنے معتقدین میں اپنی کامیابی کا شور مچانا نصیب ہوگا مگر آپ نے ہمیشہ اس چال کو سمجھا اور موقع ہی نہ دیا کہ آپ کی حقانیت پر کوئی دھبہ آئے۔

راندیر میں مبتدعین سے بر شرط پر مناظرہ اور مبتدعین کا گریز

ایک مرتبہ آپ سفرِ حج سے واپس آرہے اور اہلِ راندیر کے اصرار پر ایک دن کے لئے رانیر پر ٹھہر گئے۔ چند مبتدعین نے جو کہ پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے اس شب میں جس کی صبح کو

[1] جن میں جھگڑا ہے۔ [2] یہ تو وہ ہوگا جو خدا تعالیٰ کی صفت کو غیر میں ثابت کریگا۔ [3] دنیا کا نفع پایا اور آخرت کا خسارہ۔ اے اللہ آپ پاک ہیں میں آپ کی پاکی حمد کے ساتھ بیان کرتا ہوں دل سے گواہی دیتا ہوں کہ آپکے سوا کوئی معبود نہیں میں آپ سے مغفرت مانگتا ہوں اور آپ کی طرف توبہ کرتا ہوں [4] درج شدہ مسائل کا۔

آپ چلنے والے تھے شور مچایا کہ مناظرہ کرلو۔ ہر چند کہ آپ چار مہینے سے سفر کا تعب اٹھا رہے تھے، اہل و عیال کا ساتھ تھا، وطن پہنچنے کی عجلت تھی، روانگی کی اطلاع آپ جگہ جگہ دے چکے تھے اور یہی فریق مخالف کی جیت تھی، کہ مناظرہ کی دعوت پر لامحالہ جواب دیں گے کہ دوسرا وقت مقرر کرو۔ مگر آپ نے کسی ضرورت کی پروا نہ کی اور پہلی ہی تحریک پر کہلا بھیجا کہ "وطن کی روانگی ملتوی کرتا ہوں اور منظوری شرائط میں دیر لگانا نہیں چاہتا جو شرط چاہو طے کر لو اور میں کل صبح آٹھ بجے جائے موعود پر پہنچ جاؤنگا۔" اِدھر آپ نے احباب کو رفعِ انتظار کے لئے خطوط بھیج دیئے چنانچہ بندہ کے نام بھی یہ خط آیا۔

مولانا کا مکتوب بنام مولانا عاشق الٰہیؒ

مکرم مولانا مولوی عاشق الٰہی صاحب مد فیوضکم السلام علیکم۔ آج ۲۰ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ کو قصد روانگی یہاں سے تھا مگر یہاں کے مبتدعین کی تحریک سے مولوی ظہور الحسن رامپوری نے دعوتِ مناظرہ دی لہٰذا تا بدروازہ پہنچانے کے لئے آج قیام کیا۔ چنانچہ بحمد اللہ مبتدعین ذلیل ہوئے اب کل ۲۱ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ یوم چارشنبہ ۸ بجے فجر کو یہاں سے پنجر میں روانگی ہوگی اطلاعاً عرض کیا گیا فقط والسلام خلیل احمد عفی عنہ از راندیر۔

صبح حسب وعدہ جب آپ مقام مناظرہ پر پہنچے تو میدان خالی تھا اور دو گھنٹہ انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ فریق مخالف کا تو رات ہی سے پتہ نہیں چنانچہ آپ منبر پر آئے اور دیر تک مسائل اختلافیہ کی تقریر کی اور یہ بھی فرمایا کہ اسی وقت پر موقوف نہیں جس وقت بھی میری ضرورت ہو میں مستقل سفر کر کے حاضری کے لئے تیار ہوں۔

سفر حج کے نازک موقع پر دیدار علی کی طرف سے دعوتِ مناظرہ

مولوی فاروق احمد صاحب انبہٹوی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ سفر حج کو جاتے ہوئے راستہ میں مولوی دیدار علی الوری کی طرف سے آپ کو عین اس وقت دعوتِ مناظرہ دی گئی جبکہ آپ جہاز میں سوار ہونے کو طیار تھے آپ کے رفقا نے جواب دیدیا کہ اس وقت تو گنجایش نہیں کہ جہاز تیار اور آخری ہے البتہ واپسی پر مناظرہ ہوگا مگر آپ نے سُنا تو بے ساختہ فرمایا کہ نہیں نہیں ہم تیار ہیں۔ کل کو ہم قیام کریں گے اور صبح مناظرہ ہوگا، مولوی صاحب سے کہنا کہ مقام اور مباحثِ مناظرہ آج طے کر لیں۔ اور رفقا کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ مولوی صاحب مناظرہ کرتے ہیں تو ہمیں انکار نہ کرنا چاہئے، حج بشرطِ زندگی دوسرے سال کر لیں گے یہ بھی تو ایک دینی کام ہے۔ یہ جواب سُن کر فریقِ ثانی پر اوس پڑ گئی اور کوئی میدانِ مناظرہ میں نہ آیا حضرت چند روز قیام فرما کر بمبئی روانہ ہو گئے حالانکہ جہاز کی تاریخ روانگی گذر چکی تھی مگر اللہ کی شان کہ اس کو چار دن کسی

غیر معمولی عذر سے ٹھیر نا پڑگیا اور آپ اس میں سوار ہو کر عرب پہنچ گئے۔

روافض سے مناظرہ

تقریر اور تحریر دونوں قسم کے مناظرہ میں آپ کو ملکۂ تامہ تھا مگر اخیر عمر میں ضعفِ دماغ کی وجہ سے آپ طویل تقریر پر قادر نہ رہے تھے اس لئے اپنے کسی خادم یا دوست کو مناظر بٹھا کر کھڑا کر دیتے اور خود پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اخیر نومبر ۱۹۲۰ء کو امروہہ میں جو مشہور مناظرہ روافض کے ساتھ ہوا اس میں مولانا عبد الشکور صاحب کو مناظر بنا کر آپ نے کھڑا کیا اور خود جلسہ کے پورے وقت میں پاس بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ اثناءِ تواریخ مناظرہ میں ۳۰ نومبر مطابق ۱۸ ربیع الاول آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے سانحہ انتقال کی اطلاع ملی مگر آپ میدانِ مناظرہ کو صرف اس لئے نہ چھوڑ سکے کہ فریقِ مخالف فرار پر محمول کر کے مخلوق پر اپنا رنگ جمائے گا۔ آخر جب فریقِ مقابل خائب و خاسر ریل میں سوار ہو لیا تب آپ امروہے سے چلے۔

قادیانیوں سے مناظرہ

اسی طرح اہلِ کوہ لنڈھور نے ایک مرتبہ آپ کو قادیانیوں سے مناظرہ کے لئے بلایا تو آپ فوراً روانہ ہوئے اور مولوی محمد یحییٰ سہسرامی کو کہ مدرسہ کے مدرس تھے مناظر بنا کر کھڑا کیا اور خود پاس بیٹھے رہے۔ ہاں تحریری مناظرہ میں چونکہ وسعت تھی اس لئے رعشہ کی وجہ سے خود لکھنا دشوار تھا کاتب کو پاس بٹھا کر جامع مانع تحریر لکھوا کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مولانا عبد الشکور صاحب اڈیٹر النجم کو یہ تحریر بھیجی اور باوجودیکہ آپ خصوصی طور پر مخاطب نہ تھے مگر احقاقِ حق کیلئے مضطرب ہو کر از خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی کہ النجم میں شائع کر دیں۔

مکتوبِ گرامی بنام مولانا عبد الشکور مدیر النجم

حامداً و مصلیاً۔ از بندہ خلیل احمد۔ بگرامی خدمت مکرم و محترم مولانا مولوی عبد الشکور صاحب دامت مکارمکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہٗ۔ آپ کے اخبار میں ایک عرصہ سے جناب سید مصطفیٰ حسین صاحب شیعی کے سوالات اور ان کے جوابات شائع ہو رہے ہیں۔ ۔ صفر کا النجم دیکھ کر مجھ کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی اس بحث میں حصہ لوں شاید میری قسمت یاوری فرمائے اور مجھ ناچیز کی گذارش حضرت سید صاحب کے لئے تشفی بخش ہو کر سید صاحب کے رجوع الی الحق کا سہرا میری ہی تحریر کے سر بندھے۔

مصطفیٰ حسین صاحب سے خطاب

لہٰذا بذریعہ النجم اول سید صاحب کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ مستدعی ہوں کہ جناب نے تبدیلِ مذہب کے متعلق

اہل سنت کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اگر مجھ کو تشفی بخش جواب ملے گا تو میں سُنّی ہو جاؤں گا؛ اور اہل تشیع سے فرمایا تھا کہ میرے سوالات کا آپ کی طرف سے اگر تشفی بخش جواب نہ ملے گا تو میں سنّی ہو جاؤں گا اگرچہ اہل سنت کا جواب بھی تشفی بخش نہ ہو۔

امر اول کے متعلق التماس ہے کہ جس قدر جوابات لکھے گئے وہ تشفی بخش تھے یا نہیں؟ اگر تشفی بخش تھے تو حسب وعدہ تبدیل مذہب کا اعلان فرما دیجئے اور اگر تشفی بخش نہیں ہوئے اور آپ اپنے وعدۂ تبدیلِ مذہب پر سچے دل سے ثابت قدم ہیں اور یہ وعدہ محض سبز باغ نہیں ہے تو میں خدمت عالی میں ملتجی ہوں کہ اس دفعہ پھر مکرر اپنا وعدۂ تبدیلِ مذہب براہ بندہ نوازی اس عنوان سے النجم میں شائع کرا دیجئے۔

میں سید مصطفےٰ حسین شیعی کورٹ آف وارڈس خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بلا توریہ و تقیہ سچے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اگر اہل سنت میں سے کسی نے میرے سوالات کا جواب تشفی بخش دیا تو میں فوراً سنی ہو جاؤں گا۔

اور امر دوم کے متعلق یہ مضمون شائع فرما دیں کہ میں جو سوالات خدمت میں علماءِ تشیع کے اس سے پیشتر جواب کے لئے پیش کر چکا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ اگر تشفی بخش جواب نہ ہوا تو سُنّی ہو جاؤں گا حضرات بھی تحریرِ جواب میں عجلت نہ فرمائیں تا وقتیکہ میں اس کے بعد دوسری دفعہ اپنے سوالات شائع نہ کروں۔

بندۂ ناچیز اپنی تحریر کے آخر میں چند سوالات بھی بحثِ خلافت کے متعلق لکھے گا۔ بجائے اپنے ان سوالات کے وہ سوالات جو میں پیش کروں گا اپنے شیعہ بھائیوں کی خدمت میں بھیج کر جواب تشفی بخش مانگیں اور تحریر فرمائیں کہ اگر جوابات تشفی بخش نہ ہوئے تو میں بحلفِ شدید و غلیظ بلا تقیہ و توریہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں سنّی ہو جاؤں گا۔ اگر غیر تشفی بخش واقعی ہونے کی صورت میں میں اپنے وعدہ سے ذرا بھی انحراف کروں تو مجھ پر اس جھوٹ اور عہد شکنی کی پاداش میں خدا تعالیٰ قوی و عزیز کی وہ لعنت ہو جو ابلیس و یزید اور تمام اشقیا پر ہو چکی ہے یا قیامت تک ہونے والی ہے۔

اگر حضور نے میری ناچیز استدعا کے موافق اعلان شائع کر دیا تو بحول اللہ و قوتہ میں پوری سعی کروں گا کہ آپ کے سوالات کا تشفی بخش جواب پیشکش کروں اور مجھ کو حسب وعدۂ صادق امام علیہ السلام عین الیقین ہے کہ مجھ کو میرے پروردگار کی طرف سے ضرور حجت تلقین ہو گی اور علماءِ فریقین ان شاء اللہ تعالیٰ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ یہ جواب تشفی بخش ہے۔ اور اگر آپ نے حسب استدعاءِ نیاز مند یہ اعلان شائع نہ فرمایا تو اس سے جو اس کا شرمناک نتیجہ پیدا ہو گا وہ آپ خود دیکھ لیں گے۔

جناب مولانا عبد الشکور صاحب براہِ بندہ نوازی سید صاحب کے اس اعلان کو خاص طور پر اہمیت کے ساتھ اپنے اخبار میں شائع فرمائیں اور دیگر اخبارات میں بھی درج کرا کر تمام دنیا کو اس معاملہ کی طرف متوجہ فرمائیں

اور اس عاجزانہ تحریر کو اپنے اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دیکر بندہ کی عزت افزائی فرمائیں فقط۔

حضرت گنگوہیؒ کی دعا کا اثر

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابتدا میں تقریری مناظرہ نے میری طبیعت ڈرتی اور خصم کے سامنے بیٹھ کر مرعوب ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے اپنے حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ایک صحابی کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دے کر ان کو گھوڑے پر بٹھایا تو اس کے بعد وہ اعلیٰ درجہ کے شہسوار ہو گئے۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے تصرفات امورِ طبیعیہ پر بھی اثر کرتے ہیں لہذا حضرت دعا فرمائیں کہ میرا ضعفِ قلب جاتا رہے اور میں مناظرہ کے وقت خصم سے مرعوب نہ بنوں۔" آپ فرماتے تھے کہ اس کے بعد وہ ضعفِ قلب ایسا رفع ہوا کہ کیسا ہی بڑے سے بڑا مولوی کسی اہلِ باطل کا سامنے آگیا مگر مجھے اتنا بھی معلوم نہ ہوا جتنا ایک سمجھدار شاگرد سامنے بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور مناظرہ کے لئے دل بہت ہی کھل گیا۔

الحاصل بھاولپور کا مناظرہ اس شان سے ختم ہو لیا کہ حضرت غیر ملکی بھرے مجمع میں ایسے زور سے تقریر فرما رہے تھے جیسے شیر دڑکتا ہے اور آخر فریق ثانی کے بیان کئے ہوئے مقدمہ کی آپ نے گرفت فرما کر باآواز بلند کہا کہ یہ عین مذہبِ معتزلہ ہے۔ اللہ کی شان کہ آپ ہم کو معتزلہ بنا رہے تھے خود ہی معتزلہ بن گئے ع لو آپ اپنے دام میں صیاد پھنس گیا۔" یہ سُن کر سارا مجمع مبہوت ہو گیا اور مناظر کو آدھ گھنٹہ ساکت بیٹھے گذر گیا۔ سید چراغ شاہ جو برابر والے کمرہ میں ٹہل رہے تھے بار بار دانت پیستے اور رانوں پر ہاتھ مار رہے تھے کہ افسوس مقابلے کے لئے کوئی ہندوستانی نہ ہوا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔"

بھاولپور سے ترکِ تعلق

یہ خفت وندامت آپ کے ساتھ مزید عداوت کا سبب بن گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا۔ آپ خود ہی بھاولپور سے بیزار تھے، یہ تو صرف احقاقِ حق کا قصہ تھا کہ خود مختار ریاست میں دشمنوں کی قوت کا اندیشہ کئے بغیر آپ مناظرہ کے لئے چلے آئے تھے لہذا آپ نے استعفا دیدیا۔ مگر چند افسروں کی وہ دلی کدورت جو دینی معاملات میں آپ کی طرف سے پڑ گئی تھی آپ کو جسمانی تکالیف پہنچانے کی تحریک کر رہی اور اس سے ان کو غافل بنائے ہوئے تھی کہ ع دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است۔" آخر دنیا نے اس کو دیکھ لیا اور سُن لیا کہ فرعون بادشاہِ مصر ہو کر موسیٰ علیہ السلام کا بال بیکا نہ کر سکا۔ چنانچہ تھانہ دار کے نام حکم آیا کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے مگر خود تھانہ دار ہی نے اس وقت جبکہ آپ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے آپ کو اس کی اطلاع دیدی۔ ادھر آپ کے ایک دوست مولوی احمد کتب فروش احمد پوری نے اس خفیہ کارروائی سے

مطلع ہوکر آپ کے پاس یہ آیت شریفہ لکھ کر بھیجی ان الملأ یأتمرون بك لیقتلوك فاخرج انی لك من الناصحین۔ چنانچہ آپ شب میں روانہ ہوکر اسٹیشن پر آئے اور آخر شب میں جو گاڑی روانہ ہوتی تھی اس پر سوار ہوگئے۔ مولانا جمعیت علی صاحب وغیرہ اکثر احباب آپ کو اسٹیشن پر پہنچانے کے لئے ساتھ آئے اور گو بعد میں حکام کو اطلاع ہونے پر ان سے بازپرس ہوئی مگر انھوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور آپ کے بعد عرصہ تک وہ حضرات ریاست میں ملازم وعہدہ دار رہے۔

بریلی کا قیام

آپ کا بہاولپور سے آنا تھا کہ جگہ جگہ سے آپ کی طلب شروع ہوگئی۔ اسی اثنا میں حافظ محمد جعفر خاں صاحب بریلوی جو نہایت ہی متبع سنت بزرگ تھے گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت امام ربانی کی خدمت میں اپنے مدرسہ مصباح العلوم کے لئے مدرس اول تجویز کرنے کی درخواست کی۔

مدرسہ مصباح العلوم کی بنیاد کہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے بہ بیعت مولانا یعقوب علی خانصاحب بریلوی کہ شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے و مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی کہ اس وقت عربی کالج بریلی کے پروفیسر تھے ۱۲۸۹ھ میں حافظ حافظ جعفر خاں صاحب کی کوٹھی واقع بازار کلاں کے حصۂ زیرین میں اس مدرسہ کا افتتاح فرمایا اور مصبلح التہذیب عرف مصباح العلوم اس کا نام رکھ کر مولوی قادر علی صاحب دہلوی کو مدرس اول قرار دیا تھا۔ چند مدرسین کا تغیر تبدل ہونے کے بعد ایک سال طلبہ کا زیادہ ہجوم ہوا تو شیدائے سنت حافظ جعفر خاں صاحب نے خود گنگوہ جانا ضروری سمجھا اور امام ربانیؒ نے حضرت کو للعہ مشاہرہ پر مدرس اول بنا کر بریلی بھیجدیا۔

حافظ محمد جعفر خاں حافظ محمد جعفر خاں صاحب کپڑے اور گوٹہ وغیرہ کی تجارت کرتے اور تاجرانہ متوکلانہ خوشحالی کے ساتھ دینی نعمتوں سے بھی مالا مال تھے کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر مدنی قدس سرہ سے بیعت اور نسبت مجددیہ کے عاشق و شیدا ہونے کی وجہ سے تمامی بزرگان سلسلہ کے ساتھ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ مصبلح العلوم کا علمی صدقۂ جاریہ آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہے کہ بریلی کی زمین میں حق کی تخم ریزی کے لئے آپ نے اپنی جان ومال کا نچھاور کرنا فخر سمجھا۔

لہ بیشک تو م آپکے لئے مشورے کر رہی ہے کہ آپ کو قتل کردیں آپ یہاں سے نکل جائیے میں آپکے خیر خواہوں میں ہوں۔ ۲ہ مولانا جمعیت علی

مصباح العلوم بریلی میں دو سال

حضرت کا قیام بھی اسی کوٹھی کے اوپر شرقرویہ کمرہ میں تھا جس کے نیچے مدرسہ اور بازار کے رخ اگلے حصہ میں دکانات تھیں حضرت اپنے ساتھ صاحبزادہ حافظ محمد ابراہیم کو لے گئے تھے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بغیر اس کے مشکل تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ حافظ جعفر خاں صاحب کا بہت ادب و احترام فرمایا کرتے کہ بڑوں کے دیکھنے والے تھے مگر اس کے ساتھ ہی حافظ صاحب مرحوم حضرت کا اتنا احترام فرمایا کرتے تھے گویا پیر ہیں، اس لئے جب تک حضرت کا قیام بریلی میں رہا دونوں وقت حضرت کا اور صاحبزادہ کا کھانا حافظ صاحب کے مکان سے آتا رہا۔ چندہ بھی قلیل تھا اس لئے حضرت کی تنخواہ کے کفیل بھی حافظ جعفر خاں صاحب ہی تھے۔ حضرت کے بریلی تشریف لانے سے مدرسہ مصباح العلوم کے تنِ مردہ میں جان پڑگئی اور طلبہ و اراکینِ مدرسہ سب ہی حضرت کے علم و فضل اور خلق و دیانت کے معتقد ہو گئے مدرسہ کے آمد و خرچ کا حساب بھی حضرت کے حوالہ تھا مگر فراہمی چندہ اراکین مدرسہ اور حافظ صاحب کے بڑے صاحبزادہ حافظ علی احمد خاں مہتمم مدرسہ کا کام تھا۔

بریلی میں حضرت کے معمولات

ہر چند کہ حضرت کو مختلف علوم و فنون کی متوسط اور بڑی کتابیں پڑھاتے ہوئے پندرہ سال گذر گئے تھے مگر شب میں اس کتاب کا مطالعہ جس کا سبق صبح کو پڑھانا تھا گویا حضرت کی عادت ہو گئی تھی چنانچہ بریلی تشریف لا کر بھی مغرب سے عشاء تک حضرت کتاب دیکھتے اور بعد نماز عشاء کھانا تناول فرما کر تھوڑی دیر پھر مطالعہ میں مشغول رہتے اس کے بعد سو جاتے اور آخر شب میں اٹھ کر تہجد پڑھا کرتے۔ نمازِ فجر کے بعد تلاوت اور وظائف میں مشغول رہتے - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - اور اشراق کے بعد مدرسہ میں تشریف لے آتے تھے۔ گرمی میں دس بجے تک اور موسم سرما میں گیارہ بجے تک صبح کو دورۂ حدیث اور بعد دوپہر ظہر سے عصر تک فقہ کا درس دیتے تھے۔ دوپہر میں کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر قیلولہ فرمایا کرتے اور اسی درمیان میں جو وقت ملتا صاحبزادہ محمد ابراہیم کو پیار و شفقت کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔

طرزِ تعلیم و تربیت

حضرت کا طرزِ تعلیم بہت ہی پیارا تھا کہ طلبہ کو نہ مارتے تھے نہ جھڑکتے تھے، نہ ان کی فہم سے بالا تقریر کرتے اور نہ نفسِ مطلب سے زیادہ غیر ضروری بات بیان فرماتے، خندہ روئی اور مسکراہٹ کے ساتھ پڑھاتے اور کوئی طالب علم و ہمی[1] شبہات یا کجی[2] کے سوالات کرتا

---

[1] کمزور۔ [2] ٹیڑھے پن کے۔

تو بے رخی کے ساتھ ٹال دیتے اور نرمی کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اصل مطلب سمجھنے کی کوشش کرو اور زوائد کے پیچھے نہ پڑو کہ اس سے علم میں بے برکتی ہوتی ہے۔ مطالعہ دیکھنے کی طلبہ کو زیادہ تاکید فرماتے اور عبارت پڑھنے میں صرف و نحو کی رعایت پر بہت نظر رکھتے تھے غلط اعراب پر ٹوکتے اور زور ڈلواتے کہ خود ہی طالب علم تصحیح کرے تاکہ قواعد صرف و نحو کا علمی اجراء ہوتا رہے۔ پڑھانے کے ساتھ طلبہ کی صورت وضع اور عملی حالات پر بھی نظر رکھتے اور خلاف شرع بات پر سختی سے ٹوکتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ ابھی آزاد ہو گے تو پڑھ لکھ کر خود بھی ڈوبو گے اور دوسروں کو بھی ڈبوؤ گے، علم سے مقصود ہی عمل ہے پس علم کے ساتھ ساتھ عمل کی پوری عادت ڈالو کہ پھر اس عادت میں لذت[1] و حلاوت پیدا ہو۔ یہ خیال کہ عالم بن کر عمل کر لیں گے محض شیطانی خیال ہے۔ شریعت نے تو دس برس کے بچہ کو مار کر نماز پڑھوانے کا حکم دیا ہے حالانکہ ابھی اس پر نماز فرض نہیں ہوئی کیونکہ جب تک پہلے سے عادت نہ ہو بالغ ہوتے ہی نماز کا پابند بن جانا دشوار ہے اور طالب علم تو بہرحال عمل کا مکلف بلکہ مقتدا بننے کا وقت قریب ہونے کے سبب عمل میں پختہ ہونے کا زیادہ ضرورتمند ہے۔ اس لئے جتنی کوشش علم کی ترقی اور پڑھے ہوئے کے محفوظ رکھنے میں کی جائے اس سے زیادہ عمل کی رغبت اور پابندی شریعت کو ہر ہر قدم پر ضروری سمجھنے میں کی جائے کہ مقتدا بنکر آزاد طبع کا یکدم مقید بننا بہت دشوار ہے اور ایسوں کو خوار و خراب ہی ہوتے دیکھا ہے جو طالب علمی کے اس زمانہ کی قدر نہیں کرتے جس میں خاص رحمت الٰہیہ کا ان پر نزول ہوتا اور فرشتے ان کے قدموں میں اپنے بازوؤں کا فرش بچھاتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ طلبہ کسی قابل ذی استعداد مدرس کے جویاں تھے اور یہ وہ زمانہ آیا کہ مدرس کو ذکی و سمجھدار طلبہ کی طلب ہوئی اور جیسے محنتی طالب علم آپ چاہتے تھے جب وہ نہ مل سکے تو آپ کو وحشت ہوئی کہ ایسے درس میں علمی ترقی نہیں ہو سکتی اور آپ نے گنگوہ لکھا کہ کسی ایسی جگہ بھیج دیجئے جہاں میری علمی ترقیات متوقع ہوں۔ نیز مدرسہ میں مدرس فارسی کی ضرورت تھی اس کی تجویز کے لئے بھی آپ نے حضرت کی خدمت میں لکھا چنانچہ یہ جواب آیا۔

حضرت گنگوہیؒ کا مکتوب

از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ گرامی قدر مولوی خلیل احمد صاحب دام فیوضہم بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کا پہلا خط آیا تو چونکہ کوئی مدرس ذہن میں نہ تھا جواب میں تامل ہوا، یہ دوسرا خط آیا اور عزیز ابراہیم حسن بھی پہنچا تو وہ کہتا ہے کہ کتب فارسیہ کو محنت کر کے پڑھاؤں گا اور میڈل بھی اس نے کیا ہے وہ میری ہمشیرزادہ کا پسر ہے۔ اکثر پنجاب میں رہا اور وہیں گھر بنا لیا اس واسطے آپ واقف نہیں، اب وہ بتقریب اپنے نکاح کے کہ

[1] مزہ و شیرینی۔

کیرانہ میں عقد ہوا ہے گنگوہ آیا تھا اگرچہ اس کی رائے تحصیل علمِ دین کی ہورہی ہے مگر بسبب نکاح کے معاش کا فکر ہوا ہے لہذا اچھا ہے کہ بریلی میں رہے اور کچھ آپ سے خود بھی پڑھے، اگر وہ وہاں ہوگیا تو میری خوشی ہے مگر اس قدر خیال رہے کہ اس کی قلیل خلاف مرضی پر سرزنش نہ ہو اور زیادہ پر مختار ہو موقوف کردینے میں رنج نہ کروں گا۔ فقط۔

طلبہ کی شکایت بجا ہے مگر اس زمانہ میں ایسے ہی طلبہ ہیں۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز[1] صبر کر کے پڑھائے جاؤ اور ترک میں جلدی مت کرو۔ جب یاس[2] ترقی سے ہو جائے اس وقت جو کچھ مقدر ہے ہو جاوے گا۔ مولوی محمود حسن کی صحت سے مسرور ہوا، سلام مسنون اُن کو اور حافظ احمد حسن اور حافظ محمد جعفر خاں اور شیخ محمد حسن وغیرہم کو فرمادیں۔ سبق سولھویں شوال سے شروع ہوگئے ہر قسم کے طلبہ یہاں بھی ہیں۔ فقط

ہر چند کہ براہین قاطعہ کے متعلق یہاں بھی بہت کچھ شور مچا ہوا تھا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ مدرسہ میں آکر آپ سے ان مسائل کی بابت سوال کرے یا مناظرہ کی دعوت دے بلکہ آپ کا دل چاہتا تھا کہ بھرے مجمع میں مناظرہ ہو جائے مگر اس کی نوبت ہی[3] نہ آئی۔

حافظ جعفر خاں صاحب کے منجھلے صاحبزادہ حافظ حضور احمد خاں جو حضرت کی قیام گاہ کے کمرہ کے مقابل غرب رویہ میں رہتے تھے تحریر فرماتے ہیں:۔

مولانا یعقوب علی خاں کا ارشاد اور مولانا کا جواب

مولانا یعقوب علی خاں صاحب نے جو کہ مولوی احمد رضا خاں کے والد مولوی نقی علی خاں کے استاد اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے شاگرد خوش عقیدہ بزرگ تھے ایک مرتبہ حضرت سے فرمایا کہ مسئلہ امکانِ کذب جو عمومِ قدرت کا مرادف ہے عوام تو عوام معمولی مولویوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے عالم ذکی و متبحر ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو آڑ بنا کر بدعتی مولویوں نے عوام کو خلجان میں ڈال دیا اور اہلِ حق کی طرف سے بدگمان بنا کر بھڑکا دیا یہ مسئلہ آپ کو لکھنا نہ چاہئے تھا" حضرت نے فرمایا کہ حضرت آپ کیا فرمائیں گے شاہ اسمٰعیل صاحب شہید کے متعلق جنھوں نے شرک و بدعت کا کھول کھول کر بیان فرمایا جس کی بدعتیوں میں آج تک شورش برپا ہے؟ یہ سن کر مولانا مسکرائے اور خاموش ہوگئے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہ ایک شبہ ہے جو اکثر دیندار طبیعتوں میں پیدا ہو جاتا اور وہ مخالفین کی شورش سے محزون و مصدوم ہو کر مخلصانہ و محبانہ درجہ میں کہدیا کرتے

---

[1] زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم زمانہ سے موافقت کرلو یعنی برداشت کرلو۔
[2] ناامیدی [3] اور خود مناظرہ کی تحریک پسند نہ تھی۔

ہیں کہ آخر اس مسئلہ کی باوجودیکہ اس کے حق ہونے میں کلام نہیں مگر بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ فتنہ برپا ہوگیا۔ مگر بات یہ ہے کہ

اول تو کسی کو یہ علم نہیں کہ فلاں بات کا اظہار سبب فتنہ ہو جائے گا اور فلاں بات پر کوئی شورش نہ ہوگی کہ مغیبات کا علم حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوم از خود ایک امر کی اشاعت میں اور کسی مستفتی کے استفتاء پر جواب دینے میں بہت فرق ہے کہ امر دوم میں عالم پر اظہارِ حق ضروری ہے ورنہ صحابہؓ کی شان میں لایخافون فی اللہ لومۃ لائم[1] ایک بے محل قول ہوگا۔ جس کا مقتضا یہ ہے کہ اہلِ حق سے ایسے امور کا صدور ضرور ہوگا جس پر مخالفوں کی طرف سے ملامت ہو اور ان کا ثبات قدم[2] جانچا جائے گا کہ اس کی پروا نہ کریں۔ پس کس کی طاقت ہے کہ لائم[3] کو ملامت سے روکے اور کون صاحب حق ہے جو اس ملامت سے خائف ہو کر کلمۃ الحق سے باز رہا۔

سوم عادت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ دنیا کی نظروں میں کیسی ہی غیر ضروری[4] بات ہو اس کا صدور ہو کر رہے تاکہ موافق و مخالف دودھ اور پانی بن کر جدا ہو جائے۔ پھر اس ابتلا سے جو ایک ہی وقت میں کسی عالم حقانی و شیخ ربانی کی خدا پرستی اور راستی کے ساتھ ہی ساتھ عوام و متبعین کے اخلاص و شائبہ ہوائے نفس دونوں کا امتحان لینے کے لئے منصبِ ارشاد کا جزو لاینفک[5] ہو کر تجویز کی گئی ہے کون بچ سکتا ہے یا مقدر کا مقابلہ کر کے کون اس سے روبراہ ہو سکتا ہے۔

چہارم جو قابلِ غور اور تحقیقی امر ہے وہ یہ ہے کہ شورش و مخالفت کا مدار عناد[6] و کبر پر ہے نہ کہ کسی مسئلہ پر۔ پس جن لوگوں کی طبیعت میں کسی کی طرف سے اپنی بڑائی کے زعم میں عناد و حسد ہوگا وہ اس بات پر بھی شور مچائے گا جو کسی طرح بھی شور کے قابل نہ تھی۔ اور جس کو عقیدت ہوگی وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی خلاف یا انکار نہ کرے گا۔ بلکہ گرانی تک نہ لائے گا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سچے اور کھلے دعوے پر کہ کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے، سرزمینِ عرب میں فتنہ و فساد کی وہ آگ مشتعل ہوگئی جس نے بارہ برس تک عالم کو حیرت ناک منظر دکھایا اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ سُن کر بھی حیرت نہ ہوئی کہ آپ ایک لمحہ کے اندر با جسد مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر ساتوں آسمان اور جنت و دوزخ کی سیر اور تمامی عالم بالا کی سیاحت سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر تشریف لے آئے کہ اس قصۂ معراج پر دوسرے ہنستے مذاق اڑاتے، اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے تھے مگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو تعجب اور شک بھی نہ تھا۔

---

[1] اللہ کے حب میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ [2] ثابت قدم رہنا۔ [3] ملامت کرنے والے کو۔ [4] دین کی حفاظت اور غیر سے ممتاز کرنا علمائے حق کا فریضہ ہے اور خلاف میں مداہنت کا خطرہ ہے اگر جان کا خطرہ نہ ہو۔ [5] جدا نہ ہو سکنے والا جز۔ [6] دل کا کینہ و غرور۔

کہ یہ سیر و سیاحتِ طویلہ قلیل زمانہ میں خواب تھی یا حقیقت؟

پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیق رضؓ عرض کرتے کہ یا رسول اللہؐ بات تو بالکل حق ہے مگر اس کا اظہار مناسب نہ تھا کہ ذاتی کمال کے متعلق ایک امر ہے جس کے اظہار سے خواہ مخواہ شورش ہوگی تو میرے خیال میں حضرت صدیق رضؓ اس مشورہ میں خیر خواہ نہیں بلکہ خاطی قرار پاتے اور صاف یہ جواب ہوتا کہ مخالف و معاند کے قلب سے عداوت کا نکالنا میرے بس کی بات اور قبل از وقوع معلوم کرنا کہ اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوگا اللہ عالم الغیب ہی کے لئے مخصوص ہے، اور میں اس کا مکلف بھی نہیں کہ معاندین کی رعایت ملحوظ رکھ کر اپنی ناموس[۱] کو محفوظ رکھنے کی فکر کروں کہ ایسی شورش سے تو مخالفین نے اللہ رب العالمین کو بھی نہیں چھوڑا، اور بعوضہ[۲] و عنکبوت کا قرآن مجید میں ذکر آیا تو کہہ اٹھے بھلا ان حقیر جانوروں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ برتر کو شرم نہ آئی کہ ارفع و اعلیٰ ذات ہو کر ایسے خسیس و دنی کا ذکر شروع کر دیا؟ پس جب اللہ عالم الغیب نے مخالفین کی شورش کو جان بوجھ کر استغنا فرمایا بلکہ یہ مصلحت و خوبی مرتب فرمائی کہ اس تذکرہ سے خدا پرست و نفس پرست اور دوست و دشمن کا دنیا کو پتہ چل گیا تو میں کون کہ اللہ اپنے موافقین اور مخالفین کو یا مخلصین و منافقین کو ممتاز و متمیز کرنے کے لئے مجھے آلۂ کار بنائے اور میں مصلحت بینی کا عذر پیش کروں۔ ہاں دوستوں کی رعایت کہ ان کے فہم سے زیادہ بار اُن پر نہ ڈالا جائے اور وہ کسی فتنہ میں نہ پڑیں، اباحت کے تحت میں داخل ہے مگر بشرطیکہ اس کا علم ہو اور نیت بھی بخیر ہو۔

پس اصل بحث کسی کلام کے حق یا باطل ہونے میں کرنا مضائقہ نہیں مگر جب اس کا حق ہونا واضح ہو جائے تو اب بہ الزام کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہ تھی گویا اپنے کو مصلحت بین اور اہلِ حق کو دور اندیشی سے بے بہرہ سمجھنا ہے جو سوء ادب اور ضعفِ عقیدت سے خالی نہیں کہ ؎

احمد[۳] تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

آج سیدنا آدم سے لیکر اس وقت تک جتنے بھی ان گنت اللہ والوں کی فہرست مرتب ہوگی ان میں غالباً ننانوے[۹۹] فی صدی ہوں گے جن کو مخالفین کی شورش کا یہ فتنہ نہ پیش آیا پھر کس کس کو کہا جائے کہ فتنہ سے بچنا فرض تھا اور غیر ضروری بات کا اظہار کرکے عوام میں شور مچوانا اور سب و شتم کرواکے دونوں کا دل دکھوانا مناسب نہ تھا کہ یہ بھی محبوب کی ایک ادا ہے اور محب کا کام ہے کہ برضا اس کے

---

[۱] عزت۔ [۲] مچھر اور مکڑی۔ [۳] احمد تم تو عاشق ہو تم کو پیر بننے سے کیا کام بس ان کے دیوانے ہو جاؤ سلسلہ بیعت و اصلاح ہو ہو نہ ہو نہ ہو۔

سامنے گردن جھکائے ؎

صبرکن درکارِ خضر اے بے نفاق[1] تانگوید خضر رو ھٰذا فراق

ھذہ سنۃ اللہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا[2]۔

حافظ امیر اللہ اور ایک شیعہ حافظ امیر اللہ صاحب بریلوی ایک صاحب تھے جنھوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں ایک شیعہ سے اختلافی مسائل میں ان کی کچھ گفتگو ہوگئی اور وہ پریشان ہوکر بریلی کے نامی علماء کے پاس آئے کہ ان سوالات کا جواب دیا جائے۔ حافظ سردار احمد بریلوی لکھتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کی طرف سے ان کو جواب ملا کہ ہاں جواب تو ممکن ہے مگر ایک ہزار روپیہ ہونا چاہئے۔ حافظ صاحب نے فرمایا آخر جواب کے لئے اتنی کثیر رقم کی کیا ضرورت ہے؟ تو معلوم ہوا کہ ان کی مذہبی کتابیں خرید کر مطالعہ کی جائیں گی اس وقت جواب لکھا جائیگا بغیر اس کے جواب ممکن نہیں ہے"۔ اختلافِ عقائد کے سبب ان کو حضرت کے ساتھ مناسبت نہ تھی مگر مجبوراً بادلِ ناخواستہ وہ مصباح العلوم میں آئے اور حضرت سے مسائل مسئولہ کا تذکرہ کیا، حضرت نے جواب فوراً لکھدیئے۔

مطرقۃ الکرامہ کا سببِ تالیف اور یہ فرما کر کہ اس بحث ہی کا انشاء اللہ خاتمہ کردوں گا مطرقۃ الکرامہ کی تالیف شروع کردی جس کا حصہ اول طبع ہوکر شائع اور اب نایاب ہوچکا۔ حضرت اس تمنا و انتظار میں کہ کاش علماء شیعہ اس کا جواب دیں چالیس برس گذار کر عالمِ قدس کو سدھار لئے مگر اس کا برائے نام بھی اب تک جواب نہیں ہوا۔ حافظ امیر اللہ صاحب جوابات دیکھ کر حیران رہ گئے اور جب تک زندہ رہے اس کا اعتراف کرتے رہے کہ حضرت اپنے وقت کے علامہ ہیں۔ کم وبیش دو سال حضرت نے بریلی میں قیام فرمایا۔

دیوبند میں منصبِ تدریس پر تقرر اور آخر حضرت امام ربانی نے آپ کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام تجویز فرما کر آپ کو لکھدیا کہ گو تنخواہ میں عــــہ[3] کا تنزل ہے مگر تمہاری علمی ترقی کا لحاظ کرکے اس کو پسند کرتا ہوں"۔ حضرت کو کمی بیشی کا خیال کیوں ہونے لگا تھا جبکہ آقائے روحانی کا مشورہ تھا، آپ کے لئے تو بڑی دولت مرشد کی رضا و خوشنودی تھی اور اس صورت میں تو شیخ کا قربِ جسمانی اور مرکزِ علوم کی خدمت کا وہ روحانی احتظاظ بھی شامل تھا

---

[1] اے خلوص والے حضرت خضر کے کام میں صبر کیا کرو تاکہ خضر یوں نہ کہدیں جاؤ یہ جدائی ہے [2] یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت کا طریقہ ہے اور تم ان کے طریقہ میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ [3] دس روپے۔

جس کا شوق مدت سے آپ کے قلب میں جوش زن تھا اس لئے آپ روانگی دیوبند کے لئے تیار ہو گئے اور ظاہر کر دیا کہ میں دیوبند جا رہا ہوں یہاں کے لئے مدرس تجویز کر لو۔

اہل بریلی خصوصاً حافظ جعفر خاں صاحب کے رنج و ملال کا کیا پوچھا کہ اس قیام میں وہ لوگ حضرت کے عاشق و فریفتہ ہو گئے تھے اور حضرت کو بھی ان صاحبوں کے ساتھ بالخصوص حافظ جعفر خاں صاحب کے بچہ بچہ کے ساتھ اتنا انس تھا کہ ان کے گھر کو اپنا گھر اور ان کے بچوں کو اپنے بچے سمجھتے تھے اس لئے حضرت کو بھی مفارقت کا رنج تھا مگر مصالح دینیہ اسی مفارقت کو مقتضی تھے لہذا حافظ جعفر خاں صاحب بھی حضرت امام ربانی کی تجویز کو پختہ سمجھ لینے کے بعد خاموش ہو گئے مگر یہ ضرور کہا کہ روانگی سے قبل آپ خود ہی اپنی جگہ کسی کو بٹھاتے جائیں کہ مدرسہ کا کام بند نہ ہو اور آپ کی تجویز آپ ہی کے قیام کا حکم لیکر ہمارے سروں کا تاج بنی رہے مگر اب مدرس کی تنخواہ ۲۵ ہوگی کہ للعہ حضرت ہی کے لئے مخصوص تھے۔ حسن اتفاق سے مولوی سید محمد عمر صاحب ولایتی بہ تلاش روزگار آنولہ کے بعض صاحبوں کی سفارش لے کر انہی دنوں میں حافظ جعفر خاں صاحب کے پاس آئے اور جناب حافظ صاحب نے ان کو حضرت کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت نے ان سے باتیں کیں اور پرکھ لیا کہ خوش عقیدہ ذی استعداد اور نیک طبیعت عالم ہیں اس لئے ۲۵ ماہوار پر ان کو راضی و دل نہاد پا کر حافظ جعفر خاں صاحب سے فرمایا کہ مبارک ہو آپ کی خوش نصیبی ہے کہ گھر بیٹھے کام کا مولوی مل گیا۔ چراغ لے کر ڈھونڈتے تو ۵۰ میں بھی ایسا شخص نہ ملتا۔ یہ غیبی سامان ہے اس کو نعمت الہیہ سمجھ کر قدر کرو۔ چنانچہ آپ مولانا ممدوح کو اپنی جگہ بٹھا کر اخیر ۱۳۲۸ھ[1] میں بریلی سے روانہ ہوئے اور دار العلوم دیوبند میں مدرس بن کر تشریف لے آئے۔

ہر چند کہ آپ کا تعلق ملازمت مدرسہ سے قطع ہو گیا مگر آپ کے قلب کو مدرسہ اور اہل مدرسہ سے تازیست ایسا تعلق رہا کہ اس کی ترقی و آبادی سے خوش ہوتے اور جب اراکین و ممبران کے باہمی نزاع یا کسی امر میں مدرسہ کو نقصان پہنچانے والے اختلاف کو سنتے تو رنجیدہ و مغموم ہوا کرتے تھے۔ نیز اہل حق کے ساتھ انس و محبت اور اتباع کی طرف کشش اور رغبت کا جو تخم آپ نے بریلی کی زمین میں ڈالا اور دو برس اس کو سینچا اور نیولایا تھا وہ ضائع ہونے والا نہ تھا اس لئے آپ کبھی کبھی کسی نہ کسی حیلہ سے بریلی آکر اپنی امید افزا کھیتی کو دیکھ جایا کرتے تھے اور دعا فرمایا کرتے تھے کہ بدعات کی ظلمت دور ہو اور سنت کا نور چمکے۔ چنانچہ آخر وہ بار آور ہو کر رہا، پھولا پھلا اور مہکا۔

---

[1] یہ واقعہ ۱۳۰۸ھ کا ہے کسی غلطی سے ۱۳۲۸ھ بن گیا بعد میں تقریباً ۱۰ صفحے کے بعد صحیح آرہا ہے اور اس کے بھی اتنے ہی صفحہ بعد ادھر ہے۔

بس تجربہ کردیم دریں دار مکافات ؎ با دُرد کشاں ہر چہ در آویخت بر آویخت

حافظ محمد جعفر خاں اور ان کے خاندان کو جن کے مکان پر حضرت نے دو سال رہایش فرمائی تھی دینی نعمت سے مالا مال ہونا مقدر تھا اس لئے وہ تخم محبت جو حضرت ان کی زمین قلب میں ڈال آئے تھے آخر اپنا رنگ لایا اور ان کے دو پوتے مولوی محمد فاروق و مولوی محمد اسحاق مرحوم سہارنپور و دیوبند سے فارغ التحصیل اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

مولوی محمد اسحاق شاگرد و ارادتمند

مولوی محمد اسحاق مرحوم تو حضرت کے اتنے گرویدہ رہے کہ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے بھی وطن کا رخ کرنا پسند نہ آیا اور سفر و حضر کے خادم بن کر حضرت کی خدمت میں رہ پڑے بلکہ ان کو تو اپنا مرنا بھی حضرت کے قدموں ہی میں بھلا معلوم ہوا اور انھوں نے اپنی قبر کے لئے سہارنپور سے بہتر کسی زمین کو نہ سمجھا۔ چنانچہ مرحوم کے بھائی حافظ سردار احمد لکھتے ہیں کہ بھائی مرحوم تپ کہنہ میں مبتلا ہو کر والدہ محترمہ کے بلانے پر بریلی چلے آئے اور علاج ہونے لگا مگر مرض میں کمی نہ ہوئی بلکہ دن دونی رات چوگنی ترقی شروع ہوگئی۔ لیکن جوں جوں مرض بڑھتا تھا دن دون مرحوم کو سہارنپور واپس جانے کا شوق بڑھتا تھا۔ آخر جب انھوں نے دیکھا کہ جس سے بھی کہتا ہوں وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک صحت نہ ہو جائے سہارنپور جانا مناسب نہیں تو وہ اپنے مرض کو چھپانے اور افاقہ و صحت ظاہر کرنے لگے۔ آخر ایک دن مجھ سے فرمایا کہ بھائی مجھے ایک حصہ تو بیماری ہے اور دس حصہ یہاں کی ظلمت بدعات اور لوگوں کا تتبع سنت نہ ہونا روحانی کوفت ہے جس سے میں اندر ہی اندر گھلا جاتا ہوں۔ اگر مجھے تم سہارنپور بھیج دوگے تو امید ہے کہ حضرت کے قدموں میں پہنچکر آرام ہو جائے گا اور آرام بھی نہ ہوا تو خاتمہ بخیر ہو کر آخرت کا آرام تو ضرور ہی ملے گا۔

مختصر یہ کہ انھوں نے کسی کی نہ سنی اور آخروہ سب عزیزوں کو آزدہ خاطر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے، وہاں پہنچکر اعزہ کی تسکین کے لئے اپنے افاقہ اور رو بصحت ہونے کے خطوط لکھتے رہے حالانکہ ان کی ہڈیوں تک پہنچ جانے والا بخار اندر ہی اندر گھاس میں چنگاری کا کام دے رہا تھا آخر بارہ تیرہ دن بعد حضرت رح کا گرامی نامہ دادا صاحب کے نام آیا کہ اسحاق کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور ان کے

؎ اس بدلہ کے جہان میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ تلچھٹ پینے والوں میں حب الٰہی کی شراب والوں میں جو الجھا وہ گرا۔ یہاں جو مخالف رہے وہ گرے اور حق چمک اٹھا۔

ع مدرسۂ قدیم کی مسجد کے متصل جنوب میں ایک حجرہ اور اس کے سامنے سہ دری بنی ہوئی ہے ایک زمانہ میں اس حجرہ میں مولوی شمس الحق، مولوی محمد حامد، مولوی بدر عالم میرٹھی نیز مولوی محمد فاروق اور مولوی محمد اسحٰق بریلوی رہتے تھے۔

پاس ہر وقت ایک آدمی رہنے کی ضرورت ہے لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سردار احمد کو بھیج دو کہ اپنے ساتھ مولوی اسحاق کو بریلی لیجائیں۔" چنانچہ میں روانہ ہو کر سہارنپور مدرسہ میں اس وقت پہنچا جبکہ عصر کی نماز ہو چکی اور بھائی اسحاق سہ دری کے ستون سے کمر لگائے باہر ہی بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر تعجب سے کہنے لگے کہ خیریت تو ہے تم کیوں آئے میں نے تو اپنی حالت کا کوئی خط لکھا نہیں تھا۔ میں نے کہا ہاں تم نے تو نہیں لکھا مگر حضرت کا گرامی نامہ پہنچا کہ میں آکر تم کو بریلی لے جاؤں، یہ سن کر بالکل خاموش ہو گئے اور چہرہ پر حسرت برسنے لگی۔ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت نے داداصاحب کی خیریت دریافت فرما کر مجھ سے کہا کہ مولوی اسحاق سے مل لئے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں مل لیا۔ پھر فرمایا کس گاڑی سے روانگی کا قصد ہے؟ میں نے عرض کیا جو گاڑی حضرت کے نزدیک مناسب ہو۔ فرمایا کل دن کے دس بجے کی گاڑی سے چلے جاؤ۔

بعد مغرب بھائی مرحوم جواب تک اسی قلق و حسرت میں ٹھہر رہے تھے مجھ سے فرمانے لگے بھائی کیا واقعی تم مجھے بریلی لیجاؤ گے؟ میں نے کہا ہاں حضرت کا یہی حکم ہے اور دس بجے دن کی گاڑی طے ہو گئی۔ فرمایا اچھا حضرت سے کل شام تک ٹھیرنے کی اجازت لے لو۔ میں نے کہا کہ حضرت سے مراجعت کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ یہ سن کر عزیز نے قلق کے ساتھ اتنا کہا میری آرزو تو یہ تھی کہ میری مٹی یہیں عزیز ہو اور حضرت میرے جنازہ کی نماز پڑھائیں۔ اور پھر خاموش ہو گئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو[1]

مولوی اسحاق مرحوم کو درحقیقت حضرت کے ساتھ عشق تھا اور اسی نے ان کو اپنی جوان موت خوشگوار بنادی تھی کہ وہ مرنے کے متمنی تھے مگر شیخ کے قدموں کے نیچے اور یہی ان کی آخری زندگی کا منتہائے مراد تھا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے ۔ یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

محب کو ایسی موت اگرچہ وہ جوان مرگ ہو پیاری معلوم ہوا کرتی اور وہ اس کو لقاءِ محبوبِ حقیقی کا واسطہ سمجھ کر اس کی آرزو کرتا اور کہا کرتا ہے ؎

خرم آں روز کہ ازمنزلِ ویراں بروم[2] ۔ راحتِ جان طلبم وز پئے جاناں بروم

---

[1] زندہ رکھیں تو آپ کی عنایت ہے اور مار ڈالیں تو آپ پر فدا ہوں جان آپ پر فریفتہ جو کچھ آپ کریں آپ کی مرضی۔
[2] میں اس دن خوش ہوں گا کہ اس ویران گھر (دنیا) سے روانہ ہوں گا جان کی راحت طلب کروں گا اور محبوب کے لئے روانہ ہوں گا۔

نذر[1] کردم کہ گر آید بسر این غم روزے ۔۔۔ تا درِ میکدہ شادان و غزل خواں بروم

مگر سچی محبت کا ثمرہ محبوب کی صرف اطاعت ہے لہذا مرحوم کی تمنا حسرت سے بدل گئی اور وہ یہ سمجھ کر کہ بہتر ہے آخر بریلی بھی کچھ دور نہیں کبھی تو تشریف لانا ہو ہی جائے گا راضی برضا[2] ہو گئے ؎

کششے[3] کہ عشق دارد نگذاردت بدیں ساں ۔۔۔ بجنازہ گر نہ آئی بمزار خواہی آمد

بعد مغرب کہنے لگے دل چاہتا تھا کہ آج حضرت اپنا پس[4] خوردہ کھلا دیتے کہ پھر خدا جانے نصیب ہو یا نہ ہو مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خدا کی شان کہ عشا سے قبل حضرت کے مکان سے پیالہ آیا اور آدمی نے کہا کہ یہ حضرت نے اپنا بچا ہوا کھانا مولوی اسحاق کے لئے بھیجا ہے کہ رغبت ہو تو کھالیں مگر اسوقت مرحوم پر غشی طاری تھی لہذا اس کو رکھ دیا گیا اور اسی حالت میں عشا کی نماز ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ان کو افاقہ ہوا اور میں نے ان کو حاجت ضروری سے فارغ کرا کے وضو کرایا اور انھوں نے اپنے حجرہ میں عشا کی نماز پڑھی اس کے بعد کھانا مانگا اور حضرت کا پس خوردہ رغبت کے ساتھ کھا کر ضروری اسبابِ سفر کے متعلق کہتے سنتے رہے۔

تکان کی وجہ سے مجھ پر نیند کا غلبہ تھا اس لئے ۱۲ بجے انہی کے پاس فرش پر لیٹ رہا مگر مرحوم کو پیاس زیادہ تھی اس لئے ذرا ذرا دیر بعد اٹھ کر ان کو پانی یا عرق گاؤزباں پلاتا رہا اور پھر سو گیا تقریباً صبح کے چار بجے تھے کہ میری گھبرا کر آنکھ کھلی اور میں نے بھائی کو آواز دی، جواب نہ پایا تو میں پلنگ پر بیٹھا اور دیکھا کہ طلسم[5] عالم ہستی کا عقدہ کھل رہا ہے اور عزیز بسوئے عالم قدس کوچ کر رہا ہے۔ میں نے باآواز کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کیا کہ ایک معمولی سی ہچکی آئی اور بجائے بریلی کے سفر آخرت شروع ہوا اور ختم بھی ہو لیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت مجھ پر جو کچھ گذری اس کو کیا بیان کروں کہ یہ واقعہ ہے ؎

موت پر کچھ بس اگر چلتا کسی کے ہجر میں ۔۔۔ میں تو کیا کوئی نہ ہوتا شرمسارِ[6] زندگی

صبح کو حضرت تشریف لائے اور تھوڑی دیر میں مبطون شہید کو نہلا کر اور سفید پوش بنا کر دار الطلبہ میں لا رکھا گیا حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی کہ جان نثار کی دلی آرزو بر آئی اور ۹ بجے سے قبل دفن سے فارغ ہو لئے۔

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے ۔۔۔ کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

---

[1] میں نے منت مان رکھی ہے کہ جس کسی دن سر سے یہ غم آجائے گا میخانہ کے در تک خوش خوش غزل پڑھتا جاؤنگا۔ [2] موت کی خوشی پر خوش۔ [3] عشق جو کشش رکھتا ہے وہ آپ کو اسی طرح نہیں رہنے دے گا۔ اگر جنازہ پر نہیں آئیں گے تو مزار پر تو آئیں گے۔ [4] کھانے سے بچا ہوا جسے لوگ جھوٹا کہدیتے ہیں مگر یہ خود جھوٹ ہے [5] کہ وجود کی دنیا کے جادو کی گرہ کھل رہی ہے موت آرہی ہے [6] زندگی شرمندہ۔

پھر حافظ سردار احمد بھی جو کہ آزاد طبیعت رکھتے تھے بیعت کے خواہشمند ہوئے مگر حضرت نے انکار فرمادیا کہ تم متبع شریعت نہیں ہو۔ مگر جب انھوں نے وعدہ کیا کہ عمل کروں گا تو حضرت نے بیعت فرمالیا اور بھائی کی جگہ دین کی دولت اور سنتِ محمدیہ کی محبت لیکر وہ تیسرے دن اپنے گھر واپس آگئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے دیگر عزیزوں نے اور خود حافظ جعفر خاں صاحب اور ان کے بیٹوں حافظ ظہور احمد، حافظ عمر احمد، منشی جمیل احمد اور مستوراتِ کنبہ نے بھی حضرت کا باقاعدہ دامن پکڑا اور بیعت ہو کر داخلِ سلسلہ ہوئے۔ اللہ کی شان ہے کہ بریلی[1] کی زمین سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کو مقناطیسی کشش نے سہارنپور پہنچایا اور خود سہارنپور کی مٹی سے پیدا ہونے والے بعض نفوس اس دولتِ علیہ سنیہ سے محروم بلکہ مخالف و معاند رہے۔

حسن[2] ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

پھر آپ کا یہ فیضانِ باطنی اسی خاندان تک محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھا اور جس مرتبہ بھی آپ کو کسی ضرورت سے بریلی تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا کچھ نہ کچھ اہلِ بریلی بدعات سے تائب اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے رہے۔

محمد یسین خاں ایک تعلیم یافتہ شخص محکمہ آبکاری کے انسپکٹر تھے وہ بریلی سے چل کر سہارنپور حاضر ہوئے اور کچھ پڑھنے کے لئے وظیفہ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا بغیر بیعت کے فائدہ تام[3] نہ ہوگا اور نفس و شیطان و اشغالِ دنیا اس نیک کام سے باز رکھا کرتے ہیں"۔ یہ جامع الفاظ کچھ ایسے دل پر بیٹھے کہ فوراً درخواستِ بیعت کی مگر حضرت نے تامل فرمایا اور استخارہ کرنے کا حکم دیا۔ استخارہ کے بعد جب انھوں نے عرض کیا کہ الحمد للہ ارادہ میں پختگی اور بیعت کی ضرورت کو زیادہ محسوس پاتا ہوں تو آپ نے داخلِ سلسلہ فرمالیا اور ارشاد فرمایا کہ تمہاری نوکری ناجائز اور تنخواہ حرام ہے کہ شراب کے ساتھ کسی نوع کا تعلق بھی مسلمان کو جائز نہیں، اس سے بچنا ضروری ہے کہ رازق حق تعالیٰ ہے اور رزق کا وعدہ فرما چکا ہے جس میں تخلف نہ ہوگا حالانکہ حاضری کے وقت ان کو بیعت کا خیال بھی نہ تھا مگر تائب ہوئے اور ایسے تائب ہوئے کہ نوکری سے مستعفی ہو کر خود مع اہل و عیال کے خورد و نوش کی تکلیف مدت تک اٹھائی مگر جس کو حرام سمجھ لیا تھا اس کے پاس نہ گئے۔ اب بچوں کو پڑھانے کے مختصر معاوضہ پر قانع اور ذکر و شغل میں والہانہ[4] طریق پر عامل ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ بیعت ہونے کے بعد رات ہی کو تہجد کے لئے اٹھا

[1] کہ جہاں بدعات کا زور شور ہے۔ [2] بصرہ سے حضرت حسن، حبشہ سے حضرت بلال، روم سے حضرت صہیب پیدا ہوئے اور مکہ کی خاک سے ابوجہل یہ کسقدر تعجب اور قدرت کا کرشمہ ہے۔ [3] پورا۔ کیونکہ بیعت سے سلسلہ میں داخل ہوجاتا ہے سب لوگوں کی برکتیں شاملِ حال ہوجاتی ہیں پابندی ہونے لگتی ہے فائدہ روز افزوں ہوتا رہتا ہے، ایسے ایک بات معلوم کرنے سے نفس و شیطان کا داؤ چلتا رہتا ہے۔ [4] عاشقانہ۔

تو ہاتھوں میں ایک ایسا برقی اثر پایا تھا جس سے ہاتھ ٹوٹے جاتے تھے اور تہجد پر مداومت کا یہ پہلا سبق تھا کہ اس اندرونی لذت کی کوئی نظیر نہ ملتی تھی۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر

چند ماہ بعد ۱۹۲۰ء میں انھوں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص ان سے جدا ہو رہا ہے اور ان کی جدائی ان پر اس درجہ شاق ہے کہ رو رہے ہیں اور اتنی آہ و بکا کر رہے ہیں کہ کلیجہ نکلا جا رہا ہے۔ صبح کو حضرت کی خدمت میں خواب لکھ کر بھیجا تو حضرت کا جواب آیا۔ عجب نہیں تعبیر یہ ہو کہ میرا ارادہ عنقریب سفر حج کا ہے اور میں عربستان جا رہا ہوں۔" یہ معلوم کر کے کہ حضرت بیت اللہ کا عزم فرما چکے حضرت کی ہم رکابی و معیت کا شوق ان پر غالب ہوا اور آخر قدرت نے سامانِ سفر ان کے لئے بآسانی مہیا کر دیا کہ وہاں صرف عزم اور پختگی کی جانچ ہوتی ہے ورنہ خزانۂ غیب میں کسی چیز کی کمی نہیں، چنانچہ حضرت کے ہم رکاب یہ بھی روانہ ہوئے اور اس دولت حج و زیارت سے جس کا کبھی وسوسہ بھی نہ گذرا تھا مالا مال ہو کر ۱۳۳۹ھ میں وطن واپس آگئے۔

مدرسہ مصباح العلوم میں نظم[۲] کی کچھ خرابیاں پیش آنے پر اصلاح کے لئے شروع ۱۳۴۲ھ میں حضرت کو بریلی تشریف لانا پڑا اور اس مرتبہ حضرت کا قیام پرانے شہر میں حافظ حاجی محمد خاں صاحب سوداگر چوب کے مکان پر ہوا کہ حافظ جعفر خاں صاحب کے عزیز تھے اور ان کے مکان پر ہر قسم کی راحت کا سامان مہیا تھا۔

ایک دوسرا خواب اور اس کی تعبیر

چند ہی روز قبل ان کی بہو نے خواب دیکھا تھا کہ ایک براق آیا جس پر سب لوگ سوار ہو گئے بجز خانصاحب کی بڑی لڑکی کے کہ وہ سوار نہیں ہوئیں اور ان کے بھائی نے کہا کبھی پھر سوار ہو جائیں گی۔ اس خواب پر یہ خوش نصیب خاندان خود بخود کسی مقبولِ خدا شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا مشتاق بن چکا تھا کہ حضرت کے بریلی پہنچ کر قدرتی طور پر انھیں کے مکان پر قیام کا سامان فراہم ہوا۔ صبح ڈاک سے اترے تو خانصاحب کے صاحبزادے صدیق احمد خاں موٹر لئے ہوئے موجود تھے کہ ان کو حافظ جعفر خاں صاحب نے بذریعہ تار اطلاع دیدی تھی چنانچہ حضرت نے نماز فجر باجماعت اسٹیشن پر پڑھی اور موٹر میں سوار ہو کر خاں صاحب کے مکان پر تشریف لائے وہ دن مدرسہ کی اصلاحات و رفع نزاع باہمی میں گذرا اور اگلے دن یہ تمام خاندان مرد و زن حضرت سے بیعت ہوا بجز لڑکی کے کہ وہ اپنی سسرال تھی اور ہر چند اس نے کوشش کی کہ گھر آئے مگر نہ آسکی۔

---

[۱] ایسی برکتیں ہر مرید دیکھتا تھا۔ [۲] انتظام۔

واپسی سہارنپور کے وقت خاں صاحب نے سو روپے کا نوٹ حضرت کی نذر کیا مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا اور کہا کہ مجھے جو تنخواہ مدرسہ سے ملتی ہے وہ خرچ کو کافی ہو جاتی ہے لہذا اس کی حاجت نہیں۔ اگر ضرورت ہوگی تو پھر منگا لوں گا اس وقت معاف کرو۔

بیعت کے وقت ہدیہ قبول کرنے سے گریز

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بیعت کرنے پر حضرت کی خدمت میں اگر نذر پیش کی گئی تو حضرت نے کبھی قبول نہیں فرمائی کہ صورۃً یہ توبہ کرانے کا معاوضہ بن جاتا ہے اور اس رسم کے مشابہ ہے جو آجکل دنیادار پیروں میں چل رہی ہے ہاں اس کے بعد انس و محبت کا تعلق پیدا ہو کر اگر کوئی قلیل سے قلیل ہدیہ بھی پیش کرتا تو مسنون طریق پر آپ اسے بخوشی قبول فرماتے۔ چنانچہ سہارنپور سے تو کیا طلب فرماتے حضرت نے اس بارہ میں حافظ جعفر خاں صاحب کی سفارش بھی قبول نہ فرمائی اور سفر حج کو روانہ ہو جانے پر جب خانصاحب ممدوح نے بذریعہ تار بمبئی روانہ کیا تو آپ نے قبول فرمایا کہ اس کا محرک تعلق محبت تھا جو کہ ہدیہ کی علت و لم ہے اور اس کا رد کرنا دل شکنی مسلم کی وجہ سے ممنوع و قبیح ہے۔ نیز جب حضرت کسی معاملہ میں تصفیہ کے لئے باقاعدہ حکم بنکر جاتے تو کسی نوع کی مالی اعانت سے آپ کو گرانی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے خوب یاد ہے سہارنپور میں دو شخصوں نے کہ دونوں کو حضرت سے پرانا تعلق تھا آپ کو سرپنچ بنایا تو آپ نے منظور فرما کر بعد مغرب کا وقت سماعت قضیہ کے لئے مقرر فرما دیا۔ ایک فریق نے کہ ان کو حضرت سے زیادہ بے تکلفی تھی عرض کیا کہ پھر کھانا بھی حضرت وہیں تناول فرماویں۔ آپ نے بیساختہ فرمایا آج کی حاضری دوسرے نوع کی ہے آج تو پانی پینا بھی تمہارے گھر کا گوارا نہیں، یوں بہتیری دفعہ کھایا ہے اور زندہ رہا تو کھاؤں گا۔

انتظامی ضبط پر خاص توجہ

مدرسہ مصباح العلوم اس وقت دیوبند کی سرپرستی میں تھا اور حضرات دیوبند نے اپنی سفر سے معذوری ظاہر کر کے خود بخود تجویز کیا تھا کہ سہارنپور سے حضرت کو لے جاؤ۔ باوجود اس کے حضرت نے ضابطہ کی اتنی پابندی فرمائی کہ حافظ جعفر خاں کو دیوبند واپس بھیجا کہ میرے نام استخلاف[1] کی تحریر لے کر آؤ چنانچہ جب دیوبند سے یہ تحریر پہنچی کہ آپ ہماری طرف سے قائم مقام بن کر جائیں اور آپ کا فیصلہ بھی بعینہٖ ہمارا فیصلہ ہوگا۔ تب حضرت نے بریلی کا سفر منظور کیا اور اس وقت بھی وہی احتیاط فرمائی کہ مدرسہ کے کسی ممبر یا رکن کی دعوت منظور نہ کی۔ ان حضرات کی بیعت کا قصہ بھی اسی سفر میں پیش آیا اس لئے عجب نہیں ہدیہ سے انکار میں اس کمال تقویٰ کو

[1] اپنا قائم مقام بنانے کی۔

اثر بھی شامل ہو جس کو حضرت دل میں رکھتے اور کسی سے اظہار نہ فرمایا کرتے تھے۔ بہرحال انھی دو دن کے قیام میں بریلی و نواحِ بریلی کے اور لوگ بھی داخلِ سلسلہ ہوئے اور حضرت بعد نماز مغرب حافظ علی احمد خاں مرحوم کے گھر کہ انھوں نے حضرت کے ساتھ اہلِ مدرسہ کو بھی مدعو کیا تھا کھانا تناول فرما کر واپس سہارنپور آگئے۔

اہلِ بریلی کی عقیدتمندی بریلی میں حضرت کے متوسلین سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں مگر حافظ جعفر خاں اور حاجی محمد خاں صاحب کے خاندان کو تو دیکھا ہے کہ ماشاء اللہ بچہ بچہ کے قلب میں سنت کا وہ نور چمک رہا ہے جو بدن کے ہر حصہ سے ٹپک اور جھلک رہا ہے۔ بریلی جیسے شہر میں ان شیدایانِ سنت کا وجود جن کو طرح طرح کے ابتلا بھی پیش آئے ایک نعمتِ الٰہیہ ہے کہ وہی بریلی ہے جس سے حضرت پر صدائے تکفیر بلند ہو رہی ہے اور اسی بریلی کے یہ باشندے ہیں جن کا دل باوجودیکہ چند گھنٹے حضرت آشنا ہوا ہے مگر آج حضرت کو رو رہا اور زبان بے ساختہ پکار رہی ہے ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی[1] | کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی

قلوب میں تصرف کرنے والے خدائے ذوالجلال کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اہلِ حق کا کسی کے لئے وسیلۂ رحمت اور کسی کے لئے آلۂ نقمت[2] و زحمت۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا ؎

پیش[3] قبطی خوں بود آں آبِ نیل | آب باشد پیش سبطے جمیل
جادہ[4] باشد بحر ز اسرائیلیاں | غرق گہہ باشد ز فرعون عواں
باد[5] بد بر عادیاں گرز و تبر | لیک بُد بر ہود و بر قومش ظفر
گلستاں[6] باشد بر ابراہیم نار | لیک بر نمرود باشد زہر مار
بر سمندر[7] باشد آتش خانماں | لیک باشد بر دگر مرغاں زیاں
نزد[8] عاشق درد و غم حلوا بود | لیک حلوا بر خاں بلوا بود

بیعت کی برکت حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہونے کا فوری ثمرہ یہ مرتب ہوا کہ حاجی محمد خاں صاحب جن پر عرصہ دراز سے حج فرض تھا اور ارادہ بھی کرتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے

---

[1] تیس سال بعد خاقانی کو اس کی حقیقت کھلی کہ خدا کے ساتھ ایک منٹ کو ہونا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بہتر ہے۔
[2] عذاب و تکلیف کا آلہ جیسے قرآن مجید کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ بہت کو گمراہ کرکے اور بہت کو ہدایت دیتے ہیں کہ منکر گمراہ ہدایت پاتا ہے۔ [3] قبطی یعنی فرعون کی قوم کے آدمی کے سامنے تو نیل کا پانی خون بن گیا کہ اسے ہلاک کر دیا اور سبطی یعنی بنی اسرائیل کے ہر قبیلہ کے آدمی کے آگے عمدہ پانی ہوا۔ [4] دریائے نیل بنی اسرائیل سے تو سڑک بن جاتا ہے اور طاقتور فرعون سے غرق کی جگہ۔
[5] قوم عاد پر ہوا ہتوڑا اور تلوار تھی لیکن قوم ہود پر فتح و ظفر۔ [6] حضرت ابراہیم پر تو آگ چمن ہو گئی تھی لیکن نمرود پر سانپ کا زہر یعنی ہلاک۔ [7] آگ کے کیڑے پر تو آگ گھر کا سامان ہوتی ہے مگر دوسرے جانوروں پر نقصان و ہلاکت۔
[8] درد اور غم عاشق کے واسطے تو حلوا ہوتا ہے مگر بخیلوں پر حلوا بھی مصیبت ہے۔

آئندہ ہی رجب ۲۵ھ میں عازم ہوگئے اور بلکلف تمامی مشاغل وضروریات کو پس پشت ڈال کر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، پچیس ہزار روپیہ خرچ کیا اور اس بشاشت وفراخ دلی سے کہ جس دوست بلکہ امام مسجد بنگالی طالب علم نے بھی خواہش کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلئے تو بجز اچھا کے کچھ جواب نہ دیا۔ چنانچہ گھر کے لوگ تو بیوی، بڑا لڑکا، لڑکی اور بہو صرف چند ہی تھے باقی احباب در ملازمین سب ملا کر بائیس نفر ہوئے جنھوں نے اس خوش نصیب بزرگ کی دریا دلی سے منتفع ہو کر حج وزیارت کا وہ نفع اٹھایا جس کے لئے ہزاروں مسلمان تڑپتے ہیں اور نصیب نہیں ہوتا۔

اسی سفر میں آپ[1] کی لڑکی بھی ساتھ گئی اور جب سب لوگ مدینہ منورہ پہنچکر حضرت کے قریب مکان کرایہ پر لیکر مقیم ہوئے کہ خدمت میں حاضری مستورات کی آسان ہو تو لڑکی بھی بیعت ہوئیں جو اس وقت محروم رہی تھی اور اس طرح پر اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی جو دو سال ہوئے ان کی بھاوج نے دیکھا تھا حضرت کے اخیر دور میں اس خاندان کے لئے آخری زیارت مقدر تھی کہ یہ سامان ہوا اور یہ لوگ کافی مدت حضرت کی خدمت میں قیام کرکے بعافیتِ جسمانی وترقیاتِ روحانی وطن واپس آئے۔ چند ہی ماہ بعد حضرت کے وصال کا تار آگیا اور وہ چیز ہی نہ رہی جو مقناطیس بن کر آہنِ قلوب کو کھینچا کرتی تھی ؎

حیف[2] در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدم وبہار آخر شد

متوسلین کو حج کی ادائیگی کی ترغیب

یہ میں نے خاص طور پر دیکھا ہے کہ حضرت کو اپنے متوسلین کے متعلق حج کا خاص اہتمام رہتا اور جن پر حج فرض ہوتا ان کو تو خاص تاکید کے ساتھ فرمایا ہی کرتے کہ فریضۂ حج ادا کرنے میں غفلت وسستی نہ کرو کیا خبر ہے موت کب اور کس وقت آجائے۔ نفل حج کے لئے بھی کوئی خیال ظاہر کرتا تو حضرت اس کو پختہ فرمادیتے اور اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ روانگی سے قبل اس سے ملنے جاتے کچھ نہ کچھ ہدیہ پیش فرماتے اکثر دہلی تک مشایعت کرتے اور رخصت کے وقت متحسرانہ لہجہ میں دعا کی اس طرح درخواست کیا کرتے تھے کہ مواقع اجابت میں مجھے بھی یاد رکھنا بالخصوص یہ دعا کہ حق تعالیٰ اس مٹی کو یثرب کی مٹی میں شامل فرمادے کہ یہی منتہائے مراد ہے۔

آج پچیس برس ہوئے کہ ۲۱ھ میں جب پہلے سفر حج کو بندہ حجاز روانہ ہونے لگا تو حضرت باوجود یکہ امام ربانی حیات تھے اور مجھے حضرت کے ساتھ اس وقت یہ نیاز مندانہ خصوصی تعلق نہ تھا مگر حضرت رخصتی ملاقات کے لئے میرٹھ تشریف لائے اور مکہ مکرمہ میں میرے پاس حضرت کا جو خط پہنچا اس کے یہ جگر سوز الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں: عزیز من مجھے بھول نہ جانا، گو سیہ کار اس قابل نہیں مگر

[1] حاجی محمد خان کی۔ [2] افسوس پلک جھپکنے میں محبوب کی صحبت ختم ہوگئی پھول کے چہرہ کو جی بھر کے بھی دیکھا نہ تھا کہ بہار ختم ہوگئی۔

ہوس یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی مٹی میں ملنا نصیب ہو بس اسی دعا کی ضرورت ہے کہ حق تعالیٰ اہلیت بخش کر جوار رسول نصیب فرمائے ؎

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی[1] — بہ یاد آر محبان بادہ پیما را

مجھے وہ مضمون ہمیشہ یاد رہا حتیٰ کہ آپ اپنی مراد کو پہنچے اور کانوں نے سن لیا کہ حضرت عالم قدس کو سدھار کر جنت البقیع میں دفن ہو لئے۔

باوجود آپ کے کوہ استقلال ہونے کے عشق رسول کی آگ آپ کی رگ رگ میں اتنا اثر کر گئی تھی کہ آپ نے بارہا عرب کا سفر صرف اسی شوق و آرزو میں کیا کہ ہر مرتبہ آپ کی ہجرت کا شور عوام کی زبانوں پر مچا، آخر جب وقت آیا تو وہ پورا ہو کر رہا اور وہ آتشِ فراق بلقاءِ محبوب ٹھنڈی ہوئی جس نے آپ کو صرف ایک دروانہ کا بنا رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے آپ مولانا تھانوی کا وعظ بڑے شوق سے سنتے اور کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ مجھے تو مولانا کے وعظ میں اس شعر پر بڑا مزہ آتا ہے ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے[2] — چہ کنم کہ چشمِ بد خو نکند بکس نگاہے

یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ آپ جب اس شعر کو سنتے تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا اور وجد کی کیفیت آپ پر طاری ہوتی جس کو آپ ضبط فرمایا کرتے تھے۔

اسی کا اثر تھا کہ آپ اپنے دوستوں کو حج و زیارت کی خاص طور پر ترغیب دیتے اور چاہتے تھے کہ سب بس آستانۂ محب و محبوب کے والہ و شیدا بنے ہوئے دنیا سے اٹھیں۔ اس اہتمام کے بیسیوں واقعات میری نظر سے گذرے جن میں ایک نمونہ حافظ ریاض الاسلام کاندھلوی کا ہے کہ ان پر حج فرض تھا مگر اس کے ادا میں بہت ہی کچھ موانع ان کو پیش تھے مگر جب حضرت نے قطعی حکم فرمادیا کہ تم کو ضرور جانا چاہیئے کہ آج دم نکل گیا تو کوئی عذر بھی اللہ کے ہاں قابلِ سماعت نہ ہوگا تو یہ پختہ ہوئے اور پھر ایسے پختہ ہوئے کہ ہر چند زور دیا گیا کہ اس سال ملتوی کر دو مگر یہ نہ مانے اور سب قصوں کو پس پشت ڈال کر مع اہلیہ دخوشدامن کے کہ ان پر بھی حج فرض تھا مردانہ وار حج و زیارت کر کے واپس وطن آئے۔

حکیم عبدالغنی صاحب مقیم غازی آباد نے جو کہ اکثر حضرت کے معالج رہتے تھے آپ کی علالت سن کر آخری زمانہ میں مدینہ منورہ ایک نسخہ لکھ کر بھیجا تو آپ نے اسی کو حیلہ بنا کر حاضری حرمین شریفین کی ان کو اس طرح ترغیب دی کہ خط لکھا۔ السلام علیکم۔ علاج کی صورت یہ ہے کہ امسال آپ حج کا ارادہ کریں

---

[1] جب محبوب کے ساتھ بیٹھو اور دور شراب چلاؤ یعنی محبت کا جوش و خروش ہو تو ان دوستوں کو بھی یاد کر لیا جو دور چلاتے تھے۔ [2] سارا شہر حسینوں سے بھرا ہے مگر میں ہوں اور ایک چاند کا خیال۔ میں کیا کروں کہ بری عادت والی آنکھ کسی پر نگاہ ہی نہیں کرتی۔

اور رجب میں روانہ ہو کر پہلے مدینہ منورہ حاضر ہوں اور یہاں دو تین مہینے قیام کر کے میرا علاج کریں اور قریب حج مکہ مکرمہ جا کر حج کر کے وطن واپس ہو جائیں، یہ ترکیب علاج کی ممکن ہے ورنہ غیر ممکن۔ والسلام

مجھے جہاں تک علم ہے حضرت کے متوسلین میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس پر حج فرض ہوا ہو اور وہ ادا نہ کر آیا ہو، ہاں ایسے بکثرت ہوں گے جو دو تین بلکہ چار پانچ مرتبہ اس نعمت سے مالا مال ہو آئے کہ بیت اللہ و بیت الرسول کی مخلصانہ زیارت اور قلیل وقت کی بھی محبانہ حاضری نفع روحانی میں اولیاء اللہ کی اس صحبت سے کم نہیں جس کے متعلق مولانا روم لکھتے ہیں ؎

صحبتِ[1] نیکاں اگر یک ساعت است — بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است
یک[2] زمانے صحبتے با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

الحاصل یہی نہیں کہ بریلوی خاندان نے دخول سلسلہ کی صرف برکت پر اکتفا کیا ہو بلکہ حامد یار خاں اور صدیق احمد خاں نے اکتساب[3] بھی شروع کیا اور بحمد اللہ واردات اور انوار و تجلیات سے کامگار ہوئے۔ دونوں کی بیبیاں اور ہمشیر بھی اپنے معمولاتِ یومیہ پر باوجود نسوانی ضعف و موانع اور طرح طرح کی مشغولیت خانہ داری کے ایسی پابند ہوئیں کہ دوسروں کو ان سے سبق ملا۔ ایک مرتبہ حامد یار خاں نے شکایت لکھی کہ ذکر میں وہ لذت نہیں آتی جو پہلے آتی تھی اور اسلئے مواظبت دشوار ہے تو حضرت نے فوراً جواب دیا۔

مکتوب گرامی بنام حامد یار خاں

عنایت فرمایم حامد یار خاں صاحب سلمہ۔ السلام علیکم، عنایت نامہ پہنچا۔ بغور سنو، مقصود اصلی ذکر ہے خواہ طبیعت لگے یا نہ لگے، پراگندہ و منتشر یا دلجمعی اپنے معمولات کو ہر حال میں پورا کرنا چاہئے۔ یہ غلط راستہ ہے کہ ذوق شوق ہو تو اوراد پورے کئے جاویں ورنہ پورے نہ کئے جاویں۔ ذوق شوق نہ مقصود ہے نہ اختیاری امر ہے جو اپنا کام ہے وہ کئے جاویں اور جو عطاء حق ہے اس کو اسی کے سپرد رکھیں بدون دلبستگی کے ذکر پر مداومت زیادہ مفید اور موجب اجر ہے

---

[1] نیکوں کی صحبت اگر ذرا سی دیر کے لئے بھی ہو سو سال کے زہد و عبادت سے بہتر ہے یعنی بزرگوں کی ایک صحبت سے وہ کیف دل میں پیدا ہو جاتا ہے جو تمام دین پر عمل کا داعی بن جاتا ہے اور سو سو سال کی عبادت سے بھی بعض دفعہ یہ داعیہ نہیں پیدا ہوتا اور بہت کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔

[2] اولیائے الٰہی کی ایک وقت کی صحبت تم کو سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہو جاتی ہے کہ اس دین کا داعیہ پیدا ہو کر پابند کر دیتا ہے دونوں شعروں کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ عبادتیں بالائے طاق اور بس صحبت و خدمت اختیار کر لیں یہ سخت محرومی کی بات ہوگی۔

[3] فیض حاصل کرنا یعنی صرف بیعت ہو یا جو سلسلہ میں داخل ہوتا ہے کچھ نہ کچھ برکت اس دین کی طرف توجہ اور کچھ پیر صاحب کی توجہ سبب تو ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ان کے ارشادات پر عمل کر کر کے برائیوں سے بچنے اور بھلائیوں پر جمنے اور اخلاص و یقین کی پختگی کرنے سے فائدہ ہوتا ہے انھوں نے یہ بھی کیا ہے۔ [4] گو یہ فرض و واجب نہیں مگر فائدہ جو ہوگا وہ سخت پابندی سے ہوگا جیسے بھی ہو مگر ہو، یہ مطلب نہیں کہ فرض نماز قضا ہو یہ قضا نہ ہو بلکہ

شوق و شوق کے ساتھ ہر شخص کام کیا کرتا ہے مگر عبدیت اسی وقت معلوم ہوتی ہے کہ بلا ذوق شوق بھی ذکر پر مداومت کی جائے۔ عزیزی صدیق احمد صاحب کو بعد سلام مسنون مزاج پرسی کریں، انشاء اللہ دو چار روز میں بخار کی شکایت رفع ہو جاوے گی صحت کی بھی اطلاع فرماویں فقط السلام۔ خلیل احمد از سہارنپور ۲۵ ربیع الثانی ۴۲ھ

اکثر ذاکرین کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے کہ شروع شروع قلب کو ایک حظ و التذاذ آتا ہے اور بعد میں خواہ عادت ہو جانے کے سبب یا غذا میں طبعی یا شرعی بے اعتدالی یا اختلاط ناجنس کی وجہ سے یا اللہ پاک کی طرف سے غلامی و عبدیت کے جانچنے کے لئے وہ لذت یکدم معدوم ہو جاتی ہے جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ کام سے اپنے باز نہ آئے اور سبب کو تلاش کر کے اس کی تلافی کرے نہ یہ کہ ذکر کو بے نفع سمجھ کر چھوڑ دے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ جیسے آقا اگر انعام دیتا رہا تو کام کیا اور کسی دن ہاتھ روک لیا تو نوکر نے بھی کار خدمت چھوڑ دیا۔ ایسے خودغرض مزدور کی آقا کے دل میں محبت کیسے ہو سکتی ہے ؎

تو بندگی[1] چو گدایاں بشرط مزد مکن که خواجہ خود روش بندہ پروری داند

پھر یہ انعام کیا تھوڑا ہے کہ اپنے ذکر کی توفیق بخشی ورنہ کس کی مجال ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے شاہی دربار میں حاضر ہو سکے لہذا اس کی توفیق کا ہر وقت طالب رہے۔

حافظ محمد حسین اجراڑوی[2] نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کیا کروں اخلاص نصیب نہیں ہوتا فرمایا بھائی یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ کی توفیق پر ہے بندہ کا اس میں کیا چارہ۔ بہرحال کام سے باز نہ آوے جتنا کچھ ہو جائے توفیقِ الٰہی سمجھ کر شکر ادا کرے ہمت بلند رکھے اور دروازہ سے چمٹا رہے کہ بُعد بھی دیکھے تو مایوس نہ ہو ؎

اگرچہ[3] دور افتادم بایں امید خورسندم کہ شاید دستِ من بار دگر جانانِ من گیرد

ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت تہجد کو آنکھ نہیں کھلتی۔ فرمایا بھائی ہمت کرو کہ کوئی کام دنیا کا ہو یا دین کا بغیر ہمت کے نہیں چلتا، اور دیکھو کہ کسی معصیت کی سزا تو نہیں، ممکن ہے کھانے پینے میں بے احتیاطی[4] ہوئی ہو یا قولی و فعلی کوئی گناہ صادر ہوا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ضرورت ہے توبہ و استغفار کے اضافہ کی کہ ذکر پر ذکر بڑھایا جائے نہ یہ کہ ذکر ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ ؎

ہرچہ[5] بر تو آید از ظلمات و غم آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم

---

[1] تم مزدوروں کی طرح مزدوری کی شرط پر بندگی نہ کیا کرو کیونکہ آقا خود بندگی کی پرورش کا طریقہ جانتا ہے۔ [2] حضرت کے تلمیذ تھے قصبہ اجراڑہ ضلع میرٹھ کے باشندہ تھے۔ [3] میں اگرچہ دور پڑا ہوں مگر اس امید پر خوش کہ شاید میرا محبوب دوبارہ میرا ہاتھ پکڑلے۔ [4] حرام ناجائز مال کھا پی لیا ہو۔ [5] جو کچھ تم پر تاریکیاں اور غم آئے تو یہ بیباکی و گستاخی سے ہی ہوتی ہیں۔

غم[1] چو بینی زود استغفار کن　　غم بامر خالق آمد کار کن

ورنہ یہ تصرفات[2] ہیں متصرف حقیقی کے جن سے اس کی کائنات کا کوئی ذرہ بھی خالی نہیں اور چونکہ اس کا کوئی فعل کیسا ہی نفس کو ناگوار کیوں نہ گذرے حکمت سے خالی نہیں لہذا یہ معالجہ ہے اور مریض کو کوئی حق نہیں کہ طبیب کی دوا[3] تلخ سے منہ پھیرے ؎

چونکہ قبض[4] آید تو در وے بسط بیں　　تازہ باش وچیں می فگن برجبیں

چونکہ[5] قبضے آیدت اے راہ رو　　آں صلاح تست وایس دل مشو

بہرحال راہرو کا یہ کام ہے کہ اپنے کام کی دھن میں لگے اور مزہ و بدمزگی کو پس پشت پھینکے ؎

کارکن[6] کار بگذر از گفتار　　کاندریں راہ کار آید کار

محب کی نگاہ طالب[7] التذاذ نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطرح[8] نظر صرف رضاء محبوب ہے جس حال میں رکھے وہی نعمت اور اس میں لذت ہے ؎

فراق[9] و وصل چہ باشد رضاء دوست طلب　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

شریعت کو چونکہ رضاءِ خالق جل شانہ کا سانچہ و معیار ہے اتنا مضبوط تھامے کہ جان قفسِ تن[10] سے نکل جائے مگر یہ وصالِ محبوب کی رسی ہاتھ سے نہ چھوٹے. دم نکلے مگر محبوب کا نام لیتا ہوا نکلے ورنہ سلوک اور اللہ کی طلب کا نام نہ لے کہ ؎

سرمد[11] گلہ اختصار می باید کرد　　یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن[12] برضائے دوست می باید داد　　یا قطع نظر ز یار می باید کرد

صدیق احمد خاں نے ایک مرتبہ تہجد کی پابندی نہ ہونے کا آپ سے شکوہ کیا تو آپ کا مدینہ منورہ سے جواب آیا۔

---

[1] جب تم غم دیکھو جلد بخشش مانگو کیونکہ غم بھی خدا تعالیٰ کے حکم سے یہ کام کرتا ہے۔ [2] ردوبدل [3] کڑوی
[4] جب تم کو گھٹن پیش آئے تو تم اس میں کشادگی دیکھا کرو، تازہ رہو پیشانی پر بل نہ ڈالو۔ [5] اے راہِ خدا کے چلنے والے جب تجھے کوئی گھٹن پیش آئے تو وہ تو تیری درستی ہے تیرا دل اس سے ناامید نہ ہو۔ [6] کام کرو کام' باتیں بنانا چھوڑ دو اس راہ میں تو کام ہی تمہارے کام آسکتا ہے۔ [7] لذت اور مزہ کی۔ [8] نظر پڑنے کی جگہ۔
[9] وصل اور جدائی کیا چیز ہوتی ہے محبوب کی رضا طلب کرو کیونکہ اس سے اس کے غیر کی تمنا افسوسناک ہے۔
[10] بدن کے پنجرہ سے روح
[11] اے سرمد شکوہ کو مختصر کرنا چاہئے ان دونوں کاموں میں ایک کر لینا چاہئے۔
[12] یا محبوب کی رضامندی پر جان نثار کر دو یا پھر محبوب سے قطع نظر کر لو۔ چونکہ حق تعالیٰ سے قطع نظر ہو نہیں سکتا اس لئے جان نثار کرنا ہی ضروری ہے۔

مکتوب گرامی بنام صدیق احمد خاں

عنایت فرمایم صدیق احمد خاں صاحب سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کا خط پہنچکر موجب مسرت ہوا۔ آپ کے والدین اور متعلقین خیریت سے کل یہاں پہنچ گئے۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ آٹھ دس روز میں یہاں سے واپسی ہوگی اور انشاء اللہ بخیریت پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تم کو بھی یہ دولت نصیب فرماوے۔ تم نے لکھا کہ نماز تہجد نہیں ہوتی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تم کو ہمت اور توفیق دے۔ بات یہ ہے کہ ہر کام ہمت سے ہوتا ہے جب آدمی آرام طلبی میں پڑجاتا ہے اور دنیوی لذات کی طرف مائل ہو تو کوئی کام دینی اور دُنیوی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمت کرکے کام کرو اور اپنے گھر میں بھی میری طرف سے دعا کہو، اور نیز تم کو چاہئے کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ اخلاق کا معاملہ کیا کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: خیرکم[۱] خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی۔ فقط والسلام

اور دوسرے خط میں اس طرح تعلیم فرمایا کہ جب انسان کسی ایک کام میں مشغول ہوتا ہے تو دوسرے کی طرف مشغولی کم ہوجاتی ہے خصوصاً دین اور دنیا باہم متضاد[۲] ہیں، دنیا میں انہماک[۳] شوق الی اللہ سے مانع ہوتا ہے اور اس کے چھوٹنے کے لئے تو ایک بہانہ چاہئے۔ لہٰذا نہایت رغبت کے ساتھ اپنے وظائف واوراد میں مشغول ہوجاویں حق تعالیٰ مدد فرماویں گے۔ فقط والسلام

سید شمس الحسن ساکن گلاؤٹھی سب اور سیر ریاست ریوان نے جب عدم حصول واردات پر تاسف کیا تو حضرت کا یہ والا نامہ گیا جس کے مختصر وجامع الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں:۔

مکتوب گرامی بنام سید شمس الحسن

عنایت فرمایم سید شمس الحسن صاحب سلمہٗ، السلام علیکم۔ عنایت نامہ پہنچا مژدہ عافیت طمانیت بخش ہوا اور بحمد اللہ میں بھی مع متعلقین بخیریت ہوں۔ الحمد للہ کہ ذکر بارہ تسبیح آپ کا استقلال کے ساتھ جاری ہے مگر آپ کی حسرت اس پر کہ حالات[۴] واردات سے طبیعت عاری ہے موجب افسوس ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ نعمت کیا کچھ کم ہے کہ اس نے اپنے لطف وکرم سے آپ کو مداومت[۵] ذکر بارہ تسبیح کی عطا فرمائی ہے۔ ذکر منشور ولایت ہے جس کو ذکر کی توفیق دی گئی گویا فرمان ولایت اس کو مل گیا حالات[۶] واردات نہ مقصود ہیں اور نہ ہر ایک کو پیش آتے ہیں، یہ تو بچوں کا ایک کھیل ہے اور اس کی تمنا فضول ہے لہٰذا آپ اپنی حسن حالت پر حق تعالیٰ شانہٗ کا نہایت شکر ادا کریں اور اس نعمت عظمیٰ کو حقیر نہ سمجھیں کیونکہ شکر نعمت موجب[۷] مزید نعمت ہے اور ناشکری موجب سلب[۸] نعمت ہے حق تعالیٰ شانہٗ ناشکری سے بچاویں۔ فقط والسلام خلیل احمد سہارنپوری یکم شعبان ۱۳۴۴ھ

---

[۱] تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ خوش معاملہ ہو۔ اور میں خود اپنی اہل کے ساتھ بہترین خوش معاملہ ہوں۔ [۲] ایک دوسرے کی ضد یعنی مخالف۔ [۳] دنیا میں بھلا چاہنا اللہ کے

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور

دارالعلوم دیوبند ہندوستان بلکہ اس صدی میں دنیا کی وہ مشہور اسلامی درسگاہ ہے جس کی چاردانگ عالم میں خداداد شہرت کسی تقریب و توصیف کی محتاج نہیں۔ گزشتہ صدی میں قطب العالم مولانا سید احمد صاحب بریلوی کا مع اپنے مجاہدین گروہ کے جب اس بستی پر گذر ہوا تو آپ نے خوش ہو کر یوں فرمایا تھا کہ یہاں علم کی بُو محسوس ہوتی ہے۔ قدرت کے ہاتھوں اس ادراک معنوی کا اس طرح ظہور ہوا کہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو اس مدرسہ کی بنیاد پڑی اور یہ درس گاہ جو آئندہ چل کر روس و چین اور تبت و بخارا تک کے طالبان علوم کا مرجع بننے والی تھی چھتہ کی مسجد میں مختصر مکتب کی صورت پر قائم ہوئی کہ ملا محمود صاحب ۱۵ مشاہرہ پر مدرس اول قرار پائے اور بستی کے اکیس[۲۱] طلبہ نے عربی پڑھنا شروع کیا۔ اخیر سال میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول ہو کر تشریف لائے کہ اول ۴۰[۲] تنخواہ ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد ۵۰[۳] ہو گئی۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم و مولانا ملا محمود صاحب مدرس سوم بنائے گئے اور زمام اہتمام شاہ عبد الغنی صاحب کے خلیفہ راشد مولانا رفیع الدین صاحب کے ہاتھ میں دیا گیا۔ سرپرست امام ربانی حضرت مولانا گنگوہی تجویز ہوئے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اگرچہ ظاہری خدمت کا نام اپنے لئے پسند نہ فرمایا مگر مدرسہ کی اصل روح و رواں آپ ہی کا وجود باجود تھا کہ علوم دینیہ کا شیوع آپ کی منتہائے مراد اور مدرسہ کی ترقیات آپ کے تن کے لئے گویا حیات تھی۔

قدرت نے کچھ ایسے مقبولین مخلصین افراد کو ایک جگہ جمع فرما دیا تھا جس کی نظیر شاید دنیا نے کم دیکھی ہو اور انہیں نائبین رسالت کی توجہات کا اثر تھا کہ ایسے نازک زمانے میں جبکہ مدرسہ جاری کرنے کا نام لینا بھی دشوار تھا سال ختم ہونے سے پہلے ہی بنارس و پنجاب اور کابل کے طلبہ جمع ہو گئے کہ امتحان کے وقت طلبہ کی تعداد اٹھتر تھی۔ پھر جب طلبہ کی کثرت ہوئی تو مسجد قاضی کے متصل مکان کرایہ پر لیا گیا اور ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ کیلئے مکان کی تجویز ہو کر ۱۲۹۳ھ میں یہ بنیاد رکھی گئی جہاں اب مدرسہ ہے۔ اس کے بعد تو اس منبع کے علوم اسلامیہ کے وہ چشمے جاری ہوئے جس نے اطراف و اکناف عالم کے تشنگان کتاب اللہ و کتاب الرسول کو سیراب کر دیا اور دنیا کی کوئی سمت باقی نہ رہی جہاں اس کی نہر کا سلسلہ نہ پہنچ گیا ہو۔

انقلاب چونکہ ہر جزو عالم کے ساتھ ایسا لگا ہوا ہے جیسے روح کے ساتھ بدن اس لئے اس کو بھی حوادث اور زلازل[1] پیش آئے کہ ہم جمادی ۱۲۹۷ھ میں جبکہ مدرسہ کی عمر کا چودھواں سال تھا حضرت قاسم العلوم نے بمرض ضیق النفس دنیا کو الوداع کہا اور پانچ سال بعد ۱۳۰۲ھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بمرض ہیضہ اپنے وطن نانوتہ ضلع سہارنپور میں درجۂ شہادت حاصل کیا اور آخر میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ چلے گئے اور آخر وصال فرما کر اپنے شیخ کے متصل قبۂ عثمانی کے باہر مدفون ہوئے۔

شیخ الہندؒ کا تعلیمی دور

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ اس مدرسہ کے سابقین اولین طلبہ میں تھے کہ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز الدقائق اور میبذی و مختصر معانی کا امتحان دیا اور ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ و مشکوٰۃ اور مقامات وغیرہ کے امتحان میں شریک ہوئے پھر ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمت تصحیح قبول فرمائے ہوئے تھے۔

شیخ الہندؒ کا تدریسی دور

آخر فارغ ہو کر ۱۲۸۸ھ میں اسی مدرسہ کے معین المدرسین بنے اور ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو آپ کی دستار بندی ہوئی اور ۱۲۹۲ھ میں آپ مدرس چہارم قرار دیدیئے گئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد مولانا سید احمد دہلویؒ بالخصوص فنون ریاضیہ میں امام وقت تھے للعہ[2] مشاہرہ پر مدرس اول قرار پائے اور ملا محمود صاحب ۳۵ عہ پر مدرس دوم۔ اس وقت حضرت شیخ الہند بمشاہرہ ۳۰ عہ مدرس سوم ہوئے اور آپ کی جگہ مولوی عبد العلی صاحب مدرس چہارم بنائے گئے۔ دو ہی سال گذرے تھے کہ ملا محمود صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس انقلاب میں حضرت مولانا مدرس دوم بنا دیئے گئے مگر اسباق آپ کے متعلق صحاح ستہ اور بڑی کتابوں کے رہے ۱۳۰۵ھ میں جب مولانا سید احمد صاحب بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے تو باتفاق آراء آپ کو اسی للعہ[2] مشاہرہ پر مسند صدارت پر بٹھایا گیا اور مولوی عبد العلی صاحب مدرس دوم بنائے گئے، تین سال گذرے تھے کہ مولوی عبد العلی صاحب بھی تشریف لے گئے۔

دار العلوم دیوبند میں تدریس کے چھ سال

اور اب حضرت امام ربانی کی دوربین نظر نے حضرت کا انتخاب فرما کر آپ کو بریلی سے بلا بھیجا اور آپ ۱۳۰۸ھ میں ۳۰ عہ مشاہرہ پر دار العلوم دیوبند کے مدرس دوم قرار پائے۔ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ سے آپ کی تنخواہ

---

[1] زلزلے اور جھٹکے۔

[2] ۱۳۰۵ھ کا واقعہ، کاتب کی غلطی ہو گئی ہوگی۔ (شیخ الحدیث)

سنہ۳۲ھ اور محرم ۱۳۱۴ھ سے ۳۵روپے کردی گئی۔ آپ چھ سال وہاں رہ کر، جمادی الثانیہ ۱۳۲۰ھ کو روانہ ہوئے اور آپ کی جگہ مولوی عبد العلی صاحب تشریف لائے جو مدرسۂ مراد آباد میں مدرس اول تھے۔

شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری میں مودت وارتباط

حضرت شیخ الہندؒ عمر میں حضرتؒ سے ایک سال بڑے تھے کہ آپ کی ولادت ۱۲۶۸ھ میں بمقام بریلی ہوئی جبکہ آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب بسلسلۂ ملازمت مع اہل وعیال وہاں مقیم تھے، اس ہمعمری کے ساتھ بچپن میں کچھ دنوں ہم سبق اور ہم مکتب ہونے کا اتحاد رہا اور پھر ایک شیخ کے دامن گرفتہ اور پیر بھائی ہونے کے تعلق نے تو اس یگانگت کو ایسا شیریں بنادیا گویا ایک جان اور دو قالب بن گئے۔

ہر دو حضرات کے متعلق ایک ہم سبق کی رائے

سید شمس الحسن کا بیان ہے کہ میرے والد سید احمد حسین مرحوم دیوبند میں ہر دو حضرات کے ہم سبق رہے اور حضرت شیخ الہند کے مکان پر رہا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ مولانا کی والدہ کو میرے ساتھ اتنی شفقت تھی جب تک میں نہ آجاتا مولانا کو کھانا نہیں دیتی تھیں، یہ بھی فرمایا کہ مولانا محمود حسن صاحب اس قدر ذہین تھے کہ طالب علمی میں کبھی مطالعہ بھی اہتمام سے نہ دیکھا مگر سبق میں کسی سے کم تیز نہ رہے، اور مولانا خلیل احمد جب انبہٹہ سے آئے تو ان کے ابتدائی کتابوں کے سبق میرے سپرد ہوئے مگر وہ اتنے تیز نکلے کہ چند ہی روز میں ہمارے ہم سبق ہوگئے، مجھے ہر وقت کتاب کا کیڑا بنا ہوا دیکھ کر ان صاحبوں نے میرا نام چرخہ رکھدیا تھا۔

وہ وقت نکل گیا مگر اب ملنے کا جب کبھی اتفاق ہوتا ہے تو جس بے تکلفی ومحبت سے ملتے ہیں وہ بیان میں آنے کے قابل نہیں، پھر کیا پوچھنا دونوں ذہین وذکی روحانی بھائیوں کا جنھوں نے عمر کا اکثر حصہ قرب جسمانی کے ساتھ بھی گذارا اور طفولیت[۲] وشباب اور کہولت وشیخوخت ہر حصۂ حیات میں ایک دوسرے کے فریفتہ

شیخ الہندؒ کا پہلا وعظ

پینڈھو میں چودھری لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر ایک مرتبہ ان سب حضرات[۱] کا اجتماع ہوا اور لوگوں نے خواہش کی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہند کا وعظ سنتے۔ مولوی میر شاہ خاں بولے کہ اس میں کامیابی ہوسکتی ہے تو صرف مولانا خلیل احمد کو کہ وہی ایسی ہستی ہے جو مولانا سے بزور کہہ سکتی ہے اور مولانا ان کی بات کو نیچا نہیں ڈال سکتے ورنہ سچ یہ ہے کہ ہم بھی اسی ارمان میں رہے اور اب تک حضرت کا وعظ نہیں سنا۔ چنانچہ سب لوگ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آج تو کسی طرح مولانا کا وعظ سنوا ہی دیجئے۔ حضرت نے فرمایا بہت بہتر اور اس کے بعد

---

۱ حضرت شیخ الہند کی۔ ۲ بچپن، جوانی، متوسط عمری، بڑھاپا۔

مولانا کے پاس آکر بے تکلف لہجہ میں فرمایا: دوستوں کی خواہش ہے کہ آج بعد ظہر کچھ بیان فرما دیجئے۔ مولانا نے جو کہ استاذ الکل ہو کر ادنیٰ طالب علم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے فرمایا مجھے تو وعظ کہنا ہی نہیں آتا حضرت نے فرمایا یہ کون کہتا ہے کہ آپ کو وعظ کہنا آتا ہے اور آپ وعظ کہیں۔ درخواست یہ ہے کہ جس طرح مدرسہ میں بیٹھ کر حدیث کا ترجمہ فرماتے ہو یہاں مسجد میں بیٹھ کر کسی حدیث کا ترجمہ سنا دو حضرت مولانا کی اس وقت عجیب حالت تھی کہ نہ اقرار کئے بن پڑتی تھی نہ انکار کئے۔ آخر جب دیکھا کہ مفرؔ نہیں تو فرمایا اچھا مگر اس شرط پر کہ تم موجود نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھا مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میں بعد نماز چلا آؤں گا، میری وجہ سے یہ صدہا لوگ کیوں محروم رہیں۔" حضرت مولانا مسکرا کر چپ ہو رہے اور حضرت نے لوگوں سے کہدیا کہ جائیے درخواست منظور ہے اور بعد ظہر مولانا کا بیان ہوگا۔

چنانچہ بعد ظہر حضرت مولانا کو منبر پر بیٹھنے کا اصرار کیا گیا مگر آپ نہ اٹھے اور جب دیکھ لیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب سنتیں پڑھ کر روانہ ہوئے تو بیچ کے در میں بیٹھ کر بیان شروع فرمایا میں بھی حاضر تھا کیا کہوں کہ اس سادہ ترجمہ اور پست لہجہ کی مسلسل تقریر میں کیا شیرینی تھی جس کی حلاوت زبان قلب میں آج تک موجود ہے۔ حضرت نے جب دیکھا کہ وعظ شروع ہو گیا تو باہر باہر دوسرے راستہ آکر اندر دالان میں اس طرف بیٹھ گئے جدھر مولانا کی پشت تھی اور بیان ختم ہونے پر جلدی سے بالا بالا اسی رستہ اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

دوسرے وقت جب اجتماع ہوا تو حضرت نے فرمایا تم نے تو بہتیرا چاہا کہ سب وعظ سنیں مگر خلیل نہ سنے لیکن ہم نے سن ہی لیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کس طرح؟ فرمایا ہم بھی تمہارے پس پشت ایک گوشہ میں آبیٹھے۔ مولانا نے فرمایا پشت پناہ بننے کے لئے تم آئے کدھر سے اور وعدہ کرنے کے بعد خلاف کیسے کیا؟ فرمایا میں نے تو یہی کہا تھا کہ نماز کے بعد چلا آؤں گا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ پھر مسجد ہی میں نہ جاؤں گا اور آخر اس کی کوئی وجہ بھی کہ عمر بھر میں ایک وعظ ہو اور وہی ہمارے کانوں میں نہ پڑے۔ غرض دیر تک انبساط کے ساتھ مزاح ہوتا رہا اور حاضرین اس کا مزہ لیتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ حضرت شیخ الہندؒ کی مستقل سوانح حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب مرتب اور شائع فرما چکے ہیں اور وہی اس خدمتِ جلیلہ کے اہل بھی تھے۔ مجھے بھی حضرت کی خدمت میں بارہا حاضری کا اتفاق ہوا اور اب نظریں ڈھونڈتی ہیں کہ اس بے نظیر ہستی کو جسے امام ربانی علم کا کٹھلا[۲] فرمایا کرتے تھے کہاں اور کس طرح دیکھوں۔ علمِ ظاہری کے لحاظ سے آپ کی شانِ محدثیت

---

[۱] فرار کی یعنی بھاگنے یا بچنے کی جگہ۔ [۲] پہلے زمانے میں مٹی گارے سے چوپہلو ڈرام سا بنایا جاتا تھا اس کو گندم بھرنے کی کوٹھی کہتے تھے اور ذرا چھوٹا گول بنایا جاتا تو کٹھلا۔ حضرت شیخ الہندؒ کا قد مبارک ذرا چھوٹا تھا۔

دنیا پر کھل گئی کہ کامل اڑتیس۳۸ سال آپ نے علوم دینیہ کی اشاعت وتدریس میں صرف کئے اور کابل، قندھار، بلخ، بخارا، قازان، چین، تبت، یمن اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ تک کے لوگ آپ کے شاگرد بنے بلکہ مالٹا[1] میں ترکی و شامی بھی منتفع ہوئے کہ آپ سے مستفید ہو کر دوسروں کو فائدۂ علمیہ پہنچانے والوں کی تعداد اس وقت شمار سے بیرون ہے۔ مگر آپ کے علم باطنی کا پورا ادراک بڑی ہستیاں بھی نہ کرسکیں کہ اخفا و فنائیت آپ میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آپ ایک حال میں ہر وقت غرق رہتے تھے جس کا خلاصہ اللہ کا بول بالا ہونے کی تمنا وسعی میں مرمٹنا ہے۔ اور باوجودیکہ آپ قد و قامت میں مختصر اور جثہ میں ضعیف و نحیف تھے مگر آپ کی ہمت اور باطنی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اٹل پہاڑ کو دھکیل دینا اپنی ہمت کے سامنے کچھ بھی دشوار نہ سمجھتے تھے۔

۱۳۳۳ھ میں آپ کا سفر حجاز جو آخرکار چھ۶ سالہ مصر و مالٹا کی اسارت اور طرح طرح کی صعوبت و مشقت پر ختم ہوا جس وقت پیش آیا تو بندہ بھی حاضر تھا اور وقار و استقلال کا وہ حیرت بخش منظر دیکھ رہا تھا جو اب دنیا میں دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ چونکہ مرد و عورت یگانہ و بیگانہ ہر شخص کو خیال تھا کہ آپ ہجرت فرما کر ہندوستان چھوڑ رہے ہیں اس لئے جس کو ذرا سا بھی آپ کے ساتھ تعلق محبت تھا وہ اس رخصت کو آخری زیارت سمجھ کر رو رہا تھا۔ گھر آپ کے رشتہ داروں اور کنبہ کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا مگر مردانہ ہی سے آپ کو ایک لمحہ کی فرصت نہ تھی کہ گھر میں جاکر صاحب فراش بی بی اور نازک دل لڑکیوں کو الوداع کہیں ریل پر سوار ہونے کا وقت قریب آگیا اور آپ کو اس مردانہ اژدحام سے مہلت نہ ملی جو کئی ہزار کی تعداد میں جمع اور اضطراب کے ساتھ آپ کی آخری وصیتوں کا خواہشمند تھا۔

آخر آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد حسن صاحب آپ کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے آپ کو زبردستی گھر میں لائے کہ معصوم بچیوں اور بیمار بیوی کا بھی کوئی حق ہے جو صبح سے منہ دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں"۔ چنانچہ آپ نے اندر قدم رکھا تو صاحبزادیوں اور کنبہ کی محرم عورتوں نے آپ کو گھیر لیا۔ بندہ اس وقت دروازہ پر کھڑا تھا اور عزیزوں کی اس وقت جو حالت تھی کہ گویا جنازہ گھر سے نکل رہا ہے اس پر میرا کلیجہ نکلا جاتا تھا مگر اللہ رے استقلال حضرت کوہِ سکوت بنے ہوئے سب کی آہ و زاری سنتے رہے اور آخر بی بی اور بچیوں سے جو روتے روتے بیہوش ہوا چاہتی تھیں یہ کہہ کر کہ آخر شور و غل سے نتیجہ کیا؟ اب سوائے اس کے کہ میری کھال میں گھس کر بیٹھ جاؤ کہ ابا زندہ بیٹھا ہے اور مجھ میں کیا رہ گیا ہے۔ آخر کیا ہمیشہ یہیں بیٹھا رہوں گا اور مروں گا نہیں؟ پس صبر کرو اور اس ذات پر نظر رکھو جو تمام عالم کا حافظ و مربی ہے"۔ اپنا دامن چھڑا کر آپ چل دیئے اور السلام علیکم کہہ کر مردانہ میں آگئے۔

[1] ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ دینے پر انگریزوں نے اس جزیرہ میں قید کردیا تھا۔

زندگی میں موت کا منظر دیکھتے ہوئے آخری سفر کا یہ استقلال میرے لئے تو اتنا حیرت بخش ہوا کہ دیر تک مبہوت بنا کھڑا رہا مگر آپ کے نزدیک ایک چلتی ہوئی معمولی سی بات تھی کہ باہر آتے ہی آپ نے بیٹھک کا جس میں عمر گذری تھی قفل لگایا اور کنجی بھائی کو دیکر رومال کمر سے لپیٹا اور ایسی تیز سپاہیانہ چال سے پیدل اسٹیشن کو روانہ ہوئے کہ قوی و تندرست چلنے والے تھکے جاتے تھے۔ مصافحہ کی تمنا میں حاضرین نے اسٹیشن تک دو رویہ پرا باندھ لیا تھا اس لئے آپ نے سواری پسند نہ کی اور جس وقت آپ ریل پر پہنچے تو اتنی لا تعداد مخلوق جمع تھی جس کی گنتی نہیں ہو سکتی اس کے بعد جو کچھ طائف اور مصر و مالٹا میں گذرا وہ بزبانِ حال یوں کہتا ہے کہ ؎

قیس و فرہاد کا قصہ تو سُنا ہنس ہنس کر اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

مگر جب آپ واپس آئے تو اس مسکراہٹ و ثباتِ قدم کے ساتھ واپس آئے کہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کو چھاتی سے لگاتے اور خوش ہو کر باتیں کرتے تھے۔ آپ حقائق کے مشاہدہ میں ہر وقت غرق رہتے اور مخلوق سے غایت درجہ انبساط برتتے مگر جب خالی بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

دار العلوم دیوبند اور مظاہرِ علوم کی برکات

ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی ایک بات کہوں۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دُور کیوں جاؤ خود ہمارے اضلاع میں بھی جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا اور آج علم کی کثرت کا یہ حال ہے کہ شہر تو شہر کوئی قصبہ بلکہ شاید کوئی کوئی گاؤں بھی ایسا نہ ہو جہاں کوئی مولوی نہ مل جائے۔

زمانہ غدر میں مسلمانوں کے ایمان کی پختگی

اس کے بعد ذرا دوسرا پہلو دیکھو کہ غدر[1] کا زمانہ گذرے کچھ مدت نہیں ہوئی کہ ابھی اس کے دیکھنے والے بھی زندہ ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ پھانسی گڑی ہوئی تھی اور ان ناکردہ مظلوموں کا پرا بندھا ہوا تھا جن کو پھانسی کا حکم دیا جا چکا تھا، وہ لوگ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک نعش کو اتارا جا رہا اور دوسرے زندہ کو چڑھایا جا رہا ہے، اس طرح پر موت ان کی نظر کے سامنے تھی اور ان کو عین الیقین تھا کہ چند منٹ بعد میرا شمار مردوں میں ہوا چاہتا ہے۔ بایں ہمہ کوئی جھونٹوں بھی ان کے متعلق ضعفِ ایمان کا یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ کسی بچہ[2] نے بھی موت سے ڈر کر اسلام سے انحراف یا تبدیلِ مذہب کا خیال کیا ہو۔ باوجود قلتِ علم اور غلبۂ جہالت کے ان کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ مرنا قبول تھا مگر مذہب پر حرف آنا قبول نہ تھا اور آج

---

[1] ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جس کا نام انگریزوں نے غدر رکھ دیا تھا اور مختصر اور حکومت کی وجہ سے وہی شائع ہو گیا حالانکہ پاکستان کا بیج اسوقت بویا گیا تھا جو نوے سال بعد پھل لے آیا۔ [2] یعنی عام آدمیوں میں۔

باایں کثرتِ علم ضعفِ ایمان کا یہ حال ہے کہ ذرا ڈنڈے کے خوف یا دو پیسہ بلکہ دو حرف انگریزی کے عطیہ کی طمع دلا کر جو چاہے کہلا لو اور جو چاہے کرا لو۔

علاماتِ قیامت کا ظہور

عجیب بات ہے کہ قلتِ علم کے وقت ایمان میں اتنی قوت اور کثرتِ علم کے زمانہ میں ایمان کی اتنی کمزوری۔ اس کے بعد فرمایا سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک جگہ علامتِ قیامت بیان کیا علم کا کم ہونا اور دوسری جگہ فرمایا کہ قیامت کے قریب علم زیادہ ہو جائے گا۔ اہلِ باطن نے بغیر دیکھے نورِ فراست سے تطبیق دی تھی مگر ہم بدنصیبوں نے اس وقت کو آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صورتِ علم کثیر ہو گئی مگر حقیقتِ علم قلیل ہو گئی اور یہی خاص علامت ہے قربِ قیامت کی۔

حلت و حرمت کا اہتمام قلوب سے جاتا رہا اور مال کی محبت دلوں میں گھر کر گئی

ایک مرتبہ ایسے ہی فکر سے افاقہ پاکر فرمانے لگے مولوی عاشق الٰہی میں غور کیا کرتا ہوں ابھی چند سال ہوئے چندوں میں اتنی قلت تھی کہ دو دو چار چار پیسے بھی قدر کے ساتھ لے جاتے تھے اور مدرسین و طلبہ کو چھپر کے سایہ میں بیٹھنا بھی نعمت معلوم ہوتا تھا، باایں ہمہ علما ایسے تیار ہوتے تھے کہ بایدو شاید۔ آج انہی روکھی سوکھی کھا کر پڑھنے والوں کی بدولت دین کا ماہتاب چمک رہا ہے اور اب چندوں کا یہ حال ہے کہ ریاستوں سے ہزارہا روپیہ مقرر ہے اور امراؤ متمول تاجروں سے کثیر کثیر رقمیں آتی ہیں، مگر نہ علم میں وہ برکت ہے نہ حال اور عمل میں وہ اخلاص۔ مدارس کو دیکھو تو تعمیرات زائدہ میں ترقی اور عالی شان عمارتوں کی بھرمار۔ طلبہ کو دیکھو تو ہر طرح امرا جیسے باورچی خانے اور اس پر بھی ان کو شکایت اور اعتراض، آہ زمانہ ہی پلٹ گیا۔ ظاہرداری ہر جگہ بڑھ گئی اور بطن اندر دین ہر چیز کا جاتا رہا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پہلے جو نتیجہ پیسوں میں نکلا وہ آج ہزاروں روپیہ میں بھی نہیں نکلتا۔

ذرا سکوت فرما کر خود ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس زمانے میں حلت حرمت کا اہتمام مسلمانوں کے قلوب سے جاتا رہا اور حبِ مال نے چرلیا کہ روپیہ کمانے کی فکر میں حدودِ شرعیہ کا تذکرہ بھی لوگوں کو ناگوار گزرنے لگا ہے اس لئے پہلے جو کچھ مدرسوں میں آتا تھا اگرچہ مقدار میں قلیل ہوتا تھا مگر حلال خالص اور محنت و ریاضت کا کمایا ہوا بابرکت آتا تھا۔ لہٰذا اس کے ثمرات بھی شیریں اور بابرکت ہوتے تھے، اور آج گو مقدار میں کثیر آتا ہے مگر اس میں اکثر حصہ وہ ہوتا ہے جس میں شریعت کے جواز و عدم جواز کا لحاظ نہیں رکھا گیا لہٰذا وہ یہاں آکر بھی یا مٹی میں ملائے جانے کے قابل ہوتا ہے

لہ خطاب جیسے ڈاکٹر وغیرہ۔

اور فضول تعمیرات میں خرچ ہو جاتا ہے یا زوائد امور میں صرف ہو جاتا ہے، چھنٹ چھنٹا کر جو حلال بچتا ہے وہ مدِ تعلیم میں صرف ہوتا ہے مگر وہ اقل قلیل[2] ہے لہذا علم مورث[3] عمل کا ثمرہ بھی اقل قلیل۔ صدق اللہ العلی العظیم[4]
الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات۔[5]

حضرت پیرانِ پیرؒ فرماتے ہیں: اے لوگو میں تمہارے مصارف[6] دیکھ کر بد اصل کا پتہ چلا لیتا ہوں کہ تمہارا پیسہ حرام جگہ صرف ہوا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ضرور حرام طریق سے حاصل ہوا تھا لہذا مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔[7] اور مباح جگہ صرف ہوتا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ جائز صورت سے کمایا گیا تھا۔ اور اگر خاص اہل اللہ پر یا عین خوشنودیٔ خدا کے مواقع پر خرچ ہوتا دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ صرف اباحت ہی نہیں بلکہ طاعت و رضاءِ حق کے ساتھ حاصل کیا ہوا تھا بس جیسا بیج ویسا درخت اور جیسا تخم ویسا اس کا پھل۔

عوام شکایت تو کرتے ہیں کہ اب علماء ایسے کیوں نہیں جیسے پہلے تھے مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا کمایا ہوا پیسہ جو مدرسوں میں آتا ہے ویسا خالص اور پاک نہیں ہے جیسا ان کے بزرگوں اور اسلاف کا تھا وہ اپنا کسبِ مال اللہ کی مرضی کے موافق کریں اور اس کو طلبہ کی خورد و نوش بنا دیں تو پھر علماء پہلے سے دیندار محتاط اور مخلص اللہ والے خاشع و خاضع[8] تیار ہونے کیا دشوار ہیں۔

الحاصل حقائقِ علمیہ[9] جن کا مرتبہ کشوف کونیہ سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے ہر وقت آپ کے قلب پر وارد ہوتے اور موقع موقع پر آپ اس کا اظہار بھی فرماتے رہتے تھے۔ قدرت نے آپ کو اس صدی میں ایک خاص خدمتِ علم و عمل کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے اس وقت سے جبکہ آپ بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے آپ کو شجاعت اور اپنے آقا پر جاں نثاری کا مادہ آپ کے قلب میں موجود تھا۔ آپ کو بچپن سے شکار کا شوق تھا مگر نہ اس لئے کہ طرح طرح کے گوشت کا مزہ چکھیں بلکہ اس لئے کہ قوی مسلمان کو ضعیف مسلمان پر فوقیت[11] ہے اور اسلام چاہتا ہے کہ جس صورت سے مسجد کے مُلّا ہو کہ نماز کی صف میں دلق پوش مسکین بنے کھڑے ہو اسی طرح سیرت و ہمت سے شہسوار سپہ سالار ہو کہ امارت و قیادت کی لوا[12] ہاتھ میں دیدی جائے تو اس کی حرکت

[1] درس کے لئے راحت کا مکان یا طلبہ کے قیام کی جگہ جس کا نام دار الطلبہ ہے علاوہ اس کے کہ مہمانانِ رسول کا احترام و اکرام اور راحت رسانی ہے عملی نگرانی پر قدرت اور تخریب سے تحفظ کا سبب ہونے کے سبب اصل ضرورت میں داخل ہے۔
[2] کم سے بھی بہت کم۔ [3] عمل پیدا کرنے والے علم کا پھل بھی کم سے کم ہے۔ [4] سچ فرمایا اللہ علو و عظمت والے نے۔ [5] بری چیزیں برے آدمیوں کے لئے ہیں اور برے آدمی بری چیزوں کے لئے اور اچھی چیزیں اچھے آدمیوں کے لئے ہیں اور اچھے آدمی اچھی چیزوں کے لئے۔
[6] خرچ۔ [7] آمدنیاں۔ [8] حرام مال تھا حرام جگہ گیا۔ [9] عاجزی و انکساری والے۔ [10] علمی حقیقتیں جن کا مرتبہ غیر اختیاری باتوں کے کشف ہو جانے سے کئی درجے بلند و بالا ہے [11] یہ حدیث کا مضمون ہے اور قوی جہاد کر سکتا ہے کمزور نہیں کر سکتا
[12] جھنڈا۔

دشمنوں کے دل ہلادے۔ بغاوت تو بڑی چیز ہے اپنی[1] سرکار کے خلاف کا کبھی وسوسہ بھی آپ کو نہیں گذرا مگر آپ کی اس جامعیت کے سبب بدظنوں کو طرح طرح کے خیالات قائم کرنے کا موقع ملا اور ہوا جو کچھ ہوا کہ آپ کے مراتب میں ترقیات ہوئیں اور دینی جاہ کے ساتھ آپ کا اخلاص آخر کو اس دنیوی جاہ و اقتدار کا بھی سبب ہوا جس نے آپ کے مخالفوں سے بھی آپ کی مدح کرادی۔

شیخ الہند کا وصال اور مادۂ تاریخ

۱۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۹ھ سہ شنبہ ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۲۰ء کو آپ دنیا سے رخصت ہوئے مگر اس طرح کہ دنیا کے جم غفیر کو اپنا والہ و شیدا بنا کر اور علمی و عملی ایسی یادگار چھوڑ گئے جو عرصۂ دراز تک قائم رہے گی۔ وفات کا مادۂ تاریخ یہ ہے ع

عالم کی موت جان لو عالم کی موت ہے

وصال سے قبل کا حال

وصال سے دو دن قبل بندہ حاضر ہوا تو ضعف کی وجہ سے آپ کو کروٹ بدلنا دشوار تھا اور اکثر غشی طاری رہتی تھی مگر جب خادم نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دیتا تو آپ ایسے مستعد ہو جاتے تھے گویا تندرست ہیں۔ میری موجودگی میں عصر کا وقت آیا اور خادم نے آپ کے کان کے قریب منہ لاکر کہا کہ نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اشارہ کیا کہ نیچے اتارو[2]۔ چنانچہ دو آدمیوں نے آپ کو اٹھا کر بٹھایا اور تیمم کرایا اس کے بعد پلنگ سے نیچے مصلے پر آپ کو کھڑا کر دیا اور آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ اب چھوڑ دو سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں مجسم حیرت بنا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ضعیف جثہ جس سے پہلو بدلنا دشوار تھا کس ہمت کے ساتھ ظاہری سہارے کے بغیر ایسا چست کھڑا ہے گویا مضبوط سپاہی ہے جس کو پہرہ پر تعینات کیا گیا ہے چونکہ آپ دہلی میں بغرض علاج ٹھیرے ہوئے تھے اس لئے قصر نماز پڑھی اور دوسری رکعت پر جب سلام پھیرا تو بے اختیار گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا اور دیر تک بات یا اشارہ بھی نہ فرما سکے بس وقتی طاقت تھی جو صرف نماز کے دو فرض ادا کرنے کے لئے بجلی کی طرح بدن میں جاری ہوتی اور سلام پھیرتے ہی نکل جاتی تھی کہ پھر وہی ضعف دبا لیتا اور آپ کو فرش پر گرا دیتا تھا۔[3]

سلہ زمانہ کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے سرکار سے اللہ تعالیٰ کو مراد لیا ہے جیسے حدیث میں ہے السید اللہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے سردار اور سرکار ہیں۔ سلہ فرلیقتہ۔ سلہ گو چارپائی کے اوپر نماز درست ہے مگر وہاں کھڑا ہونا مشکل تھا اور گو خود قدرت اترنے کی نہ ہونے کی وجہ سے نہ اترنا اور بیٹھ کر ہی پڑھ لینا جائز تھا مگر اماموں نے دوسروں کے ذریعے ہونے کو بھی قدرت فرمایا ہے اس لئے اس کو اختیار فرمایا اور گو بحکم اللہ تعالیٰ اپنی رخصت پر عمل کرنے کو بھی ایسا ہی پسند فرماتے ہیں۔ جب عزیمت (اولیٰ حکم) پر عمل کو اور گو بظاہر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی تھی اس لئے بیٹھ کر پڑھنا بھی پسندیدہ تھا مگر اپنی ہمت کو انسان خود دیکھ سکتا ہے باطنی قوت سے ہمت محسوس فرمائی تو قیام ترک نہیں کیا۔

تو در وگم شد وصال این است وبس[1] — گم شدن گم کن کمال این است وبس

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست[2] — از کجا می آید این آواز دوست

شیخ الہند کی حضرت سے رخصتی ملاقات

حضرت رحمۃ اللہ علیہ[3] شریف حسین کی شورش میں جب واپسی ہندوستان کے قصد سے چلے تو حضرت شیخ الہند طائف میں تھے اور جب آپ مکہ معظمہ آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب چلے گئے مگر بانتظار جہاز جدہ میں ٹھیرے ہوئے ہیں تو آپ اونٹ پر سوار ہو کر جدہ آئے اور محض رخصتی ملاقات کے لئے سنگستان عرب کا وہ راستہ قطع کیا جس کو حجاج مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ آخر چندے قیام فرما کر آپ اُدھر روانہ ہوئے کہ اسیر مالٹا بن کر بہت کچھ حاصل کرنا مقدر تھا اور حضرت ادھر آئے کہ یثرب کی مٹی میں شامل ہونے سے قبل چند علمی و عملی صدقات جاریات کی تکمیل کرنا باقی رہ گئی تھی اور آخر چھ سال کے اندر عالم برزخ میں پھر دونوں حضرات ایک لوا[4] کے نیچے محشور ہونے کے لئے جمع ہو گئے کہ رنگ جدا جدا تھا مگر مقصود[5] واحد سہ

بہر رنگے[6] کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم

کتب درسیہ جو دار العلوم میں پڑھائیں

دار العلوم دیوبند کے مدرس دوم ہونے کی حیثیت سے مسلم شریف کا سبق حضرت کے پاس خاص التزام سے رہا اور آپ اس کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ دوپہر کو وقت معمول سے پہلے آپ خانقاہ سے مدرسہ میں تشریف لاتے اور نودرہ میں طلبہ کے ساتھ نماز باجماعت پڑھ کر سبق شروع فرما دیتے، بارش کے موسم میں پائنچے چڑھا کر خانقاہ سے چلتے اور کبھی ایسا نہ ہوتا کہ معمولی عذر پر مدرسہ تشریف نہ لاویں۔ توضیح تلویح اور ہدایہ اخیرین کے اسباق بھی آپ کے پاس رہتے اور ادب کی کتابیں بھی آپ ہی کے سپرد ہوا کرتی تھیں۔

اس دور کے چند نامور تلامذہ

چھ سالہ مدت قیام میں جسقدر طلبہ نے دار العلوم میں دورۂ حدیث پڑھا وہ سب آپ کے شاگرد ہیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری،[7] مولوی ولایت حسین صاحب دیوہ ضلع گیا۔ مولانا صدیق احمد صاحب جہا محمد نی برادر مولانا حسین احمد صاحب۔ مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹی۔ مولوی گل محمد خاں صاحب مدرس حال دیوبند اور مولوی انظار حسین صاحب سہسپوری۔

---

[1] تم تو بس اس میں گم ہو جاؤ وصل بس یہی ہے اور گم ہونے کے خیال کو بھی گم کر دو تو بس کمال یہ ہے۔ [2] سوکھا تار اور سوکھی لکڑی اور سوکھی کھال تو پھر یہ دوست کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ [3] حضرت سہارنپوری صاحب سوانح۔ [4] ایک جھنڈے کے نیچے اکٹھے ہونے کے لئے۔ [5] اللہ کے دین کی پابندی وحفاظت۔ [6] تم جس جس رنگ کا کپڑا چاہے پہن لو میں تو تمہارے قد کے انداز کو پہچان ہی لیتا ہوں۔ [7] اہلحدیث کے سرخیل۔

دار العلوم دیوبند میں شورش

وہ زمانہ حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی کے اہتمام کا تھا اور ممبران کے اضافہ کی آڑ میں کچھ ایسا فتنہ برپا ہوا جس نے اہلِ مدرسہ کو پریشان کر دیا کہ کچھ اہلِ شہر بھی مخالفین میں شریک ہوگئے اور اتنا زور دیا گیا کہ یا ہماری خواہش کے موافق ہو ورنہ مدرسہ استبداد کی بدولت بند ہو جائے گا۔ شریر اوباشوں کی دھمکیاں جدا تھیں اور حکام رسی کے ناز پر سب کو مغلوب کرنے کا دعویٰ جدا تھا کہ ہمدردانِ مدرسہ کو بھی اندیشہ تھا مدرسہ آندھی کے جھونکوں سے متزلزل ہو جائے گا مثل مشہور ہے "ملا کی دوڑ مسجد" ان روحانی بھائیوں نے بھی آخر اپنی پریشانی و بیکسی کا اظہار بذریعہ تحریر اپنے باپ[1] سے کیا کہ مدرسہ کے سرپرست بھی تھے تو یہ تسلی بخش جواب آیا جو استقامت کا مجسمہ اور شفقت کی تصویر ہے۔ اس خط کا فوٹو لیکر اعلیٰ کاغذ پر طبع بھی کر دیا گیا ہے کہ جن کو حضرت گنگوہیؒ کی تحریر بجنسہ دیکھنے کا شوق ہو وہ زیارت کر سکیں اور یادگار بنا کر پاس رکھ سکیں کہ اب نہ وہ تحریر باقی ہے نہ تحریر کرنے والا قیمت ۲ رہے۔

مکتوب حضرت گنگوہیؒ ہر دو حضرات کے نام

از بندہ رشید احمد عفی عنہ۔ برادران مکرمان بندہ مولوی محمود حسن صاحب و مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہما۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ دونوں کے چند خطوط پہنچے جس سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ آج مولوی خلیل احمد صاحب کا خط آیا جس سے پریشانی مدرسین کی دریافت ہوئی یہ تحریر ضروری ہوئی۔ میرے پیارے دوستو! تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے تم تو ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ[2] پر قانع رہو اور مدرسہ سے آپ کو فقط اتنا تعلق ہے کہ درس دیئے جاؤ، اگر مدرسہ بند حق تعالیٰ کرادے گا تم اپنے گھر بیٹھ رہنا اگر مفتوح رہا[3] درس میں مشغول رہنا۔ جو تم سے درس اہلِ شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائیگا تم کس واسطے پریشان ہوتے ہو، خبر بھی مت رکھو کہ کیا ہو رہا ہے اپنا کام کئے جاؤ، تمہارے برابر تو کسی کے دست و پا نہیں چلتے، تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو لکھتے ہو، جس کام کے تم ہو اس میں تکرار نہیں۔ اب فقط نزاع یہی ہے کہ اہلِ شوریٰ کی زیادت ہو تمہارا کیا حرج ہے، تم اپنا کام کرو۔ حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں وہ اپنی تدبیر میں رہیں خواہ کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف۔ اور اہلِ شوریٰ خود سب اختیار حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہوگئے تو تم پر کیا بار ہے۔ پس تم جیسے لوگوں سے تردد کا ہونا بے موقع ہے، تم کسی امر میں لب کشا مت ہو، کوئی پوچھے تو جواب دو کہ درس کے باب میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے۔ انتظام وغیرہ کو نہ ہم جانیں نہ ہم دخل دیں، اور اندیشۂ بدمعاشاں بھی کیوں کرو۔ اس شعر

---

[1] روحانی باپ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ [2] اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرلیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہیں۔ [3] کھلا ہوا۔

حضرت شیخ المشائخ قدس سرہ کو مدنظر رکھو ؎

قصد[1] ظالم بسوئے کشتنِ ما — دلِ مظلوم ما بسوئے خدا
او[2] دریں فکر تا بما چہ کند — ما دریں فکر تا خدا چہ کند

اے عزیزان! روزِ ازل مقدر ہو چکا ہے ذرہ ذرہ جو واقع ہوگا مدرسہ کے امور میں بھی بس وہی ہوگا اور ہو کر رہے گا خواہ کوئی دفع کرے یا واقع کرے۔ پھر تم کیوں سرگشتہ ہوتے ہو، ہرچہ[3] از محبوب رسد شیریں بود۔ ہم کون ہیں؟ بے اختیار محض ہیں، اگرچہ بظاہر مختار ہیں۔ ہم پر جو گذرے گا وہ عین لطف ہوگا اور جو عالم میں صادر ہوگا وہ عین مصلحت ہوگا۔ خواہ خرابی مدرسہ ہو یا بقا خواہ عزت و نصب ہمارا تمہارا ہو خواہ ذلت و عزل۔ تم بسبب وقائع بازیگر کے سانگ سمجھ کر اپنی درس کے شغل میں بسر کرو، این و آں و زید و عمر پر چھوڑو۔ ہرکس[4] بخیال خویش خبطے دارد۔ نہ کوئی مفسد کچھ کرسکے نہ کوئی مصلح کرسکتا ہے سب فاعل مختار کرتا ہے وَمَا[5] تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ ؎

من[6] از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ بامن انچہ کرد آں آشنا کرد

وَھُوَ[7] اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ بس تمام ہوا قصہ۔

وہاں کی خبر کا مشتاق ہوں بشر ہوں اپنے دوستوں کا دعاگو خیر طلب ہوں۔ تم کو کوئی گزند نہیں مطمئن رہو، نہ مدرسہ کہیں جاوے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر نازاں جان کر کالائے بد بریش خاوند[8] کرو اور دم بخود ہو کر مِی[9] نوش دمی نیوش و چیزے مخروش۔ فقط۔ سب عزیزوں کو بعد سلام مسنون یہی مضمون جان بخش بعد سلام مسنون فرمادیویں۔ جو دوستان اہل تدبیر ہیں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں بعد سلام مسنون مضمون شکر و رضا ان سے کہدیویں، اور جس کو چاہو سلام کہدینا، یہ وقت شور یہ خروش اہلِ فساد عین مصلحت ہے اس کا جسقدر غلغلہ ہوگا اسی قدر مفید ہوگا، انجام خیر ہی خیر واصب[10] و دائم رہے گا۔

رشید احمد

---

[1] ظالم کا ارادہ تو ہمارے مار ڈالنے کی طرف ہے اور ہمارا مظلوم دل خدا کی طرف ہے۔
[2] وہ تو اس فکر میں ہے کہ آخر ہمارے ساتھ کیا کرے اور ہم اس فکر میں ہیں کہ آخر خدا تعالیٰ کیا کرتے ہیں۔
[3] محبوب کی طرف سے جو کچھ بھی پہنچے وہ شیریں ہی ہے۔ [4] ہر شخص اپنے اپنے خیال کے موافق بھٹکنا رکھتا ہے۔
[5] اور تم تو کچھ چاہ بھی نہیں سکتے بغیر اس کے تو داللہ تعالیٰ ہی چاہیں۔ [6] میں غیروں کی وجہ سے گریہ وزاری نہیں کرتا ہوں کیونکہ میرے ساتھ تو جو کچھ کیا ہے اپنوں ہی نے کیا ہے۔ [7] اور وہ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔ [8] برا سامان شوہر کی ڈاڑھی پر۔ ایک محاورہ ہے۔ [9] پی لو اور سن لو اور بالکل نہ بولو۔
[10] پائیدار۔

مہتمین دار العلوم

مدرسہ آخر اللہ کا کام تھا اور اللہ کی چیز تھی اس لئے آندھیاں خوب خوب چلیں مگر اوپر ہی اوپر زور دکھا کر فنا ہوگئیں۔ اور بگولے شور و غل مچاتے رہے مگر اپنے ہی چکر میں گھوم کر تمام ہوگئے کہ مدرسہ کا بال بھی بیکا نہ ہوا بلکہ شعبان ۱۳۱۰ھ میں اہتمام منشی فضل حق صاحب کے نام تبدیل ہو کر شورش کا برسہا برس کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اواخر ۱۳۱۱ھ میں منشی صاحب مستعفی ہوئے تو مولانا محمد منیر صاحب مہتمم مقرر ہوئے۔

حافظ محمد احمد رح

اور آخر کار ۱۳۱۳ھ میں زمام مدرسہ بانیٔ مدرسہ کے جگر گوشہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے ہاتھ میں آئی جو اس وقت مدرسہ کے مدرس سوم تھے اور اس کی تحریک حضرت نے فرمائی تھی

حافظ محمد احمدؒ کی مہتمی کے محرکِ اوّل

میاں صاحب مولانا سید اصغر حسین دیوبندی تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں بزمانۂ اخیر حضرت نے مہتمم صاحب مرحوم کے متعلق اپنے اخلاص و محبت کے ذکر میں نہایت وثوق کے ساتھ فرمایا کہ حافظ احمد صاحب کے اہتمام کے متعلق حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں سب سے اول میں نے تحریک کی تھی۔ اس وقت تک کسی کو خیال بھی نہ تھا اور فرمایا کہ تحریک ہی کر کے نہیں چھوڑ دی بلکہ حسب موقع یاد دہانی اور تائید بھی کرتا رہا۔

احقر نے عرض کیا کہ یہ حضرت کی بصیرتِ صادقہ تھی کہ اتنا عمدہ انتخاب فرمایا جس سے دار العلوم نے اتنی ترقی ہوئی نیز فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت گنگوہی کی خدمت میں میری نسبت کچھ پہنچا کر حضرت کے اعتماد و تعلق کو کم کرنا چاہتے ہیں لیکن واقعی امر یہ ہے کہ یہ سب ایسی ہی معمولی سماعی باتیں تھیں یقین کے ساتھ کبھی نہیں معلوم ہوا کہ میری نسبت کسی نے ایسا ارادہ یا معاملہ کیا ہو اور اب الحمد للہ میرے دل میں کسی کی طرف سے کوئی خلش اور شکایت نہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی جو میرے دل میں آئی اور میں پڑھنا چاہتا تھا ونزعنا ما فی صدورھم من غل (یعنی اہل اللہ کے قلوب سے رنجش باہمی نکل جانے کا مصداق اور وقوع بعض دفعہ دنیا ہی میں ہوجاتا ہے)۔

عـــہ منشی فضل حق مولانا سراج الحق دیوبندی مقیم بھوپال کے حقیقی بھائی تھے۔ سنا ہے کہ منشی صاحب پر مخالفین نے خیانت کا الزام لگایا تھا جس سے وہ اس قدر کبیدہ خاطر اور ملول ہوئے کہ انھوں نے نہ صرف استعفا دیا بلکہ دیوبند ہی چھوڑ دیا کبھی کبھی بیوی بچوں کے پاس خط آجاتا تھا مگر خود کبھی نہیں آئے۔ مولانا ظہور الحق صاحب مرحوم مدرس مظاہر علوم ان کے چھوٹے فرزند تھے۔ اور مشہور صحافی ابو سعید بزمی مدیر مدینہ بجنور و احسان لاہور منشی صاحب کے حقیقی پوتے اور مولانا سراج الحق کے نواسے تھے ایک صحافتی وفد کے ساتھ امریکہ گئے وہاں اچانک انتقال ہوگیا نعش بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لاکر دفن کی گئی۔ (اخلاق غفرلہ)

ـلہ اور نکال دیا ہم نے جو ان کے سینوں میں تھا کینہ۔

حضرتؒ صورت اور سیرت میں اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے بہت مشابہ تھے کسی تحریکِ اہتمام کے زمانہ میں کسی نے حضرتؒ سے کہا کہ آپ سعی تو کر رہے ہیں مگر حافظ احمد صاحب کے مہتمم ہو جانے کے بعد آپ مدرسہ میں نہیں رہ سکتے کہ وہ آپ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے ان کے باپ نے آپ کے ماموں کو دیکھا۔ مگر آپ مسکرا دیئے اور فرمایا کہ میں رہوں یا نہ رہوں مدرسہ ترقی و عروج کے زینہ پر چڑھتا رہے کہ میرے لئے دوسرا دروازہ مفتوح ہو جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی تنخواہ کی خاطر مدرسہ کی ترقی کا خیال چھوڑ دوں۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور آخر آپ نے اپنے کو کامیاب دیکھ لیا کہ مدرسہ کا اہتمام حافظ صاحب کے ہاتھ سے نہ نکلا۔

حافظ محمد احمد کا انتقال

یہانتک کہ ۳ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ میں خود حافظ صاحب نے دنیا کو چھوڑ دیا اور حیدر آباد[1] سے واپسی میں کہ مدرسہ ہی کی ضرورت کے لئے سفر کیا تھا اسٹیشن نظام آباد پر انتقال فرما کر حیدر آباد کے مقبرہ خطۂ صالحین میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتقال ۱۳۰۲ھ

قدرت کو منظور تھا کہ دونوں نحیف الجثہ قوی القلب حضرات کے فیضانِ ظاہری و باطنی کا جدا شیوع ہو اور ہر ایک اپنے اپنے استاذ کے لگائے ہوئے باغ کا مستقل باغبان بنے اس لئے آپ کو دیوبند چھوڑنا پڑا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ کے استاذ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کہ مدرسہ کی روح رواں تھے اور آپ ہی کے نام پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم رکھا گیا۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کی شب میں بمرضِ درد گردہ انتقال فرما گئے تو آپ کی جگہ بٹھانے کے لئے مدرس اول کی تلاش ہوئی۔ ۱۳۰۳ھ میں مولوی عبد العلی صاحب کو کہ مدرس دوم تھے قائم مقام مدرس اول بنا دیا گیا مگر ۱۳۰۶ھ میں مولانا رخصت لیکر مراد آباد گئے اور وہاں سے استعفا بھیجدیا تو مولوی احمد علی صاحب میرٹھی جو کہ مدرس دوم تھے اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے صاحبزادہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جن کا جدید تقرر ہوا تھا ایک درجہ میں رہے۔ مدرس اول کسی کے نام پر نہ لکھا جاتا اور کیفیت میں اندراج نام کے لئے تقدم و تاخر کی بھی رعایت ہوتی تھی ۱۳۱۰ھ میں مولوی احمد علی صاحب کو مدرسہ نے علیحدہ کر دیا گیا اور اب مولانا حبیب الرحمٰن کے نام پر مدرس اول لکھا جانے لگا۔

مظاہر علوم کی صدارت

ربیع الاول ۱۳۱۴ھ میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایک ماہ کی رخصت لیکر حیدر آباد گئے اور وہیں معقول تنخواہ پر قیام فرما کر سہارنپور استعفا بھیجدیا

[1] حیدر آباد دکن کی ریاست میں مفتی عدالت عالیہ ہو گئے تھے جس میں مدرسہ کی مصلحت منظور تھی۔

تب ممبرانِ مدرسہ نے حضرت گنگوہی کی خدمت میں زور کے ساتھ درخواست کی کہ مولانا خلیل احمد صاحب دیوبند میں مدرس دوم ہیں یہاں ان کو مدرس اول بنا کر بھیج دیا جائے کہ دونوں مدرسے حضرت ہی کے زیر سرپرستی ہیں، چنانچہ حضرت نے منظور فرما کر مولانا کو لکھ دیا اور آپ ۸ رجادی الثانیہ ۱۳۱۴ھ کو خیر و برکات کے مظہر ثانی بن کر مظاہر علوم میں تشریف لے آئے، اس وقت مدرسین کی تنخواہیں حسب ذیل تھیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدرس اول للعہ مولانا عنایت علی صاحب مہتمم و مدرس عہ مولانا ثابت علی صاحب مدرس ۵ مولوی محمد احکم صاحب مدرس عہ

مظاہرِ علوم میں موصوف کے درس کا آغاز

ہر چند کہ سال کے ختم ہونے میں صرف دو مہینے باقی تھے مگر اس میں بھی آپ کی تعلیمی کارگذاری کافی سے زائد ہوئی کہ جو کتابیں ناتمام رہ گئی تھیں ان کو ختم کرا دیا اور چند کتابیں از ابتدا تا آخر پڑھائیں۔ توضیح تلویح از ص۱۸۸ تا ص۲۲۴ دیوان حماسہ از ص۱ تا ص۳۲ رشیدیہ از ص۳۲ تا ختم۔ شرح وقایہ جلد دوم از ص۲۷ تا ختم موطا امام مالک از اول تا کتاب الصوم موطا امام محمد تمام، شرح نخبہ از ابتدا تا ص۸ اور سراجی از ابتدا تا ص۱۹۔

۱۳۱۵ھ حضرت کے درس کا نظام الاوقات

دوسرا سال ۱۳۱۵ھ شروع ہوا تو دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں اور ادب و منطق وغیرہ کے مختلف بڑے اسباق آپ کے سپرد ہوئے اور ختم سال پر آپ کے تعلیمی نقشے میں کتب ذیل کا اندراج ہوا۔ بخاری شریف تمام، ابو داؤد شریف تمام، ترمذی شریف تمام، مسلم شریف تا ص۳۰، شرح نخبہ تمام، شرح عقائد خیالی تمام، حسامی تا ص۱۰۱، مقامات حریری ۲۵ مقامہ، ملا جلال تمام ایضا دو بارہ تمام، سلم العلوم تصورات ملا حسن تمام، میر زاہد رسالہ تمام، غلام یحیی تمام، حمد اللہ تا ص۹، مطول تا ص۱۱۱، تلخیص المفتاح تا ص۵

قلتِ تنخواہ کی وجہ سے آپ نے اہل و عیال کو دیوبند ہی میں اپنے پاس بلا لیا تھا کہ علیحدہ رہنے میں گذر مشکل تھا چنانچہ سہارنپور تشریف لائے تو یہاں بھی متعلقین ساتھ آئے۔ دیکھنے کو تو سہارنپور میں پانچ روپے آپ کی ترقی ہوئی مگر خرچ اتنا بڑھ گیا کہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے آپ کی تنخواہ ختم ہو جایا کرتی کہ وطن قریب تھا اور رشتہ داروں کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی، ادھر گنگوہ کا قرب ہوا اور آپ کو اپنے ہادی و مرشد کی زیارت کا شوق ہر جمعہ کو حاضری پر مجبور کرنے لگا پھر مروت و سخاوت آپ کے خمیر میں ملی ہوئی تھی اس لئے اس مقدس سفر میں جتنے بھی رفقا آپ کے ساتھ ہوتے ان سب کا کرایہ آپ خود دینے کی کوشش کرتے۔

---

[1] ظاہر ہونے کی دوسری جگہ کہ اول مولانا محمد مظہر صاحب تھے۔

سہارنپور چونکہ ضلع تھا گنگوہ وانبہٹہ اور دیوبند کا اس لئے کوئی واقف یا عزیز کسی شہری یا عدالتی ضرورت سے بھی آتا تو آپ گوارا نہ فرماتے کہ سرائے میں ٹھیرے یا بازار سے کھائے۔ پھر ماشاءاللہ کنبہ کثیر اور برادری کا جتھا بڑا تھا اس لئے تقریبات غمی وشادی میں اپنی اور اہل وعیال کی شرکت کو بھی آپ حسنِ معاشرت اور صلۂ رحمی کے درجہ میں ضروری سمجھتے تھے کہ یہ شیریں تعلقات انجام کار ہدایت واصلاح کا سبب بنتے ہیں۔ ان تمامی وجوہ سے آپ تنگدست رہے مگر آپ کے استقلال اور توکل نے کسی پریشانی کا کبھی اثر نہ لیا اور یہ فکر تو پاس بھی نہ پھٹکا کہ کہیں دوسری جگہ زیادہ تنخواہ پر جاویں یا کسی ریاست سے وظیفہ اعانت کے خواہشمند ہوں جب قرض کچھ بڑھا تو جدی ترکہ میں آپ کو جو کچھ ملا تھا اس کا کوئی جزو فروخت کرکے سبکدوشی فرمالی اور اپنے تعلیم کے کام میں اتنے مستعد ہو کر مشغول رہے کہ ماتحت مدرسوں پر بھی اس کا اثر پڑتا تھا وقتِ مقررہ سے حاضری میں ذرا بھی کسی کو دیر ہوتی تو وہ حضرت کو موجود اور پڑھانے میں مشغول دیکھ کر خود شرما جایا کرتا تھا۔

وقت کا انضباط اور معمول پر مداومت آپ کے لئے کچھ ایسی طبعی شے بن گئی تھی کہ آندھی ہو یا مینہ، صحت ہو یا مرض، عسر[1] ہو یا یسر کچھ ہی کیوں نہ ہو جو ارادہ آپ کرتے یا وعدہ فرمالیتے جب تک بالکل ہی مجبور نہ ہو جاویں کسی بڑے سے بڑے مانع ومزاحم سے بھی متزلزل نہ ہوتے تھے۔

ایک بار حضرت مولانا تھانوی مدرسہ میں تشریف لائے ہوئے تھے موضع شیخپورہ کے ایک مخلص نے حضرت کی مع خدام اور حضرت مولانا تھانوی کے سب کی دعوت کردی جس کو حضرت نے قبول فرمالیا کہ اخلاص اور فقر کی آپ بہت زیادہ رعایت اور قدر فرمایا کرتے تھے۔

حضرت تھانوی کے ساتھ دعوت

دوسرے دن کے لئے ایک سہارنپوری تاجر نے تمام مجمع کو مدعو کیا اور حضرت نے وعدہ فرمالیا کہ بہتر ہے صبح کو انشاء اللہ واپس آجائیں گے اور دوپہر کا کھانا تمہارے یہاں کھائیں گے۔ شام کو گاؤں گئے اور شب کو قیام فرمایا۔ صبح کو روانگی کا وقت آیا تو ایسے زور کی بارش کہ چند قدم چلنا مشکل مگر حضرت کے ارادہ میں تزلزل نہ آیا اور ہرچند ہی اہلِ موضع کا اصرار ہوا کہ ایسی حالت میں حضرت سفر نہ فرمائیں مگر حضرت نے فرمایا نہیں بھئی آج دوپہر کی دعوت فلاں شخص کی قبول کرچکے اور وعدہ ہوچکا ہے کہ صبح کو آلیں گے۔ غرض چل دیئے اور خوب بھیگتے ہوئے ٹپری اسٹیشن پر آکر ریل میں سوار ہوگئے۔ اسٹیشن سہارنپور پر اتر کر گاڑی میں بیٹھے آرہے تھے کہ راستہ میں وہ تاجر ملے اور حضرت نے گاڑی ذرا ٹھیرا کر ان کو اطلاع دی کہ ہم لوگ اپنے وعدہ پر آگئے ہیں، وہ پریشان ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت بارش اتنی زور کی تھی کہ مجھے آپ کے واپس تشریف

---

[1] تنگی ہو یا آسانی۔

لانے کی بالکل امید نہ تھی اور اس لئے میں نے کچھ سامان نہیں کیا، اب کل صبح کی دعوت ہے۔"
مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت کا حلم اور میرا غصہ دیکھنے کے قابل تھا مگر بوجہ ادب کے غصہ ظاہر نہ کر سکتا تھا اور مولانا نے یہ بھی منظور فرمایا حالانکہ حضرت خود ہمارے ساتھ واپس آرہے تھے اور گھر والوں کو اطلاع تھی کہ آنے والے مجمع کی دعوت ہو چکی ہے، مگر آتے ہی حضرت رح نے کھانے کا انتظام فرمایا اور سارا مجمع نا وقت حضرت کا مہمان ہوا اگلا دن ہوا تو حضرت حسب وعدہ داعی کے گھر جانے کو تیار ہوئے مگر میں نے کل کے غصہ کی وجہ سے انکار کر دیا اور ظاہری عذر کیا کہ سویرے بھوک نہیں لگتی اور دیر ہو جانے سے ریل نہ ملے گی اور مجھے کل وطن جانا ضروری ہے۔ حضرت مزاج شناس تھے اور بات کو سمجھ چکے تھے مگر ساتھ ہی صاحب تدبیر بھی تھے اور ہر دو مخالف پہلوؤں کو سنبھالا کرتے تھے اس لئے سفارش فرمائی کہ شریک تو ہو جاؤ اگر رغبت ہوئی تو کھا لینا ورنہ اصرار نہ ہوگا۔ چنانچہ مولانا شریک ہوئے اور تھوڑی دیر بعد اجازت لیکر بغیر کھائے روانہ ہو گئے مگر صاحب دعوت کو مکان سے باہر ساتھ لاکر خوب سرزنش کی اور کان کھولے کہ بزرگوں کے حلم و تواضع سے مغرور ہو کر ایسی نامعقول حرکت پھر نہ کریں۔

وعدہ کا نباہ ایک مرتبہ حضرت رح نے میرٹھ تشریف لانے کے لئے وقت مقرر فرما کر خط کے ذریعہ مجھے اطلاع دیدی، اتفاق سے تمام رات اتنی شدید بارش رہی کہ گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ میں نے اسٹیشن پر حاضری کا قصد کیا تو دوستوں نے احمق بنایا کہ ابر اتنا غلیظ و وسیع ہے کہ یہ موسلا دھار مینہ سو سو میل سے کم نہیں۔ ایسی حالت میں حضرت کا گھر سے چلنا وہم میں بھی نہیں آتا بالخصوص جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی محرک سفر نہیں ہے۔ ہر چند کہ دل میرا بھی مانتا تھا کہ اس حالت میں سفر ہرگز نہ ہوگا مگر بارہا حضرت کے وعدہ پر جاؤ اور پختگی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے محض واہمہ پر چل نکلا اور شدت بارش کی وجہ سے کوئی سواری بھی نہ ملی تو پیدل روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پہنچتے ہی گاڑی آئی اور حضرت نظر آئے کہ کھڑکی سے منھ نکالے جھانک رہے ہیں۔ میں نے اپنی حاضری پر اسوقت حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کیا اور حیران ہو گیا کہ مجھ کو جوان ہو کر اسٹیشن تک آنا مشکل تھا اور حضرت بزمانہ پیری سہارنپور سے سفر کرکے اس وقت موعود پر پہنچ رہے ہیں۔ وہم ہوا کہ شاید سہارنپور میں بارش کا یہ زور شور نہ ہو مگر حضرت نے گاڑی سے اترتے ہی سینہ سے لگا کر فرمایا کہ تو نے کیوں تکلیف کی۔ بارش تو چلتے وقت وہاں اتنی تھی کہ دروازہ سے باہر آنا مشکل تھا مگر وعدہ کر چکا تھا خیال ہوا کہ دوستوں کو انتظار کی تکلیف ہوگی اسلئے بند گاڑی کرایہ کی منگا کر اسٹیشن پر آیا اور جوں توں کرکے سوار ہی ہو گیا۔

وعدہ پر عمل حافظ فخرالدین صاحب نے اپنی لڑکی کے عقد میں حضرت کو مع اہل کے مدعو کیا اور حضرت نے باوجودیکہ اماجی ضعفِ پیری اور مرض کے سبب چند قدم چلنے سے بھی معذور تھیں مگر حافظ صاحب کے ساتھ محبتِ پدرانہ ہونے کے سبب منظور فرمالیا۔ اتفاق سے ایک دن قبل بذریعہ تار آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی رشید احمد جو دہلی میں زیر علاج تھے سخت بیمار ہیں اور آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔ اس تار پر آپ فوراً تیار ہو گئے اور شرکتِ نکاح کے وعدہ کا فوراً انتظام فرمایا کہ اماجی اپنے بھائی حاج مقبول احمد کے ساتھ وقت معینہ پر غازی آباد روانہ ہو جاویں دہلی سے جس وقت گنجائش پاؤں گا وقت پر غازی آباد پہنچ لوں گا۔ گاڑی شام کو جانے والی تھی اس لئے آپ نے مدرسہ کے اسباق پڑھائے اور پھر اسٹیشن پر پہنچ کر ریل میں سوار ہو لئے۔

بھائی رشید احمد کا انتقال آپ کی روانگی کے بعد دوسرا تار آیا کہ بھائی رشید احمد کا انتقال ہو گیا اور وہ تار بھی آپ کو اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا جبکہ آپ ریل میں بیٹھ چکے تھے بھائی کی وفات کا صدمہ اور اس پر یہ فکر مزید کہ بی بی بچے محض علاج کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے کس قدر پریشان ہوں گے کہ دفن کفن کا انتظام بھی پردیس میں بیوہ اور یتیموں کو مشکل ہوگا۔ بایں ہمہ آپ وعدہ نہ بھولے اور مزید تاکید فرمائی کہ مقبول احمد سے کہدیا کہ اپنی بہن کو لیکر وقت پر غازی آباد پہنچ جاویں ایسا نہ ہو کہ حافظ فخرالدین کو پریشانی ہو۔

حزن اور فکر کے ساتھ یہ حیرانی جدا تھی کہ گاڑی ۱۲ بجے شب کو دہلی پہنچے گی اور مرحوم کے قیام کی جگہ بھی معلوم نہیں کہ کس مکان میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ موسم بھی سردی کا ہے کہ سب اپنے مکانوں میں مکانات کے اندر پڑے سوتے ہوں گے کسی کو آواز دینا اور پتہ معلوم کرنے کے لئے جگانا بھی مشکل، مگر آپ کا استقلال ہر جگہ آپ کو تھامتا اور کہتا تھا کہ جیسا بھی کچھ پیش آئے گا دیکھا جائے گا چنانچہ آپ دہلی پہنچے اور اس کوچہ میں قدم رکھا جس کا نام تار میں لکھا تھا مگر وہاں آدم نہ آدم زاد، رات اندھیری اور نہ کوئی دکان کھلی ہوئی نہ مکان جگہ جگہ گنٹ اور کنکر پڑا ہوا تھا اور آپ تنہا تھے۔ ایک جگہ ٹھوکر کھائی اور گھٹنے میں چوٹ بھی آئی مگر آپ اس خیال میں آگے بڑھتے رہے کہ کوئی نظر آوے تو کچھ اتہ پتہ معلوم ہو۔ دیر کے بعد آپ کو ایک واقف کا مکان نظر آیا اور آپ نے دروازہ پر دستک دے کر ان کو جگایا وہ باہر آئے تو حضرت کو کھڑا دیکھا اور کہا کہ بھائی رشید احمد کو تو دفن بھی کر چکے اور ان کی بی بی اور بچیاں علیگڈھ روانہ ہو گئیں۔

یہ سنتے ہی حضرت نے علیگڈھ جانے کا عزم کر لیا اور ہر چند انھوں نے عرض کیا کہ حضرت آرام فرمالیں

مگر آپ نے فرمایا وقت بہت کم ہے کل شام کو مجھے ایک عقد میں غازی آباد شریک ہونا ہے اور اس سے قبل بیوہ اور یتیم بچیوں کو دیکھ لینا اس لئے آپ فوراً واپس ہوگئے اور آخر شب میں جانے والی گاڑی سے علیگڈھ روانہ ہوگئے۔ ۱۰ بجے مکان پہنچے اور یتیم بھتیجیوں کے سر پر ہاتھ رکھا بیوہ کو تسلی دی اور مرحوم بھائی کے مرض وفات اور انتظام دفن وکفن کے حالات پوچھتے رہے۔ دو گھنٹہ بعد گاڑی غازی آباد واپس آتی تھی اس لئے آپ نے جاتے ہی فرمادیا کہ وعدہ کرچکا ہوں بعد عصر ایک نکاح میں شرکت کا اس لئے اس وقت ٹھیر نہیں سکتا اور ہر چند بچیوں کا اصرار ہوا کہ رات کو چلے جانا مگر آپ اپنے نظام اوقات کو نہ توڑ سکے۔

تمام ضروری انتظامات فرما کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وقت سے قبل اسٹیشن پر پہنچ گئے، یہاں آکر معلوم ہوا کہ کوئی میلہ ہے اور سواریوں کی اتنی کثرت ہے کہ سیکنڈ کلاس میں بھی جگہ ملنا ناممکن۔ اس پر بھی آپ نہ گھبرائے اور ارادہ میں تذبذب نہ لائے فوراً سکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ گاڑی آئی تو درحقیقت کشاکشی کی یہ حالت کہ الامان الامان سکنڈ کلاس میں بھی گھسنے تک کی جگہ نہیں۔ آخر بدقت تمام آپ اندر پہنچے اور بیت الخلاء سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ گاڑی چل کر جب دو اسٹیشن نکل لی تو آپ نے دیکھا مسافر زیادہ اترلئے اور نماز ظہر بھی پڑھنا ہے اس لئے گاڑی جب ٹھیری تو آپ اترے اور ڈیوڑھے درجہ میں کچھ جگہ پاکر اس میں آبیٹھے کہ سکنڈ کلاس میں تنگی کے ساتھ ناجنسوں کی معیت زیادہ کوفت کا سبب تھی۔ وہیں آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی اور عصر سے کچھ بعد غازی آباد پہنچ لئے۔ بندہ بھی چونکہ شریک عقد تھا اور اکثر کو حضرت کی شرکت سے مایوس پارہا تھا مگر یقین کئے ہوئے تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو حضرت جب شرکت کا وعدہ فرماچکے تو اپنی انتہائی کوشش میں حبہ برابر کمی نہ فرماویں گے اور وقت پر ضرور پہنچ جائیں گے چنانچہ مغرب کی جماعت کھڑی ہوا چاہتی تھی کہ حضرت کا چہرۂ مبارک نظر آیا اور بلبلیں اس گلاب پر قربان ہونے لگیں۔

وعدہ کا پاس اور پابندیٔ اوقات

دو چار دس بیس نہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ملیں گے جن میں ہر واقعہ اس کی مستقل شہادت ہے کہ پابندیٔ وقت اور ایفاءِ وعدہ کا اہتمام آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا تھا اور کوئی صعوبت کیسی ہی دشوار کیوں نہ ہو آپ کی ہمت اور حوصلہ کو داب نہیں سکتی تھی۔ پھر کیا پوچھنا حاضری مدرسہ اور پابندیٔ اسباق کا جو کہ آپ کا فریضہ منصب اور سارے کاموں میں اصل تھا کہ اس کی پابندی نے تو تمامی مدرسہ کو وقت کا پابند بنادیا تھا اور بغیر اس کے کہ کوئی نگرانی کرے ہر چھوٹا بڑا اپنے وقت پر مدرسہ میں موجود اور خدمتِ مفوضہ میں مشغول نظر آتا تھا۔ آپ کا غایتِ مقصود یہ تھا کہ تمامی نصاب سال بھر کا

ہر مدرس کے پاس ایسے ماہواری اوسط سے پورا ہو کہ ختم سال پر نہ کوئی سبق بچے اور نہ آخر سال میں ختم کتاب کی خاطر زیادہ زیادہ سبق ہو کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔

درس کی تقریر

آپ کی تقریر مختصر اور جامع ہوتی تھی، صاف اور عام فہم لفظوں میں عبارت کا ترجمہ کرتے اور مطلب سمجھایا کرتے تھے۔ آواز زیادہ اونچی نہ تھی مگر پھر بھی پچاس ساٹھ طلبہ کے دائرہ تک بآسانی پہنچتی تھی۔ مفہوم عبارت سمجھانے کے بعد آپ طلبہ کو شبہ اور اعتراض کا موقع دیتے اور پھر مسکرا کر اس کا جواب دیا کرتے تھے۔ بات کرنے میں آپ کے دہن سے پھول جھڑتے اور تقریر گویا موتیوں کی لڑی ہوتی تھی۔ اخیر عمر میں آپ کی آواز مرتعش[۱] ہو گئی تھی مگر تسلسل و حلاوت[۲] وہی تھا جو جوانی کے زمانے میں تھا۔ بڑے درجہ کی پندرہ سولہ ضخیم کتابوں کا ختم سال سے قبل تمام کرا دینا آپ کے لئے معمولی بات تھی اور کامل چھ سات گھنٹہ درس دینا اور دماغ و زبان سے کام لئے جانا آپ کی عادت بن گیا تھا۔

فتاوی نویسی اور خطوط کی جواب دہی

درس سے فارغ ہو کر آپ فتاوی نویسی میں مشغول ہوتے اور اس کے لئے بھی جو وقت مقرر کر لیا تھا اس میں تخلف نہ ہوتا۔ پھر آئے ہوئے خطوط[۳] کے جوابات جدا تھے اور اس کا بھی اس قدر التزام و اہتمام تھا کہ جس خط کا جواب نہ آئے اس کا یقین ہو جاتا تھا کہ پہنچا نہیں۔ بالخصوص جن خطوط میں ٹکٹ رکھا ہوتا اس کا جواب تو جلد سے جلد لکھواتے تھے کہ بارِ امانت سے سبکدوشی ہو۔ ضروری سے ضروری کام آپ مدرسہ کا وقت ہو جانے پر ملتوی کر دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں اناج یا آٹا نہیں اور مدرسہ کا وقت آگیا تو آپ مدرسہ میں آجاتے اور منتظر رہتے کہ کوئی دوست آجائے تو اس سے آٹا منگوا کر گھر میں پہنچا دیا جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا یا آپ مشغولیت میں بھول جاتے اور جب فارغ ہو کر کھانے کا وقت آتا تب آپ کو خیال ہوتا کہ آٹا تو تھا ہی نہیں روٹی کہاں پکی ہوگی۔

مظاہرِ علوم میں اکتیس[۳۱] سالہ تدریسی خدمات

۱۳۱۴ھ سے اخیر تک آپ کا تعلق مظاہر علوم سے رہا اور کامل اکتیس[۳۱] برس آپ نے ایک جگہ بیٹھ کر علومِ دینیہ کی خدمت تدریس میں صرف کئے کہ ۳۹۱ طلبہ فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ سے سند لے کر رخصت ہوئے جو ہندوستان کے تمامی اطراف میں اور حجاز و یمن تک پھیلے کہ بحرِ خلیل کی انہارِ جاریہ بن کر ملکی خشک زمین کو سیراب کریں اور قیامت تک یہ سلسلہ کہ ایک ایک مستفید سو سو کو عالم بنا کر آبیاری ارض یابس کے

---

[۱] رعشہ والی کانپتی ہوئی۔ [۲] شیرینی۔ [۳] اصلاح و تربیت کے۔

قابل بنائے اُس بے شمار اور گنت تعداد میں پہنچ گئے ہیں جس کا علم بس اللہ ہی کو ہو سکتا ہے اور وہ سب کارنامے حضرتؒ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہیں گے۔ والباقیات[1] الصالحات خیر عند ربك ثوابا وخیر املا۔

سنہ ۱۲۸۹ھ سے سنہ ۱۳۱۴ھ تک منگلور، بھوپال، بہاولپور، سکندرآباد، بریلی اور دیوبند کی پچیس[25] سال تک تدریس علم و نفع رسانی خلق کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھا جائے تو صرف مدرسہ مظاہر علوم کے صدقات جاریات آپ کے اتنے کثیر در کثیر ہیں کہ ان کی نظیر اس صدی میں بمشکل ملے گی اور ایک ایسے شخص کے لئے جو اس کا سچا طالب ہو کہ بندہ کو دنیا میں آکر کیا کرنا چاہئے آپ کی سوانح بتائے گی کہ بس اس تعلیم کی اشاعت میں مرمٹنا چاہئے جو خالق جل شانہٗ کی طرف سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم تک پہنچی اور اسی کی خدمت میں یہ سانس گذار دینے چاہئیں جو لمحاتِ مہلت بنا کر مولیٰ کریم کی طرف سے ہم کو عطا ہوئے ہیں کہ یہی ہر وقت کا شغل ناز اور فخر کے قابل ہے ؎

نازم[2] بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم[3] ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را ۔۔۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور باوجود دینی خدمت میں فنا ہو جانے کے کبھی اس کا وسوسہ بھی نہ آیا کہ آخرت کا ذخیرہ کچھ جمع ہو گیا جب فرمایا چشم نم ہو کر یہی فرمایا کہ دوستوں کے حسنِ ظن پر جی رہا ہوں کہ شاید کسی کے طفیل مغفرت ہو جائے اور حق تعالیٰ اپنے صلحاء کے حسنِ ظن کی لاج رکھ لے ؎

منت[4] منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنم ۔۔۔ منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

مظاہر علوم کے بانی اور اساتذہ

ایک مدرسہ[5] کی تاریخ کا پہلا ورق تھا کہ مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپوری کے قلب میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا خیال ہوا اور یکم رجب کو محلہ قاضی میں آپ نے اس کی بنیاد رکھی۔ مولوی سخاوت علی صاحب انبہٹوی کو عہ ماہوار پر مدرس بنا کر بٹھا دیا اور مولوی عنایت علی صاحب و حافظ قمر الدین صاحب کو کہ مولانا سعادت علی صاحب سے عربی پڑھا کرتے تھے مدرسہ کا ابتدائی طالب علم بنایا ان کو مولوی سخاوت علی صاحب نے نحو میر شروع کرائی اور خود مولانا نے بلا تنخواہ مدرسہ کی ہر خدمت کو تنہا انجام دیا پھر مولانا احمد علی صاحب نے

---

[1] اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے رب کے نزدیک بہترین ثواب اور بہترین امید ہیں۔ [2] مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے آپ کا حال دیکھا ہے اور میں اپنے پیروں کے پاؤں پڑتا ہوں کہ آپ کے کوچے تک پہنچے ہیں۔ [3] ہر وقت اپنے ہاتھ کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ اس نے آپ کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچ لیا ہے۔ [4] یہ احسان مت رکھو کہ میں بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں تم تو ان کا احسان پہچانو کہ انھوں نے تم کو خدمت میں رکھ لیا ہے۔ [5] مدرسہ مظاہر علوم

معاونت فرمائی اور تین ماہ بعد شوال ۱۳۰۸ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب صدر مدرس مقرر ہوئے تو مولوی سخاوت علی صاحب مدرس دوم ہو گئے۔

سفر حجاز کے لئے ڈیڑھ سال کی رخصت

اس ابتدائی سرنامہ کو دیکھئے اور ایک اس وقت کو جبکہ حضرت نے سفر حجاز کے لئے ڈیڑھ سال کی رخصت لی اور مدرسہ کو اپنے تلامذہ وخدام کے حوالہ فرما کر ۱۶ شوال ۱۳۴۴ھ کو عرب سدھارے کہ مالی اور علمی ترقیات میں اس عروج پر پہنچ چکا تھا جس نے ابتدائی زمانہ کو ایسا بنا دیا تھا جیسے یوسف علیہ السلام کے شاہِ مصر بن جانے کے زمانے میں آپ کے کنعان سے نکل کر بازارِ مصر میں آنے کا وقت، کہ پہلا زمانہ دیکھنے والا اگر اس حالت کو اچانک دیکھ لے تو برادرانِ یوسفؑ کی طرح یہ بھی نہ سمجھے کہ ہم جس کا نظارہ کر رہے ہیں اس سے کچھ سابق تعارف ہے یا نہیں۔

اس درمیان میں مدرسہ کو مختلف حوادث وانقلابات پیش آئے جن کا پیش آنا دنیا میں آنے والی ہر چیز کے لئے ضروری ہے اور جن کے مفصل حالات مدرسہ کی سالانہ کیفیت میں درج ہیں جو اب تک مدرسہ کی یادگار بنی ہوئی رکھی ہیں۔ مگر بحمداللہ وہ عروج جو حضرتؒ کے ہاتھوں مدرسہ کے لئے روزِ ازل میں مقدر ہو چکا تھا کسی حال ہبوط پذیر نہ ہوا اور ایسی علمی اسلامی یادگار بن کر صفحۂ ہستی پر موجود ہے جس کو بعض امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے اس وقت دنیا میں بے نظیر کہنا بے موقع نہیں کہ علمی افادہ کے ساتھ اب تک طلبہ کے عملی حالات پر بھی اہتمام کے ساتھ نظر رہتی ہے اور تمامی[1] موجودہ مدرسین حضرت ہی کے تلامذہ ومریدین ہیں۔ اور ان کی مخلصانہ ومتوکلانہ معیشت اس وقت نمونۂ اسلاف ہے کہ قلیل تنخواہ پر اس اہتمام وشوق کے ساتھ خدماتِ مفوضہ انجام دیتے ہیں جو دوسری جگہ کثیر تنخواہیں والے بھی انجام نہیں دیتے۔ کیونکہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پیشوا نے تنگی معاش کی مختلف صعوبتیں اٹھائیں مگر قرض لینا بھی گوارا نہ کیا۔ جو اثر پڑا وہ آپ کے بطن وجسد پر پڑا مگر مدرسہ سے ایک وقت غیر حاضر رہنا یا ایک سبق پر بھی فاقہ کے ضعف واضمحلال کا اثر ڈالنا آپ کو پسند نہ آیا۔

بڑے بڑے زلزلوں میں بھی آپ مدرسہ سے نہ ہلے اور اپنے نفس یا اہل وعیال کی خوش عیشی کی خاطر آپ نے محلہ سے بھی باہر قدم نہیں نکالا، ہاں مدرسہ کی خاطر آپ نے نہ گرمی دیکھی نہ سردی، نہ ضعفِ پیری کا خیال کیا نہ رمضان کی تعطیل اور روزوں کی دشواری کا، نہ ریل کے سفر سے گھبرائے نہ جہاز کے سفر سے، آرنگ بمبئی، رنگون، بہاولپور، اور دیراول وجوناگڈھ جیسے مقامات بعیدہ مدرسہ کو نفع پہنچنے کی طمع پر آپ کیلئے اس بڑھاپے کے زمانہ میں ایسے تھے جیسے سہارنپور سے انبہٹہ یا دیوبند۔

[1] بجز ایک مدرس ابتدائی شعبہ کے کہ ان کو تلمذ بیعت حاصل نہیں گو محبت وعقیدت مثل تلامذہ ہے۔

تنخواہ میں اضافہ

سنہ ۳۰ھ تک کامل سولہ برس آپ کو گذرے کہ آپ کی تنخواہ میں ایک روپیہ کی بھی ترقی نہیں ہوئی، ہاں جمادی الثانیہ سنہ ۳۰ھ میں جب تمامی ملازمین کو ترقیاں دی گئیں تو آپ کی تنخواہ میں بھی عـہ کا اضافہ کردیا گیا جس کو آپ نے بادلِ ناخواستہ قبول کیا اور فرماتے رہے کہ للعـہ ہی کے قابل کام کرنا مشکل ہے اب فـہ کے قابل کام کس طرح انجام دوں۔

سنہ ۲۵ھ سے چونکہ حضرت پر نظامتِ مدرسہ کا بار پڑگیا اور مدرسہ جس کے ساتھ آپ کو گویا عشق تھا اپنی ضروریات کے لئے آپ کو اسفار پر مجبور کرنے لگا تھا اس لئے دو متضاد خدمتوں کا بیک وقت انجام دینا آپ کو دشوار ہوا ہرچند آپ نے کوشش کی کہ اسفار سے واپس آکر اسباق مافات کی تلافی کردیں مگر وقت میں ربڑ کی خاصیت نہیں ہے کہ بڑھانے سے بڑھ سکے اس لئے آپ قادر نہ ہوئے۔ جمادی الثانیہ میں آپ نے دیکھا کہ سالانہ امتحان کا صرف ایک مہینہ باقی ہے اور دورہ کی کتابیں سب ناتمام ہیں، ادھر اسفار کی وجہ سے آپ کی طبیعت بھی ناساز ہوگئی کہ ہمت بھی فرماویں تو پورا نہیں کراسکتے اس لئے آپ نے گنگوہ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب کو بلوایا کہ قائم مقام بن کر ناتمام کتابیں ختم کرادیں۔ چنانچہ رجب سنہ ۲۶ھ میں مولانا آئے اور ۱۸ دن میں کتابیں باحسن وجوہ ختم کراکر واپس تشریف لے گئے۔ سنہ ۲۷ھ میں بھی یہی صورت پیش آئی اور مولانا ممدوح نے کہ بارگاہ گنگوہ کے پیشکار ہونے کے وقت سے حضرت کے خاص محبوب اور لاڈلے تھے

لـه اس سنہ اور حالات میں کچھ سہو یا غلط روایت کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بلفظ الشریف درج ہے۔

"یہ غلط ہے نظامت سنہ ۳۵ھ سے ہے اور میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کے بلانے کا واقعہ جو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا اس میں گڑبڑ ہوگئی۔ میرے والد صاحب کو کثرت اسفار کی وجہ سے سال کے ختم پر دورے کی تکمیل کے لئے بلایا جاتا تھا سنہ ۲۶ھ سنہ ۲۷ھ میں تقریباً ایک ایک ماہ کے لئے تشریف لائے اور سنہ ۲۸ھ سے مستقل قیام کے لئے تشریف لے آئے تھے جیسا کہ خود تذکرۃ الخلیل میں اس کی تصریح ہے اور نظامت کا تعلق سنہ ۳۵ھ سے ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب کا انتقال ذیقعدہ سنہ ۳۴ھ میں ہوگیا تھا اور حضرت نور اللہ مرقدہ اس وقت مینی تال جیل میں حضرت کی واپسی پر محبوس تھے۔ جب حضرت کی رہائی ہوئی اور مدرسہ تشریف لائے تو حضرت نے تنخواہ لینے سے شدت سے یہ کہہ کر انکار فرمادیا تھا کہ میں اپنے ضعف کی وجہ سے مدرسہ کا کام کام نہیں نہیں کرسکتا اور اب تک چونکہ مولانا یحییٰ صاحب میری اعانت میں سبق پڑھاتے تھے اور ہم دونوں مل کر ایک مدرس سے کہیں زیادہ کام کرتے تھے اس لئے میں بے تکلف تنخواہ لیتا تھا۔ ہرچند سرپرستان نے اصرار کیا کہ حضرت کا ایک دو سبق پڑھانا سرپرستان کے نزدیک کافی ہے اس پر حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہما کا تحریری اور تقریری اصرار بہت ہوا مگر حضرت قدس سرہ نے قبول نہیں فرمایا۔ اس پر حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ نے نظامت کا عہدہ تجویز فرماکر یہ فرمایا کہ اب سبق صرف تبرع ہے چاہے ایک بھی نہ پڑھائیں اسلئے کہ حضرت کے وجود کی مدرسہ اور عملۂ مدرسہ سے کام لینے کی بڑی شدید ضرورت ہے۔

اصل کتاب میں چند ورق بعد ان واقعات کا ذکر آرہا ہے وہاں بھی نظامت سنہ ۳۵ھ سے ہونا اور حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہونا بیان ہے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب کے اس خط کے موافق ہے۔

اہتمام کتابوں کی تکمیل کرائی اور حضرت کی تنخواہ باضابطہ وضع نہ ہونے دی۔

آخر حضرت نے دیکھا کہ اسفار کی ضرورت روزافزوں ہے اور بار بار اس عارضی نظم کا اہتمام دشواری سے خالی نہیں لہٰذا مولانا کو مجبور کیا کہ مدرسہ میں مستقل قیام کریں اور دورہ کے اسباق قبول فرماویں۔ چنانچہ مولانا کو حضرت کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ میں مستقل قیام فرماکر حضرت کو راحت پہنچائی کہ جس وقت بھی جہاں جانے کی ضرورت ہو حضرت آزادی کے ساتھ جائیں۔ اور اپنے متعلقہ اسباق کے ساتھ حضرت کے اسباق بھی مولانا پڑھائیں۔ مگر مولانا کی شرط یہ تھی کہ تنخواہ نہ لوں گا چنانچہ ہر چند ہی سرپرستان مدرسہ کا اصرار ہوا مگر آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ ہاں جب حضرت سفر میں جاتے اور قائم مقام بن کر حضرت کے اسباق پڑھاتے تو وہ تنخواہ وصول فرماتے اور مکان پر جاکر اماں جی کے حوالے کراتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا چوتھا سفر حج جو بمعیت مولانا شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہٹ ۱۳۲۸ھ میں ہوا وہ اسی صورت سے ہوا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے پانچ مہینے قائم مقام بن کر حضرت کے اسباق پڑھائے اور ہر مہینے تنخواہ وصول کر کے اماں جی کو پہنچاتے رہے کہ وہ اس سفر حج میں حضرت کے ہمراہ نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سال کی تنخواہ کیفیت میں حضرت کے نام درج ہے اور حضرت بلا تردد یہ تنخواہ لیتے رہے ورنہ اصالۃً مولانا محمد یحییٰ صاحب نے خدمت درس پر کبھی ایک حبہ بھی نہیں لیا اور یہ ان کی مخصوص اور امتیازی شان تھی۔

مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور حضرت گنگوہی سے نسبت رکھنے والوں میں شاید کوئی ایسا ہو جو مولانا سے واقف نہ ہو، ان کا تاریخی نام بلند اختر[1] تھا اور وطن اصلی کاندھلہ ضلع مظفرنگر۔ ان کے والد مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ، دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے سمدھیانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے جو غدر کے بعد شاہ نظام الدین میں رہتے اور اس تقریب سے مولانا بھی وہیں مقیم تھے۔

سلسلۂ نسب مولانا کا جدی نسب حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب سے اور مولوی مظفر حسین صاحب سے چھٹی پشت مولوی محمد فیض پر اس طرح جا ملا ہے کہ مولوی محمد یحییٰ بن محمد اسمٰعیل بن غلام حسین بن حکیم کریم بخش بن حکیم غلام محی الدین بن مولوی محمد ساجد مولوی محمد فیض بن مولوی محمد شریف بن مولوی محمد اشرف بن جمال محمد شاہ بن بابن بن بہاؤالدین بن شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ۔

[1] شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے لکھا ہے: تاریخی نام تو یہی تھا شاید اختلاف روایت ہو ولادت غرۂ محرم ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۳ر مارچ ۱۸۷۱ء یوم پنجشنبہ ہے۔

مولانا کی والدہ بی صفیہ بنت مولوی ضیاء الحسن[1] بن مولوی نورالحسن بن مولوی ابوالحسن[2] بن مفتی الٰہی بخش[3] بن شیخ الاسلام وہ حافظِ قرآن بزرگ تھیں جن کے حیرت بخش معمولاتِ یومیہ پہلے درج کرچکا ہوں کہ مولانا مظفر حسین بن مولانا محمود بخش بن شیخ الاسلام کی نواسی اور امی مرحومہ کی بیٹی تھیں۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب فطرةً ذہین وذکی اور طبعاً نظیف اور لطیف المزاج پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ میرے دودھ کم تھا اس لئے یحییٰ کو مرضعہ نے دودھ پلایا مگر حالت یہ تھی کہ اس کے کپڑے اگر میلے ہوتے تو یحییٰ رویا کرتا اور دودھ نہ پیتا تا وقتیکہ وہ نہا کر کپڑے نہ بدل لیتی۔

حفظِ قرآن آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا اور اس کے بعد چھ مہینے تک مسلسل اپنے والد کی طرف سے مامور رہے کہ جب تک قرآن مجید پورا حفظ نہ پڑھ لو گے روٹی نہ ملے گی۔ ہاں ختم کے بعد تمام دن چھٹی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں عموماً ظہر سے قبل پورا کلام مجید[1] ختم کرلیا کرتا اور پھر کھانا کھا کر چھٹی کے وقت میں اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا تھا۔ حفظِ قرآن کے زمانے میں بھی آپ نے باپ سے پوشیدہ فارسی کے بہت دواوین وقصص از خود دیکھ لئے تھے اور باوجود اس کے حفظِ قرآن کے سبق پر اثر نہیں آنے دیا۔

عربی تعلیم کا آغاز چھ مہینے گذرنے پر باپ نے عربی شروع کرائی اور خود ہی پڑھائی۔ آپ کے والد اکابر اہل اللہ میں سے تھے وظائف کے زیادہ پابند اور تہجد کا خاص اہتمام فرمانے والے اس لئے مولانا کو اور آپ کے بڑے بھائی مولوی محمد صاحبؒ کو آخر شب میں سویرے سے اٹھا دیا کرتے تھے کہ شروع ہی سے اس کی عادت پڑ جائے۔ مولوی محمد صاحب تو اٹھ کر طویل نفلیں پڑھتے

مطالعہ کا شوق مگر مولوی محمد یحییٰ صاحبؒ چند مختصر نوافل پڑھ کر کتاب دیکھنے میں لگ جاتے کہ طبیعت اس پر مجبول[2] تھی۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ والد صاحب کو وضو کے اوراد کا خاص اہتمام[3] تھا اور ہم پر بھی اصرار تھا کہ پابندی کریں مگر مجھے علم کی دھن تھی اس لئے میں وضو کرتا ہوا بھی فارسی اور عربی کے لغات یاد کیا کرتا۔ والد صاحب میری رٹائی کو سنتے تو ملامت کے طور پر فرمایا کرتے تھے خوب وضو کی دعائیں پڑھی جارہی ہیں۔ شرم کی بات ہے۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنونِ عقلیہ کی مہارت نامہ اس نوعمری میں مسلم ومشہور ہونے کے ساتھ علماءِ عصر میں حیرت کی نظروں سے دیکھی گئی کہ بڑوں بڑوں کو مولانا نے

---

[1] ایک گھنٹہ میں چار پارے تو تیز ناظرہ خواں بھی پڑھ سکتا تیز حافظ تو پانچ چھ پڑھ سکتا چھ گھنٹے میں ختم ہونا آسان ہے [2] پیدا کی ہوئی۔
[3] گو ان کی حدیثیں ضعیف ہیں مگر موضوع وبے اصل تو نہیں اسلئے فضیلت حاصل کرنے کے

علمی مکالمہ کرنے میں فخر تھا مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر کتابیں آپ نے خود دیکھی ہیں اور استاذ سے بہت ہی کم پڑھی ہیں۔

دیوبند میں برادرِ شیخ الہندؒ سے مقامات پڑھنا

عربی ادب میں آپ کو اتنی مہارت تھی کہ نثر اور نظم دونوں بے تکلف لکھتے مگر یوں فرمایا کرتے تھے کہ تمام ادب میں استاذ سے میں نے صرف مقاماتِ حریری کے ۹ مقامے[1] پڑھے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ استاذ نے کہدیا تھا میرے مکان کو آتے جاتے راستے میں پڑھ لیا کرو اس۔ لئے میں ساتھ جاتا اور راستہ میں پڑھا کرتا اور اکثر جگہ استاذ فرمایا کرتے کہ اس لفظ کے معنی مجھے معلوم نہیں خود دیکھ لینا۔ یہ ادب کے استاذ شیخ الہند کے بھائی حکیم مولانا محمد حسن صاحب دیوبندی تھے اور اس لئے آپ ان کا ہمیشہ احترام بھی بہت کرتے اور استاذ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ محض اسی کی خاطر مولانا کا چند روز دیوبند قیام رہا کہ نصف مقامہ یا کچھ زیادہ روزانہ ہو جایا کرتا۔ نو مقامے پڑھ کر آپ وہاں سے کاندھلہ آگئے۔

مولوی ہدایۃ اللہ سنبھلی سے اٹھارہ دن حمد اللہ پڑھنا

اور وطن کے مدرسہ عربیہ میں مولوی ہدایۃ اللہ صاحب سنبھلی سے کہ معقولات میں مشہور تھے منطق کا سبق شروع کر دیا مگر وہ علمِ ادب سے ناواقف تھے اس لئے ایک گھنٹہ مولوی محمد یحییٰ صاحب ان سے حمد اللہ پڑھا کرتے اور ایک گھنٹہ مولوی ہدایۃ اللہ صاحب آپ سے مقاماتِ حریری پڑھا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حمد اللہ میں نے ۱۸ دن میں پڑھا کہ ظہر کے بعد اس کا سبق ہوتا تھا اس لئے صبح ہی میں حمد اللہ اور اس کے حواشی لے کر مطالعہ دیکھنے کو نانی اماں کی چھت پر جا بیٹھتا اور ۱۲ بجے اتر کر روٹی کھایا کرتا تھا۔ بسا اوقات حمد اللہ کے سبق میں استاذ سے بحث ہو جاتی کہ میں جو مطلب سمجھا ہوتا وہ اس کو غلط بتاتے اور دوسرے عنوان سے تقریر فرماتے تھے۔ میں کہدیا کرتا تھا کہ مطلب تو یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں مگر گفتگو مقامات کے گھنٹہ میں کروں گا ورنہ میرا سبق ناقص رہ جاوے گا۔

سُلّم کا ازبر کرنا

آپ فرمایا کرتے تھے کہ سلم[2] مجھے ازبر یاد تھی اور تسبیح لے کر میں نے اس کی عبارت کو از اول تا آخر دو دو سو مرتبہ پڑھا ہے۔

ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے دیکھا ہے کہ ادب کی اکثر درسی کتابیں مولانا محمد یحییٰ نے محض اپنے حافظہ سے لکھ کر طلبہ کو دیدیں اور چلتے پھرتے نہایت بے پروائی کے ساتھ پڑھائی ہیں چنانچہ نفحۃ الیمن متنبی اور حماسہ تمام ان کے لکھے ہوئے اب بھی موجود ہیں۔

---

[1] قصے مگر ان میں بہت ہی لغات استعمال کئے گئے ہیں۔ [2] سلم العلوم منطق کا دقیق متن ہے جس کی حمد اللہ وغیرہ شرحیں ہیں۔

مدرسہ حسین بخش میں درسیات پڑھنا منطق اور ادب کے علاوہ باقی کتابیں آپ نے دہلی مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں۔

حدیث پڑھنے کی شرط مگر حدیث پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا کیونکہ یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ دہلی میں حدیث پڑھنے سے آدمی غیر مقلد ہو جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بھائی مولوی محمد صاحبؒ نے چونکہ حدیث گنگوہ میں پڑھی تھی اس لئے میں حضرت کا معتقد تھا اور میں نے ٹھان لی تھی کہ حدیث پڑھوں گا تو گنگوہ میں پڑھوں گا ورنہ نہیں پڑھوں گا۔ مگر زمانہ وہ تھا کہ حضرت امام ربانی کی آنکھ میں نزولِ ماء شروع ہو چکا اور حضرت نے دورہ کا درس بند فرما دیا تھا۔ یہاں امتحان کا وقت قریب آیا تو اہلِ مدرسہ نے مولوی محمد یحییٰ صاحب کا نام بھی بخاری شریف کے امتحان میں لکھ دیا۔ حالانکہ آپ نے اس کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اہل مدرسہ نے والد صاحب پر زور دیا تو انھوں نے فرمایا یحییٰ کیا حرج ہے ابھی پانچ مہینہ باقی ہیں اس میں پڑھ لو۔

حدیث کا مطالعہ چنانچہ وہ پانچ مہینے میں نے نظام الدین کے حجرہ میں اس طرح گذارے ہیں کہ خود مسجد کے رہنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں بجز اُن دو لڑکوں کے جن کے ذمہ میری روٹی اور وضو کے لئے پانی لانا مقرر تھا۔ چنانچہ اسی دوران میں کاندھلہ سے میرے نکاح کی طلبی کا تار آیا تو لوگوں نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ مکتوب الیہ عرصہ سے یہاں نہیں ہے اور نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ جب ان طلبہ کو خبر ہوئی تو مجھے بھی تار کی اطلاع ہوئی۔

بخاری، سیرت ابن ہشام، طحاوی، ہدایہ اور فتح القدیر کا مطالعہ کر کے حدیث کا امتحان دینا غرض اسی دوران میں میں نے بخاری شریف، سیرۃ ابنِ ہشام، طحاوی، ہدایہ اور فتح القدیرؒ بالاستیعاب اس اہتمام سے دیکھی ہیں کہ مجھے خود حیرت ہے۔ اتفاق سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ممتحن تجویز ہوئے اور تشریف لائے تو میرے جوابات دیکھ کر یہ لفظ فرمائے کہ ایسے جوابات مدرس بھی نہیں لکھ سکتا۔"

حضرت گنگوہی سے دورۂ حدیث کی تکمیل اسی بنا پر حضرت نے جب گنگوہ حاضر ہوئے تو امام ربانی سے سفارش فرمائی کہ ایک مرتبہ دورہ میری خاطر مولوی یحییٰ کو اور پڑھا دیجئے کہ ایسا شاگرد حضرت کو نہ ملا ہوگا۔ چنانچہ حضرت نے وعدہ فرما لیا اور اب حضرت کا وہ آخری دورہ ہوا جس کو آخری دور کا آخری منظر کہا جاتا ہے اور مولوی یحییٰ کے طفیل ایک کثیر جماعت جو مایوس ہو چکی تھی اس آخری بہار کے دیکھنے کو پھر گنگوہ میں جمع ہو گئی۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کا وہ دورہ

سمجھنے کے لئے گنگوہ آنا گویا حضرت کی خدمت کے لئے اپنے کو وقف کر کے آنا تھا کہ بارہ برس تک جانے کا نام نہ لیا حتی کہ امام ربانی دنیا سے سدھار گئے اور وہ بہار ہی ختم ہوگئی جس نے دنیا کو قدوسی[1] منظر دوبارہ دکھانے کیلئے اپنی طرف کھینچا تھا۔ آپ کا قیام لال مسجد کے حجرہ میں ہوا اور آخر تک وہ حجرہ آپ کے پاس رہا۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ دورہ میں میری ایک حدیث بھی کبھی نہیں چھوٹی۔ کاندھلہ قریب تھا مگر میں کاندھلہ جانے کا نام تو کیا لیتا والدہ کے اصرار پر حضرت مجھے خود امر فرماتے تو سبق کے حرج کا عذر کر دیا کرتا تھا۔ عید کے موقع پر حضرت نے یہ وعدہ فرمایا کہ سبق میں تمہارا انتظار کیا جائے گا اور مجھے حکم دیا کہ تمہاری والدہ کا بار بار تقاضا ہے جاؤ گھر ہو آؤ تو میں کاندھلہ گیا اور فوراً واپس آگیا۔ جو صاحب قراءت کیا کرتے تھے ترمذی کا ایک باب چھوڑ کر دوسرے باب سے پڑھنے لگے۔ ہر چند میں نے اور دیگر شرکاء سبق نے اصرار کیا کہ ایک باب چھوٹ گیا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ نہیں وہ ہو چکا۔ چند روز بعد جب دوسری مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ کاندھلہ ہو آؤ تو میری زبان سے نکلا کہ حضرت پہلی مرتبہ کا قلق ہے کہ ایک باب چھوٹ گیا۔ حضرت نے فرمایا اچھا کل اس کو پڑھائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن وہ باب پڑھایا اور اتنی طویل تقریر فرمائی کہ حد نہیں جس دن کا قاری کچھ ایسا مدہوش تھا کہ سبق کم ہونے پر اس کو غصہ آیا اور جب تقریر تمام ہو چکی تو میری طرف مخاطب ہو کر کہا کوئی اور حدیث رہ گئی ہو تو وہ بھی پڑھ لو۔ میں اور حضرت اقدس دونوں چپ کہ زبان سے کچھ نہ فرمایا مگر غصہ کی وجہ سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ سنا ہے کہ یہ طالب علم کچھ ہی مدت بعد باؤلا ہوگیا اور عقل جاتی رہی۔ اعوذ[2] باللہ من غضب اللہ وغضب رسولہ وغضب اولیائہ۔ فقط۔

بارہ برس حضرت گنگوہی کی خدمت میں

آہ مولوی محمد یحیٰی مرحوم میرے محسن اور مخلص دوست تھے جن کے کمالات مخفیہ اور حالات سنیہ[3] بیان کرنے کو مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ آخر کوئی چیز تھے کہ امام ربانی کو اولاد سے زیادہ پیارے ہوئے کہ حضرت ان کو بڑھاپے کی لاٹھی اور نابینا کی آنکھیں فرمایا کرتے اور کسی ضرورت سے وہ چند منٹ کے لئے ادھر ادھر ہو جاتے تو امام ربانی بےچین اور بےکل ہو جایا کرتے تھے۔ بارہ برس کامل اس لاڈ اور پیار میں گذرے کہ کوئی اس کی نظیر بیان نہیں کر سکتا حتی کہ امام ربانی کا وصال ہوگیا۔

خلافت سے سرفرازی

اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے جن کی دوربین بصیرت بارہ برس پہلے سمجھ چکی تھی کہ مولوی یحیٰی کوئی چیز ہیں گنگوہ جا کر وہ عمامہ جو آپ کو مرشد العرب و عجم کے دست مبارک سے عطا ہوا اور اصل بیچوں پر بیا ہوا اب تک محفوظ رکھا ہوا تھا یہ کہتے ہوئے اپنے

---

[1] حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کی تربیت کا۔ [2] میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب ان کے رسول کے غضب اور ان کے اولیاء کے غضب سے۔ [3] عمدہ و بلند۔

دست مبارک سے مولوی یحییٰ کے سر پر رکھ دیا کہ اس کے مستحق تم ہو اور میں آج تک اس کا محافظ و امین تھا الحمد للہ کہ آج حق کو حقدار کے حوالہ کرکے بار امانت سے سبکدوش ہوتا ہوں اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ کوئی طالب آئے تو اس کو سلاسل اربعہ میں بیعت کرنا و اللہ کا نام بتانا۔

مولوی محمد یحییٰ صاحبؒ بھی خود صاحب بصیرت تھے اور بارہ برس امام ربانی کے پیشکار بن کر گذار چکے تھے کہ سب ہی چھوٹے بڑے اس دربار میں آتے اور حاضری دیا کرتے تھے مگر شروع سے ان کے قلب میں حضرت کی ایک خاص عظمت تھی اور اس وقت بھی جبکہ گنگوہ کا دربار قائم ہونے کے سبب کسی کو وہم بھی نہ تھا کہ چند روز بعد ہر مجاز[1] کا دربار جدا قائم ہوگا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا خلیل احمد صاحب سے تعلق رکھنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا اور مولانا کی ایک شان خاص ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ یہی سبب ہے کہ اپنے جس مخلص کو بھی امام ربانی کے بعد انھوں نے مشورہ دیا یہی دیا کہ حضرت کی طرف رجوع کرو اور جس دوست کی خیر خواہی پر مٹے اس کو مجبور کیا کہ حضرت سے بیعت ہو اور آستانہ خلیلیہ سے نہ ہٹو کہ یہاں سے محروم جانے والا کامیاب نہیں ہوسکتا۔

رمضان میں روزانہ ختم قرآن ایک مرتبہ میری درخواست پر رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لئے میرٹھ تشریف لائے تو میں نے دیکھا دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن مجید ختم فرما لیتے اور افطار کا وقت ہوتا ان کی زبان پر قل اعوذ برب الناس ہوتی تھی۔ ریل سے اترنے تو عشا کا وقت ہوگیا تھا ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی اس لئے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آگئے اور تین گھنٹہ میں دس پارے ایسے صاف اور رواں پڑھے کہ نہ کہیں لکنت تھی نہ تشابہ گویا قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور باطمینان پڑھ رہے ہیں تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہوگئے کہ نہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی۔

کبھی تنخواہ لیکر نہیں پڑھایا یہ بھی مولانا کی خصوصی شان تھی کہ بالاصالۃ[2] کبھی تنخواہ نہیں لی اور کبھی درس پر کسی قسم کا معاوضہ گوارا نہیں فرمایا۔

طلبہ سے برتاؤ میں نے بارہا دیکھا کہ کھانے کا وقت ہوتا تو سارے طلبہ سے کہتے اپنے اپنے کھانے لے آؤ۔ اور جب مختلف قسم کے کھانے سب لے آتے کہ کسی کو دال ملی اور کسی کو ساگ۔ کوئی گوشت لایا اور کوئی ترکاری تو اپنے گھر سے بھی کھانا منگاتے اور ایک طشت یا کونڈے میں سب کھانوں کو مخلوط[3]

[1] بیعت کرنے کی اجازت دیا ہوا خلیفہ۔ [2] اصل اپنے لئے۔ صرف یہ ہوا ہے جیسے پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی جگہ کام حج کے زمانہ میں کیا اور تنخواہ لیکر اماں جی کو دیدی۔ [3] ملا کر اور ممکن ہے اس سے یہ مقصود ہو کہ رنگ رنگ کے کھانے نہ رہیں جو زہد کے خلاف ہے سب مل کر ایک رنگ ہو جائے اور یہ بھی نہ ہو کہ اچھا کوئی اڑائے برا دوسرے کیلئے رہ جائے سب دوئی رہے

کر کے فرماتے کھاؤ بسم اللہ۔ طلبہ کی اکثر دعوت کیا کرتے اور خفیہ طور پر ان کی تمامی ضروریاتِ مالیہ پوری فرماتے۔ یتامیٰ و بیوگان اور یگانہ و بیگانہ محتاجوں کی پوشیدہ طریق سے اتنی خدمت کرتے کہ سننے والا حیران ہو جائے۔ سادگی اور اپنے نفس کی طرف سے استغنا کا یہ عالم تھا کہ شاید گھر میں پانچ روپیہ کا غلہ بھی ایک دفعہ نہیں ڈلوایا مگر مصارفِ خیر پر خرچ کا یہ عالم تھا کہ جس وقت انتقال ہوا تو آٹھ ہزار کے مقروض تھے اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کس مد میں قرض ہوا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اللہ پاک نے بیٹا بھی باپ کا نمونہ عطا فرمایا تھا اس لئے اس نے سارا قرض اس ذخیرۂ کتب سے ادا کیا جو باپ نے چھوڑا تھا اور ہر بات میں باپ کا سچا جانشین ہونے کے سبب حضرت کا ایسا نورِ نظر بنا جیسا باپ حضرت گنگوہی کا بنا تھا۔ فللہ الحمد کہ علم شریعت و طریقت دونوں میں کامگار ہوا اور تعلیقات ابوداؤد میں بالتخصیص حضرتؒ کا فوتِ بازو بن کر بارگاہِ خلیل سے وہ انعام پایا جس پر ہم عصروں کو جو کچھ بھی غبطہ ہو وہ کم ہے کہ حضرت نے ختم تعلیقات کے بعد مجازِ طریقت بنا کر مدینہ منورہ سے واپس کیا اور شیخ الحدیث خطاب عطا فرما کر اپنے مدرسہ میں بٹھانے کا امر فرمایا۔ بعض اراکینِ مدرسہ کو بعض مصالح کی بنا پر پس و پیش ہوا تو حضرت نے مدینہ منورہ سے بندہ کو تحریر فرمایا کہ مولوی زکریا ماشاء اللہ اس خطاب کے اہل ہیں میں خوب جانتا ہوں کہ حدیث میں ان کو کتنا تبحر حاصل ہے لہٰذا اگر مدرسہ والوں کو اس خطاب کے دینے میں تامل ہے تو تم میری طرف سے یہ خطاب دیدو اور مدرسہ کے انتظامات جزئی و کلی میں ان کی رائے کو دخیل بنا کر مشیرِ ناظم قرار دو۔

مولوی عبد اللہ گنگوہی مولوی عبد اللہ صاحب گنگوہیؒ کہ حضرت کے مجازِ طریقت تھے مولانا محمد یحییٰ صاحب ہی کے شاگرد اور ارے باندھے ادھر لائے ہوئے تھے کہ انگریزی سکول میں پڑھا کرتے اور اپنے محلہ والی مسجد میں جس کا حجرہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے اپنے قیام کے لئے لے رکھا تھا کبھی کبھی نماز کو آجایا کرتے تھے۔ آپ نے تاڑ لیا کہ نماز کا شوق رکھتا ہی اسلئے کیا عجب ہے دینی تعلیم کی طرف رغبت پا جائے لہٰذا صاحب سلامت پیدا کی اور بہلا پھسلا کر خارج وقت میں عربی پڑھنے کا شوق دلایا۔ مولوی عبد اللہ کہنے میں آگئے اور میزان شروع کردی، ذراغبی زیادہ تھے ایک دن مولانا نے دو گردان یاد کرنے کو کہدیا جن کو رٹتے رٹتے شام ہو گئی۔ مولانا نے فرمایا خدا کے بندے یا ظلم ہے کہ ایک گردان میں شام کردی۔ کہنے لگے نہیں مولوی صاحب یہ تو دو تھیں اور یہ کہہ کر

ئے حاشیے جن کا نام بذل المجہود شرح ابوداؤد بے مثال شرح ہے اب کمیاب ہو گئی دعا کیجئے اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دیں کہ دوبارہ شائع کرے

رونے لگے۔ غرض اس طرح پھسلا کر آگے چلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی چھوٹ گئی اور عربی کے ہو رہے۔
حق تعالیٰ نے خوش نصیب بنایا تھا لہٰذا اول عالم با عمل ہوئے اور پھر سالک مجاز طریقت۔ اس بنا پر مولانا مرحوم کے اعمال حسنہ بھی مولوی محمد یحییٰ صاحب ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہیں ورنہ جس انگریزی میں پڑ لئے تھے وہ خدا جانے کہاں پہنچاتی۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کی وفات کے بعد اپنے استاذ زادہ مولوی محمد زکریا صاحب سے مولوی صاحب کو محبت بڑھ گئی تھی اور باوجود عمر میں بڑے ہونے کے ان کا احترام فرمانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ مولوی زکریا صاحب میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر بتاؤ۔ خواب یہ ہے کہ آسمان سے ایک بڑا انار گرا اور زمین پر گرتے ہی اس کے سب دانے جُدا جُدا ہو گئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب تشریف رکھتے ہیں اور فرما رہے ہیں بھائی اس انار میں ایک دانہ میرا بھی ہے۔ یہ خواب سنا کر تعبیر کا تقاضا کیا اور جب مولوی زکریا صاحب نے بار بار یہی جواب دیا کہ مجھے تعبیر دینا نہیں آتی تو فرمایا اچھا میں بتاؤں تعبیر کہ وہ دانہ میں ہوں اور میں تو آخر مولوی صاحب کا ہوں ہی۔ اور یہ بشارت ہے میری موت اور پھر مغفرت کی۔" چنانچہ چند ماہ بعد اسی سال مولانا کا وصال ہو گیا۔ اور دق میں مبتلا ہو کر ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت گنگوہیؒ کے درس حدیث کی تقریروں کو قلمبند کرنے کا اہتمام

مولانا محمد یحییٰ صاحب نے گنگوہ میں دورۂ حدیث پڑھتے وقت اس کا بھی اہتمام کیا کہ حضرت کی تقریرات جو سبق میں سُنتے وہ خارج وقت میں ضبط کر کے نقل فرما اور لکھ لیا کرتے تھے جو ہر کتاب کی ایک مستقل تعلیق اور نادر الوجود شرح[2] بن گئی تھی۔

حضرت چونکہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کی ذکاوت اس وقت جانچ چکے تھے جبکہ وہ دہلی میں طالب تھے اور اب بارہ برس گنگوہ حاضر ہونے میں ان کے تبحر علمی اور استعداد عملی کا مزید تجربہ فرما چکے تھے اس لئے آپ مدت سے متمنی تھے کہ مولوی یحییٰ مظاہر علوم میں آجاویں مگر اول تو حضرت صاحبزادی صاحبہ کا اصرار کہ وہ ان کو باپ کی خانقاہ سے جدا نہ ہونے دیتی تھیں دوسرے مولانا کا تنخواہ سے انکار جس پر احتمال ہوتا تھا کہ دل نہادا و پابند ہو کر نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا دو سال تو آپ نے صاحبزادی صاحبہ کو راضی کر کے رمضان کو اخیر سال میں چند روز کے لئے بلایا اور وہ ناتمام کتابیں ختم کرا کر گنگوہ تشریف لے گئے۔ مگر تیسرے سال

---

[1] تیسیر المبتدی فارسی کی ابتدا کے لئے اور تیسیر المنطق اس فن کی ابتدا کے لئے اور اکمال الشیم تصوف کی ابتدا میں آپ کی یادگار ہیں ہر مدرسہ میں شریک درس ہیں۔ [2] ترمذی شریف کی تقریر الکوکب الدری اور بخاری شریف کی لامع الدراری نام سے طبع بھی ہو چکی ہیں۔

آپ نے مستقل قیام پر زور دیا اور تنخواہ نہ لینے کی شرط کو منظور فرمالیا کیونکہ اندازہ ہوگیا کہ پابندی کے لئے تنخواہ اور اس کا عدم دونوں بالکل مساوی ہے اور تنخواہ لینا کسی طرح بھی منظور نہیں فرماسکتے چنانچہ جمادی الاولیٰ ۲۸ھ میں مولانا مستقل تشریف لے آئے کہ حضرت کے اسفار مدرسہ کی ضروریات کے لئے دن بدن بڑھتے جاتے اور اس کا اثر آپکے اسباق پر پڑ کر مدرسہ کی علمی کارگذاری میں نقصان کا سبب بنتا تھا

مظاہر علوم میں درس کی مدت اور وصال

اِس وقت سے لے کر ساڑھے پانچ سال کامل آپ مظاہر علوم میں درس دیتے رہے حتیٰ کہ اخیر ذیقعدہ ۳۲ھ کی شب میں جس کی صبح کو حضرت کا تار آیا کہ سفر حج سے واپس ہو کر بمبئی پہنچے مولانا ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور چند ہی گھنٹے میں شہید ہو کر راہی عالم قدس ہوئے فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔ علم وعمل کا مجسمہ آن کی آن میں دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ کے لئے سہارنپور کے گورستان میں سو رہا اور حضرت کو بذریعہ تار اس سانحہ کی بمبئی میں اطلاع دی گئی حضرت کے قلب پر اس وقتی واقعہ کی سخت چوٹ لگی لیکن آپ تو مجسم صبر و رضا تھے اس لئے برداشت فرماگئے۔ مگر پیری کا زمانہ صدمہ زدہ دل اور وہی اسفار کی کثرت اور درس کا بارِ عظیم جس کے انتظام سے اطمینان پایا تھا وہ پھر سر پر آپڑا اس لئے حضرت راضی برضا اپنی علو ہمت سے اس کو انجام دیتے رہے۔

تنخواہ سے انکار

لیکن اب تنخواہ لینے میں حضرت کو تردد ہونے لگا کہ جتنے اسباق جوانی میں پڑھا سکتا تھا جب ضعفِ پیری کے سبب اس کو انجام نہ دیسکوں اور مولوی یحییٰ جیسا قائم مقام بھی نہ رہا کہ میری کمی کو نیابۃً پورا کردے تو اب مدرسہ سے تنخواہ لینا جائز نہیں چنانچہ حضرت نے تنخواہ ترک فرمادی اور ہر چند سرپرستانِ مدرسہ کا اصرار ہوا کہ تنخواہ ہی کیا ہے جو حضرت کی خدماتِ جلیلہ کا معاوضہ ہوسکے اور حضرت کے لئے گھنٹہ بھر پڑھانے پر سو روپیہ ماہوار بھی تھوڑا ہیں مگر حضرت نے نہ مانا اور فرمایا کہ مدرسہ کا روپیہ چندہ کا ہے اور خدا کا مال ہے جس کے ہم لوگ صرف امین و خازن ہیں بیجا تصرف یا مراعات کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے اور میں خود خوب سمجھتا ہوں کہ صرف کے قابل درس نہیں دے سکتا لہٰذا تنخواہ نہ لوں گا۔

یہ وقت ہی کچھ عجیب تھا کہ ادھر تنخواہ سے حضرت نے دست برداری فرمائی اور اُدھر مصارف بدستور بلکہ دن بدن زیادہ کہ تعلقات وسیع ہوجانے کے سبب مہمانوں کی آمد و رفت بڑھ گئی اس لئے آپ نے قصد فرمایا کہ انبہٹہ میں سکونت منتقل فرمادیں کہ وہاں کوئی خاص اہتمام ہی سے جائیگا تو پہنچ سکے گا

[1] حضرت شیخ الحدیث صاحب نے ۱۰ ذیقعدہ ۳۲ھ روز شنبہ صبح ۸ بجے وقت لکھا ہے۔

اور قصباتی گذران جدّی زمین کی پیداوار میں تنگی ترشی سے ممکن ہے کہ شہری گذران میں ہر قسم کا خرچ بڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آہستہ آہستہ آپ کا یہ قصد پختہ ہو چلا اور اہل مدرسہ کو معلوم ہوا کہ حضرت اس خیال میں ہیں تو حضرت مولانا رائے پوری قدس سرہ کو کہ سرپرست مدرسہ بھی تھے اور حضرت کے ساتھ غایت انس و محبت بھی رکھتے تھے یہ صورت بہت شاق گذری اور سمجھ لیا کہ مدرسے سے حضرت کے اٹھتے ہی نہ وہ علمی برکات رہیں گے نہ عملی ثمرات، اس لئے پریشان ہو کر سہارنپور آئے اور بقیہ سرپرستان کو جمع فرما کر تجویز پیش کی کہ حضرت کا مدرسہ سے جانا مدرسہ کی کھلی بربادی ہے اور تنخواہ لینے پر حضرت کو راضی کرنا خدام کی طاقت سے باہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آمدنی نہ ہونے کی صورت میں سہارنپور قیام کرنے پر مجبور کرنے کا منہ بھی نہیں پس میرے نزدیک مناسب ہے کہ حضرت سے تدریس کا بوجھ باضابطہ اٹھا دیا جائے اور نظامت کا جدید عہدہ قائم کر کے (جس کو پرنسپل[1] کہتے ہیں) حضرت کو اس کا معاوضہ دیا جائے کہ درحقیقت حضرت کا مدرسہ میں محض بیٹھا رہنا ہی نظام مدرسہ کے قائم رہنے کا ذریعہ ہے چہ جائیکہ انتظام و نگرانی خود بڑی شے ہے جس کو حضرت رات دن بلا تحدید وقت انجام دیتے ہیں۔ اور پھر حضرت سے باتفاق اور زور کے لفظوں میں عرض کیا جائے کہ بمدّ نظامت معاوضہ قبول فرماویں اور تدریس محض تبرّع[2] کا درجہ رہے کہ صدر مدرس کوئی دوسرا ہو اور حضرت کے پاس ایک دو سبق اس درجہ میں رہے کہ جب حضرت یہاں رہیں تو پڑھائیں اور جب سفر کریں تو صدر مدرس اس کو پورا کرائیں"۔ چنانچہ حضرت کو بھی بصورت منظور کرنا پڑی اور حافظ عبد اللطیف[3] صاحب کو صدر مدرس بنا کر شوال ۳۵ھ سے حضرت نے بھی پھر تنخواہ لینا شروع فرما دی۔

۳۸ھ میں جبکہ گرانی اجناس اور کثرتِ مصارف کی عامہ شکایات اور بحمد اللہ مدرسہ کی مالی ترقیات اور کافی اعانت کے حصول پر کہ یہ بھی حضرت ہی کی سعی و توجہ سے ہوا تمامی ملازمین مدرسہ کو

---

[1] دینی مدرسوں میں صدر مدرس وہ ہے کہ ہر فن کی انتہائی کتابیں خصوصاً حدیث شریف کی پڑھائے اس کیلئے انتظامات کی ذمہ داری ضروری نہیں ہوتی۔ اکثر بڑے مدرسوں میں صدر مدرس اور بزرگ ہوا کرتے ہیں اور مہتمم ناظم دوسرے صاحب، مگر حضرت دونوں کام انجام دیتے تھے گو تھے صدر مدرس اس لئے اب تجویز ہوا کہ صرف انتظام کی ذمہ داری ضابطہ میں درس مرضی پر ہو کہ منتظم کے لئے درس لازم نہیں ہے۔ [2] احسان اور بلا معاوضہ۔

[3] حضرت شیخ الحدیث صاحب نے لکھا ہے کہ "حضرت حافظ صاحب کو صدر مدرس بنانا اس وقت کا واقعہ نہیں۔ صدر مدرس حج کو جاتے ہوئے شوال ۳۳ھ میں بنایا تھا وہ بھی میرے والد صاحب کی درخواست پر کہ حضرت جاتے وقت میرے والد صاحب (حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب) کو صدر مدرس بنا رہے تھے انھوں نے صدر مدرسی سے تو انکار فرما دیا اور یہ فرمایا کہ سبق تو جتنے ارشاد فرمائیں گے پڑھاؤں گا صدارت کیلئے مولانا عبد اللطیف صاحب مناسب ہیں"۔

ترقیاں دی گئیں تو عـ۱۰ـہ کا اضافہ حضرت کی تنخواہ میں بھی ہوا جس کو حضرت نے باصرار قبول فرمایا[1] ورنہ آپ اپنے لئے یہی فرماتے رہے کہ مجھ سے تو عـ۵ـہ کے قابل بھی کام نہیں ہوتا اور نہ میری کوئی ضرورت بند ہے اس لئے اس کی حاجت نہیں۔

جمادی الثانیہ ۴۲ھ میں جبکہ حیدرآباد سے معقول وظیفہ مدرسہ کا مقرر ہوا تو مدرسین نے پھر ترقی چاہی کہ درحقیقت وہ حضرات کتنا ہی خرچ میں تنگی کرتے مگر موجودہ قلیل تنخواہ میں گذر نہیں کر سکتے تھے اور مقروض ہو کر پریشان و پراگندہ دل رہتے تھے چنانچہ عطاءِ خداوندی کا لحاظ کرتے ہوئے مدرسین کو دل نہاد اور یکسو کرنے کے لئے کہ فکر معاش سے مستغنی ہو کر بسکون و طمانیت تعلیم میں مشغول ہوں پھر سب کو حسب عہدہ ترقی دی گئی اور حضرت کے نام بعہدۂ نظامت عـ۱۵ـہ کا اضافہ ہو کر عـ۶۵ـہ ماہوار لکھے گئے جس کو حضرت نے تین سال لیا اور آخر ۱۶ شوال ۴۲ھ کو آپ ڈیڑھ سال کی رخصت بوضع تنخواہ لیکر مدینہ منورہ روانہ ہوگئے اور پورا ڈیڑھ سال گذرنے پر کہ نہ ایک دن کم نہ زیادہ آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر جنت البقیع[2] کو خوابگاہ بنایا۔

مظاہرِ علوم کا نظام اور کارگذاری

مظاہرِ علوم کا اصل محل وقوع اور جگہ کی تبدیلی مدرسہ اپنی بنیاد کے وقت قاضی محلہ میں ایک کرایہ کے مکان میں تھا اور کوشش کی گئی کہ اس محلہ میں مدرسہ کے لئے مکان بنایا جائے مگر اسباب مہیا نہ ہو سکے۔ چند سال بعد حافظ فضل حق صاحب کو کہ مولانا محمد قاسم صاحب سے بیعت اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے خیال ہوا کہ مدرسہ کو اپنے محلہ میں لے آویں۔ یہ مکان جس میں اس وقت مدرسہ ہے حافظ صاحب کا ذاتی مکان تھا اس کو انھوں نے توڑ کر مدرسہ کی موجودہ حالت پر تعمیر کرایا اور مدرسہ کے نام بیعنامہ کرکے مدرسہ اس میں قائم کر دیا۔ اثنا تعمیر میں مولانا سعادت علی صاحبؒ فقیہ بانیٔ مدرسہ انتقال فرما گئے۔

مظاہرِ علوم تاریخی نام ہے ۱۲۹۲ھ اور اسی تعمیری سال پر مدرسہ کا تاریخی نام مظاہرِ علوم ۱۲۹۲ تجویز ہوا۔

مظاہرِ علوم کے سرپرست اس وقت مدرسہ کے ممبران و سرپرست صرف تین حضرات تھے۔ مولانا محمد مظہر[1] صاحب۔ قاضی فضل الرحمٰن[2] صاحب اور حافظ فضل حق[3] صاحب۔

[1] عرض کیا گیا تھا کہ آپ کی تنخواہ نہ بڑھے گی تو نیچے والوں کی نہیں بڑھ سکتی اور وہ سب پریشان ہیں۔ [2] مدینہ منورہ کا قبرستان۔

۱۲۹۵ھ میں جب اکابر اہل اللہ کا مشہور مجمع حج کو روانہ ہوا تو مولانا محمد مظہر صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب کانپوری کہ مدرس دوم تھے اور مولوی عنایت الٰہی صاحب بھی ہمرکاب تھے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا مظاہر علوم میں درسِ حدیث

اور مدرسہ میں ان حضرات کی جگہ مولانا احمد علی صاحب محدث اور ان کے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمٰن اور ایک بنگالی مولوی ابن الحق صاحب عارضی طور پر مدرس رکھے گئے جو واپسی حضرات پر علیحدہ ہو گئے۔

مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتقال

۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کی شب میں ۸ بجے مولانا محمد مظہر صاحب نے انتقال فرمایا کہ بمقتضائے حدیث المؤمن یموت بعرق الجبین[1] آپ کی پیشانی پر پسینہ تھا اور آپ ماتھے پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد قاضی فضل الرحمٰن صاحب نے ممبرانِ مدرسہ میں اضافہ کیا اور قاضی ابو سعید، مولوی ناظر حسن وکیل، خواجہ احمد حسن، میر تونگر علی مولوی شتاق احمد وغیرہ کارکن ذمہ دار قرار پائے۔

حضرت گنگوہی کی سرپرستی اور مولانا کی صدر مدرسی

۱۳۰۴ھ میں بعض ممبران کی تحریک پر حضرت امام ربانی سرپرست بنائے گئے اور مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرسی پر تشریف لے آئے مگر چونکہ اکثر ممبران کو نہ حضرت گنگوہی سے عقیدت تھی نہ مولانا سے انس و تعلق، اس لئے مولانا کے متعلق صرف پڑھانا تھا کہ انتظامی امور میں نہ آپ کو دخل تھا نہ آپ سے کوئی مشورہ لیا جاتا بلکہ مدرسہ سے ہر وقت واسطہ رکھنے کی بنا پر گاہے ماہے جمع ہو جانے والے ممبروں کو آپ کسی ضرورت پر مطلع فرمانے اور مشورہ بھی دیتے کہ یہ انتظام کر دیا جائے تو اس کو ٹھکرا دیا جاتا تھا۔ آپ بھی خاموش تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے کہ پابندیٔ وقت کے ساتھ سبق پڑھائے اور مکان تشریف لیگئے چنانچہ پانچ سال کامل گذر گئے اور آپ نے کار تدریس کے سوا کسی نظم میں دخل نہیں دیا۔

حضرت گنگوہی کا سرپرستی سے استعفا

مگر اس پر بھی آپ نے دیکھا کہ ممبران میں کثرت اس جانب ہے جن کو حضرت گنگوہی سے عناد ہے اور حضرت کی سرپرستی کے ساتھ مولانا کی صدارت بھی دل سے ناگوار ہے کہ خفیہ طور پر آپ کو علیحدہ کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں تو آپ نے امام ربانی سے اس کا تذکرہ فرمایا اور حضرت مدرسہ کی سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔ آپ کا خیال درحقیقت صحیح تھا اور چند ہی روز بعد اس کا ظہور ہوا کہ امام ربانی کا استعفیٰ بخوشی منظور کر لیا گیا۔

---

[1] مسلمان تو پیشانی کے پسینے سے مرتا ہے۔

صدر مدرسی کے عہدہ سے وقتی طور پر سبکدوشی

اور اس کے ساتھ ہی پانچ حضرات نے ناتمام مختصر کمیٹی کرکے آپ کو مدرسی سے برخاست کردیا۔ حافظ فضل حق مرحوم کے صاحبزادہ مولوی حبیب احمد کو جنھیں اخیر تک حضرت کے ساتھ خاص محبت رہی اس قصہ کا بہت صدمہ ہوا اور وہ حضرت سے چمٹکر زار زار رونے لگے۔ ہرچند کہ وہ محلہ میں سربرآوردہ اور اس باپ کے بیٹے تھے جو مدرسہ کو قاضی محلہ سے یہاں اپنے مکان میں لائے تھے مگر اپنی قومی نااتفاقی کے سبب مدرسہ پر حاوی ہوجانے والے ممبران کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اس لئے حضرت کا مختصر اسباب اٹھا کر اپنے گھر لے گئے کہ حضرت مکان چھوڑ چکے اور اسباب و متعلقین کو انبہٹہ بھیج چکے تھے۔ اور یہ کہہ کر کہ حضرت تین چار دن توقف فرماکر ہمیں کوشش کا موقع دیں حافظ عزیز علی اور مولوی مشتاق کو ساتھ لیکر اس پر زور دینے لگے کہ یہ برخاستگی ناتمام کمیٹی میں اور بلا وجہ طے ہوئی ہے لہٰذا قابلِ عمل نہیں ہے، مگر ممبرانِ مدرسہ کے کان پر جوں بھی نہ رینگی اور ان صاحبوں کے آخری عام جلسہ میں اس تحریک پر بھی یہی جواب دیا گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہوچکا اب کوّوں کی کائیں کائیں سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ سچ ہے کہ مخلص کی بیکسی جب اس کو چار طرف سے مایوس کردیتی ہے تو قدرت اپنا کرشمہ دکھانے کے لئے اسباب ظاہری کا پردہ اٹھا دیتی ہے۔

اصلاحِ حال کے سامان

یہ لوگ پریشان تھے کہ نہ مولانا کو روک سکتے ہیں نہ چھوڑ سکتے ہیں، بجز رونے کے کوئی کام نہ تھا کہ غیب سے سامان ہوا اور ایک شخص اس وقت جبکہ میاں حبیب احمد متفکر و پریشان مسجد کے در پر کھڑے تھے آکر ان سے پوچھنے لگا کہ کیا پریشانی ہے۔ انھوں نے اس کو فریق ثانی کا جاسوس سمجھ کر دھتکار دیا کہ چل تو کون ہم سے پوچھنے والا کہ کیا بات ہے اس نے کہا کہ میں خفیہ پلیس کا ملازم ہوں اور تمہیں اطمینان دلاتا ہوں مجھے ص ۔ روداد سارا قصہ حسب منشا طے سمجھو۔ انھوں نے ص ۔ رتو دیدیئے مگر ڈرتے رہے کہ الٹا ہم ہی کو نہ پھانس دے۔ فریق ثانی اپنی تجویز کی تکمیل میں مشغول تھا اور اگلے دن مولوی عبد العلی صاحب آگئے جو حضرت کی جگہ مدرسِ اول بنائے جانے کو بلائے گئے تھے۔ یہ دوسری کشمکش تھی کہ اپنوں میں مقابلہ کرانے کی تدبیریں تھیں۔

حضرت رائپوری کی خصوصی توجہ

اس قصہ میں سب سے زیادہ درد اور دکھن کا اثر خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا رائپوری قدس سرہٗ پر تھا کہ رائپور سے ہر تیسرے چوتھے دن اپنے چھکڑے میں سہارنپور آتے اور حضرت کے شریک حال ہر قسم کی اعانت اور جان و مال تک نچھاور کرنے کیلئے تیار ہوکر قدرت والے مسبب الاسباب کی طرف سے غیبی مدد کا انتظار فرمایا کرتے تھے۔

ادھر حضرت گنگوہی کا حکم تھا کہ روزانہ مجھے حالات کی اطلاع دی جائے اور اسلئے مولوی مشتاق کے بھائی حبیب احمد روزانہ ٹٹو پر سوار ہو کر گنگوہ جایا کرتے اور ایک ایک واقعہ کانوں میں ڈال آیا کرتے۔

غدر کے مشہور باغی رشید احمد

اپنی بات کی پچ اور دعوے کو پورا کرنے کا اہتمام دنیاداروں کے لئے ایسا ضروری ہے کہ چاہے جان جائے مگر آن نہ جائے اس لئے خواجہ مظاہر حسن نے کہ آنریری مجسٹریٹ تھے یہاں تک کہدیا کہ میں باور صاحب کلکٹر سے کہدوں گا کہ یہ سارا فساد غدر کے مشہور باغی رشید احمد کا ہے اور یہ سب لوگ اس کے جرگہ کے ہیں۔ حق تعالیٰ کو یہ دعویٰ اور ناز پسند نہ آیا کہ اسی نے ایک اسلامی علمی یادگار کو اس عقابؓ کے قتل بے بال و پر بنادیا تھا جو کسی ناقدردان بڑھیا کے ہاتھ میں پڑ گیا اور اس کے خیر خواہی کے دعوے میں اس کی چونچ اور پنجے کاٹ دیئے تھے کہ ؎

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر ۔۔۔ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اجنبی شخص کی عملی کارروائی

اسباب کا شیرازہ بکھر گیا اور اس اجنبی سائل نے ادھر تھانہ میں رپٹ کی کہ مدرسہ میں صبح کو بلوا ہوا چاہتا ہے اور ادھر کلکٹر ضلع کو متنبہ کیا کہ خواجہ صاحب کی مجسٹریٹی بقاء امن کی جگہ نقض امن کے کام آرہی ہے کہ ممبر مدرسہ ہونے کی حیثیت سے مدرس اول کو بے قصور برخاست کرکے عامہ مسلمانوں میں فساد کا ہیجان پیدا کردیا اور ادھر مولوی احمد العلی صاحب کو جا سمجھایا کہ آپ اپنے پاؤں میں کلہاڑی کیوں مار رہے ہیں حکام نے طے کرلیا ہے کہ موقع پر جا کر فریقین کو گرفتار کریں اس لئے خیر خواہانہ مشورہ دینے آیا ہوں کہ راتوں رات واپس ہوجاویں اور ادھر مولوی حبیب احمد کو سارے قصے سے باخبر کیا کہ مولانا کو ریل میں سوار کرآیا ہوں اور اب ذرا ہمت دکھاؤ کہ صبح کو مدرسہ کا دروازہ کھول کر مولانا کو جا بٹھاؤ کہ سبق شروع کرائیں اور چند آدمیوں کو دروازہ پر کھڑا کردو کہ انسپکٹر حلقہ آویں تو زور و قوت کے ساتھ اپنا سچا احتجاج پیش کریں۔"

فریقین کو مصالحت پر مجبور کیا گیا

چنانچہ صبح ہوئی تو صاحب علاقہ مع گارد کے موجود تھے جن کو دیکھ کر ایک مجمع کثیر تماشائیوں کا اکھٹا ہوگیا اور انھوں نے ایک نظر میں حقیقت حال معلوم کرکے کمال شرافت و سیاست کا یہ برتاؤ کیا کہ فریقین کو باہمی مصالحت پر مجبور کیا۔ ادھر سے جواب صاف تھا کہ ہمیں نہ پہلے انکار تھا نہ اب انکار ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ مدرسہ نہ ہمارا نہ ان کا۔ ورثہ یا ترکہ پر جھگڑا نہیں ہے صرف مدرسی پر جھگڑا ہے کہ ہم غریبوں کی درخواست ہے

لہ شکرہ۔ ٢ہ جہان کے خاک جیسوں یعنی درویشوں کو تحقیر سے نہ دیکھا کر تجھے کیا خبر ہے کہ ممکن ہے اس گرد میں کوئی سوار ہی ہو۔

برخاستگی کی وجہ بتادو اور علیحدہ کرنا ہو تو پوری کمیٹی منعقد کرکے علیحدہ کرو اور وہ اپنی طاقت پر نازاں ہماری آواز کو نقار خانے میں طوطی آواز اور کوے کی کائیں کائیں سمجھتے ہیں۔ بات چونکہ بالکل معقول تھی اسلئے نعیم اللہ خاں صاحب کے مکان پر دونوں فریق کو بلا کر اس تحریر پر سب کے دستخط لے لئے گئے کہ ہم جملہ اشخاص اس بات پر رضامند ہیں کہ جو اختلاف نسبت برخاستگی مولوی خلیل احمد صاحب مدرس اول کے باہم فریقین میں ہے اس برخاستگی کی وجہ پر محمد نعیم اللہ خاں صاحب مجسٹریٹ اور صاحب علی خانصاحب انسپکٹر جو کچھ رائے یعنی نسبت برخاستگی و بحالی کے قائم کریں وہ فریقین کو منظور ہوگی اور اس میں کسی فریق کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ فقط۔ یکم فروری ۱۹۰۳ء

اسی وقت مدرسہ کا رجسٹر جس میں تجاویز سرپرستان درج کی جاتی تھیں قاضی صاحب سے منگالیا گیا اور جس نے بھی تقرری ثالثی پر دستخط کرنے میں ذرا تامل کیا کہ تمامی ممبران کو جمع کیجئے اسی کو انسپکٹر نے ڈانٹا کہ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ صورت کر رہا ہوں کہ اسی نااہلیت اور دعوئے انانیت نے آج مدارس دینیہ کو جنھیں تاج بنا کر سر پر رکھنا چاہئے تھا بچوں کا کھیل اور کھلونا بنا رکھا ہے اور علماء کو جنھیں آنکھوں کی پتلی سمجھنا چاہئے تھا اور ذلیل ترین نوکر قرار دے رکھا ہے جس کا ہم پر وبال پڑ رہا ہے اور ہوش نہیں آتا، ورنہ آج نہ بوڑھا دیکھتا نہ جوان ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈال کر جیل خانہ بھر دیتا۔ چنانچہ پھر کسی نے چوں نہ کی اور آخر دونوں نے اندر جا کر تجویز لکھی اور قطعی حکم کی صورت میں سب کو سنادیا جس کی نقل یہ ہے:-

حضرتؒ کی اپنے عہدہ پر برقراری اور نئے سرپرستوں کا انتخاب

کتاب امورات کمیٹی مدرسہ عربی مظاہر علوم ۱۳۱۹ھ کی کارروائی جلسہ منعقدہ ۳ر شوال ۱۳۲۰ھ مطابق ۳ر جنوری ۱۹۰۳ء دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ممبران مدرسہ قاضی فضل الرحمن و محمد ابوسعید و مولوی خلیل الرحمن و میر تونگر علی و مولوی ناظر حسن وکیل صاحبان پانچ کس نے باتفاق رائے مولوی خلیل احمد صاحب مدرس اول مدرسہ مذکور کو بوجوہات چند علیحدہ کرنے کا قصد کیا لیکن کوئی وجوہات علیحدگی مولوی صاحب تحریر نہیں کی اور نہ مولوی صاحب موصوف کا کچھ جواب لیا گیا۔ اور کاغذات سابقہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوا کہ مولوی خلیل احمد صاحب کو علیحدہ کرنا نہیں چاہئے اور نہ کوئی قصور اور خطا مولوی صاحب موصوف کا بظاہر ثابت ہے۔ اور اگر مولوی صاحب نے دوسری جگہ قصد بندوبست کا کیا بھی تھا تو ان کو اطمینان دلایا کہ اگر وہ قواعد مدرسہ کی پوری پابندی اور بجا آوری فرائض منصبی عمل میں لاتے رہیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ مدرسہ سے علیحدہ کئے جاویں اور اب مولوی صاحب کو بلا وجہ خاص

علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ علیحدگی مولوی خلیل احمد صاحب کی مناسب نہیں ہے جب تک کہ کل ممبران جمع ہو کر ایک جلسہ منعقد کر کے ان کو علیحدہ نہ کریں۔

اور ہماری رائے میں اس مدرسہ کے سرپرست مولوی ذوالفقار علی صاحب[1] دیوبندی اور مولوی عبدالرحیم صاحب رائپوری اور مولوی اشرف علی صاحب[2] تھانوی مقرر کئے جاویں تاکہ متعلق تعلیم و تقرر و برخاستگی و ترقی و تنزلی مدرسان مدرسہ ان کی رائے سے ہوا کرے اور طریقہ تعلیم کے وہ نگراں اور سرپرست رہیں۔ اور دیگر رؤسا و عمائدین شہر بطور ممبر کے رہیں جو ترقی چندہ و انتظامات مدرسہ کے کوشاں رہیں اور خواجہ مظاہر حسن جو اس وقت مستعفی ہو گئے ہیں وہ بھی کم سے کم ایک سال تک معین اور مددگار رہیں۔ فقط یکم فروری ۱۹۰۳ء

العبد
محمد نعیم خاں

العبد
صاحب علی انسپکٹر

عامہ مسلمانانِ شہر اس انتخاب پر مسرور ہوئے کہ دین کا گھنٹہ ان تجربہ کار گھڑی سازوں کے ہاتھ میں گیا جو اس کی مشین کے پرزوں سے پوری واقفیت رکھنے والے ہیں اور یہ مادۂ تاریخ ہو کر کہ ذالک فضل اللہ[۱۳۲۰] ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۲۰ھ کو سرپرستان نے مدرسہ میں مجتمع ہو کر اپنا کام شروع فرما دیا۔

مظاہر علوم کا غسلِ صحت

یہ پہلا دن تھا جس کو مدرسہ کے غسلِ صحت کا پہلا دن یا یتیم نوزائیدہ بچہ کے شفیق مرضعہ[3] کی گود میں آنے کا پہلا روز کہنا چاہئے کہ اس کی ترقیاتِ جسمانیہ و روحانیہ کا دروازہ کھلا اور وہ دن دونا رات چوگنا پھلنے اور پھولنے کے لئے تیار ہو گیا سرپرستانِ مدرسہ جیسے دیانتدار اور دینی مدرسہ کی بقا و ترقی کے شیدا تھے ایسے ہی حضرتؒ اپنے استاذ کے لگائے ہوئے نخلستان[4] کی ہر روش اور کیاری پر جان نثار تھے اس لئے نظام میں دخل دینے اور ہر شعبہ کی ضروریات پر سرپرستوں کو توجہ دلانے کا موقع ملا اور وہ مدرسہ جو زاویہ خمول[5] و کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا گھٹنیوں چلنے اور پھر لپکنے اور تیز رفتار دوڑنے لگا۔

ترقی کا دور

طلبہ کی کثرت ہوئی، مدرسین کا اضافہ ہوا، چندہ میں توسیع ہوئی، نایاب کتابوں کی بذریعہ وقف و خرید بیشی ہوئی اور عالی شان و محفوظ کتب خانہ جدید بنایا گیا خالی چھتوں پر درسگاہیں تعمیر ہوئیں، ماہرِ تجوید قاری کا تقرر ہوا مفتی رکھے گئے اور فتاوی نویسی کا مستقل انتظام ہوا کہ وقت پر جوابات جائیں اور سب رجسٹر میں بلفظہا درج ہوں۔ جب ترقیات کو ماشاءاللہ اور ترقی ہوئی تو مدرسہ کا مکان ناکافی ہو گیا کہ نہ مدرسین کے قیام کے لئے حجرات کافی اور نہ طلبہ کی رہائش کیلئے

[1] والد ماجد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ۔ [2] دودھ پلانے والی۔ [3] کھجور کا باغ مراد چمن۔ [4] گوشۂ گمنامی۔

جگہ واقی، طلبہ شہر کی مسجدوں میں مقیم جن کے حالات علمیہ وعملیہ کی نگرانی محال اور مختلف محلوں میں ان کی روٹیاں مقرر کہ ہر معطی ان پر حکومت چلانے کو طیار، اس رُلانے والی بوسیدہ حالت کو دیکھ کر حضرتؒ نے محض توکلاً علی اللہ[1] ایک وسیع زمین خرید کر عالی شان تعمیر کی بنیاد ڈالدی کہ اوپر کے حصہ میں جدا جدا متعدد درسگاہیں ہوں اور نیچے کے طبقہ میں طلبہ کی رہایش کیلئے کافی مقدار حجرے۔

۱۳۲۷ھ میں دار الطلبہ اور درسگاہوں کی تعمیر

مہمانانِ رسول کے لئے مہمان خانہ بننے کے لئے خلیل الٰہی آواز کا بلند ہونا تھا کہ پہلے ہی سال اسماعؑ کی رقم آئی اور دوسرے سال مسمی الدعوت ۱۳۲۷ھ میں اس یادگار خلیل کا بنیادی پتھر حضرات سرپرستان کے ساتھ کثیر جماعت علماء وصلحاء کے مبارک ہاتھوں رکھا گیا اور ادھر تعمیر جاری ہوئی اور اُدھر اہلِ خیر کی عطاء وسخا کے دریا بہہ پڑے کہ کام نے ایک دن بھی رُکنے کا نام نہ لیا حضرتؒ مولوی تھے اور درسی کتابوں یا مدرسہ کی چٹائیوں کے سوا کسی چیز سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا خدا جانے انجینری اور سیاقِ فن تعمیر کہاں سیکھا تھا کہ محض اپنی تجویز سے نقشہ بنایا اور خود کھڑے ہو ہو کر مستری سے از اول تا آخر تعمیر کرائی۔ آخر ۱۳۳۰ھ میں دس سال کے اندر جب یہ قصر معلی مکمل ہوا تو دیکھنے والے ماہرین فن حیران ہو جاتے اور ستر پچھتر ہزار کی لاگت کا تخمینہ کیا کرتے تھے حالانکہ اس میں چالیس ہزار بھی پورا صرف نہیں ہوا۔

حضرتؒ کی یادگار

حضرت دنیا سے تشریف لے گئے مگر حضرت کی یہ یادگار جس کی تعمیر میں مدرسہ سے فارغ ہو کر دوپہر اور شام کا وقت حضرتؒ مستری کے پاس کھڑے ہو کر گذارا کرتے اور نہ دھوپ کی پروا کرتے تھے نہ بارش کی ایک بڑا صدقہ جاریہ بھی بن کر مدت دراز تک باقی رہے گا اور حضرت کی یاد اس طرح دلاتا رہے گا کہ زبانوں پر دعائیں ہوں گی اور دلوں میں تشکر۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ مرنے کے لئے آیا ہے مگر اس موت پر ہزار زندگیاں قربان جس کے ہر لمحہ میں ایصالِ ثواب کے لئے وہ بہترین دینی یادگاریں قائم ہوں جو عالم دنیا وآخرت دونوں میں ہر دیکھنے والے کو دعا گو اور مسرور بنائیں اور ہر بہار میں آب وتاب کے ساتھ سرو قد کھڑی ہوئی اپنی بانی کے نام کا بزبانِ حال ترانہ گائیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ توم را کایں قوم[2]   شہان بے کمر وخسرواں بے کلہ اند

عمارتوں کی تفصیل

اسی کے متصل خوشنما مسجد تیار کی گئی جس میں اہلِ محلہ اور طلبہ ومدرسین سماکین اور فرش وشامیانہ وروشنی کے وہ کافی انتظام مہیا ہوئے کہ نماز پڑھنے میں اتنی

---

[1] اللہ پر بھروسہ کر کے۔ [2] قوم کے ان درویشوں کو حقیر مت دیکھو یہ بغیر پٹکے کے بادشاہ بغیر تاج کے سلطان ہیں۔

دل بستگی ہوتی تھی جس کی ماہیت بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ بلند کرسی کے صدر دروازہ پر دارالحدیث اور اس کی بغلوں میں دو درسگاہیں، شمالی رخ ہوادار و وسیع دو درسگاہیں جدا اور غرب وجنوب میں ایک درسگاہ علیحدہ۔ ایک جانب خزانہ جس میں آہنی الماری ہر طرح محفوظ اور نیچے کے طبقے میں دو سے لیکر آٹھ طلبہ رہنے کے قابل چھوٹے بڑے حجرے۔ چونکہ یہ قابل دید عمارت ظاہری حُسن کے لحاظ سے بھی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اس لئے ہم نے اس کا فوٹو لیکر بلاک طبع کرادیا اور اس کے ساتھ کتب خانہ اور نیز حضرت کے حجرے و درسگاہِ قدیم کا فوٹو بھی شامل کردیا ہے کہ ناظرین گھر بیٹھے ان کا نظارہ کرسکیں۔

مٹھی بند کرکے ہاتھ کی دوربین بنانے سے عمارتِ ممثلہ[1] صاف نظر آئے گی، سب سے اوپر فوٹو دارالحدیث کا ہے کہ نیچے طلبہ کا دارالاقامہ ہے اور صدر دروازہ کے اوپر بڑا کمرہ دارالحدیث ہے جہاں حضرتؒ حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، اس عمارت کے محاذ[2] میں شرقی سمت سڑک کے داہنی جانب مطبخ ہے اور وہ بھی حضرت ہی کا قائم کیا ہوا ہے کہ اکثر طلبہ کو بجائے نقد وظیفے کے خوراک دی جاتی ہے اور خدانخواستہ مرض وغیرہ کی وجہ سے پرہیزی کھانا درکار ہو تو اس کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ نیز جو با استطاعت طلبہ معاوضہ دیکر کھانا لینا چاہیں ان کے لئے بھی یہاں انتظام ہوتا اور صرف جنس وغیرہ کا جو صرفہ[3] مہینہ میں پڑا وہ ان سے لے لیا جاتا ہے۔ جن طلبہ کو مدرسہ سے کھانا دیا جاتا ہے ان کی تعلیمی نگرانی زیادہ ہوتی ہے اور ماہواری امتحان میں ناکامیاب ہونے پر ان کی خوراک بند کردی جاتی ہے اور اس کے دوبارہ جاری کرانے کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں کہ آئندہ امتحان میں اچھے نمبروں پر کامیاب ہوں۔ دارالطلبہ کی غربی سمت میں وہ حسین مسجد ہے جو بھوپال کی ایک نیک دل خاتون کلثوم جہاں بیگم نے اپنے روپیہ سے طیار کرائی ہے اور اس کا دروازہ اہلِ محلہ کے بیرونی دروازہ کے علاوہ اسی دارالطلبہ کے برآمدہ میں ہے اور اس میں وضو وغسل وروشنی کا مستقل اور کافی انتظام ہے۔

دوسرا فوٹو کتب خانہ کا ہے جو حضرت مولانا رحیم بخش صاحب سابق وزیر بہاولپور مدظلہم کے عطیہ سے تیار ہوا ہے اور کتابوں کی ترتیب و تحفظ کا یہ جدید طرز بھی حضرت ہی کا دماغ آفرین ہے کہ چھوٹی سی سطح پر ہر فن کی کتابیں بترتیب سجائی ہوئی ہیں کہ جس کتاب کی ضرورت ہو نہایت آسانی سے نکالی جاسکتی ہے۔

کتب خانہ میں کتابوں کا غیر معمولی اضافہ

سنہ ۱۳ھ میں جب حضرت مدرسہ میں تشریف لائے ہیں تو چند فنون کی کتابیں تھیں جن کی تعداد صرف ۱۱۷۷ تھی مگر سنہ ۴۲ھ میں جب آپ ہمیشہ کے لئے حجاز تشریف لے گئے تو تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، اسماء رجال،

[1] تصویر دی ہوئی۔ [2] مقابلہ۔ [3] خرچہ۔

نقہ، اصول فقہ، عقائد، معانی، فرائض، کلام، مناظرہ، وعظ، ادب، عروض، تجوید، تصوف، منطق، ریاضی، صرف ونحو، غرض معقول ومنقول ہر علم وفن کی کافی مقدار میں کتابوں کا ذخیرہ فراہم ہوچکا تھا جن کی تعداد ۱۰۳۳۷ تھی۔ اس کے بعد نایاب چند قلمی کتابیں آپ نے مدینہ منورہ سے مدرسہ کو بھیجیں اور اضافہ ہوتا رہا، وہ سب کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں جو آپ کو نظر آرہا ہے۔

تیسرا فوٹو مدرسہ قدیم میں حجرہ شریف کا ہے جس میں حضرت کا قیام رہا اور اب مولانا عبداللطیف صاحب کے تصرف میں ہے۔ صلوٰۃ فجر سے فارغ ہوکر اشراق تک اسی میں حضرت مراقب رہتے اور اکثر دوپہر کو اسی میں قیلولہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی کے باہر دروازہ کے متصل دیوار سے کمر لگا کر اوقات فراغ میں بیٹھتے اور جوابات خطوط وفتاویٰ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ سامنے کا حصہ آپ کی قدیم درسگاہ ہے کہ کتاب سامنے رکھ کر قالین پر تشریف رکھتے اور طلبہ سامنے اور دائیں بائیں بیٹھا کرتے تھے حتی الوسع ہر منظر اصل حالت پر دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مکان بجنسہ اور اسی حالت پر موجود ہے مگر افسوس کہ مکین نہیں رہا جس سے اس کی زینت تھی اور اب نظریں اس کو ترستی ہیں۔

مکان دنیا میں ہزاروں ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت ہیں مگر مجسم نور اور از سرتاپا گلاب کے پھول کے قیام وقعود نے جس جگہ کو تماشا گاہ عالم بنا رکھا تھا وہ نگاہ میں کچھ ایسا حسین نظر آتا ہے کہ مجبور فوٹو لوانے اور غائبین کو نظارہ کرانے کی رغبت ہوئی ؎

ہر وقت ہے پیش نظر اک حسن کی دنیا   اب تو ہے جو آنکھوں میں تو ہر چیز حسیں ہے

طلبہ کی کثرت

۱۳۱۴ھ میں جبکہ آپ مدرس اول بن کر آئے تو طلبہ کی کل تعداد ۱۴۷ تھی یعنی درجہ عربی میں ۵۶، درجہ فارسی میں ۳۴، اور درجہ قرآن مجید میں ۵۷۔ مگر ۱۳۴۴ھ میں جب آپ مدرسہ سے بسوئے طیبہ رخصت ہوئے ہیں تو تعداد طلبہ ۵۰۲ تھی یعنی درجہ عربی اعلیٰ میں ۱۸۶ درجہ عربی ابتدائی میں ۵۸، درجہ تجوید میں ۸۸، فارسی وریاضی میں ۴۰، اور قرآن شریف میں ۱۳۰، طلبہ میں بالعموم اور بنگالیوں میں بالخصوص کلام مجید پڑھنے میں صحت لفظی تک کا خیال نہ ہونا آپ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا اس لئے آپ نے مدرسہ میں تجوید کے درجہ کا اضافہ کیا اور

قاری عبدالعزیز کا تقرر

کئی قراء کے ادل بدل کے بعد قاری عبدالعزیز صاحب کو کہ جوان صالح وجیہ تھے اور چار سال مدینہ منورہ میں تجوید سیکھ کر سہارنپور بغرض تحصیل علم آئے تھے اس خدمت کے لئے انتخاب فرمایا کہ خود دینیات کی تکمیل کریں اور طلبہ کو فن تجوید کی کتابیں بھی پڑھائیں اور مشق بھی کرائیں۔ چنانچہ مدرسہ خوش الحانی وصحت لفظی کے ساتھ تلاوت کلام اللہ ہے

گونج اٹھا اور چند ہی ماہ میں اس ضرورت کی بہت کچھ مکافات آپ نے آنکھوں سے دیکھ کر اس درجہ کو مستقل بنادیا کہ اکثر طلبہ گو حافظ نہ ہوئے مگر قاری اور مجود ہو کر مدرسہ سے نکلے۔ اسی طرح عربی کے طلبہ کا دن بدن علمی ضعف آپ کو پریشان کرتا تھا کہ دورہ میں شریک ہونے والے بھی عبارت پوری صحت کے ساتھ نہیں پڑھتے اور اس کا بڑا سبب ان کی ابتدائی صرف و نحو کی کمزوری و بے توجہی تھی جس پر مزید تائید مدرسوں کے اس قانون سے ہوگئی تھی کہ شرح جامی تک وظیفہ نہ دیا جائے اور اس لئے باہر کے طلبہ بالخصوص اطرافِ بنگال کے جن کی ابتدائی استعداد نہایت کمزور ہوتی تھی وظیفہ کی خاطر بڑی کتابوں میں شریک ہوجاتے اور پھر ان کو اپنی ابتدائی کمزوری کے دور کرنے میں شرم آنے لگتی تھی۔

تعلیم میں اصلاح اس لئے قانونِ مدرسہ میں کہ بوجوہاتِ چند در چند وہ بھی مصلحت پر مبنی تھا آپ نے ترمیم نہیں کی مگر ایک درجہ ابتدائی کھولا جس میں میزان سے لیکر شرح جامی تک تعلیم دی جائی اور اس کی نگرانی حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے حوالہ فرمائی کہ ان کو خصوصیت سے ابتدائی صرف و نحو کے ساتھ مناسبت تھی اور اپنی طالب علمی کے زمانے سے اس کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ اس درجہ کے لئے آپ نے وظائف علیحدہ مقرر کئے جو عطا کنندگان اسی مد کے لئے دیا کرتے اور اس لئے اس مد کا حساب جدا رکھا جاتا تھا۔ سالانہ امتحان لینے کے لئے خود مولانا صدیق احمد صاحب تشریف لاتے اور سختی سے اس کی جانچ کیا کرتے تھے کہ طالب علم صرف و نحو پر پورا قادر ہوگیا یا نہیں۔ اس کمزوری کو بھی آپ نے دور ہوتا ہوا آنکھوں سے دیکھا اور اس وقت داخلہ کے امتحان میں سختی فرمائی کہ جب تک طالب علم شرح جامی پر حاوی نہ ہو اس کو اعلیٰ درجہ میں ہرگز نہ لیا جائے بلکہ مجبور کیا جائے کہ ابتدائی شعبہ میں داخل ہو اور وظیفہ لیکر اپنی علمی بنیاد کو مضبوط کرے ورنہ کمزور بنیاد پر تعمیر کیا ہوا مکان ہمیشہ کمزور رہے گا اور گریگا تو بیسیوں کو دبا کر ہلاک کردیگا۔ اسی درجہ میں آپ نے بقدرِ ضرورت فارسی و ریاضی اور تحریر کی مشق پر زور دیا کہ طلبہ روزمرہ کی ضروریاتِ عامہ میں ناقص و کمزور نہ رہیں۔

مولانا صدیق احمد حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرتؒ کے چچا زاد بھائی اور[1] ہمعصر تھے کہ بچپن سے آپ ہی کے ساتھ کھیلے اور پڑھے۔ مولانا کو حضرت کے ساتھ ابتدا سے ایک منافست[2] کا مضمون رہا کہ جو کام حضرت کرتے وہی آپ کرتے اور پیچھے رہنا نہ چاہتے تھے حضرت نے پڑھنا شروع کیا تو انھوں نے بھی شروع کیا۔ حضرت چچا کے پاس گوالیار گئے تو یہ بھی گئے۔ حضرت انگریزی سکول میں داخل ہوئے تو یہ بھی داخل ہوئے۔ حضرت نے عربی شروع فرمائی تو انھوں نے بھی عربی

[1] جن کے صاحبزادے حضرت مولانا فاروق احمد سابق شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور اس وقت اس مناسبت میں مشہور ہیں۔

[2] نیک رغبت میں برابری۔

شروع کی حضرت دیوبند آئے تو یہ بھی آئے حضرت گنگوہ آکر بیعت ہوئے تو یہ بھی ہوئے۔ اور حضرت نے ذکر و شغل شروع کیا تو انھوں نے بھی کیا۔ حتیٰ کہ حضرت مجاز و صاحب نسبت ہوئے تو یہ بھی مجاز و صاحب نسبت ہوئے۔ غرض جس کام میں بھی حضرت ہاتھ ڈالتے اپنے پیچھے اور ساتھ ساتھ مولانا کو پاتے اور اس لئے خوش ہوتے اور دونوں کی محبت باہمی دن بدن بڑھتی چلی جاتی تھی۔ مولانا خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو مولانا خلیل احمد کی حرص و منافست نے بڑھایا۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب۔[1]

نسبت کی دو قسمیں اور ان کا مصداق

آیت شریفہ میں وصول الی اللہ یعنی نسبت کی دو قسم ظاہر ہوئیں ایک اجتبائی کہ اُدھر سے کشش ہو اور بندہ سالک کو مطلوب بنایا جائے اور ایک اناتبی کہ اِدھر سے طلب ہو اور سالک محب و والہ[2] بنے چنانچہ میری نسبت اجتبائی ہے کہ تھوڑی محنت کروں یا زیادہ وہ نسبت یکساں حالت پر رہتی ہے اور اگر میری طرف سے ذکر و اعمال صالحہ میں کوتاہی ہوتی ہے تو اُدھر سے خود کشش ہوتی ہے اور مولوی خلیل احمد صاحب کی نسبت اناتبی ہے کہ جتنی عبادات میں زیادتی کرتے ہیں اسی قدر نسبت میں ترقی ہوتی ہے اور اگر عبادات میں کمی ہوتی ہے تو نسبت میں ضعف و کمی لاحق ہوتی ہے۔"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر زمانہ اکتساب[3] واردات کا بکثرت ہجوم ہوا اور سلوک میں آپ کو مقامات کی تفصیلی سیر کرائی گئی چنانچہ مکاتیب رشیدیہ میں آپ کے نام کے پچیس خطوط درج ہیں وہ سب اسی حالت کے مظہر ہیں۔ ایک بار حضرت نے فرمایا کہ میں سفر حج سے واپس آکر مولانا سے ملنے کے لئے دہلی گیا تو میں نے دیکھا کہ ذکر میں ایک جگہ الجھ رہے ہیں اور طبیعت آگے کو نہیں چلتی۔ گنگوہ آکر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت مولوی صدیق احمد صاحب کی طرف توجہ فرماویں کہ وہ ذکر میں الجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا ماشاء اللہ خوب چل رہے ہیں۔" آپ فارغ التحصیل ہو کر مالیر کوٹلہ چلے گئے تھے حکیم عبدالمجید خاں مرحوم دہلوی جب وہاں گئے اور آپ کو دیکھا تو طب پڑھنے کی ترغیب دی اور اپنے ساتھ دہلی لے آئے چنانچہ کتب طب کی تکمیل کرائی اور مطب بھی کرایا۔ اس وقت آپ گنگوہ میں بیعت ہو چکے اور اکتساب شروع کر چکے تھے۔ جب سب کچھ ہو لیا تو دفعۃً دل گھبرایا کہ روز گو مُوت کون دیکھا کرے اور اس میں تو یہی کرنا پڑے گا اس لئے ہر چند حکیم صاحب نے ٹھیرایا مگر میں نہ ٹھیرا۔ پھر حکیم صاحب کو چونکہ

---

[1] اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف چن لیتے ہیں اور ہدایت ہر اس شخص کو دیتے ہیں جو ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔
[2] شیدا فریفتہ۔ [3] شیخ سے فیض لینے کا۔ [4] آخر دنیا ہی کا تو کام ہے آخرت کا نہیں گو حلال ہے۔

مجھ پر شفقت زیادہ تھی اس لئے بہت سی خاص دوائیں میرے ساتھ کردیں مگر مجھے توجہ نہ رہی تھی اس لئے وہ بھی پڑے پڑے خراب ہوگئیں اور میں سب پڑھا پڑھایا بھول گیا کہ معالجہ کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس

آپ اپنے ابتدائی زمانہ کا قصہ فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد مجھے بارہ روپیہ ماہوار پر مدرسہ ہی میں مدرس بنالیا گیا اور میں نے پڑھانا شروع کردیا میرے طرزِ تعلیم پر طلبہ کا رجوع میری طرف زیادہ ہوا اور مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم نے فرمایا مولوی صدیق احمد تمہاری وجہ سے میری دیرینہ مراد پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ مجھے مدت سے افسوس ہے کہ پنجاب وبنگال دُور دُور کے طلبہ آتے اور فارغ ہوکر چلے جاتے ہیں اور ہمارا علاقہ علم سے خالی ہوا چلا جاتا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ملکی طلبہ کا زیادہ خیال ہے اور یہی میری تمنا وشوق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو اگر یہ پسند ہے تو وظیفہ کے لئے کافیہ اور قدوری کی قید اٹھادیجئے اور طالب علم چھوٹا ہو یا بڑا اس کا کھانا مقرر فرمادیجئے چنانچہ آپ نے اس کو منظور فرمالیا اور پھر تو طلبہ کی یہ حالت ہوئی کہ سو میں پچھتر میرے پاس جن کی تعلیم میزان سے ملاحسن تک تھی اور ۲۵ باقی مدرسین کے پاس۔ عام مدرسین کی عادت یہ تھی کہ کتاب میں جو جگہ سمجھ میں نہ آئی استاذ کے پیچھے پڑے اور پوچھ لیا مگر مجھے اس سے عار آتی تھی اور میں مطالعہ دیکھتا اور دماغ پر زور دیکر نکالا کرتا تھا۔ مدرسہ کے نصاب میں تعلیم نحو میر کے لئے دو مہینے مقرر تھے مگر میں نے اپنی جماعت کو آٹھ دن میں نحو میر حفظ کرادی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے دوسرے مدرسین نے شکایت کردی اور حضرت نے مجھے بلایا حضرت کو غصہ زیادہ تھا اور دیر تک خفا ہوتے رہے میں نے عرض کیا کہ حضرت میری جماعت کا اور دوسرے مدرسین کی جماعتوں کا امتحان لے لیجئے مگر شرح جامی کے سوالات نہ کیجئے اس سے معلوم ہوجائے گا کہ میں نے بے پروائی سے وقت ضائع کیا یا کچھ کام کرکے دکھایا، چنانچہ حضرت نے سب کو بلا کر امتحان لیا اور سخت امتحان لیا کہ اکثر ناکام رہے مگر جتنے کامیاب ہوئے وہ میری ہی جماعت کے تھے اور ناکام طلبہ میں بھی میرے شاگردوں کے نمبر دوسروں سے زیادہ تھے۔ ان باتوں سے مدرسوں کو مجھ پر حسد بڑھنے لگا اور آخر مجھے مدرسہ سے نکال کر گلاوٹھی بھجوادیا۔

طلبہ کی ابتدائی تعلیم بالخصوص صرف ونحو میں پختگی اور ملکۂ راسخہ[1] پیدا ہوجانا چونکہ بچپن سے آپ کے نزدیک قابلِ اہتمام رہا اس لئے آپ سہارنپور دیوبند دونوں مدرسوں کے ابتدائی شعبہ کے باضابطہ ممتحن رہے کہ ہر سال مالیر کوٹلہ سے تشریف لاکر امتحان لیتے اور رئیس جس کے آپ ملازم تھے ان ایام کو آپ کی رخصت میں بھی محسوب نہ کرتا تھا۔

[1] پختہ اور دیر تک رہنے والی حالت۔

مؤلف کو دعا

میں نے بھی ایک مرتبہ آپ کو امتحان دیا ہے کہ مجھے عربی شروع کئے ہوئے تیسرا مہینہ تھا اور نحو میر ختم ہو چکی تھی، اتفاق سے آپ میرٹھ تشریف لائے اور مدرسہ میں قیام فرمایا چونکہ شوق تھا اس لئے آتے ہی میرے استاد مولانا عبدالمومن صاحب سے کہ میں نے از اول تا آخر مولانا ہی سے پڑھا ہے دریافت فرمایا کہ بچے کون کتاب پڑھتے ہیں۔ مولانا نے مجھے پیش کر دیا اور فرمایا کہ اس کو میزان شروع کئے دو مہینے ہوئے اور نحو میر ختم کر چکا ہے، مولانا نے کتاب بند کرا دی اور اول سے جو سنا شروع کیا تا آخر تک حفظ پوچھ لیا کہ کتاب کی ایک سطر یا ایک بات بھی نہ چھوڑی، اس کے بعد خوش ہو کر دعا دی اور فرمایا بچہ ہونہار ہے۔" مولانا اس کو بھول بھلا گئے اور اب جس وقت بھی دیکھتے احترام فرمایا کرتے مگر مجھے شرم آتی اور ابتدائی امتحان یاد آجاتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو میرے بھی ممتحن بن چکے ہیں کہ فلاں وقت فلاں مدرسہ میں آپ نے نحو میر کا از اول تا آخر میرا امتحان لیا تھا حالانکہ میری عمر بارہ سال کی تھی اور میزان سے لیکر نحو میر تک میں نے دو مہینے میں پڑھا تھا سوچ کر فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے۔

کشف

حضرت ممدوح کو کشف بہت ہوتا اور مزاج میں اتنی سادگی تھی کہ بے تکلف اپنے کشوفِ کونیہ[1] کا اپنے لوگوں سے اظہار فرمایا کرتے تھے۔ تذکرۃ الرشید کے بعد سے چونکہ حضرت کو مجھ پر شفقت بہت بڑھ گئی اور آپ کی غایت بے تکلفی نے مجھے بھی بے تکلف بنا دیا تھا اس لئے ایک مرتبہ ظہورِ مہدی کے غایتِ قرب کی بابت اپنے کشوف بیان فرمانے لگے گویا ہر لحہ انتظار ہے اور توقع غالب ہی کہ اسی سال ظہور ہو جائے۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت بات یہ ہے کہ مجھے ان امور سے دلچسپی نہیں اور یوں سمجھتا ہوں کہ جو امر جس وقت بھی ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا کوئی قبل از وقت معلوم کر لے تو کیا نفع اور معلوم نہ ہو تب کیا نقصان. بالخصوص قیامت اور اس کے متعلقات چونکہ ان پانچ چیزوں میں ہیں جن کا علم بجز اللہ جل جلالہ کے کسی کو حاصل نہیں حتی کہ خلاصۂ عالم وعالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وقت کا تعین معلوم نہ ہوا اور محض آثار وعلامات کا آپ نے تذکرہ فرمایا جس میں اس کا اشارہ بھی نہیں کہ کس صدی یا کس سال اور کس مہینے میں یہ واقعہ ہوگا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ کو منظور ہی نہیں کہ اپنے اختصاصی علم کا کسی کو کچھ بھی حصہ دیں ورنہ محبوب کی ذات اس کے لئے احق واولیٰ تھی۔

لہٰذا میرا خیال تو یہ ہے کہ جن اہل اللہ کو اس کے متعلق کوئی کشف ہوا اس میں ضرور خلط ڈالا گیا تاکہ علم مغیبات کی تخصیص[2] بذات اللہ میں فرق نہ آئے۔ صاحبِ کشف کی ولایت میں بھی کوئی فرق نہ آیا کہ اس نے

---

[1] ان باتوں کا کشف جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ [2] اللہ تعالیٰ کی ذات کے خاص ہونے میں۔

جو کچھ دیکھا حق دیکھا۔ جیسے دُوربین میں دُور کی چیز پاس نظر آتی ہے کہ دیکھنے والا ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑنا چاہتا ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ چیز درحقیقت دُور ہے اور صرف دوربین اس کو پاس دکھا رہی ہے پس غلطی بھی ہے اور واقعیت بھی کہ شے نظر آنے والی بیشک صحیح مگر اس کا قرب بعد دوربین کی مقدار قوت پر مشتبہ اور غیر معین ہے۔ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ ہاں بات یہی ہے۔

سخاوت و مہمان نوازی

حضرت ممدوح میں سخاوت و مہمان نوازی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ایک بار خود فرمایا کہ جب میں طالب علمی کے لئے دیوبند آیا تو میرے والد صاحب نے مجھے ایک چونی دی کہ ضرورت میں کام آئے گی۔ میں نے اس کو کمربند میں باندھ لیا اور وہ چھ مہینے تک بندھی رہی اس کے بعد کسی ضرورت سے اس کو بھنایا۔ بس اس کے بعد سے میرے ہاتھ میں کبھی پیسہ نہیں رہا اور جو کچھ آتا وہ خرچ ہو جایا کرتا تھا۔

فریضۂ حج کی ادائیگی

حتیٰ کہ ۱۳۰۲ھ میں جب میں حج کو جانے لگا اور حضرت امام ربانی سے اجازت لینے گنگوہ آیا تو حضرت نے دعائیں دیکر رخصت فرمایا۔ باہر نکلا تو حضرت نے پھر آواز دی اور فرمایا کہ مولوی صدیق احمد جب میرے پاس سے کوئی حج کے لئے رخصت ہوتا ہے تو میں اس کو نصیحت کیا کرتا ہوں کہ ہاتھ کو تنگ نہ رکھنا مگر تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ ہاتھ کو فراخ نہ کرنا بلکہ تنگ رکھنا چنانچہ آپ نو سو روپیہ لیکر وطن سے مع اپنی والدہ کے روانہ ہوئے اور زمانہ وہ تھا کہ تین سو روپیہ فی کس بھی کافی سمجھا جاتا تھا مگر آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب مدینہ منورہ سے واپس مکہ ہوا ہوں تو سب خرچ ہو چکا اور مجھے فکر تھا کہ ہندوستان جانے کے لئے کس سے قرض مانگوں۔

اسی پریشانی میں ایک دن جا رہا تھا کہ ایک دکاندار نے مجھے بلایا اور کہا مجھے چار سو روپیہ سہارنپور کے فلاں تاجر کو پہنچانا ہیں اگر آپ لیتے جاویں تو احسان ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایک شرط منظور ہو تو لیتا جاؤں گا وہ یہ کہ اس میں سے دو سو روپیہ قرض لوں گا جن کو سہارنپور پہنچکر ادا کروں گا اور دو سو روپیہ امانت ہوگا۔ بجنسہٖ پہنچاؤں گا، دکاندار نے اس کو بخوشی منظور کر لیا اور میرے لئے زادِ راہ کا انتظام بلا سوال غیب سے ہو گیا۔

یہ بھی فرمایا کہ قافلے والے عام طور پر اپنے بدوؤں کی شکایت کرتے تھے مگر مجھے تو میرے بدو نے بہت ہی آرام دیا۔ میں نے اس کے واسطے کھجوریں خرید لی تھیں اور جب وہ کہتا یا شیخ الجوع تو میں اس کو ایک لپ کھجوریں دیدیتا اور وہ خوش ہو جاتا تھا۔ غرض باوجودیکہ آپ نے شیخ کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ روکنے کی ہر وقت کوشش رکھی مگر پھر بھی آپ کا ہاتھ دوسرے فراخ دستوں سے آگے بڑھا رہا اور گیارہ سو روپئے دو نفر کے حج میں صرف ہو گیا۔

خواب میں حضورؐ کی زیارت اور بیماری سے صحت

ایک مرتبہ آپ بزمانہ طالب علمی بیمار ہوئے کہ کسی کو زیست کی امید نہ رہی۔ سہارنپور میں ایک حکیم حاذق تھے آپ کے والد نے بغرض علاج ان کے پاس لے جانا چاہا اور رتھ بھی کرایہ کر لیا۔ آپ فرماتے تھے کہ اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ منورہ روضۂ مطہرہ پر حاضر ہوں اور بڑے شوق سے صلوٰۃ وسلام پڑھ رہا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دفعۃً دروازہ کھلا اور میں سلام پڑھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا دروازہ کھلا اور میں اندر گیا تو معلوم ہوا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ملاء علیٰ کی سیر کو تشریف لے گئے ہیں۔ میں ٹھیر رہا اور ذرا دیر بعد آنحضرتؐ روحی فداہ ایک تخت پر تشریف لائے کہ داہنی طرف ابوبکرؓ تھے اور بائیں طرف عمر فاروقؓ۔ میں نے حضرتؐ کو دیکھتے ہی پھر الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھنا شروع کیا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف رُخ فرما کر پوچھا کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت بیماری کی وجہ سے میرا پڑھنا رہ گیا میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ صحت ہو جائے فرمایا جا اچھا ہے یا اچھا ہو گیا۔ (صحیح لفظ یاد نہیں رہا) اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ صبح کو اٹھا تو آرام معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ رتھ کرایہ کر لی گئی تھی اس لئے مجھے سہارنپور لے گئے۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر والد صاحب سے فرمایا کہ پیر جی صاحب تمہارا لڑکا تو بالکل اچھا ہے صرف نقاہت اور ضعف باقی ہے سو معجون کا نسخہ لکھے دیتا ہوں اس کو کھلائیں ضعف بھی جاتا رہے گا۔

مولانا انوار احمد صاحب کا مبارک خواب

آپ کے حقیقی بھائی مولوی انوار احمد صاحب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جب حضرتؒ کے بعد میں گنگوہ کی مدرسی پر آیا تو جائداد کی مشترکہ آمدنی پر میری غلط فہمی سے مجھے بھائی صدیق احمد کی طرف سے کبیدگی ہو گئی اور میں کشیدہ ہو بیٹھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ دہلی بغرض تعلیم طب گئے اور طب کو چھوڑ چھاڑ کر وہیں ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے تھے۔ میں نے خواب دیکھا کہ کسی بلند جگہ پر کھڑا ہوں جو نہ زمین ہے نہ آسمان اور خوشنما بنگلہ ہے جس کا کمرہ تعمیر ہو رہا ہے۔ معمار مسلمان ہیں، ایک کا نام مولا بخش ہے اور دوسرے کا غلام رسول۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بنگلہ کس کا ہے؟ جواب دیا گیا کہ آپ کے بھائی مولوی صدیق احمد کا۔ میری نظر نیچے پڑی تو چنائی میں خم نظر آئی اور میں نے کہا ایسی بھدی چنائی کیوں کی؟ کہا ابھی درست کئے دیتے ہیں اور سیفہ لے کر فوراً اس کو سیدھا کر دیا کہ ایک سوت میں ہو گئی اور بنگلہ مکمل و طیار ہو گیا۔ باہر دیکھا تو چار طرف چھوٹی سی نہر جاری ہے اور بجانب غرب چھوٹی سی مسجد ہے جس میں خوبصورت لوٹے رکھے ہیں۔ پھر میں نے نظر اٹھائی تو صدہا بنگلے چھوٹے بڑے تیار نظر آئے مگر مکین کسی میں نہیں۔ دوبارہ نظر اٹھائی تو شمالی رُخ ایک عالی شان عمارت

نظر آئی اور ایک عمارت بجانب جنوب۔ میں نے شمالی عمارت کے اندر جانے کا قصد کیا تو دربان نے روکا کہ ابھی حکم نہیں ہے تم پہلے جنوبی محل میں جاؤ۔ وہاں تو دربان نہ تھا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ دیکھتا ہوں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مع خلفاءِ اربعہ تشریف فرما ہیں۔ فرطِ شوق میں کئی منٹ تک قدم چومتا رہا کہ غلبۂ سرور میں میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، دفعتہً آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ آنسو جاری تھے۔ پھر آنکھ لگ گئی اور پھر یہی خواب دیکھا حتیٰ کہ تین دفعہ یہی پیارا منظر نظر آیا۔ بس اسی خواب پر میری وہ بدظنی بھائی کے ساتھ جاتی رہی۔

حضرت گنگوہی کا انھیں، حاجی صاحب کا کرتہ دینا

اور میں وطن آیا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نے اپنا مستعملہ کرتہ حضرت گنگوہی کے پاس بھیجا کہ خلفا میں جس کو اس کا مستحق سمجھو اسے دیدینا اور حضرت امام ربانی نے وہ کرتہ بھائی صدیق احمد کو مرحمت فرمایا ہے۔ چنانچہ بھائی بھی وطن آئے اور اس ملبوس شریف کی مجھے زیارت کرائی۔ اس کے بعد ہم بھائیوں میں کبھی کوئی خلش یا رنجش نہیں ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے ایک بار مجھ سے کہا گیا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ میں نے تین[۳] باتیں دریافت کیں جن میں ایک یہ تھی کہ مجھ پر یہ انعامات کیوں ہوئے؟ تو ارشاد ہوا کہ شفقۃ علی الخلق والطلبہ کی وجہ سے۔ ایک بار ارشاد ہوا کیا چاہتے ہو؟ شہرت یا اولاد۔ تو میں نے اولاد کو پسند کیا۔ چنانچہ آپ صاحب اولاد ہوئے۔ اور ماشاء اللہ سب عالم وصالح اور خوشحال، ضروریاتِ معاش سے فارغ البال۔

مرزا قادیانی سے گفتگو اور مرزا کا عجز

ایک مرتبہ فرمایا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے شروع میں مجددیت کا دعویٰ کیا تھا۔ میں اس وقت مالیر کوٹلہ تھا اور بھائی مشتاق کے پاس جو کہ لدھیانہ کے سکول میں ہیڈ مولوی تھے وطن کو آتے جاتے ٹھہرا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی اکثر لدھیانہ آتے تھے اور مریدوں میں خوب آؤ بھگت ہوتی تھی۔ بھائی مشتاق احمد کی مجلس میں تذکرہ ہوا کہ مولوی صاحب ذرا معلوم تو کریں کہ آیا واقعی وہ مجدد ہیں؟ میں نے کہا جب ایسا اتفاق ہو کہ وہ آئے ہوئے ہوں اور میں بھی یہاں موجود ہوں تو اس وقت چلیں گے۔ اتفاق سے ایسا موقع پیش آگیا اور ایک مجلس میں میرا اور مرزا صاحب کا اجتماع ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ علمی گفتگو میں تو مرزا صاحب کچھ الٹی سیدھی بولتے ہی رہیں گے اور نتیجہ نہ نکلے گا لہٰذا میں نے ان سے پوچھا کیا واقعی آپ مجدد ہیں؟ کہا ہاں۔ میں نے کہا تو آپ کو مقاماتِ سلوک ضرور طے کرائے گئے ہوں گے؟ بولے جی ہاں۔ میں نے کہا سیر اجمالی ہوئی یا تفصیلی؟ کہا اجمالی ہوئی۔ میں نے کہا سیر اجمالی والا مجدد نہیں ہوسکتا کہ حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ

اپنے مکتوبات میں فلاں جگہ اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس پر مرزا صاحب بولے مجھے اجمالی اور تفصیلی دونوں قسم کی سیر کرائی گئی ہے۔ میں نے کہا تفصیلی بیان کیجئے۔ بولے ایسی تفصیل تھی جیسے ریل گاڑی تیز چل رہی ہو کہ بظاہر تفصیلی ہوتی ہے مگر یاد کچھ نہیں رہتا۔ میں نے کہا ایسی تفصیل سیر میں اسٹیشن تو تمامی پڑتے ہیں انہی کے نام شمار کرا دیجئے، تو کچھ جواب نہ بن پڑا اور اکثر مولوی صاحبان کو جو مجمع میں موجود تھے ان کی طرف سے اعتقاد جاتا رہا۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مالیرکوٹلہ میں مولوی عبدالرحیم مرحوم کے پاس دو طالب علم تھے جن کو یہ زعم تھا کہ نہ ہمارے استاذ جیسا کوئی معقولی دنیا میں ہے نہ ہم جیسا مستعد کوئی طالب علم۔ میرے پاس مولوی عبداللطیف (لطیف یار جنگ بہادر پنشنر حیدرآباد دکن) مُلّا حسن پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ دونوں طالب علم آئے اور کہنے لگے یہ لڑکا ملا حسن کا کتنا سبق پڑھتا ہے؟ میں نے کہا دو ورق۔ تعجب سے کہنے لگے ہم تو تین چار سطر سے زیادہ نہیں پڑھتے کیا یہ دو ورق سمجھ لیتا ہے؟ میں نے کہا بلکہ سمجھا سکتا ہے ان کو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ ہم مُلّانوں کو تو وہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ قال اللہ و قال الرسول کے سوا انھیں کچھ آتا ہی نہیں اور معقول سے ان کو کیا سروکار۔ لہذا کہنے لگے اچھا اجازت دیجئے کہ یہ ہمارے ساتھ تکرار کیا کریں۔ میں نے کہا بہتر ہے تم آجایا کرو۔ چنانچہ دونوں طالب علم دوسرے وقت آئے اور مولوی عبداللطیف نے ملا حسن کھول کر ایک مقام ان کو سمجھایا۔ اس کے بعد پوچھا کہ سمجھ بھی لیا؟ اور اچھی طرح ذہن نشین بھی ہو گیا؟ وہ بولے کہ ہاں خوب سمجھ لیا۔ تب مولوی عبداللطیف نے کہا کہ کتاب کا یہ مطلب نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے اور اس کی اچھی طرح تقریر کی۔ اس بحث کو جب وہ تسلیم کر چکے تو مولوی عبداللطیف نے پھر کہا کہ یہ بھی مطلب غلط ہے اور یہ یہ اعتراض پڑتا ہے چنانچہ تیسرے مطلب کی تقریر کی اور اس کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا کے ان کو تسلیم کرا دیا۔ آخر وہ اٹھے اور اپنے مزعومہ خیال کو وہیں چھوڑ کر اٹھے۔

انعاماتِ الٰہی مولانا مرحوم اُن خوش نصیب بزرگوں میں تھے جن کو حق تعالیٰ کی طرف سے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں بھرپور عطا ہوئیں۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کے مجھ پر بڑے انعامات ہیں:-

(۱) عالم دین بنایا۔

(۲) اولاد عطا فرمائی۔

(۳) اولاد بھی صالح مطیع اور عالم

(۴) میں نے اپنی اولاد کی اولاد کو بھی دیکھا۔

(۵) اور مجھے اپنی اولاد کا یا کسی دوسرے کا دنیوی امور میں مختلج نہیں بنایا بلکہ میرے سے دوسروں کو نفع پہنچوایا۔ چنانچہ آپ مالیر کوٹلہ میں مفتی تھے اور ۵۰ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ باوجود کثیر العیال ہونے کے اپنے خاندان اور وطن کے نادار دحاجتمند اور یتامیٰ و بیوگان کی ہمیشہ خبر گیری فرماتے اور مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔

انبہ کے موسم میں وطن آنا اور پھر مالیر کوٹلہ جانا

انبہ کے موسم میں مولانا کا رخصت لیکر وطن آنے کا معمول تھا کہ انبہ سے خاص رغبت تھی اور کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلانے کا شوق تھا۔ چنانچہ جولائی ۲۵ئہ میں حسب معمول مع اہل وعیال وطن آکر موسم انبہ کے ختم پر ستمبر میں واپس ہوئے تو گردن وشانہ کے درمیان خفیف درد ہو گیا جس کا علاج اول یونانی ہوا اور اس سے نفع نہ ہونے پر ڈاکٹری۔ چنانچہ چند روز بعد درد جاتا رہا اور آپ نے پنجشنبہ ۲۷ صفر ۴۲ئہ کو ڈاڑھی پر مہدی کا خضاب لگایا اور غسل فرما کر کپڑے بدل کر بعد نماز عصر معالج کا شکریہ ادا کرنے کے لئے چلے۔ دروازہ میں آکر کچھ ضعف معلوم ہوا اور وہیں بیٹھ گئے۔ ذرا دیر ہمت فرما کر اٹھے اور ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا شکریہ ادا کر کے گھر آئے، کھانا کھایا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ مسجد سے واپسی میں پھر ضعف محسوس ہوا کہ چلتے چلتے ٹھیرے اور پھر ہمت کر کے مکان کے بالاخانہ پر حسب عادت جالیٹے۔ عشا کی نماز کو پھر مسجد میں آئے اور باجماعت ادا فرما کر مکان پہنچے۔ حسب معمول آخر شب کے لئے پانی بھر کر لوٹہ رکھا۔ کوٹھری کو جس میں آپ کی مختصر اشیاء ضروریہ رکھی رہتی تھیں قفل لگایا اور گیارہ بجے کے قریب چارپائی پر لیٹ رہے۔

انتقال

مگر آرام نہ آیا تو بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے اور ذکر جہر شروع کر دیا۔ ذرا دیر بعد قضاء حاجت کو گئے اور واپسی میں ضعف زیادہ ہو گیا فرمایا سینہ میں درد معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے صاحبزادہ مولوی شفیق احمد نے سینکنا شروع کیا مگر دیکھا کہ آواز پست ہوتی جاتی ہے۔ دوبارہ قضاء حاجت کے لئے چوکی قریب رکھی گئی اور آپ فارغ ہو کر تکیہ سرہانے رکھ کر پلنگ پر لیٹ رہے۔ اب ذکر کی آواز اتنی کمزور ہو گئی کہ بدشواری سنائی دیتی تھی کہ بارہ بجے شب کو دفعۃً بلند آواز سے اللہ کہا اور روح رفیق اعلیٰ سے جا ملی۔ متعلقین نے سمجھا کہ غشی یا سکتہ ہوا مگر ڈاکٹر نے آکر کہا کہ رخصت ہو لئے اور اب کچھ نہیں ہے۔ اگلے دن جمعہ کو مالیر کوٹلہ کے گورستان میں دفن ہوئے اور اس طرح پر ایک نماز قضا کئے بغیر چند لمحات میں آخرت کا کٹھن سفر ختم فرمایا۔

فانا للہ وانا الیہ راجعون ؎

ہر آنکہ زیست[1] بہ ناچار بایدش نوشید ۔۔۔ ز دورِ جام مئے کل من علیہا فان

[1] جو شخص زندہ ہے ضرور ہے کہ اس کو کل من علیہا فان (جو بھی زمین کے اوپر ہے فنا ہونے والا ہے) کی شراب کا دور جام پینا ہوگا۔

انتقال کے بعد دیکھا گیا تو آپ کے کمر بند میں صرف ایک اکنی تھی اور بس۔ وصال سے تین[۳] دن قبل آپ کا خط بڑے صاحبزادے مولوی فاروق احمد کے نام بھاولپور پہنچا تھا جس میں تحریر تھا کہ تقریباً ساڑھے چار سو روپیہ کا مقروض ہوں لیکن اس سے کچھ زیادہ میری تنخواہوں کا سرکار میں باقی ہے۔ اللہ کی شان کہ نواب صاحب اس وقت شملہ تھے، آپ کی وفات سے مطلع ہوتے ہی حکم آیا کہ ریاست کا ایک بڑا اہل کار ہماری طرف سے تعزیت کیلئے پس ماندگان کے پاس جائے اور مفتی صاحب کی چڑھی ہوئی ساری تنخواہیں ساتھ لیتا جائے اور ایسے موقع پر ریاست کا جو دستور ہے وہ عمل میں لائے۔ اس طرح پر حق تعالیٰ نے آپ کو بار قرض سے اور کفن دفن کے تمامی خرچ کو آپ کی کمائی سے پورا کرایا کہ پسماندگان پر آپ کا بار ایک پیسہ کا بھی نہیں پڑا۔ آپ اپنی حیات میں متعدد مرتبہ فرما چکے تھے کہ میری تمام کتابیں بتولیتِ[۱] اولاد وقف ہیں اور میں اپنی اولاد کو وصیت کرتا ہوں کہ علم دین کو جو کہ ان کا ترکہ پدری ہے اپنی اولاد سے نکلنے نہ دیں اور اگر خدانخواستہ میری اولاد میں علم نہ رہے تو اس وقت ان کتابوں کو کسی مدرسہ میں داخل کردیں۔ فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ

مولانا کے ساتھ حضرت کے تعلقات

حضرتؒ کو مولانا کے ساتھ کئی تعلقات سے محبت تھی کہ

(۱) چچازاد بھائی تھے۔

(۲) بچپن کے ہمجولی اور ہمعصر تھے۔

(۳) ہر معاملہ میں عرصہ دراز تک ساتھ رہے تھے۔

(۴) سمدھی تھے کہ آپ کے صاحبزادہ حافظ ابراہیم کا مولانا کی صاحبزادی سے عقد ہوا تھا۔

(۵) ہم مکتب اور پیر بھائی تھے۔ اور

(۶) ایک شیخ سے اجازت پائے ہوئے دونوں حضرات امام ربانی کے خلیفہ تھے اس لئے جب آپ کے کانوں میں یکایک اس سانحہ کی خبر پہنچی تو گویا آپ کی کمر شکستہ ہوگئی۔ وطن میں خبر پہنچنے پر اعزہ مالیر کوٹلہ گئے اور جب ان کی واپسی ہوئی تو حضرت نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد جا چکے اور خطبہ شروع ہو گیا تھا۔ سنن سے فارغ ہو کر جب حضرت چلے تو آنے والے صاحب نے مصافحہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت وہیں بیٹھ گئے اور مرض و وفات کے مفصل حالات سنتے اور پوچھتے رہے۔ آخر میں چشم نم ہوئے اور انا للہ پڑھ کر فرمایا کہ میرے ہمعصر سارے رخصت ہو چکے اب صرف میں ہوں دیکھئے اس مٹی کو کب تک گھسیٹنا مقدر ہے ؎

بزمِ[۲] علم و بذلہ سنجی گشت برہم یک بیک — ساقی از محفل شد و بشکستہ شد جام و سبو

محفلِ[۳] علم و ادب شد بے نمک از رفتنش — کام جان شد بے مزہ از تلخی ہجرانِ او

[۱] اولاد کے متولی ہونے کے ساتھ۔ [۲] علم اور لطیفہ گوئی کی مجلس ایک دم الٹ پلٹ ہوگئی ساقی محفل سے گیا اور جام و سبو ٹوٹ گئے۔
[۳] علم و ادب کی محفل ان کے جانے سے بے نمک ہوگئی روح کا تالو ان کے ہجر کی تلخی سے بے مزہ ہوگیا۔

طلبہ کی بدوضعی اور آزادی سے نفرت

حضرت طلبہ کے متعلق تعلیمی امور میں بہت سخت تھے اور امتحان میں کسی ادنیٰ رعایت کو بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی طرح طلبہ کی عملی و اخلاقی حالت پر بھی سخت نظر ڈالا کرتے اور کیسا ہی عزیز یا دوست کا بچہ ہو جب اس کی بدوضعی یا آزادی کو محقق فرما لیتے تو بے تامل مدرسہ سے خارج کر دیتے اور جب تک وہی اپنی حالت پر نادم ہو کر سچی توبہ نہ کرے اس کے ولی و وارث کی کوئی سفارش نہ سنتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو اتنی بات پر کہ انھوں نے حضرت کی قرابت کے ناز پر اپنے استاذ کا احترام و ادب ملحوظ نہ رکھا تھا فوراً مدرسہ کی کتابیں واپس کرنے کا حکم دیدیا اور جب تک خود استاذ نے حضرت سے سفارش نہ کی اسوقت تک واپس کردہ کتابیں ان کو دوبارہ نہ دی گئیں لیکن اس کے ساتھ ہی دفتر و مطبخ وغیرہ کے ملازمین کی طلبہ پر کوئی داب یا سختی حضرت کو گوارا نہ تھی اور ایسے مواقع پر حضرتؒ ہمیشہ طلبہ کا پہلو لیا کرتے تھے۔

طلبہ کا احترام اور ان سے ہمدردی

ایک مرتبہ میں حاضر تھا کہ ایک طالب علم کی آپ کے پاس محرر مطبخ کے متعلق شکایت آئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ طلبہ کو کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ اس طالب علم کو جلی ہوئی روٹی ملی جس کے لینے سے اس نے انکار کیا اور محرر مطبخ نے سختی سے جواب دیا کہ اب ختنے بہک گئے کہ جلی اور موٹی سوجھنے لگی۔ لینا ہو لو ورنہ جاؤ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو اپنے حصہ میں لگا لوں یا جو روٹی جلے اس کا تاوان دیا کروں۔ حضرت یہ خبر سنتے ہی مطبخ میں آئے اور غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں ساتھ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ حضرت کے بدن اور آواز دونوں میں رعشہ ہے۔ محرر مطبخ سے آپ نے واقعہ پوچھا اور جب انھوں نے خود ہی اس توقع پر صحیح صحیح بیان کر دیا کہ طلبہ کا انتظام قائم رکھنے کے لئے محرر کی طرفداری کی جائے تو اس وقت آپ نے فرمایا منشی جی سنو، مدرسہ انہی پردیسی بے وطن مسکین طلبہ کے دم سے قائم ہے اور تم اور میں دونوں انہی کے طفیل میں روٹیاں کھا رہے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو نہ مطبخ کی ضرورت نہ تمہاری حاجت اور مدرسین بھی فارغ اور مدرسہ بھی خالی۔ یہ مسکین سہی محتاج سہی مگر مجھے اور تمہیں دونوں کو روٹیاں دے رہے ہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں ترش کلام کرنے کا کیا حق تھا اور تم کون تھے یہ کہنے والے کہ ختنے بہک گئے۔ میں ان کا باپ بنا ہوا ابھی زندہ بیٹھا ہوں تم کو مطبخ سے جزو تنخواہ بنا کر دو خوراک ملتی ہیں آخر کیا وجہ تھی کہ جلی ہوئی روٹی تم اپنی خوراک میں نہ لگا سکے اور مہمانِ رسول کو مجبور کیا کہ یا تو یہی جلی ہوئی کھائے ورنہ فاقہ کرے۔ اب تو اپنی خوراک اس کے حوالہ کر دو اور آئندہ کے لئے خوب کان کھول لو کہ کسی طالب کے ساتھ کچھ بھی تیز یا ترش برتاؤ کیا تو کان پکڑ کر مطبخ سے نکال دوں گا، ہاں کسی طالب علم کی کوئی غلطی ہو تو مجھ سے کہو میں تحقیق کے بعد جو

مذمت سمجھیں گا دوں گا مگر دوسرے کو نہ دیکھ سکوں گا کہ وہ انھیں ترچھی نظر سے بھی دیکھے۔ چونکہ پہلی غلطی ہے اس لئے اس وقت تنبیہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ آئندہ اس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

مدرسین کا احترام اسی طرح مدرسین کے احترام کا آپ کو خاص اہتمام تھا اور ان کے ساتھ وہ شفقت ولطف کا برتاؤ فرمایا کرتے تھے جو ان کے لئے شایاں تھا۔ باوجودیکہ تمام مدرسین آپ کے شاگرد اور معتقد خادم تھے مگر جب کوئی آتا تو آپ اس کو پاس بٹھا لیتے اور ان کی بُری بھلی سب توجہ سے سنتے تھے مسکراتے اور کوئی شکایت لاتا تو اس کی کافی تحقیق فرما کر ان کو تسلی دیا کرتے تھے۔ طالب علم اور استاذ کے مابین کوئی قصہ ہوتا جس میں غلطی استاذ کی ہوتی تو اس وقت بڑی ضیق پیش آتی اور بڑی حسنِ تدبیر سے دونوں پہلو سنبھالا کرتے تھے۔

مولوی ظفر احمد کے مزاج میں غصہ تھا ایک مرتبہ طالب علم کے بے تکے سوالات پر اُن کو پڑھاتے ہوئے غصہ آیا تو کتاب کہ فلسفہ کی تھی طالب علم کے منھ پر ماری۔ حضرت کے قریب ہی ان کی درسگاہ تھی اور حضرت نے سب دیکھا اور سن لیا تھا اس وقت گرفت کرنے میں طالب علم کی جرأت بڑھنے کا اندیشہ تھا اور حضرت کو اس کا خاص اہتمام رہتا تھا کہ طلبہ کے قلوب میں استاذ کی عظمت قائم اور باقی رہے اس لئے ایسا کر دیا گویا سنا ہی نہیں۔ بعد عصر جب مولوی ظفر احمد صاحب مجلس میں آکر بیٹھے تو حضرت نے فرمایا مولوی ظفر کیا کتاب سے بھی مارا کرتے ہیں؟ کتاب تو اس کے لئے موضوع نہیں ہوئی، پھر کتاب بھی مدرسہ کی جو کہ وقف ہے اور جس کی حفاظت ضروری۔" مولوی صاحب نے غلطی کا اقرار اور آئندہ کے لئے احتیاط کا عہد کیا تو آپ مسرور ہوئے اور پھر محبت کے لہجہ میں فرمایا بھائی آجکل طلبہ کو مارنے کا زمانہ نہیں ہے کیونکہ زمانہ فساد کا ہے قلوب میں تکبر بھرا ہوا ہے۔ بعض نادان مقابلہ سے پیش آنے لگتے ہیں اس سے تو بالکل ہی احتیاط کرو اور اگر کوئی زیادہ بک بک لگا دے اس کو مہتمم سے اطلاع کر کے درس سے اٹھا دو۔ بس اس سے زیادہ سزا کی ضرورت نہیں۔

امتحان سخت لینا اور نمبر پورے دینا امتحان اپنے مدرسہ کا ہو یا دوسرے مدرسہ کا حضرتؒ سخت لیا کرتے مگر اس کے ساتھ ہی نمبر اچھے دیتے تھے۔ ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں دینیات سے فارغ شدہ طلبہ کے امتحان دلائے جانے کی تجویز ہوئی کہ تمام علوم میں امتحان لیا جائے اور بجائے تقریری کے تحریری امتحان ہو جس کے لئے سوالات بیرونی علماء سے منگائے جاویں۔ چنانچہ ادب و بلاغت اور صرف ونحو کا امتحان حضرت کے سپرد ہوا اور حضرت نے علوم عربیت کے اہم سوالات تحریر فرما کر مدرسہ میں بھیجدیئے۔ مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی بھی شریک امتحان تھے

اور جب امتحان سے فارغ ہو کر وطن آتے تو حضرتؒ کی زیارت کا شوق ہوا کہ اس سے قبل کبھی زیارت ہوئی نھی۔ چنانچہ جب بھائی کے ساتھ دیوبند جانے لگے تو بھائی سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ راستہ میں سہارنپور حضرتؒ کی زیارت کرتے چلیں کہ ادب و بلاغت میں ہمارے ممتحن تھے شاید کچھ نتیجہ امتحان کا بھی پتہ چل جائے بھائی نے کہا کہ بس زیارت کرنا چاہو تو کر لو باقی نتیجہ امتحان کا پتہ مولانا نہیں دیں گے کہ یہ قاعدہ کے خلاف بات ہے۔ چونکہ مولوی ظفر احمد صاحب کے قلب میں حضرت کی عظمت بیٹھ گئی اور ایک میلان و کشش پیدا ہو گئی تھی اس لئے مدرسہ میں آئے اور حضرت کی زیارت کی۔

مولوی ظفر احمد صاحب کا بیان ہے کہ حضرت کی طبیعت مبارکہ میں شفقت تو قدرت نے ایسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ زیارت کے ساتھ ہی جس چیز کو میں نے دیکھا وہ حضرت کا تبسم کے ساتھ خندہ پیشانی سے شفقت و عنایت فرمانا اور تھوڑی ہی دیر میں قبل ازیں کہ میں نتیجہ امتحان کے متعلق کچھ عرض کرتا خود ہی یہ فرمانا تھا کہ میاں ظفر تمہارے جوابات سے ہم بہت خوش ہوئے تم نے سب سوالات کے جوابات اچھے لکھے اور بالخصوص اردو کی عربی اور عربی کی اردو سب اچھی بنائی اس لئے ہم نے نمبر بھی تم کو اچھے دیئے۔ اور یہ فرما کر حجرہ میں تشریف لے گئے اور جوابات کے پرچوں کا پلندہ نکال کر باہر تشریف لائے اس میں سے میرے جوابات کا پرچہ نکالا اور میرے سامنے ڈالدیا کہ دیکھو تمہارے نمبر سب سے زیادہ ہیں (یعنی سو نمبر میں صرف ایک یا دو کم تھے) اور کسی کے نمبر اسقدر نہیں ہیں سب تم سے کم ہیں۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ شاید حضرت کو کشف ہو گیا کہ میں نتیجہ امتحان کے متعلق خیال لیکر آیا ہوں۔ اس کے بعد پھر مجھے اپنے ساتھ زولنکدہ پر لے گئے اور چولھے پر چاء تیار تھی اپنے ہاتھ سے پیالی میں نکال کر مجھے عطا فرمائی۔

اسباق کی ترتیب اور فتویٰ نویسی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں اول صبح کے دو گھنٹے ترمذی شریف ہوا کرتی اور اس کے ختم ہو جانے پر بخاری شریف شروع ہو جاتی تھی اور رجب کے وسط میں دونوں کتابوں سے باطمینان فراغ ہو جاتا تھا اس کے بعد فقہ و تفسیر کے اعلیٰ اسباق ہوتے اور اوقاتِ مدرسہ میں ایک گھنٹہ آپ کا درس سے فارغ رہتا تھا جو فتاویٰ لکھنے یا دوسروں کے لکھے ہوئے کو دیکھنے اور سننے میں خرچ ہوتا تھا۔

مصروفیات اور اوقاتِ کار

۲۸ھ سے جب مولوی محمد یحییٰ صاحب تشریف لے آئے تو آپ کا ایک گھنٹہ صبح کا اور ایک شام کا فارغ ہونے لگا اور یہ وقت امور نظم مدرسہ میں صرف ہونے لگا۔ ۳۵ھ میں جب آپ نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود کی تالیف شروع

فرمائی تو دو گھنٹے صبح کے تالیف کے لئے تھے اور ایک گھنٹہ شام کا فتاویٰ کے لئے اور باقی گھنٹوں میں درس۔ مگر ۱۳۳۹ھ میں صبح کا تمام وقت بذل کی تالیف میں مستغرق ہو گیا اور شام کو ایک سبق کا آپ درس دیتے تھے جو ہر سال بدل جاتا تھا کہ ایک سال ابوداؤد شریف ہوئی دوسرے سال مسلم شریف اور پھر نسائی شریف۔ اخیر کے دو سال ۴۳-۱۳۴۲ھ میں صرف مؤطا امام محمد طلبہ کے اصرار پر تبرکاً پڑھاتے اور صبح کا تمام وقت بذل میں خرچ ہوتا تھا اور شام کا خطوط کے جوابات اور فتاویٰ میں کہ ڈاک کی آمد بہت بڑھ گئی تھی۔ جوابات خطوط ابتدا میں آپ خود تحریر فرمایا کرتے اور خط ایسا حسین تھا گویا تصویر کھینچ دی چنانچہ ۱۳۲۹ھ تک کے آپ کے بھیجے ہوئے خطوط بندہ کے پاس ایک ہزار سے زیادہ موجود ہیں جو حضرت کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ جلد اور اتنا حسین لکھنا حضرت ہی کا کام تھا۔ بعض خطوط حضرت نے آخر شب میں چراغ کے سامنے لکھے ہیں کہ دن کو فرصت نہیں ملی مگر کیا مجال کہ حسن میں ذرہ برابر فرق آیا ہو۔

آخری ایام کے جواب نگار پھر جب رعشہ بہت بڑھ گیا تو مولوی محمد یحییٰ صاحب مولوی عبداللہ حاجی مقبول احمد اور مولوی زکریا صاحب وغیرہم آپ کے کاتب رہے۔

انتظام مدرسہ انتظام مدرسہ کے متعلق حضرت میں ایک خاص کمال یہ تھا کہ ہر شعبہ کی نگرانی بغیر وقت صرف کئے فرماتے تھے کہ کسی کام میں بھی مشغول ہوں خیال چار طرف رہتا اور کسی شعبہ سے بھی غفلت نہ ہوتی تھی۔ مدرسین کی تعلیم، طلبہ کی حاضری مطالعہ تکرار کتب بینی پابندی نماز و تلاوتِ قرآن اور نیک چلنی و وضعداری کا جدا دھیان تھا اور دفتر کے تمامی رجسٹروں کی وقت پر خانہ پری اور حساب کتاب کی صحت و صفائی کا جدا خیال تھا۔ کتب خانہ کی محافظت اور صفائی و ترتیب پر علیحدہ نظر تھی اور مطبخ کی اجناس کے محفوظ اور وزن میں ہر وقت صحیح رہنے پر علیحدہ نگاہ تھی۔ ہر شعبہ کے ملازمین کا صحیح وقت پر آنا حضرت کی ادنیٰ توجہ اور ہیبتِ خداداد کی بدولت اتنا قابو میں آیا ہوا تھا کہ چند منٹ کی غیر حاضری کے چھپا لینے پر کوئی قادر نہ تھا۔

علمی مشغلہ علمی مشغلہ آپ کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اہلِ نظر اس پر تعجب کیا کرتے تھے چہ جائیکہ اس پر فتاویٰ کا اشتغال کہ وہ مستقل مد ہے اور پھر خطوط کے جوابات جس میں علمی اشکالات، طلب مشورہ احتیاج تربیت ذکر و اوراد کے استفسار اظہارِ واقعات خانگی معاملات وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ہوتے تھے جدا مشغلہ تھا جو دماغ کے کامل سکون اور طبیعت کے پورے حضور کو چاہتا تھا۔ اس پر ہر شعبہ کی نگرانی اور طرہ براں ہر جزو کی اصلاح اور ترقی کا فکر و تدبر ایسے امور تھے کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا تھا

بس ایک مشین تھی جو بھاپ کے ذریعہ چل رہی اور اپنے ساتھ جڑے ہوئے ہر آلہ کو اس کام میں لگائے ہوئے تھی جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہے کہ انجن صرف ایک ہے مگر اس میں سے نکلنے والی برقی قوت چکیاں بھی چلا رہی ہے کہ آٹا پیسیں، پریس بھی چلا رہی ہے کہ کاغذ چھاپیں، پنکھے بھی چلا رہی ہے کہ پسینہ سوکھے اور قمقمے بھی روشن کر رہی ہے کہ دنیا جگمگا اٹھے۔ اور رات کی تاریکی میں نصف النہار کا سورج نکل آوے۔
اسی طرح حضرت کا ایک دم تھا کہ درس بھی دیتا تھا تالیف بھی کرتا تھا معاشرت اہل وعیال میں بھی نمونہ سنت بنا ہوا تھا مدرسہ کے ہر شعبہ کی نگرانی اور اس کی ترقی میں فکر وسعی بھی رکھتا تھا۔ مہمانوں کی مدارات اور تمامی کنبہ وبرادری سے شیریں تعلقات نباہتا تھا۔ مخلصین کی دلدہی اور ہمعصروں کی مخلصانہ محبت میں دور دور کے سفر اور متواتر ومسلسل ومختلف اسفار میں حسب موقع دن اور ہفتے اور مہینے خرچ کرتا تھا۔

طالبین کی اصلاح وتربیت

طالبین میں ہر شخص کی طاقت وقابلیت کے موافق ان کو زبانی اور بذریعہ مراسلت اصلاح حال کی تعلیم بھی دیتا تھا توجہ وتصرف ہمت سے ان کی تربیت بھی فرماتا تھا اور با ایں ہمہ اپنے مولیٰ کے ساتھ قلبی وجسدی تعلقات کے تمامی وہ حقوق ادا کرتا تھا جو زہاد وعباد کسی پہاڑ کی تلہٹی میں بیٹھ کر ادا کیا کرتے ہیں۔ اس دماغی اور بدنی مشاغل میں مشغول ہو کر کوئی برسوں کا حاضر باش بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نماز کی تکبیر تحریمہ حضرتؒ سے چھوٹ گئی یا فلاں شب تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھلی۔ حضرت کے مشاغلِ روزمرہ کا عشر بھی کسی کے سر رکھدیا جائے تو بڑا بہادر وباہمت کہلائے گا۔ اگر چند ہفتے بھی یکساں حال پر تیقظ وچستی میں گذار دے چہ جائے کہ عمر کا بڑا حصہ اور وہ بھی اخیر جس میں ساری جسمانی قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اس چستی وپابندی میں گذرا کہ جو دن آیا وہ ایک جدید اشتغال کا اضافہ ساتھ لایا کہ مدرسہ بھی ترقی پذیر ہو کر روزانہ مزید توجہ کی احتیاج بڑھاتا رہا اور اصلاح وتربیتِ روحانی کے سلسلہ میں روزانہ ترقی ہو کر کماً وکیفاً[1] مزید اشتغال کی ضرورت بڑھتی رہی۔

مدینہ طیبہ سے انتظامی امور کے متعلق ہدایات

باوجودیکہ آپ مدینہ کی زمین میں دفن ہونے کی ہوس میں ہندوستان چھوڑ چکے اور سمندر پار جہاں سے خط بھی پچیس[25] دن میں پہنچے یکسو ہو کر بیٹھ چکے تھے، مدرسہ سے رخصت لے چکے اور اس کو اپنے معتمد خدام کے حوالہ کر کے تمامی ذمہ داریاں سر سے اتار چکے تھے مگر میں مجسم حیرت بن گیا جب آپ کا رجسٹری شدہ والا نامہ میرے نام آیا جس میں مدرسہ کے متعلق بیس سے زیادہ وہ جزئی واقعات لکھے جن کی تحقیق اور اصلاح

[1] یعنی باعتبار مقدار اور کیفیت ہیں۔

ضرورت تھی۔ اور پھر خود ہر معاملہ کا قطعی فیصلہ بھی تحریر فرمایا کہ فلاں واقعہ اگر صحیح ہو تو یہ کرنا چاہئے اور غلط ہو تو یہ ہونا چاہئے۔ اور اس کے بعد قواعد کلیہ کے درجہ میں نگرانی کا سبق پڑھایا مافات کی تلافی اور آئندہ کی احتیاط کا طریق سکھلایا اور ان علامات مخفیہ پر آگاہ کیا جو اس وقت نہیں مگر آئندہ سوئی کا پھاوڑا بنتی نظر آتی ہیں۔ غرض جن امور سے ہم حاضرین کی آنکھیں اور کان بے خبر اور قلوب مغفل ودماغ معطل تھے آپ نے یثرب کی زمین میں بیٹھے ہوئے ان پر روشنی ڈالی اور ایسی ڈالی کہ ان سے نفع اٹھانے والا ایک چلتے ہوئے مفید عام کارخانہ کی تمام ذمہ داریوں کو بآسانی انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ چاہے۔

دور اندیشی و بصیرت یہ آپ کا خداداد تیقظ اور عطاء الٰہی بصیرت تھی کہ آپ دور بیٹھے وہ دیکھتے اور سمجھتے تھے جو پاس بیٹھے ہوئے کو نظر نہیں آتا تھا۔ عام انتظام اگرچہ برائے نام مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کے حوالہ تھا مگر آپ خفیہ اور ظاہر دونوں طرح خود نگرانی فرماتے بلکہ ناظم اور نظام پر بھی نظر رکھتے تھے کہ آئندہ کام ان کے حوالہ کرنا اور ان کو وہ انتظامی سبق پڑھانا تھا جو آئندہ نگران کا محتاج نہ رکھے۔ احباب ومتوسلین میں کوئی تجارت پیشہ یا حساب دان مدرسہ میں آتا تو آپ ان کو دفتر کے رجسٹروں پر نظر ڈالنے آمد و خرچ جانچنے روزنامچہ اور بہی کھاتہ بغور دیکھنے کا حکم فرماتے اور مشورہ لیا کرتے کہ موجودہ طریق میں جو نقص ہو وہ بتائیں کہ اصلاح کی جائے۔ پھر اچھے اچھے تاجر اور محاسب کوئی مشورہ دیتے تو حیران ہو جایا کرتے تھے جبکہ حضرت کو دیکھتے کہ ادنیٰ تفصیل سے حضرت نے اس کو سمجھ لیا اور پھر اس کے حسن و قبح کی موجہ بحث اور کرید شروع کر دی اس کے بعد اس کا مفید ہونا محقق ہوا تو حضرت نے فوراً تسلیم کر لیا اور مہتمم صاحب سے فرمایا کہ رجسٹر کا اندراج ان کی تجویز کے موافق ان سے سمجھ کر کر لیجئے اور اگر مفید نہ پایا تو ہنس کر جواب دیا کہ مولویوں کے لئے موجودہ طریق کافی ہے اور فضول طوالت میں پڑ کر زائد کاغذ اور فاضل کہاں سے لائیں اب تو اسی طرح رہنے دو۔

مدرسہ کے تمامی نظام کا خلاصہ یہ تھا کہ عطا کنندگان کا عطا کردہ چندہ اپنے محل پر صرف ہو اور علم دین کی تکمیل کرنے والے عالم باعمل بن کر مدرسہ سے جائیں کہ اطراف دنیا میں منتشر ہو کر اس نور کو پھیلائیں جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رحمٰن ورحیم سے لیکر مکہ میں تشریف لائے تھے۔ چنانچہ آپ کی اکتیس سالہ مدت صدارت ونظامت میں قریب چار سو کے وہ علما تیار ہوئے جو ہدایت یاب نہیں بلکہ دوسروں کو ہادی بنانے کے لئے کافی ثابت ہوئے۔ اور بحمداللہ ان کا اکثر حصہ اب بھی درس وتدریس میں مشغول اور علما تیار کرنے میں لگا ہوا ہے جن میں چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:-

---

[1] مع ذجہ سمیت۔

نامور تلامذہ

مدرسہ کے موجودہ تمام مدرسین یعنی مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم، مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث، مولانا عبد الرحمٰن صاحب صدر المدرسین، مولوی اسعد اللہ صاحب رامپوری، مولوی محمد زکریا صاحب قدوسی، مولوی منظور احمد صاحب سہارنپوری، مولوی جمیل احمد صاحب تھانوی، مولوی مسعود علی خان صاحب راجوپوری، مفتی ضیا احمد صاحب گنگوہی، قاری عبد العزیز صاحب اور قاری سعید احمد صاحب اجراڑوی وغیرہم مدرسین مظاہر علوم۔ مولوی عبد الکریم صاحب مدنی نواسہ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مہاجر اور مولوی عبد الحق صاحب مدنی نقشبندی مدرسان مدرسۃ الایتام مدینہ منورہ مولوی علیم اللہ صاحب مدرس کنز العلوم ٹانڈہ مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی مدرس فتحپوری مولوی محمد مبین صاحب دیوبندی مدرس مدرسہ اسلامیہ انبالہ چھاؤنی مولوی عبد الرحمٰن صاحب اورنگ آبادی مدرس مدرسہ وسطانیہ (دکن) مولوی سید میر جہان شاہ صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ عدن کیمپ، مولوی شمس الحق صاحب مدرس موضع اجراڑہ، مولوی محمد حامد صاحب مدرس کالج پشاور، مولوی بدر عالم صاحب مدرس مدرسہ ڈابھیل ضلع سورت، مولوی محمد عادل صاحب گنگوہی مترجم (حیدرآباد دکن) مولوی عتیق احمد صاحب دیوبندی مولوی شبیر علی صاحب برادر زادہ حضرت مولانا تھانوی، مولوی حافظ عبد العزیز صاحب نواسہ حضرت مولانا رائپوری، مولوی شفیق احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولوی حکیم محمد ایوب صاحب سہارنپوری مولوی لطیف الرحمٰن صاحب کاندھلوی مولوی محمد طیب صاحب رامپوری مولوی محمد الدین صاحب کشمیری، مولوی غلام الرحمٰن صاحب تبتی، مولوی عبد الرحیم صاحب غزنوی، مولوی غلام حیدر صاحب بخاری، مولوی روشن دین صاحب بہاولپوری اور مولوی محمد عرفان صاحب ہزاروی وغیرہم اطال اللہ بقاءہم[1]

[1] مدرسہ دینیات بہاولپور میں تین سال زیر تعلیم رہنے کے بعد احقر حضرت کی اجازت سے شوال ۱۳۳۸ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں دوبارہ داخل ہوا۔ ۱۳۴۲ھ میں جب تعلیم سے فارغ ہو گیا تو کارکنان مدرسہ نے بیک وقت میرا اور مولوی عبد الشکور کامل پوری کا مدرسی پر تقرر فرما دیا۔ پانچ سال تک ادب نحو منطق فلسفہ اور اصول فقہ کی تدریس میں مشغول رہا۔ ۱۳۴۶ھ میں جب حضرت رحمہ کی وفات کی خبر آئی تو حضرت حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ کے حکم سے دار الطلبہ کی مسجد میں اساتذہ و طلبہ کا اجتماع ہوا اس غمناک موقع پر ناظم صاحب نے اس ناچیز کو تقریر کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں حضرت کے سانحۂ ارتحال کا اعلان کیا اور حضرت رحمہ کی مغفرت و ترقی درجات کے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ دعا کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ رمضان ۱۳۴۸ھ میں بعض عزیزوں کی ترغیب پر میں حیدرآباد دکن چلا گیا اور وہیں کا ہو رہا ۱۹۵۰ء سے کراچی میں مقیم ہوں۔ جب حضرت ۱۳۴۴ھ میں حج کے لئے تشریف لیجا رہے تھے تو مجھے ۱۵ شوال ۱۳۴۳ھ کو سند عطا ہوئی جس پر حضرت کے دستخط اور مہر ثبت ہے۔ شرف تلمذ و بیعت کے علاوہ مجھے حضرت سے یہ نسبی تعلق بھی ہے کہ حضرت کی ہمشیرہ محمود النساء میری حقیقی دادی تھیں ؎

احب الصالحین ولست منہم - لعل اللہ یرزقنی صلاحا۔ اخلاق احمد انصاری عفی عنہ ۱۵ رجب ۱۳۹۸ھ

خلاصہ یہ ہے کہ ہر چہار طرف پورب پچھم اُتر دکن تمامی اکنافِ ہند کے بڑے شہروں میں مدرسہ کا فیض بواسطہ وبلاواسطہ پہنچا ہوا ہے کہ ہزارہ، پشاور، کشمیر، دریاخاں، غزنی، کابل، سیالکوٹ، جموں، راولپنڈی، ملتان، گوجرانوالہ، بنوں، گجرات، جہلم، امرتسر، فیروزپور، جالندھر، کوہاٹ، اٹک، مظفرگڈھ، ڈیرہ غازیخاں، بہاولپور، جیندھ، پٹیالہ، دہلی، میرٹھ، علیگڈھ، مرادآباد، لکھیم پور، فیض آباد، اعظم گڈھ، سیتاپور، مونگیر، آرہ، بردوان، چاٹگام، نواکھالی، باریسال، فریدپور، کمرلا، پورنیہ، میمن سنگھ، مالدہ، سلہٹ، ڈھاکہ، سندھ اور دکن میں کوئی بڑا ضلع ایسا نہیں جہاں مدرسہ کے فیض کی نہر جاری نہ ہو اور اس کی تفصیل مدرسہ کی روداد سے معلوم ہوسکتی ہے کہ سنہ ۱۳۱۴ھ میں چار طلبہ کو سند فراغ دی گئی اور سنہ ۱۳۱۵ھ میں پانچ کو سنہ ۱۳۱۶ھ میں سات کو سنہ ۱۳۱۷ھ میں سات۔ سنہ ۱۳۱۸ھ میں چھ۔ سنہ ۱۳۱۹ھ سات۔ سنہ ۲۰ھ میں ۱۰۔ سنہ ۲۱ھ میں ۵۔ سنہ ۲۲ھ میں ۹ سنہ ۲۳ھ میں ۱۰۔ سنہ ۱۳۲۴ھ میں ۹۔ سنہ ۲۵ھ میں ۹۔ سنہ ۲۶ھ میں ۱۶۔ سنہ ۲۷ھ میں ۸۔ سنہ ۲۸ھ میں ۱۰۔ سنہ ۲۹ھ میں ۱۶۔ سنہ ۳۰ھ میں ۱۳۔ سنہ ۳۱ھ میں ۱۶۔ سنہ ۳۲ھ میں ۷۔ سنہ ۳۳ھ میں ۹۔ سنہ ۳۴ھ میں ۱۴۔ سنہ ۳۵ھ میں ۷۔ سنہ ۳۶ھ میں ۱۹۔ سنہ ۳۷ھ میں دس۔ سنہ ۳۸ھ میں ۱۱۔ سنہ ۳۹ھ میں ۲۴۔ سنہ ۴۰ھ میں ۱۸۔ سنہ ۴۱ھ ۱۴۔ سنہ ۴۲ھ میں ۲۵۔ سنہ ۴۳ھ میں ۳۴۔ اور سنہ ۴۴ھ میں ۳۰ کو سند عطا کی گئی۔

حضرت رائپوریؒ بھی حضرتؒ کے شاگرد تھے اس لحاظ سے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہ نے بھی حضرت سے ابتداء میں کچھ پڑھا ہے حضرت ممدوح کو بھی تلامذہ میں شامل کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ممدوح باوجودیکہ حضرت کے ہمعصر ہمعمر پیر بھائی اور ایک شیخ کے مجاز تھے اور دونوں حضرات میں وہ محبت و یگانگت تھی جس کی نظیر نہیں مل سکتی کہ حضرت سفر حجاز کو تشریف لے جاتے تو اپنے تمام متوسلین کو یہ وصیت فرما کر جاتے تھے کہ رائپور کی حاضری دیتے رہیں اور جس امر میں مشورہ یا استفسار کی حاجت پیش آوے وہ مولانا رائپوری سے پوچھیں۔ مگر بااین ہمہ حضرت رائپوری حضرتؒ کا وہی ادب کرتے تھے جو شاگرد کو استاد کا کرنا چاہیئے اور حضرت کی شاگردی پر فخر کیا کرتے اور جب اس کا اظہار فرماتے تو بے حد مسرت اور ناز کے ساتھ اظہار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت رائپوری مدرسہ کے سرپرست تھے اور جب حضرتؒ کی مدرسہ سے علیحدگی کا قصہ ہوا ہے تو مخلصانہ محبت کا جو اثر حضرت رائپوری پر ہوا اس کی مثال نہیں پیش ہوسکتی کہ رات دن کا کوئی گھنٹہ اس فکر سے خالی نہ جاتا تھا۔ رات کو نیند نہ آتی تھی، دن کو آرام نہ ملتا تھا۔ ہر تیسرے چوتھے دن اپنے سگھڑ میں سوار ہوکر سہارنپور آتے حضرت کی سنتے اپنی کہتے اور مجیب الدعوات کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہوئے رائپور واپس چلے جاتے تھے حتی کہ وہ خوشگوار نتیجہ نکلا جس کی کسی کو خواب بھی نظر نہ آئی تھی کہ رجسٹری شدہ سرکاری تجویز کے تین سرپرستوں میں آپ کا نام بھی شامل ہوا۔ اور

باوجودیکہ آپ حد سے زیادہ یکسوئی پسند اور گوشہ نشینی کے عاشق و شیدا تھے مگر اس سرپرستی پر بہ ایں وجہ کہ حضرت استاذ مدرسی پر بحال ہی نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہو کر ترقیاتِ مدرسہ میں سعی کے قابل ہوگئے اور علومِ دینیہ کی اشاعت کا دروازہ کھل گیا کہ اللہ کا نام اور اس کے احکام اطرافِ دنیا میں پھیل سکیں گے آپ نے سرپرستی کا بار سر پر رکھنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کیا بلکہ غیبی کارنامہ کو دیکھ کر آپ کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی اور آپ مولانا تھانوی کو بلانے کے لئے کہ دیوبند میں جمع ہو کر تینوں صاحب باتفاق رائے اس کو منظور فرمادیں خود تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ اس کے بعد عمر بھر اس بارِ عظیم کا وہ حق ادا کیا جس کیلئے بس آپ ہی شایاں تھے اور اس زمانے میں بھی جبکہ آپ کو کروٹ لینا مشکل اور بات کرنا دشوار تھا اس خدمت سے مستعفی ہونا گوارا نہ فرمایا۔

۱۳۲۲ھ میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے وصال فرمایا تو آپ کی جگہ آپ کے لختِ جگر اور دنیا کے نورِ نظر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرسہ کے سرپرست قرار پائے اور پھر حضرت مولانا محمد احمد صاحب رامپوری اور مولانا سر رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بھاولپور کا سرپرستوں میں اضافہ ہوا اور آخر میں سب حضرات سرپرستان کے اصرار و اتفاق رائے پر خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرپرستوں میں شامل ہوا۔ اس طرح پر مدرسہ مظاہرِ علوم دنیا کے چیدہ و برگزیدہ افراد کی ہمت و سعی اور توجہات کے گہوارہ میں تربیت پاتا ہوا اس حالت پر پہنچا کہ دیوبند و سہارنپور اور رائپور کے مقتدا مدرسہ کے نظام کو اپنے خدام کے حوالہ فرما کر عالمِ قدس کا سفر اختیار کر گئے اور مدرسہ اسی شان کمال کے ساتھ ناظرین کی آنکھوں اور اہل دل کے قلوب کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ دیکھنے والا کہتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم[1] کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

حضرت مولانا رائپوری قدس سرہٗ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حضرت ممدوح اس صدی کی وہ مقتدر ہستی تھی جو گذشتہ صدیوں کے بزرگان مشاہیر کا نمونہ بن کر دنیا میں آئی تھی۔ شانِ تفویض[2] کی مجسم تصویر، بحرِ توحید کی غواص[3]، تسلیم و رضا میں غرق اور توکل و اعتماد

[1] سر سے پیر تک جہاں کہیں میں دیکھتا ہوں ناز انداز وں کا دامن کھینچ لیتا ہے کہ بس جگہ یہی ہے۔ [2] ہر بات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرنا۔ [3] غوطہ لگانے والے۔

میں فنا. شریعت میں آپ عالم متبحر تھے مگر طریقت کا آپ پر غلبہ تھا کہ دیکھنے والا آپ کو مولوی و عالم نہ سمجھتا تھا۔ یکسوئی اور وحدت نشینی[1] آپ کی طبیعتِ ثانیہ تھی مگر حق تعالیٰ کو آپ کے نورِ فیضان سے عالم کو منور کرنا تھا اس لئے جس گمنامی و تنہائی کے آپ متمنی و شیدا تھے اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ مخلوق کو قدرتی طور پر آپ کی طرف کشش ہوتی اور آپ جتنا دنیا سے بھاگتے گھبراتے اور دامن چھڑاتے تھے اسی قدر دنیا آپ کا تعاقب کرتی لپکتی اور دامن پکڑتی تھی۔ آپ کے حالاتِ عجیبہ بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ محبوبیت آپ پر سایہ افگن تھی اور اس لئے مخلوق کو آپ کے وجود باجود سے ظاہری و باطنی ہر قسم کا ہر وقت نفع پہنچتا رہتا تھا۔ آپ کا قیام قصبہ رائپور ضلع سہارنپور میں بستی سے باہر ایک باغ میں تھا جس کے نیچے نہر جاری تھی اور دنیا ہی میں حق تعالیٰ نے آپ کو جنّت[2] تجری من تحتہا الانھار کا مصداق بنا رکھا تھا۔ آپ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اجل خلفا میں تھے اور غلبۂ کتمان[3] و اخلاص کی وجہ سے نقشبندیت کا آپ پر غلبہ تھا کہ باغ کے پتّہ پتّہ اور نہر کے قطرہ قطرہ سے ذکر اللہ سنائی دیتا اور بے حس و بے مس شخص بھی حاضرِ خدمت ہو کر اس اندرونی لذت کو محسوس کرتا تھا جس میں آپ کا اور آپ کے متوسلین کا ہر لمحہ گذرا کرتا تھا ؎

نقشبندیہ[4] عجب قافلہ سالارانند ۔ کہ برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

قرآن و سنت سے عشق آپ سنتِ نبویہ کے عاشق تھے اور تعلیم قرآن مجید سے بالخصوص مانوس کہ تمامی علومِ دینیہ بلکہ دین کی اصل یہی ہے اور عام طور پر اس کی طرف سے توجہات کے قلیل ہو جانے سے آپ کی توجہ اس طرف اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جگہ جگہ مکاتبِ قرآنیہ جاری کرنے کے آپ حریص تھے اور بچوں کو صحیح و صاف سادہ لہجہ میں قرآن مجید پڑھتا ہوا دیکھ کر آپ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔

مثالی مدرسۂ قرآن خود آپ کے باغ میں بھی ایک مدرسہ تھا جو توکل کا مجسمہ تھا کہ نہ کوئی جائداد اس کے لئے وقف تھی نہ کہیں سے چندہ مقرر تھا بلکہ حاضر ہونے والے مخلصین میں کوئی اہلِ مال یا خوش حال حاضر ہوتے تو ان کے سامنے مدرسہ کا تذکرہ کرنا بھی آپ کو گراں گذرتا تھا کہ یہ تذکرہ بھی ایک قسم کا سوال ہے اور مخلوق پر اپنی حاجت کا پیش کرنا اس ہی قسم کی ان سے مدد چاہنا آپ کی طبعی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ باایں ظاہری بے سروسامانی کے بستی کا یا باہر کا جو بچہ بھی پڑھنے کے خیال سے آتا وہ بشوق و رغبت لیا جاتا اور اس کو اپنا محسن سمجھ کر محبت و شفقت کے ساتھ فوراً داخل کر لیا جاتا تھا۔ ماشاء اللہ اس مکتب میں ستر سے زیادہ طلبہ تھے جن کے کھانے اور کپڑے کی تمامی ضروریات خزانۂ غیب سے

---

[1] اکیلا بیٹھنا۔ [2] وہ باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ قیامت میں مومنین کیلئے فرمایا۔ [3] خود کو چھپانا۔
[4] نقشبندی بزرگ بھی عجیب راہبرِ قافلہ ہیں کہ چھپے راستے سے ہی قافلہ کو حرم شریف پہنچا دیتے ہیں۔

پوری ہوا کرتی تھیں۔ ان طلبہ میں اندھے اور معذور بھی ہوتے تھے جن کی کفالت والدین اور کنبہ کو بھی بار معلوم ہوتی تھی اور اس لئے وہ مدرسہ میں آجاتے تھے کہ یہاں ماں باپ سے زیادہ شفقت کرنے والے ان کو ملتے تھے۔ نیز یہاں ایسے چھوٹے نوعمر بچے بھی تھے جن کو خود منھ دھونا بھی اچھی طرح نہیں آتا تھا اور ان کے ماں باپ ناداری کی وجہ سے ان کو مکتب میں پہنچا دیتے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ مدرسہ میں پہنچ جانے کے بعد ان بچوں کا ایسا دل لگتا تھا کہ پھر نکالے بھی نہ نکلتے تھے۔ ہر خورد سال اور نابینا معذور بچہ کسی سمجھدار بڑے طالب علم کی نگرانی میں دیدیا جاتا تھا کہ وہی اس کی بول و براز اور خورد و نوش کی تمام ضروریات کا کفیل بنتا، ہاتھ پکڑ کر جنگل لے جاتا، واپس لاکر حمام و سقایہ بتاتا، لوٹے میں پانی لے کر منھ دھو اور آہستہ آہستہ ہر ستھرائی و صفائی کی پیار کے ساتھ اس کو تعلیم دیتا رہتا تھا۔ تمام طلبہ عموماً گاؤں کے باشندے تھے جن کی گذران سادہ اور جفاکشی طبعی عادت تھی۔ اس لئے حضرت کو اس کا لحاظ بھی زیادہ تھا کہ طلبہ کاہل نہ بنیں۔ لہٰذا ان کی اور مدرسہ کی تمامی ضروریات کا بار خود انہی پر تھا کہ چند طلبہ کے متعلق روٹی پکانا تھی اور وہ مدرسہ سے چھٹی ملتے ہی سارے مدرسہ کے طلبہ کی روٹیاں پکایا کرتے اور چند طلبہ کے ذمہ پانی لانا تھا کہ وہ وقت آتے ہی گھڑے لے کر نہر پر جاتے اور جس قدر پانی کی بھی مدرسہ تمام طلبہ کو ضرورت ہوتی وہ گھڑے اور مٹکے لبریز کر دیا کرتے تھے۔ مسجد کا سقایہ بھی وہی بھرتے اور جنگل سے خودرو لکڑی کاٹ کر یا چن کر بھی طلبہ ہی لاتے تھے۔ آٹھویں دن اپنے اور ان ناسمجھ بچوں کے جو ان کی تحویل میں ہوتے کپڑے دھوتے اور نہر پر جا کر خود نہاتے اور ان کو مل مل کر نہلایا کرتے تھے۔

غرض ضروریاتِ بشریہ کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو اِن سے نہ لیا جاتا ہو، اور اس طرح پر نہ اُن پر کاہلی آنے پاتی تھی اور نہ ان میں وہ مادہ پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے آئندہ اپنی ضروریات پورا کرنے میں ذلت کو عار آوے یا کسی کام کو خلافِ شان سمجھیں۔ خس پوش مکان جس کی دیواریں بھی پھونس اور بانس کی تھیں ان کا مدرسہ تھا اور جنگل کی زمین جو نہ کبھی میلی ہو کہ دُھلنے کی ضرورت پڑے نہ پھٹے اور پرانی ہو کہ بدلنے کی حاجت پیش آوے ان کا فرش تھا جس پر دینی و دنیوی ضروریات سے فارغ ہو کر آرام سے لیٹتے اور ہنسی خوشی سو کر ہنستے خوش ہوتے اٹھ بیٹھا کرتے تھے۔

صبح صادق سے ڈھائی گھنٹہ قبل آخر شب میں سب کو جگا دیا جاتا اور وہی وقت ان بچوں کے اپنا سبق یاد کرنے کا ہوتا تھا کہ چار چار پانچ پانچ طلبہ دَور بنا کر ایک چراغ بیچ میں رکھ کر تھوڑے تھوڑے فصل پر بیٹھ جاتے اور دن میں پڑھا ہوا سبق یاد کر کے اُٹھا کرتے تھے۔ اس طرح بچپن ہی سے ان کو آخر شب میں اُٹھنے کی عادت ہو جاتی اور وہ برکات جو اس مبارک وقت میں قدرت نے رکھی ہیں بآسانی

ان کو حاصل ہو جاتی تھیں۔ نو وارد طلبہ شروع شروع میں کسمساتے مگر ساٹھ ستر طلبہ کا با آواز بلند پڑھنا ان کو میٹھی نیند سونے نہ دیتا اور آخر چار دن کے بعد وہ خود اپنے زمرہ میں شامل ہو جاتے تھے کہ نہ نیند رہتی تھی نہ خمار۔ یہ سنسان گھڑیوں کے چند منٹ جس میں معدہ بھی صاف اور ہلکا ہوتا تھا اور یکسوئی بھی بدرجہ کمال تھی وہ دن کے چند گھنٹوں سے بڑھ کر حفظ میں مدد دیتے اور صبح کو سبق ایسا فر فر سناتے تھے کہ تمام دن رٹنے والا بھی ایسا نہیں سنا سکتا۔

صبغۃ اللّٰہی مکتب مکتب کیا تھا نائب رسول جامع شریعت وطریقت شیخ کی خانقاہ تھی جس میں کچی لکڑیوں کو[1] بآسانی سیدھا کیا جاتا اور ان اخلاق حسنہ کو عادت و خو بنا کر دلوں میں رچایا جاتا تھا جو بڑے ہو کر برسوں کے مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ایثار و شفقت علی الخلق کا ان بچوں میں ایک خاص مضمون ہوتا تھا اور قناعت و صبر کا ایک مخصوص رنگ۔ ایک مرتبہ صبح سویرے بندہ خس پوش مسجد میں چلا گیا جو خس پوش مدرسہ کے متصل تھی تو میں نے ایک بچہ کے رونے کی آواز سنی جس کی عمر سات آٹھ برس کی تھی کہ سبکیاں لے رہا اور اس کا نگران طالب علم بڑے پیار کے لہجہ میں اسی اپنی دیہاتی سادہ زبان میں اس سے پوچھ رہا تھا کیوں رووے ہے؟ کیا ماں یاد آ رہی ہے؟ یا پیٹ میں درد ہے؟ میں تو تیرے پاس موجود ہوں اور تیری ہر خدمت کو حاضر ہوں کچھ تو بتا کیوں پریشان ہے؟ تاکہ اس کا انتظام کروں دیر ہو گئی کہ نہ بچہ کی سبکیاں تھمیں اور نہ طالب علم پوچھنے اور بہلانے پھسلانے سے اکتایا۔ آخر جماعت کا وقت آیا تو اس کو گود میں اٹھا کر باہر لایا اور خدا جانے کیا تدبیر کی کہ اس کو منالیا اور وضو کرا کے اس کو سنتیں پڑھانے میں لگا دیا۔ سلام پھیر کر دیکھتا ہوں تو وہ پیچھے بچوں کی صف میں بیٹھا دعا مانگ رہا ہے۔

مسجد نبوی کا نقشہ صرف یہی ایک جگہ تھی جہاں مسجد نبوی کا نقشہ نظر آتا تھا اور بارش میں ٹپک کر سجدہ گذار پیشانی کو نمزمین سے مانوس کیا کرتی تھی۔ اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جو لطف پھونس کے سایہ میں اس ستھرے ریتیلے فرش پر نماز پڑھنے میں نصیب ہوا وہ آج تک کبھی اور کہیں[2] نصیب نہیں ہوا۔ قرآن شریف کے ساتھ اردو کی دینیات اور نماز روزہ کے مسائل ضروریہ کے رسائل بچوں کو پڑھائے جاتے تختی لکھوائی جاتی اور اس قابل بنا دیا جاتا تھا کہ مدرسہ سے جا کر اپنی کھیتی کے کام میں لگیں مگر جنگلی بن کر نہیں بلکہ آدمی اور ولی بن کر لگیں کہ دین کا کوئی پہلو کمزور نہ ہو اور ان کی سادہ راحت کی گذران میں نقصان نہ آوے۔

---

[1] بچوں کو درست کیا جاتا۔ [2] مسجدوں کی اصل زینت تو یہی خلوص ہے نہ کہ پختگی اور نقش و نگار بلکہ یہ تو قرب قیامت کی علامت فرمایا گیا ہے۔

اصلیت اور تصنع میں بڑا فرق ہے

اصل طبیعت میں اور تصنع و بناوٹ میں بہت فرق ہے کہ اول الذکر کا انجام برکت و کامیابی ہے اور ثانی الذکر کا ثمرہ ذلت و ناکامی۔ پس ایک شخص کسی بڑے رئیس کا ملازم ہو اور رئیس نے وعدہ کر لیا ہو کہ تمہاری تنخواہ تازیست بند نہ کی جائے گی اس کے دل کو ٹٹولو کہ اپنی معاش کی طرف سے اس کو کیا بے فکری ہوگی اور وقت پر تنخواہ مل جانے کا کتنا بھروسہ ہوگا اور اس کے مقابل اس کا حال دیکھو جو سندیں لئے ہوئے طلب ملازمت میں جگہ جگہ درخواست پیش کرتا پھرتا اور ہر جگہ سے یہ جواب سنتا ہے کہ اس وقت کوئی جگہ خالی نہیں ہے ہاں آئندہ خیال رکھا جائے گا۔ اس شخص پر جو پریشانی مسلط ہوگی اس کا یہ اثر ہوگا کہ اب کسی محکمہ میں درخواست دینے پر بھی اسی جواب کے واہمہ و خوف میں اس کو سکون حاصل نہ ہوگا اور نہ توقع ہی کی راحت ملے گی کہ یہاں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پس یہ شخص لاکھ دعوے کرے کہ مجھے معاش کی طرف سے اطمینان ہے اور میں صرف سبب کے درجہ میں جگہ جگہ درخواستیں دے رہا ہوں مگر اس کا یہ دعویٰ غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ پس حق تعالیٰ کے وعدۂ رزق رسانی پر کسی قلب کا سچا اعتماد درحقیقت ایک بڑی نعمت ہے اور اس پر بلا شبہ ہر ضرورت کے انجام دینے کا وہ شہنشاہ کفیل ہے جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں مگر اس اعتماد کا محض دعویٰ کرنا یا اعتماد والوں کی سی صورت بنانا کہ دل میں اعتماد کا نام بھی نہیں کچھ کام نہیں دے سکتا اور نہ اس وعدہ کا مستحق بناتا ہے جو ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ[1] کے ذریعہ تمامی بندوں کے لئے عام ہے۔ پس درحقیقت ضعف ہمارا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر توکل کی صورت بناتے اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے ہیں ورنہ جو توکل کی حقیقت ہے اگر قلب کو میسر آجائے تو ہم سے زیادہ کوئی غنی و بے نیاز نہیں۔ ضعف و ناکامی کا نام توکل رکھنا ہماری نادانی ہے اور اس لئے اس کا نتیجہ ہمیشہ ذلت و پشیمانی ہے۔

توکل کی نعمت

حضرتؒ کو حق تعالیٰ نے توکل کی نعمت نصیب فرمائی تھی اور اس لئے مدرسہ کا یہ بڑا کارخانہ نہ کسی محصل کا حاجتمند تھا نہ سفیر و مبلغ کا۔ بمقتضائے "ہر کسے را بہر کارے ساختند"[2] آپ کا ایک رنگ خاص تھا جس میں آپ مستغرق تھے اور اس لئے بلا اسباب ظاہری آپ کے سارے کام منجانب اللہ انجام پایا کرتے تھے کیونکہ آپ کا قدم ابتلا و امتحان کے وقت ڈگمگاتا نہ تھا۔

ایک مرتبہ ملا عبدالعزیز صاحب نے کہ آپ کے قدیم مخلص خادم اور مدرسہ کے نگران اعظم تھے آکر اطلاع دی کہ آٹا بھی ختم ہو چکا اور لکڑیاں بھی تمام ہو گئیں۔ کل کے لئے نہ جنس کا دانہ ہے نہ پاس کوئی پیسہ۔ آپ سن کر خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا مگر خود فرماتے تھے دل میں اپنے مالک سے یہ عرض کیا

---

[1] اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہیں۔ [2] ہر ایک شخص کو ایک ایک کام کے واسطے بنایا ہے۔

کہ اے کریم آقا یہ تیری مخلوق جو تیرے کلام کی تلاوت و تعلیم میں مشغول ہے کیا فاقہ کرے گی؟ اس کے بعد خود ہی یہ مضمون دل پر جما کہ تو جان تیرا کام، اگر فاقہ ہی کرانا منظور ہے تو صبر کی توفیق بخشے کہ یہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔" رات ہوئی اور موجودہ غلہ پک پکا کر مٹکے خالی ہو گئے مگر آپ کی طبیعت پر نہ ہراس و پریشانی آئی نہ کسی سے قرض مانگنے کا وسوسہ ہوا۔

صبح نہ ہوئی تھی کہ طالب علم جو نہانے کے لئے ندی پر گئے تھے دوڑے ہوئے آئے اور کہا حضرت جی ندی میں تو لکڑیاں ہی چلی آرہی ہیں خوشی کے مارے آپ کا چہرہ دمکنے لگا اور آپ نے فرمایا کہ کریم رزاق نے تمہاری روزی کا سامان بھیجا ہے جاؤ جتنی سمیٹی جائیں سمیٹ لاؤ۔ چنانچہ سارے طالب علم دوڑ پڑے اور روک لگا کر لکڑیاں لادنا شروع کر دیں کہ دو گھنٹہ میں اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا جس سے زیادہ کی گنجایش بھی نہیں تھی۔ لکڑیوں کی آمد بھی بند ہو گئی اور اب آٹے کی ضرورت رہ گئی۔

دو گھنٹہ بعد ڈاکیہ آیا اور ڈیڑھ سو روپیہ کا منی آرڈر پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ مدرسۃ القرآن کے لئے بھیجتا ہوں اس کے خرچ میں لائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بھیجنے والے کا نام پوچھا تو ایسا شخص جس کو میں جانتا بھی نہ تھا۔ میں نے بار بار کہا کہ کسی اور کا ہوگا کیونکہ بھیجنے والا میرے ذہن میں نہیں آیا مگر ڈاکیہ نے کہا کہ پتہ آپ کا نام آپ کا مرسل کو آپ پہچانیں یا نہ پہچانیں مگر اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ آپ کا ہے پس آپ نے وصول فرمایا اور یہ کہہ کر ملا عبد العزیز کے حوالہ کیا لو ملا جی اللہ نے اپنے مہمانوں کے آٹے لکڑی کا سامان کر دیا۔ روٹی کا وقت آگیا ہے اس لئے جلدی آٹا منگا لو کہ لکڑی موجود ہی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر نمک سے سب کھالیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لکڑیاں پورے چھ مہینے کام آئیں اور روپیہ کا تو آج تک پتہ نہ چلا کہ کس نے بھیجا تھا۔ الحمد للہ اس کے بعد مدرسہ کو کبھی ایسی صورت پیش نہیں آئی اور نہ میں نے جانا کہ مولیٰ کریم کہاں سے بھیجتے ہیں اور کس سے دلواتے ہیں ؎

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما[۲] فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما[۳]

صبر و شکر، قناعت، اخلاص، علم و یقین، تفویض[۴] و توکل، رضا و تسلیم کی آپ مجسم تصویر تھے
[۵] ہرچہ از دوست می رسد نیکوست آپ کی خوشی، مرض اور تکلیف کا کتمان[۶] آپ میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ

[۱] برسات میں پانی برس کر بہہ کر نالوں ندیوں میں جاتا اور پڑی گری لکڑیوں، خس و خاشاک کو بہا لیجاتا ہے یہ لکڑیاں عام ہوتی ہیں جو لے لے اس کی ہیں اس لئے لی گئیں۔
[۲] ہمارے کام بنانے والا تو ہمارے کاموں کے بنانے میں ہی ہے اب ہمارے کاموں میں ہمارا سوچ بچار کرنا یہ خود ہماری تکلیف ہے۔ [۳] سب کچھ خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دینا۔ [۴] محبوب کی طرف سے جو کچھ بھی پہنچتا ہے بہتر ہی ہے۔
[۵] چھپانا۔

اس کا ظاہر کرنا یا زبان سے نکالنا بھی آپ اپنے اللہ جل جلالہ کی شکایت[1] کرنا سمجھتے اور مخلص سے مخلص حاضر باش کو بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ آپ کو تکلیف ہے۔

صبر وتحمل ایک بار حاضرین نے دیکھا کہ نماز کے لئے مسجد کو جاتے وقت آپ کے پاؤں میں لنگ ہوتی ہے اور پوچھا بھی کہ حضرت کیا کچھ تکلیف ہے مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں[2] الحمد للہ ہر طرح راحت ہے۔ کئی دن متواتر اسی حال پر گذر گئے آخر چھٹے ساتویں دن مسجد کو جاتے ہوئے پاجامہ پیپ اور خون سے بھر گیا اور اس وقت خدام کو پتہ چلا کہ دُنبل[3] تھا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا اور آپ نہ زبان سے ذکر فرماتے تھے نہ چلنے میں اثر محسوس ہونے دیتے تھے کہ بزبانِ حال اظہار نہ ہو جائے۔

ایک بار آپ سخت بیمار ہوئے کہ زیست کی امید نہ تھی حکیم جمیل[4] الدین صاحب معالج تھے ایک دن بندہ بھی حاضر تھا کہ اشاروں سے باتیں فرمائیں، ہر چند حکیم صاحب نے دریافت کیا کہ کیا تکلیف ہے مگر آپ چہرہ کی بشاشت اور ہاتھ کے اشاروں سے صحت و راحت ظاہر فرماتے رہے۔ آخر تین دن اسی حالت پر گذرے اور چوتھے دن معلوم ہوا کہ سارے منھ کے اندر آبلے پڑ گئے تھے جن کو کھول کر دکھانا تو کیا گوارا ہوتا بات کرنے میں منھ کا کھلنا اور آبلوں کا دیکھ جانا بھی آپ کو گوارا نہ ہوا اس لئے اشاروں سے باتیں کیں۔

دلجوئی ومدارات اس کے ساتھ مخلوق کی دلجوئی و مدارات[5] بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا حضرت کو سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ ہے۔ اس لئے دونوں کے جمع ہو جانے کے وقت آپ کو بڑی ضیق پیش آتی کہ جب آپ کا مرض کھل جاتا تو خدام کا اصرار ہوتا تھا دوا استعمال کرنے کا اور آپ طبعی اقتضا سے دوا[6] کا استعمال مکروہ سمجھتے تھے کہ جس مالک نے مرض دیا وہی معالج کافی ہے۔ اور ادھر خدام سے صاف انکار فرما کر اُن کی دل[7] شکنی بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے مفید و مضر دوا یہ سمجھ کر کہ یہ بھی منجانب اللہ ہے آپ پیتے اور دوا کے مؤثر[8] ہونے کا کسی درجہ میں بھی آپ کو واہمہ نہ ہوتا تھا۔

---

[1] یعنی شکایت کی صورت بنا دینا ہے کہ گویا ہم اس کے مستحق نہ تھے ہم پر ظلم و زیادتی ہو رہا ہے مگر مریض کی یہ صورت نہیں ہوتی اس لئے شکایت نہیں شکایت کی صورت ہے بلکہ یہ حکایت ہے کہ نقل کرنا کہ ایسا ہوا ہے بعض بزرگ اس صورت سے بھی بچتے ہیں اور بعض اپنی عاجزی اور خدا کی مدد کی حاجتمندی ظاہر کرنے کے لئے ظاہر بھی کر دیتے ہیں جیسی نیت اور حال ہو وہی مناسب ہوتا ہے — [2] محبوب کی طرف سے ہونے کی وجہ سے جب ذہن یہ حاضر ہو تو تکلیف نہ ہونا کہنا صحیح ہے۔

[3] پھوڑا۔ [4] حکیم اجمل خاں کے استاد دہلی والے۔

[5] دوسروں کی باتوں کو برداشت کر کے بجائے ناگواری کے خوش خلقی کرنا۔

[6] گو علاج کرنا جائز طریقے سے جائز بھی ہے اور کامل درجے کے لوگوں کو کمال توکل میں ترک درست ہے۔

[7] ان کا بھی حق ہے کہ وہ مخدوم کے لئے جائز علاجات کر کے سکون دل حاصل کریں۔

[8] خود بخود اثر کرنے والی۔ بلکہ حق تعالیٰ کے فضل کا ذریعہ قرار دے کر۔

ایک دفعہ ایک نادان طبیب نے مخلصانہ خدمت کا حق ادا کرتے ہوئے آپ کو زہر دیدیا کہ فوراً آپ کو قے ہوگئی اور مرض ترقی کر گیا۔ ڈاکٹری تشخیص سے پتہ چلا کہ چند قے نہ ہوتی تو جانبری محال تھی۔ حضرت سے جس کو ذرا بھی تعلق تھا وہ حکیم صاحب پر آنکھیں نکالتا اور ان کی صورت سے بیزار ہوگیا۔ مگر آپ کو حکیم صاحب کی ندامت اور اپنے خدام کی ان سے یہ وحشت ایک مستقل تکلیف بن گئی کہ وہ بھی کتمان وضبط میں رہی جس کا اثر یہ تھا کہ حکیم صاحب تشریف لاتے تو آپ ان کو سب سے الگ اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے اور کسی کی بھی دوا کا استعمال ہو مگر حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے اور وہ اس کو مناسبِ مرض بتاتے تو آپ استعمال فرماتے ورنہ ان سے ایسی ہی باتیں کرتے جس سے ان کو یقین ہوجاتا کہ حضرت میرے معالجہ کے معتقد اور میری حذاقت ومزاج شناسی کے معترف ہیں۔ اور مخلص خدام سے ایک مرتبہ نرم لہجہ میں اس طرح فرمایا کہ "حکیم صاحب تو میرے محسن ہیں۔ غلطی تو ہر بشر کے ساتھ لگی ہوئی ہے مگر جو کچھ کیا وہ محبت وشفقت ہی کی نیت سے کیا، ان کو کوئی ترچھی نظر سے دیکھتا ہے تو میرے دل پر ایک برچھی لگتی ہے، فاعل مختار[۱] بجز مولیٰ کریم کے کوئی نہیں جو ہوا وہ اس کی مشیت[۲] سے ہوا پھر کسی کو کیا حق ہے کہ آلہ وادزار[۳] کو سرزنش کرے۔" مجھے خوب معلوم تھا کہ حضرت دوا کا استعمال محض مخلوق کی دلداری کے لئے مجاہدہ[۴] سمجھ کر کیا کرتے تھے مگر بایں ہمہ میں نے دیکھا کہ یہ حکیم صاحب آئے تو فوراً حضرت نے اس اہتمام سے بلایا گویا حضرت دیر سے ان کا انتظار کر رہے تھے اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرتے اور یہ سمجھا سمجھا کر حضرت کو جواب دیا کرتے کہ یوں کرنا چاہئے اور اس دوا کا استعمال ہونا چاہئے۔ حضرت اس پر فرحت کا اظہار فرماتے اور ان کا دل باغ باغ ہوجاتا کہ حضرت کو میری تشخیص ومعالجہ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں ہے۔

سفرِ حج میں رفقا کی دلداری

دلداریٔ خلق کا رنگ آپ پر اتنا غالب تھا کہ پیاری سے پیاری چیز اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ آپ سفرِ حج کو چلے اور اٹھاسی[۸۲] بیاسی نفر آپ کے ساتھ ہولئے جن میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کے لوگ تھے۔ اتنا جم غفیر اور ان کی خبرگیری کوئی آسان بات نہ تھی خصوصاً جبکہ آپ کے ساتھ اہلیہ اور بہو اور صاحبزادہ عبدالرشید مرحوم بھی تھے کہ اپنے ہی انتظامات کی سنبھال مشکل تھی مگر اللہ رے ہمت نہ بیوی بچہ کا فکر ہوا نہ اپنی جان کا۔ رفقا میں ہر شخص کی راحت کا خیال مقدم تھا۔ بمبئی پہنچے تو جہاز تیار مگر سب کے ٹکٹ ملیں تو آپ سوار ہوں

[۱] اختیار کے ساتھ مرنے والا۔ [۲] اجازت اور چاہنے سے۔ [۳] جب کرنے والے وہ ہیں تو بندے مثل آلہ وادزار کے ہوئے ان کو سزا دینا ٹھیک نہیں۔ [۴] طبیعت کے خلاف کیونکہ طبیعت پر توکل کامل غالب تھا مگر خادموں کے دل کے سکون کا بھی حق تھا۔

اور وہاں دس بارہ سے زیادہ ٹکٹ ہی باقی نہیں۔ آخر رفقا کو آپ نے روانہ کیا اور خود دوسرے جہاز کے انتظار میں پندرہ دن پڑے رہے۔

بیٹا بیمار ہے مگر رفیقوں کا خاص خیال

مکہ مکرمہ پہنچکر عبدالرشید مرحوم پیچش میں مبتلا اور اتنا بیمار ہوا کہ کروٹ لینا مشکل مگر آپ کو رفقا[1] کے سامنے نہ اپنی تکلیف کا حس نہ بچہ کی تکلیف کا احساس۔ جوں توں اونٹ پر لاد کر حج ہوا اور اب مدینہ منورہ کے لئے قافلہ کی تیاری کا وقت آیا تو ہر شخص کا تقاضا کہ جلدی چلو ہمارے پاس خرچ کم رہا ہے اور اس لئے مکہ میں زیادہ ٹھیر نہیں سکتے۔ عبدالرشید کی یہ حالت کہ اونٹ پر لیٹنا بھی مشکل چہ جائیکہ بارہ دن مسلسل کا کٹھن سفر مگر آپ نے تیاری کردی اور مطوف کو سب کا کرایہ پہنچا دیا کہ اسی قافلے میں ہمارے چلنے کا انتظام کرو۔

اتفاق سے بندہ بھی اپنے حضرت کے ساتھ بعد میں حاضر حرم شریف ہو کر حضرت سے مل لیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر حضرت تشریف لائے اور بندہ ساتھ تھا۔ حضرت نے تیز لہجہ میں مولانا سے فرمایا کہ آپ مکہ میں ہیں جنگل میں نہیں اس لئے اس حالت میں کہ عبدالرشید کسی طرح سفر کے قابل نہیں آپ کیوں عجلت کر رہے ہیں؟ مولانا چونکہ حضرت کا بہت ہی زیادہ[2] احترام فرماتے تھے کہ شاید کوئی مرید اپنے پیر کا بھی اتنا احترام نہ کر سکے اس لئے گھبرا گئے اور عرض کیا کہ حضرت کیا کروں رفقا کو اپنی خاطر[3] تکلیف میں نہیں ڈالا جاتا کہ ان کو عجلت ہے اور خرچ کم ہو چلا وہ میری وجہ سے رُکے تو ان کا مکہ میں بادلِ ناخواستہ وحشت کے ساتھ قیام ان کے لئے موجبِ وبال ہو جائے گا۔ حضرت نے اپنے صاف گوئی کے دوسرے رنگ میں غرق تھے بیساختہ فرمایا نہیں ان کے روکنے کی ضرورت نہیں کہدو جس کا دل چاہے جائے اور میں اس وقت عبدالرشید کی شدتِ علالت کے سبب سفر نہیں کر سکتا، آخر رفقا کی مراعات آپ پر ضروری ہے تو عبدالرشید کی مراعات ان سب سے زیادہ ضروری ہے کہ رفیقِ سفر بھی ہے اور بیٹا ہے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں۔

مولانا گردن جھکا کر چپ ہو رہے اور جب حضرت چلنے لگے تو اشارہ سے مجھے رک جانے کا امر فرمایا اور پھر تنہائی میں اپنی پریشانی وضیق ظاہر فرمائی کہ سمجھتا سب کچھ ہوں مگر یہ لوگ میری معیت کے لئے گھروں سے چلے ہیں اب کس منھ سے جواب دوں کہ تم جاؤ میں نہیں جاتا، ان کے دل کیا کہیں گے کہ عبدالرحیم کی معیت کے شوق میں حج کو گئے اور اس نے بیچ چھوڑ کر ٹکا سا جواب دیدیا۔ اب دوسری ضیق حضرت کی گرانی خاطر

---

[1] گو حق پدری اور طبعی بات کا اثر تھا مگر ان پر ظاہر نہ فرمایا۔ [2] گو پیر بھائی تھے اور دونوں خلیفہ ہونے کی وجہ سے ایک درجہ میں تھے مگر پھر بھی فرقِ مراتب کا لحاظ ہوتا ہے۔ [3] کیونکہ عبدالرشید کی ضرورت اپنی ضرورت تھی

کی پیش آگئی کہ حضرت کے خلافِ مزاج سفر کس طرح کروں۔

رہا عبدالرشید کا قصہ سو موت ہے یا حیات امر مقدر ہے اور وقت مقرر ہے جتنے دنوں کی لیکر آیا ہے اس میں ایک لمحہ کی کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی سب گذر ہی جائے گی۔ اب معاملہ تیرے سپرد کرتا ہوں کسی طرح حضرت سے بخوشی اجازت دلادے کہ میری تو حضرت کے سامنے عرض کی ہمت ہی نہیں"۔

مجھے درحقیقت دونوں حضرات سے محبت و عقیدت تھی کہ حضرتؒ اگر داہنی آنکھ تھے تو مولانا میری بائیں آنکھ تھے۔ اور واقعہ ہے کہ ان دونوں حضرات کو بھی اس ناکارہ کے ساتھ اسی نسبت کا تعلق شفقت و تربیت تھا اس لئے دونوں حضرات کے رنگ سے انس و مناسبت رکھتا اور ہر ایک کا نرالا لحاظ کیا کرتا تھا۔ میں وہاں سے رخصت ہو کر حضرت کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت مجھ سے زیادہ حضرت کو علم ہے کہ مولانا پر رفقا کی مراعات و دلداریٔ خلق کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کے ترک پر قدرت نہیں رکھتے اور عبدالرشید کی تکلیف چونکہ بیٹا ہونے کی حیثیت سے خود حضرت کی تکلیف ہے اس لئے رفقا کی اتنی دلجوئی پر کہ ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے اپنی ہر تکلیف کا برداشت کرنا حضرت کو سہل ہے مگر اس وقت حضرت کے ارشاد پر ایک بڑی ضیق مولانا کو یہ پیش آگئی کہ نہ دلداری و معیتِ رفقا چھوٹ سکے اور نہ حضرت کے خلافِ حکم کچھ کرسکیں، عجب پریشانی ہے کہ مجھے اندیشہ ہے حضرت اس کشاکشی میں خود علیل نہ ہو جاویں۔ حضرت کو مولانا سے خود محبت تھی یہ سن کر متاثر ہوئے اور فرمایا "اچھا بھئی بنامِ خدا سفر کریں خدا حافظ و ناصر ہے"۔ میں اسی وقت واپس آیا اور عرض کیا کہ حضرت اپنا قصد پورا فرمادیں کہ حضرت کی طرف سے اجازت[1] ہے۔ چنانچہ آپ نے بمعیت رفقا سفر کیا اور اسی حالت میں مدینہ منورہ سے ینبع ہو کر جہاز میں سوار ہوئے۔

لختِ جگر عبدالرشید کا انتقال

حتیٰ کہ عدن کے قریب عبدالرشید مرحوم راہیِ عالمِ قدس ہوا اور آپ نمازِ جنازہ سے فارغ ہو کر بیٹے کی نعش کو سمندر کے حوالہ کر کے اسی سکون سے بیٹھے رہے جو آپ کے لئے گویا فطری تھا۔

---

[1] یہ مقام نازک مقام ہے مولانا کے نزدیک حق خدام کا جو دینی تعلق کا ہے اور بہت افراد کا ہے وہ مقدم تھا مگر حضرت نے فرمایا کہ بیٹے کا تعلق دنیوی بھی ہے اور دینی بھی اور شدت و قوت میں یہ مقدم ہے اس کو صرف اپنا حق سمجھ کر مؤخر نہ کیا جائے مولانا کے نزدیک ان کا رکنا بادلِ ناخواستہ ہوا ادب مکہ کے خلاف اور وبال کا خطرہ ہے۔ حضرت کا جواب یہ ہوا کہ اپنے نفل کے وہ مختار نہیں دل لگانا ان کا کام ہے ورنہ جائیں۔ مؤلف کتاب نے غلبۂ حال سے استدلال کیا تو حضرت نے قبول فرمالیا اجازت دیدی کہ غلبۂ حال میں یہ مقدم و مؤخر ہونا معاف ہے۔ اللہ اکبر کس قدر باریک نظریں تھیں ان حضرات کی۔

عبدالرشید کے خسر حاجی عبدالعزیز خاں بھی شریک حج تھے اور مرحوم کی خدمت وتیمارداری انھیں کے حوالہ تھی۔ بندہ جب سفر سے واپس ہو کر رائپور پہنچا تو کمال حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ مرحوم کے آخری سانس سے لیکر اب تک اس ارمان میں ہوں کہ حضرت کی زبان سے عبدالرشید کا نام سنوں مگر حضرت سے کوئی تذکرہ ہی ایسا نہ سنا جس میں مرحوم کا نام لیں، تیرے انتظار میں ٹھیرا ہوا تھا کہ مجھے حضرت سے مرحوم کا نام سنوادے۔ میں نے کہا بہتر ہے کوشش کروں گا۔

چنانچہ حاضر ہوا اور سمجھتا تھا کہ حضرت کو درحقیقت میرے ساتھ بیحد محبت ہے اس لئے سارے سفر کی باتیں کر کے میں نے عرض کیا کہ حضرت معلوم ہوا کہ عبدالرشید مرحوم جان بر نہ ہوا اور عدن کے قریب رخصت ہوا۔ حضرت اس کو گھول گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے عبدالرشید جیسا بیٹا سمجھیں۔ بس اس پر جوش آگیا اور بے ساختہ فرمایا عبدالرشید جیسے پچاس ہوں تو تجھ پر قربان اور تیرے ساتھ محبت کا مقابلہ عبدالرشید کی محبت کیسے کرسکتی ہے؟ حضرت کی یہ شفقت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حاجی عبدالعزیز صاحب کا ارمان پورا ہو گیا کہ انھوں نے دو مرتبہ مرحوم کا نام حضرت کی زبان سے سُن لیا۔

حضرت مولانا قدس سرہ کی ذات اور خود حضرت کے ساتھ میرا خادمانہ تعلق اس کو مقتضی تھا کہ جداگانہ مستقل سوانح لکھتا کہ میری اصلاح وتربیت میں حضرت کا ایک خاص حصہ ہے جس کے احسان سے میری گردن نہیں اُٹھ سکتی۔ مگر حضرت کا رنگ اخفا وکتمان کے متعلق مجبور کئے ہوئے ہے کہ لاکھ میں سے ایک بات بھی بیان نہیں کرسکتا۔ آپ دائم الفکر اور دائم السکوت تھے کہ بلا ضرورت بولنا ہی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب امر بالمعروف کا وقت آتا تو آپ کی عالمانہ تقریر ایسی نرالے طرز پر ہوتی تھی کہ دلوں میں بیٹھتی اور آہن کو موم بناتی چلی جاتی تھی۔

صحابہؓ کی باہمی جنگوں کی عجیب توجیہ

ایک مرتبہ بعد عصر حسب معمول آپ صحن باغ میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے اور چار طرف مونڈھوں پر خدام حاضرین کا ایک کثیر مجمع چاند کا ہالہ بنا بیٹھا تھا کہ راؤ مراد علی خاں صاحب نے حضرات صحابہؓ کی باہمی جنگ و رنجش کا تذکرہ شروع کردیا اور اس پر رائے زنی ہونے لگی کہ فلاں نے غلطی کی اور فلاں کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچی تو دفعۃً حضرت کو جوش آگیا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی کہ جھرجھری لے کر

ے۱ دینی تعلق اور اہل اللہ کے ساتھ کا تعلق اس طبعی سے بدرجہا افضل ہے جو صرف طبعی ہو گو یہ تعلق عقلی ہوگا طبعی نہ ہوگا مگر اس پر طبیعت کے اثرات مرتب ہوں۔

حضرت سنبھلے اور فرمایا راؤ صاحب ایک مختصر سی بات میری سن لیجئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مخلوق کو قیامت تک پیش آنے والی تمامی ضروریاتِ دین و دنیا سے باخبر کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وقت اتنی بڑی تعلیم کے لئے آپ کو بہت ہی تھوڑا دیا گیا تھا۔ اس تعلیم کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے حوادث اور واقعات پیش آنے کی ضرورت تھی[۱] کہ ان پر حکم اور عمل مرتب ہو تو دنیا سیکھے کہ فلاں واقعہ میں یوں ہونا چاہئے۔ پس اصول کے درجہ میں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں رہا جو حضرت روحی فداہ کے زمانۂ بابرکت میں حادث نہ ہو چکا ہو۔ اب واقعات تھے دو قسم کے ایک وہ جو منصب نبوت کے خلاف نہیں، اور دوسرے وہ جو عظمت شانِ نبوت کے منافی[۲] ہیں۔ پس جو واقعات منصبِ نبوت کے خلاف نہ تھے وہ تو خود حضرت پر پیش آئے مثلاً تزویج اور اولاد کا پیدا ہونا ان کا مرنا دفنانا کفنانا وغیرہ وغیرہ تمامی خوشی وغمی کے واقعات حضرت کو پیش آگئے اور دنیا کو عملاً یہ سبق مل گیا کہ عزیز کے مرنے پر ہم کو فلاں فلاں کام کرنا مناسب ہے اور فلاں نامناسب، اور کسی کی ولادت و ختنہ و نکاح وغیرہ کی خوشی کے موقع پر یہ بات جائز ہے اور یہ خلافِ سنت۔

مگر وہ واقعات باقی رہے جو رسول پر پیش آویں تو عظمت رسالت کا خلاف ہو اور نہ پیش آویں تو تعلیم محمدی ناتمام رہے۔ مثلاً زنا و چوری وغیرہ ہو تو اس طرح حد و تعزیر ہونا چاہئے اور باہم جنگ و قتال یا نفسانی اغراض پر دنیوی امور میں نزاع و رنجش ہو تو اس طرح اصلاح ہونا چاہئے۔ یہ امور ذاتِ محمدی پر پیش آنا کسی طرح مناسب نہ تھے اور ضرورت[۳] تھی پیش آنے کی۔

لہٰذا حضرات صحابہؓ نے اپنے نفوس کو پیش کیا کہ ہم خدام و غلام آخر کس مصرف کے ہیں، جو امور حضرت کی شان کے خلاف ہیں وہ ہم پر پیش آویں اور حکم و نتیجہ مرتب کیا جائے تاکہ دین کی تکمیل ہو جائے۔ چنانچہ حضرات صحابہ پر وہ سب ہی کچھ پیش آگیا جو آئندہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے رشد و ہدایت بنا اور دنیا کے ہر بھلے بُرے کو معلوم ہو گیا کہ فلاں واقعہ میں یہ کرنا اور اس طرح کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا اور اس طرح کرنا نامناسب۔ پس کوئی ہوا ایسا باہمت جاں نثار جو تکمیلِ دینِ محمدی کی خاطر ہر ذلت کو عزت اور عیب کو ہنر سمجھ کر نشانۂ ملامت بننے پر فخر کرے اور بزبانِ حال کہے کہ ؎

نشود[۴] نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت	سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

شہرت و نیکنامی اور عزت و نام آوری سب چاہا کرتے ہیں مگر اس کا مزہ کسی عاشق سے پوچھو کہ جاں نثاری

۱؎ تاکہ حضور کا عمل مبارک ہر معاملہ میں شمع ہدایت بن جائے۔ ۲؎ مخالف۔ ۳؎ اگر اس وقت جاری نہ ہو جاتیں تو کون جاری کرتا کہ اب اس کے باوجود بھی لوگ کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ ۴؎ یعنی قضاء و قدر میں۔ ۵؎ دشمن کو نصیب ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو ہم دوستوں کا سر سلامت رہے تاکہ تو اس پر خنجر آزمالے۔

میں کیا لطف ہے اور کوچۂ معشوق کی ننگ و عار کیا لذیذ شے ہے ؎

> از ننگ[1] چہ گوئی مرا نام ز ننگ ست — واز نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است

سچے عاشق تو اس طرح ہماری تمہاری اصلاح و تعلیم کی خاطر اپنی عزت و آبرو نثار کریں اور ہم ان کے منصف و ڈپٹی بن کر تیرہ سو برس بعد ان کے مقدمات کا فیصلہ دینے کے لئے بیٹھیں اور نکتہ چینیاں کر کے اپنی عاقبت گندی کریں، اس سے کیا حاصل؟ اگر ان جواہراتِ سنیہ[2] کے قدردان نہیں بن سکے تو کم سے کم بدزبانی و طعن ہی سے اپنا منھ بند رکھیں کہ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا[3]۔ دیر تک آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ دہنِ مبارک سے پھول جھڑتے اور سامعین کے مشامِ جان[4] میں جگہ پکڑتے رہے۔

تلاوتِ قرآن

جس طرح آپ کو تعلیم قرآن مجید سے شغف تھا اسی طرح خود تلاوتِ کلام اللہ سے عشق تھا، آپ حافظِ قرآن تھے اور شب کا قریب قریب سارا وقت تلاوت میں صرف ہوتا تھا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ گھنٹہ بھر سے زیادہ نہ سوتے ہوں۔ اور اسی لئے آپ کو لوگوں سے وحشت ہوتی تھی کہ معمولِ تلاوت میں حرج ہوتا تھا عصر و مغرب کے درمیان کا وقت عام دربار اور سب کی ملاقات کے لئے مخصوص تھا اور اس کے علاوہ بغیر کسی خاص ضرورت کے آپ کسی سے نہ ملتے اور مکان کا دروازہ بند فرما کر خلوت کے مزے لوٹتے اور اپنے مولیٰ کریم سے راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے تھے۔

خوراک

خوراک آپ کی بہت ہی کم تھی اور ماہ رمضان میں تو مجاہدہ اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا۔ افطار و سحر دونوں کا کھانا بمشکل دو پیالی چار اور آدھی یا ایک چپاتی ہوتا تھا۔ شروع میں آپ قرآن مجید تراویح میں خود سناتے اور دو بجے ڈھائی بجے فارغ ہوتے تھے مگر آخر میں دماغ کا ضعف زیادہ بڑھ گیا تو سامع بنتے اور اپنی تلاوت کے علاوہ تین چار ختم سن لیا کرتے تھے ماہِ مبارک میں چونکہ تمام رات اور تمام دن آپ کا مشغلہ تلاوت کلام اللہ رہتا تھا اس لئے تمام مہمانوں کی آمد آپ روک دیا کرتے تھے اور مراسلت بھی پورے مہینے[5] بند رہتی تھی کہ کوئی خط کسی کا بھی عید سے

---

[1] شرم و عار کو کیا کہتے ہو مجھے تو اس عار سے ہی نام میسر ہے اور نام آوری کو کیا پوچھتے ہو مجھے تو نام آوری سے ہی عار آتی ہے۔

[2] عالی شان۔ [3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے متعلق کہ ان کو میرے بعد نشانۂ ملامت نہ بنا لیجیو ۱۲ منہ آگے اسی حدیث میں یہ ہے کہ جو ان سے محبت کرتا ہے میری محبت کی وجہ سے محبت کریگا اور جو ان سے بغض رکھے گا مجھ سے بغض کی وجہ سے رکھے گا یعنی اگر حضور سے محبت ہے تو ان سے محبت ہوگی حضور سے بغض ہوگا تو ان سے بھی ہوگا لہذا جو شخص کسی ایک صحابی سے بھی بغض رکھتا ہے سمجھ لو اس کو حضور سے بغض ہے اور نبی سے بغض رکھنا خدا سے بغض ہے اب اس کا نتیجہ غور کر دیکھا ہوگا۔

[4] روح کی سونگھنے کی قوتیں۔ [5] بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں کہیں ذاتی عبادات کا غلبہ ہوتا ہے کہیں تبلیغ و اصلاح کا اس لئے ایک کو دوسرے پر شبہ نہ کرنا چاہئے کہ دونوں عبادتیں ہیں جس کے لئے غیبی اشارہ ملتا ہے وہ اس میں رغبت کرتے ہیں۔

تبار دیکھا یا سنا نہ جاتا تھا۔ اللہ جل جلالہ کا ذکر جس پیرایہ پر بھی ہو آپ کی اصل غذا تھی اور اسی سے آپ کو وہ قوت پہنچتی تھی جس کے سامنے دوار المسک اور جواہر مہرہ ہیچ تھا۔

معارف و حقائق سے بیماری کا علاج

ایک مرتبہ آپ سخت بیمار ہوئے اور ضعف کی وجہ سے کروٹ بدلنا مشکل ہو گیا۔ پھر مرض سے کچھ افاقہ ہوا مگر ضعف کی وہی حالت رہی کہ دودھ پینے کے لئے چمچہ ہاتھ میں تھامتے تو ہاتھ کانپتا اور چمچہ پکڑا نہ جاتا تھا۔ ایک مزاج شناس خادم نے طبیب کو رائے دی کہ مقویات و مفرحات کا استعمال بیکار ہے کوئی کتاب جس میں معارف و حقائق ہوں سنانا شروع کر دیجئے کہ روزانہ قوت بڑھتی رہے گی۔ چنانچہ غالباً حجۃ اللہ البالغہ کا اشراق کے وقت سنانا حکیم صاحب نے معمول بنا لیا۔ حضرت بڑے شوق سے سنتے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے بعض دفعہ جوش میں اٹھ بیٹھا کرتے تھے۔

دو متعارض حدیثوں کی نفیس توجیہ

اسی زمانہ میں بندہ حاضر اور شریک سماعت ہوا تو ایک جگہ یہ حدیث آئی ومن یتالی علی اللہ یکذبہ۔ جو شخص اللہ پر قسم کھاتا مثلاً یوں کہتا ہے کہ واللہ فلاں کام اس طرح ہو گا تو حق تعالیٰ اس کو جھوٹا بناتا اور اس کی قسم و دعوے کے خلاف فرماتا ہے۔" یہ سن کر آپ جوش میں اٹھ بیٹھے اور بندہ کی طرف رخ فرما کر ارشاد فرمایا ایک حدیث میں تو یوں ہے: منھم من لو اقسم علی اللہ لابرہ۔ خدا کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرماتا ہے۔" حضرت کا منشا یہ تھا کہ دونوں حدیث میں تعارض کس طرح رفع ہو اور تطبیق کی کیا صورت ہے۔ حضرت کا فیضان چونکہ پاس بیٹھنے والوں پر بھی برستا تھا اس لئے فوراً ایک بات ذہن میں آئی اور میں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں لفظ اقسم آیا ہے اور یہاں یتالی جو کہ باب تفعل سے ہے اور اس کی خاصیت ہے تصنع و تکلف۔ لہٰذا مطلب صاف ہے کہ قسم بیساختہ کسی جوش قلبی سے نکلے تو اس پر ثمرہ مرتب ہو گا کامیابی کا اور اگر بناوٹ و تصنع سے قسم کھائی جو دعوےٰ ہے اپنے تقرب[1] اور مجاب الدعوات ہونے کا تو اس پر ثمرہ مرتب ہو گا ناکامی اور جھٹلائے جانے کا، لہٰذا تعارض ہی نہیں کہ تطبیق کی ضرورت ہو، حق تعالیٰ کے ہاں قدر و منزلت اخلاص کی ہے نہ کہ نفاق و تصنع کی۔ ایک چرواہے نے جوش محبت میں اپنے اللہ سے باتیں کیں کہ آپ مجھے مل جاویں تو پاؤں دباؤں اور دودھ پلاؤں، وہ خدا کو اتنا پیارا ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے الفاظ پر نظر کر کے اس کو گستاخ قرار دیا اور ایسے الفاظ کے استعمال سے روکا تو حق تعالیٰ کا سیدنا موسیٰ کو حکم ہوا کہ ؎

---

[1] خدا کے قرب اور دعاؤں کے قبول ہونے کا۔

تو برائے وصل کردن آمدی ‍ نے برائے فصل کردن آمدی[1]

اور منافقین نے پیغمبر کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور محبت و عظمت رسول کے بڑے بڑے دعوے کئے مگر حکم آیا کہ انّ المنافقین فی الدرك الاسفل من النار[2] پس بڑا فرق ہے اخلاص وسادگی میں اور بناوٹ و تصنع میں۔ حضرت کا چہرہ اس تقریر کو سن کر خوشی سے دمکنے لگا اور سبحان اللہ سبحان اللہ فرماتے ہوئے پھر تکیہ پر لیٹ رہے۔ کامل تین گھنٹہ آپ کتاب سنتے اور پتہ بھی نہ چلتا کہ آپ بیمار ہوئے تھے اور ضعف ہے حتیٰ کہ چند ہی روز میں آپ کی کمزوری قوت سے بدل گئی اور آپ نماز کو اپنے پاؤں سے مسجد تک جانے لگے۔

حقائق و معارف کا فیضان

حقائق و معارف آپ پر بارش کی طرح برسا کرتے مگر آپ کسی پر ان کا اظہار نہ فرمایا کرتے تھے۔ کسی خاص موقع پر کوئی بات زبان سے نکل جاتی ورنہ ہر وقت آپ ایک اندرونی لذت میں غرق رہتے اور بزبانِ حال فرمایا کرتے ؎

ستم است[3] اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ ‍ تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

حق و باطل کی معرفت کا معیار

ایک دن آپ کی مجلس میں بدعت وسنت کے مسائل اختلافی کی بحث ہونے لگی، آپ دیر تک سنتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ میرے نزدیک علاوہ دلائلِ علمیہ کے حق و باطل پہچاننے کا ایک معیار اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ قدرت نے ہر چیز میں اس کے ہمجنس کی طرف کشش کا مادہ رکھا ہے کہ کبوتر با کبوتر باز با باز۔[4] اور یہ قدرت کا عطیہ جس کو فطرت کہنا چاہئے اجسام[5] ہوں یا اعراض سب ہی میں جاری وساری ہے۔ پس جس فعل کے متعلق یہ شبہ ہو کہ معلوم حق ہے یا باطل، اس میں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی طرف میلان کن قلوب کا ہوا اور کشش کس قسم کے لوگوں کی ہے؟ پس اگر دیکھو کہ بددین فساق و فجار کو ابتداءً اس کی طرف حرکت ہوئی اور وہی قلوب جوش و خروش کے ساتھ اس کی طرف لپکتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں ضرور ظلمت ہے اگرچہ ظاہری صورت نورانی اور دینی معلوم ہوتی ہو کیونکہ اس میں نور ہوتا تو ظلمانی قلوب کو جذب نہ کرتا بلکہ وہ اس سے بھاگتے اور نورانی قلوب اولیاء و صلحاء کے اس کی جانب کھنچتے۔ اور اگر کسی فعل کو دیکھو کہ دیندار اہل اللہ

---

[1] تم تو سب کو ہم سے ملانے کے واسطے آئے ہو ہم سے جدا کرنے کیلئے نہیں آئے۔ [2] بیشک منافق لوگ جہنم کے نیچے کے طبقہ میں ہیں۔ [3] بڑا ظلم ہے اگر ہوس تم کو اس طرف کھینچے کہ چنبیلی وسرو کی سیر کے لئے داخل ہو تم خود پھول سے کم نہیں کھلے ہوئے دل کا درکھولو اور چمن میں داخل ہو جاؤ۔ [4] پہلا مصرعہ یہ ہے کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کہ ایک جنس جنس کے ساتھ ہی اڑا کرتی ہے کبوتر کبوتر کے ساتھ باز باز کے ساتھ۔ [5] لمبائی چوڑائی موٹائی والی چیز جسم ہے اور جو بغیر دوسرے کے الگ موجود نہ ہو سکے وہ عرض ہے اعراض جمع۔

اس کی طرف جاتے اور عوام و بازاری اس سے بھاگتے ہیں تو سمجھ لو کہ ضرور اس فعل میں نورانیت ہے کہ اہل نور کے قلوب کو اس طرف کشش ہوئی اور ظلمانی قلوب نے اس سے وحشت کھائی۔

پس عوام کا کسی اختلافی مسئلہ کے متعلق یہ کہنا کہ "ہم تو بے پڑھے ہیں اور دونوں طرف مولوی ہیں پھر ہم کیونکر سمجھیں کہ کون حق پر ہے" خدا کے نزدیک معتبر اور عذر مقبول نہ ہوگا۔ بالخصوص جبکہ وہ دونوں طرف علماء ہونے کے قائل ہو کر بھی ایک طرف جھکے ہوئے ہیں خود دلیل ہے کہ ایک شق کو ان کے نفوس نے ترجیح دے کر اختیار کیا اور اپنے اوپر سے الزام اتارنے کے لئے مولویوں میں فیصلہ نہ کرسکنے کا عذر تراشا ہے۔ اس طرح پر ذرا غور کرنے سے ہر بے پڑھے سے بے پڑھا حق اور باطل سمجھ سکتا ہے کیونکہ دیکھ رہا ہے کہ رسومات و بدعات رائجہ کی طرف زیادہ بازاری عوام جھکتے ہیں جن کو نماز روزہ تک سے وحشت و بے تعلقی ہے اور زیادہ پڑھے لکھے مائل ہوتے ہیں جن کی نورانیت قلوب کو حب جاہ و مال نے داب لیا ہے اور اگر کوئی مخلص دھوکہ کھا کر ادھر چلا بھی گیا تو خود اپنے قلب کو ٹٹول لے کہ وہ کشش نہ ہوگی جو درود و نماز و روزہ جیسی کھلی اور صاف عبادتوں کی طرف اس کو ہوتی ہے اور اس لئے امید ہے ان شاء اللہ کسی وقت اس کا قلب اس کی رہبری کرے گا اور وہ متنبہ ہو کر نور سنت کی طرف ضرور آجائے گا۔

یہ سننے کے بعد میرے ذہن میں یہ مضمون آیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے قصہ بہتان میں آپ کی برات و پاکدامنی کا ثبوت دیتے ہوئے آخر میں حق تعالیٰ نے ایک دلیل یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات "گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے علیٰ ہذا ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لئے خاص ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لئے"۔ پس اگر تعلق زوجیت مراد ہو کر ثبوت لیا جائے کہ حضرت صدیقہ رضؓ چونکہ اطیب الخلق[1] پیغمبر کی بی بی ہیں لہٰذا فحشاء کی گندگی سے پاک صاف ہونی چاہئے۔ تو یہ دلیل منقوض[2] ہو جائے گی حضرت آسیہؓ اور حضرت لوطؑ کی بی بی سے کہ اول الذکر طیبہ ہو کر خبیث بلکہ اخبث[3] کی زوجیت میں آئیں اور امراۃ لوط خبیثۃ النفس[4] ہو کر طیب النفس پیغمبر کی زوجہ بنی اور دلیل حق تعالیٰ کی خصوصاً ایسے نازک قصہ کی برات کے لئے مخدوش نہیں ہوسکتی۔ پس لامحالہ کشش اور محبت مراد لی جائے گی کہ دنیا جانتی اور ہر موافق و مخالف آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ حضرت صدیقہ رضؓ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہیں کہ اطیب الخلق کا قلب مطہر ان کی طرف کھنچتا اور مائل ہوتا ہے۔

[1] ساری مخلوق سے زیادہ عمدہ [2] ٹوٹ جائے گی [3] بڑا خبیث فرعون۔ [4] خبیث روح والی۔

پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حضرت صدیقہؓ میں طیبؓ ضرور ہے اور بے عفتی سے جو کہ اصل گندگی ہے وہ پاک صاف ہیں ورنہ گندی طبیعت رکھتے ہوئے پاک اور ستھرے قلب کا میلان اس طرف کبھی نہ ہوتا۔ پس کہیں زوجیت کے تعلق میں اس کا خلاف ہوا بھی تو یہ کوئی نہیں ثابت کر سکتا کہ کشش اور دلی محبت بھی دونوں میں ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ جس کو حق تعالیٰ نے آخری اور قطعی دلیل بنا کر ہر قریب و بعید اور ذکی و بلیدؔ کے لئے فیصلہ قرار دیدیا کہ اگر حضرت صدیقہؓ پر واہمہ ہو گندگی بے عفتی کا تو اس کا اثر پڑے گا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقدرشناس بلکہ پھر حق تعالیٰ کی سبوحیتؔ کے ساتھ گستاخ بننے پر، جس میں ایمان ہی ہاتھ سے گیا کہ آپ محبوب ہیں حق تعالیٰ کے، اور اگر حضرت کو بحیثیت رسالت و محبوبیت اطیب النفس سمجھا جیسا کہ ایمان کا مقتضا ہے تو حضرت عائشہؓ کو ضرور طیبۃ النفس ماننا پڑے گا کہ حضرت عائشہؓ کی محبوبیت اور آنحضرتؐ کے قلب کا اسطرف انجذابؔ و میلان اس زمانہ والوں کے لئے مشاہدہ سے اور ہمارے لئے تواترؔ و شہرت سے ثابت ہو کر محقق و یقینی بن چکا ہے۔ اب جس کا بھی دل چاہے ہر امر میں حق و باطل ہونے کا فیصلہ کرلے کہ قد تبین الرشد من الغیؔ پس اگر اپنے اللہ سے معاملہ صاف کرنا مقصود ہوا تو انشاء اللہ انشاء اللہ حق واضح ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

اس کے بعد فرمایا المرءؔ مع من احب میں بھی یہی راز ہے کہ محبت سے کشش ہوتی ہے اور کشش محبوب کو محب کے رنگ دیتی ہے کہ جس درجہ کی کشش ہوگی اسی درجہ کی معیتؔ لامحالہ مرتب ہوگی۔ اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ اسی لئے یہ کہتے ہیں کہ اہل اللہ کی محبت بڑی نعمت ہے کہ جو کچھ ملتا ہے اسی کی بدولت ملتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تمام صحابہ پر فضیلت اسی محبت پر نصیب ہوئی ورنہ آپ کا مجاہدہ عملی اس درجہ نہ تھا کہ تمام صحابہؓ سے بڑھا دے، اور محبت و کشش کے یہ اثرات تھے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں کبھی اجتہادیؔ غلطی ہوئی تو ابوبکرؓ کی رائے بھی اس غلطی میں شریک اور شامل رہی کہ یہ غلطی کا اشتراک دوسروں کی اصابتہ رائے سے بہتر اور عنداللہ زیادہ وقیع تھا۔ اسی محبت کا ثمرہ نے حضرت صدیق کو خلافت بلا فصل کا اہل بنایا جس کو حضرت نے بایں الفاظ ارشاد فرمایا کہ ابی اللہ والمومنون الا ابا بکر

لہ عمدگی و پاکیزگی۔ ۲ کند ذہن۔ ۳ پاکی یہ کہ حضورؐ حق تعالیٰ کے محبوب اور حضرت صدیقہؓ حضورؐ کی محبوب حضرت صدیقہؓ پر واہمہ ہونے سے حضورؐ پر اور پھر خدا تعالیٰ تک اثر پہنچے گا۔ ۴ کھنچنا۔ ۵ حضورؐ کے زمانہ سے ابتک اتنے روایت کرنے والوں سے جن کا جھوٹا ہونا عقل سے محال ہے۔ ۶ ہدایت گمراہی سے ظاہر ہو چکی۔ ۷ انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرے گا یعنی قیامت میں۔ ۸ ساتھ۔ ۹ مگر انبیاءؑ کی اجتہادی غلطی کو فوراً وحی سے درست کر دیا جاتا ہے جیسے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑنے میں آیت نازل ہوگئی تھی وہاں بھی حضرت ابوبکرؓ کی رائے حضورؐ کے ساتھ تھی۔ ۱۰ ایک ناگوار بات پر فرمایا تھا۔

کہ جس طرح ذاتِ محمدی کے ہوتے ہوئے اللہ اور اس کے ایماندار بندے کسی دوسرے کی حاکمیت کی طرف میلان نہیں کر سکتے اسی طرح وفاتِ محمدی کے بعد آپ کے محب مجانس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی جانشینی کی طرف جھک ہی نہیں سکتے، کہ حقدار کے حق کو قائم رکھنا ایک نور ہے اور نورانی ذات و نورانی قلوب کا نور کی طرف طبعی میلان ضروری اور فطری امر ہے۔

غرض دیر تک تقریر فرمائی کہ سننے والے محو و مستغرق تھے اور رحمتِ الٰہیہ کی پھوار دلوں پر پڑ رہی تھی۔ اس قسم کے حقائق کا ہر لحہ آپ پر ورود ہوتا تھا جن کو اول تو آپ ہی زبان سے نہ نکالتے تھے اور کبھی کچھ بیان فرمایا تو میرا دل نہیں چاہتا کہ حضرت کے خلافِ طبع ان کی اشاعت کروں۔

وساوس و خطرات پر آپ کو اطلاع زیادہ ہوتی اور بلا ارادہ آپ اس پر مطلع ہوتے تھے۔ حافظ مختار احمد صاحب سیوہاروی جب پہلی مرتبہ رائپور حاضر ہوئے تو مہمان خانہ میں اُترے۔ اور چونکہ چار کے زیادہ عادی تھے اس لئے حضرت کو اطلاع ہونے سے قبل ان کے ملازم نے چار طیار کرنے کا قصد کیا۔ ابھی ارادہ ہی تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا آپ کو حضرت بلا رہے ہیں۔ ان کو بغیر اطلاع پائے حضرت کی طلبی پر تعجب ہوا اور جلدی جلدی حضرت کے پاس حاضر ہوئے۔ مصافحہ کرتے ہی حضرت نے خادم سے فرمایا ملاجی سے کہو کہ چودھری صاحب کے لئے چار جلدی لے آویں۔ اس پر ان کو دوسری حیرت ہوئی مگر ساتھ ہی ان کو یہ خیال آیا کہ میری چار کی طلب کا تو حضرت کو کشف ہوگیا لیکن میری عادت تو یہ ہے کہ صبح کو چا نہیں پیا جب تک انڈا نہ کھالوں۔ یہ خیال آنا تھا کہ حضرت نے خادم کو آواز دی اور فرمایا ملاجی سے کہنا دو انڈے بھی لیتے آویں"۔

اس قسم کے واقعات کشوف کونیہ اور اطلاع خطرات کے ہزاروں کی تعداد میں پیش آئے اور رات دن پیش آتے تھے مگر نہ آپ کے نزدیک وقیع تھے نہ آپ اس کا قصد فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ بندہ حاضر ہوا اور حاجی احمد حسن صاحب کو حضرت کے خادم اور میرے دوست اس وقت دہرہ دون میں ضلعداری نہر پر تعینات تھے میری موجودگی میں حضرت کی زیارت کے خیال سے ایک گھوڑے پر آئے جو کسی دوست سے مانگ لیا تھا۔ گھوڑا باغ میں چھوڑ کر حضرت کے پاس حاضر ہوگئے اور باتوں میں دیر لگ گئی مغرب کے قریب باہر آئے تو گھوڑے کی تلاش ہوئی۔ چار طرف دیکھا کہیں پتہ نہیں، فکر ہوا کہ گھر کا راستہ نہ لیا ہو کہ اب بغیر سواری پہاڑی راستہ وقت پر دہرہ پہنچنا بھی مشکل۔ ملا عبدالعزیز سے کہا کہ حضرت کو اطلاع دیدو اور سنو حضرت کیا فرماتے ہیں۔ وہ حضرت کے پاس گئے اور قصہ عرض کیا حضرت نے فوراً گردن جھکائی اور پھر فرمایا ملاجی کسی طالب علم کو نہر کی سیدھی پٹڑی پر تو ذرا بھیجو کہ تلاش کرے۔ ملاجی خوش خوش

یہ کہتے ہوئے آئے کہ لو گھوڑا مل گیا اور اس کے بعد طالب علم کو نہر کی پٹری پر بھیج دیا، عشا کا وقت ہوا چاہتا تھا کہ طالب علم گیا اور دو ڈھائی فرلانگ چلا ہوگا کہ گھوڑے کو رائپور کی طرف رُخ کئے کھڑا پایا اور وہ اس کی رسّی پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا۔

کم کھانا، کم سونا، کم بولنا

قلت طعام، قلت مقام اور قلت کلام کا[1] آپ مجسمہ تھے۔ امراء سے آپ کو وحشت اور فقراء سے انس تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہمان نوازی آپ کی حد سے بڑھی ہوئی تھی کہ مہمان پر اپنی راحت کا نچھاور کرنا آپ کی عین مراد تھی۔

ایک دفعہ بندہ حاضر ہوا تو بعد مغرب دیکھا کہ مکان سے جو کہ بستی میں باغ سے دو فرلانگ فاصلہ پر کھانا خود لئے آرہے ہیں۔ شرم کے مارے مجھے پسینہ آگیا اور میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا کوئی خادم نہ تھا کہ حضرت نے تکلیف فرمائی، بیساختہ فرمایا دل یوں ہی چاہا کہ خود لیکر چلوں کہ اس سے زیادہ خوشی کا وقت کون سا ہوگا۔

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو شب کو آنکھ کھلی، دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت لاٹھی لئے باغ میں پھر رہے ہیں۔ اٹھ کر بیٹھ گیا تو حضرت پاس آئے اور فرمایا جنگلی بھینسا کبھی کبھی باغ میں گھس آتا ہے اس کی نگرانی کر رہا تھا کہ مہمانوں کی نیند خراب نہ کرے، آپ اطمینان سے سو جائیے۔" صبح کو معلوم ہوا کہ حضرت کی تو تمام رات پہرہ داری ہی میں گذری۔

ایک مرتبہ مولوی وہاج الدین صاحب جو کہ حضرت گنگوہی سے بیعت تھے رائپور آئے۔ رات زیادہ جا چکی تھی اور سفر کا تکان بہت تھا ایک طرف لیٹ کر سو گئے۔ ذرا دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شخص پائنتی بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے مگر اس احتیاط سے کہ آنکھ نہ کھل جائے۔ اول تو سمجھے کہ شاید حضرت نے کسی خادم کو بھیج دیا مگر پھر غور کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ تو خود حضرت مولانا ہیں۔ یہ گھبرا کر اٹھے اور کود کر چارپائی سے نیچے آئے کہ حضرت یہ کیا غضب کیا۔ فرمایا بھائی اس میں حرج کیا ہے آپ کو تکان بہت ہو گیا ہوگا ذرا لیٹ جائیے کہ آرام مل جائے۔ انھوں نے کہا بس حضرت معاف فرمائیے میں باز آیا ایسے آرام سے کہ آپ سے پاؤں دلواؤں؎

تواضع اور مروت گر کوئی شخص مجسم ہو — تو وہ سرتا قدم عبدالرحیم باصفا ہوگا

تعبیرِ خواب میں دستگاہ

خواب کی تعبیر میں آپ کو بہت مناسبت تھی مگر تفصیل بہت کم بیان فرمایا کرتے تھے۔ چودھری حافظ مختار احمد صاحب نے ایک مرتبہ خواب دیکھا

---

[1] کم کھانا، کم سونا، کم بات کرنا۔ [2] جبتک مہمان کو علم نہ ہوا مہمان نوازی اور تواضع رہی علم ہونے پر جب کلفت کا سبب معلوم ہوا ترک فرما دیا کہ اب راحت میں کلفت ہے یہ بات تواضع نہ رہی تھی، کس قدر رعایت ہے حدود کی۔

کہ چت لیٹے ہوئے ہیں اور سیدھی جانب سر کے برابر ایک مونڈھے پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ سے کچھ نیچے قلب کے مقابل سیدنا یوسف علیہ السلام ہیں۔ قلب بجائے بائیں جانب کے دائیں جانب ہے اور کھلا ہوا ہے کہ نہ اس پر کوئی کپڑا ہے اور نہ گوشت، کھال کو چیر کر اس کے اوپر سے ہٹا دیا گیا ہے اور قلب پر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے فیضان کا ترشح ہو رہا ہے جس کی لذت بائیس سال گذر جانے پر اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ خواب ہی میں یہ خیال ہے کہ نور بھرا جا رہا ہے۔ چند علماء سے انھوں نے خواب ذکر کیا اور ہر ایک نے تعبیر دی مگر ان کے دل کو نہ لگی۔ رائپور حاضر ہوئے تو حضرت کو خواب سنایا فرمایا بارک اللہ بہت اچھا خواب ہے جس کی تعبیر کھلی ہوئی ہے کہ آپ کو نسبت یوسفی حاصل ہے انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ذرا اس کو مشرح[1] فرما دیں کہ نسبت سے کیا مراد ہے؟

فرمایا چودھری صاحب دیکھئے جس طرح دنیا میں جس کسی کو جو کچھ بھی انعام اکرام عطا ہوتا ہے وہ سب حقیقتًہ پادشاہ کی جانب سے ہوتا ہے مگر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ خزانہ شاہی سے وزراء کو دیا جاتا ہے اور وزراء کے یہاں سے ہر محکمہ کے سردار کو اور پھر اس سردار کی طرف سے ہر اس شخص کو ملتا ہے جو اس کا مستحق اور اس افسر کا ماتحت ہوتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی روحانی برکات و فیوض بندوں کو عطا ہوتے ہیں وہ سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے سیدنا موسیٰ سیدنا عیسیٰ اور سیدنا یوسف غرض جملہ انبیاء علیہم السلام تک پہنچتا ہے، اور یہ حضرات اپنی صفات اور کمالات خصوصی کی بنا پر جس جس محکمہ کے سردار و امیر قافلہ قرار پائے ہیں اسی خصوصی انعام سے بہرہ یاب ہونے والوں کو وہ فیوض و انعامات الٰہیہ پہنچاتے ہیں اور وہی صفات خصوصی نسبت کہلاتے ہیں کہ کوئی نسبت ابراہیمی ہے اور کوئی نسبت یوسفی کوئی موسوی اور کوئی عیسوی، اسوقت چودھری صاحب کو انشراح صدر[2] ہوا اور سمجھے کہ سر کی جانب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف فرما ہونا اور قلب کے محاذ[3] میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قلب پر انوار و برکات کا ڈالنا یہ حقیقت رکھتا ہے۔

سنت سے محبت، بدعت سے نفرت ہر چند کہ آپ خلق مجسم تھے مگر خلاف سنت عقیدہ والوں سے آپ کو کمال نفرت تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے کسی مرید نے ضلع رہتک کے ایک عالم کی صفائی کرتے ہوئے یوں کہا کہ حضرت وہ تو حضور کے رشتہ دار ہیں اور بالکل ہمارے ہم خیال ہیں صرف بعض عقائد میں کچھ یوں سا جزوی اختلاف ہے جیسا باہم ائمہ میں۔ وہ صاحب اپنی تقریر ختم کرنے نہ پائے تھے کہ آپ کے چہرہ پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے اور آپ نے تعجب کے ساتھ فرمایا کہ ہائیں عقائد میں اور اختلاف؟

---

[1] کھول کر۔ [2] دل کا کھل جانا اور قبول کر لینا۔ [3] مقابلہ۔

یہ تو جزوی ہونا آپ کو خود ہی تسلیم ہے میرا تجربہ تو یہ ہے کہ عقائد میں جز تو جز اگر بالکل بھی اختلاف نہ ہو مگر شک اور شبہ کا درجہ ہو تو وہ بھی برباد و گمراہ ہوئے بغیر نہیں بچتا پھر اس کو ائمہ کے اختلاف سے تشبیہ[1] دینا تو بڑی ہی دلیری کی بات ہے۔ پس چاہے عمل میں کتنی ہی کمزوری ہو مگر خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان بدعت کو سنت سمجھے یا سنت کے سنت ہونے میں شک لاوے کہ یہ بلائے بے درمان مہلک اور سم قاتل ہے۔"

اصلاح اور امر بالمعروف کا انداز

آپ کے امر بالمعروف کا طریق بھی عجیب پیارا تھا کہ کوئی کتنا ہی بدعمل ہو آپ اس کو چھاتی سے لگاتے اور اپنے کو اس کے سامنے ہیچ در ہیچ سمجھتے۔ مگر جب دیکھتے کہ اس کو تعلق ہو گیا اور اب نصیحت کرنا بے اثر نہ ہوگا تو چپکے سی نہایت نرم اور میٹھے لفظوں میں اس کو اتباع شریعت کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

ایک بار میرے ساتھ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے جن کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی حضرت کے اخلاق و مہمان نوازی دیکھ کر وہ حیران ہو گئے اور جب رخصتی مصافحہ کرنے لگے تو عرض کیا کہ حضرت میرے لئے دعا فرماویں۔ حضرت نے ہاتھ تھامے ہوئے ان سے ارشاد فرمایا بہت اچھا انشاء اللہ حکم کی تعمیل کروں گا مگر ایک عرض میری بھی ہے اس کو آپ قبول فرمالیں وہ یہ کہ طلائی انگشتری[2] کو شریعت نے مرد کے لئے حرام کہا ہے۔ مگر اس گناہ بے لذت کو ترک فرمادیں تو پھر خوش ہو کر دل سے دعا نکلے گی۔ یہ سن کر وہ صاحب شرما گئے کہ پیشانی پہ پسینہ آگیا اور فوراً انگوٹھی اتار کر ہاتھ میں لے لی۔

الفتح الربانی کا اردو میں ترجمہ

حضرت پیران پیر کے مواعظ الفتح الربانی ایک مرتبہ مجھے ملے اور میں حضرت کو پڑھ کر سنانے لگا تو حضرت پر وجد طاری ہونے لگا اور بے اختیار باصرار فرمایا کہ اس کا ترجمہ کر دے کہ بہت مفید ہوگا اور طباعت شروع ہوتے پر جتنا بھی طبع ہوتا جائے وہ مجھے فوراً بھیج دیا کر کہ بھیجنے میں کتاب پوری ہونے کا انتظار نہ دیکھیو۔ چنانچہ میں نے اس کا ترجمہ کیا اور حضرت اس سے بہت ہی محظوظ ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کتاب جس کے پاس بھی گئی اس کو خاص روحانی فائدہ پہنچا حتی کہ ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گئی اور دوبارہ[3] طبع ہوئی جو قریب ختم ہے۔ اس کے مطالعہ سے قلب میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے اور رضا بر قضا و شان تسلیم کی ایک عجیب و غریب تعلیم حاصل ہوتی ہے جو تجربہ ہی پر موقوف ہے۔

---

[1] ائمہ مجتہدین میں عقائد کا اختلاف نہیں ہوتا صرف فقہی فروعی مسائل کے راجح و مرجوح ہونے کا ہوتا ہے حق و باطل کا وہ بھی نہیں۔ [2] سونے کی انگوٹھی۔ [3] اس کا نام فیوض یزدانی ہے اس کے ۲۰ وعظ کی شرح عجیب طرز پر جدا لکھی ہے جس کا نام انوار سبحانی ہے۔ دونوں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مصنف کتاب ہذا کی تصنیف ہیں۔

بزرگوں اور متعلقین کی آمد سے مسرت آپ کو حضرت گنگوہی قدس سرہ کے متوسلین سے خاص محبت تھی کہ وہ شیخ کے یتیم بچے تھے اور شیخ کی یاد تازہ کیا کرتے تھے، ان میں سے کوئی بھی آتا تو گویا آپ کے ہاں عید آجاتی اور اگر کوئی خاص تعلق والا آتا تب تو آپ کی مسرت کا کچھ ٹھکانا ہی نہ رہتا تھا، اس کی خدمت ودلداری کو تمامی نوافل واذکار پر ترجیح دیتے اور اکابر میں سے کوئی بزرگ تشریف لاتے تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ آپ کتنا اہتمام فرماتے اور آپ کا رواں رواں مسرور ہو کر یوں پکارا کرتا تھا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بیوہ سے نکاح نکاح بیوگان آپ کی قوم میں عیب سمجھا جاتا تھا اس کی اصلاح میں آپ نے بہت کچھ تکلیفیں سہیں اور مصائب برداشت کئے۔ عملاً اس کی سنت ثابت کرنے کے لئے خود بھی بیوہ سے نکاح کیا اور اس نکاح پر جو کچھ طعن تشنیع اور جان کے خطرات آپ کے رفع درجات کے لئے مقدر تھے وہ پیش آکر رہے جن کو آپ نے شیر وشکر سمجھ کر پیا اور مزہ لیا۔ آپ کے جوان صاحبزادہ عبدالرشید مرحوم کا انتقال ہوا تو صبر ورضا کی آپ مجسم تصویر تھے کہ مرحوم کے خسر کو داماد کا نام باپ کی زبان سے سننے کی تمنا تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ کو اس کی وفات کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔ مگر میں نے جہاں تک غور کیا حزن تو غیر اختیاری اور لازمۂ بشریت[1] ہے انسان کو دو دن کے پالے ہوئے بکری کے بچے سے بھی تعلق ہوتا اور اس کے مرنے پر دل دکھتا ہے پھر بیٹا تو بیٹا ہی ہے جس کو ثمرۃ الفواد[2] اور کلیجہ کا ٹکڑا کہا جاتا ہے اس کا نوجوانی میں مرنا حزن سے کیسے خالی رہ سکتا ہے لیکن اس موت کے حزن بشری وطبعی کے ساتھ ایک روحانی مسرت بھی آپ کو حاصل تھی جو طبیعت ثانیہ نہیں بلکہ طبیعتِ اصلیہ بن گئی تھی کہ آپ کو بیوہ بہو کے نکاحِ ثانی کا موقع ملا اور مردہ سنت کے زندہ کرنے کی ایک قدرت حاصل ہوئی۔

نصیحتِ قولی وعملی نصیحت کرنے اور دوسرے کو کسی کام کی ترغیب دینے اور عمل کرانے کی دو ہی صورتیں ہیں ایک زبان سے سمجھانا دوم خود عمل کر کے دکھانا، زبان سے سمجھانا جو تعلیم قولی کہلاتی ہے اگرچہ زمانہ اور وقت کے لحاظ سے انفع اور زیادہ دیرپا ہے کہ عمل تو صرف دیکھنے والے حاضرین کو تعلیم دے سکتا ہے لیکن قول حاضر وغائب دونوں کا معلم بنتا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو سبق پڑھاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عمل کے ذریعے سے جو تعلیم ونصیحت ہوتی ہے وہ متعلم کے لئے قولی تعلیم کی بہ نسبت نہایت آسان اور بہت جلد سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے۔ اسی لئے جہاں حق تعالیٰ نے بندوں کی

---

[1] ہر بشر کے لئے لازم۔ [2] دل کا پھل۔

بہبودی کے لئے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں کہ موجودہ اور آئندہ ہر زمانے کے لوگوں کو ان کے ذریعہ سے مرضیاتِ الٰہیہ کا علم حاصل ہو۔ پھر ہی کتابوں کے ساتھ ان کے احکام پر عمل کرنے والے پیغمبروں کو بھی بشر بنا کر دنیا میں بھیجا کہ خود عمل کرکے مخلوق کو احکامِ الٰہیہ پر عمل کرنا سکھا دیں۔

ایک سمجھدار جوان کو زبانی نماز پڑھنا سکھاؤ اور کہو کہ اول تکبیر پڑھو اور پھر ہاتھ باندھو وغیرہ وغیرہ تو چند گھنٹے سکھانے پڑھانے کے بعد بھی شاید وہ پوری نماز نہ پڑھ سکے گا لیکن اگر ایک ناسمجھ بچہ کو بھی سامنے بٹھا کر خود نماز پڑھ کر دکھا دو تو عجب نہیں تمہاری چند منٹ کی یہ تعلیم اس سے پوری نماز پڑھوا دے گی یہ دوسری بات ہے کہ اس تعلیم کا اثر دیکھنے والے ہی تک محدود ہوگا اور جو موجود نہیں یا پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو نماز سکھانے کیلئے پھر قول کی حاجت ہوگی کہ عمل ختم ہو جانے والا ہے اور قول باقی رہنے والا۔

یہی وجہ ہے کہ انگریزی سکولوں میں یہ الزام دُور کرنے کے لئے کہ مسلمان بچے اپنے دین سے ناواقف اور بے بہرہ رہ جاتے ہیں کتنا ہی دینیات کا نصاب کیوں نہ پڑھا لیا جاوے مگر وہ مفید نہیں ہوتا اس لئے کہ وہاں صرف قول سے تعلیم دینے اور زبان سے پڑھانے اور بتانے والے ہوتے ہیں خود عمل کرکے دکھانے والے اور عملی تعلیم دینے والے نہیں ہوتے۔ پھر عمل کے بھی دو درجے ہیں ایک اوپری دل سے عمل کرنا دوم دلبستگی اور محبت و شوق کے ساتھ کرنا۔ کہ پہلا درجہ کتنا ہی پابندی و مواظبت[1] سے ہو مگر نہ اس کے بقا کا اعتبار ہے اور نہ اس میں حلاوت و شیرینی ہے۔ مگر دوسرا درجہ اگر ضعفِ بدن کی وجہ سے کمزور بھی نظر آئے تو بھی پختہ و پائیدار ہوتا ہے اور اس کے اندر ایسا مٹھاس ہوتا ہے جس کی ماہیت بیان میں نہیں آسکتی یہی وجہ ہے کہ مدارس دینیہ میں بھی گو تعلیم قولی کے ساتھ عاملین کے اعمال و افعال طلبہ کو عملی تعلیم ضرور دیتے ہیں مگر وہ تعلیم صرف بدن پر رہتی ہے اور دل میں نہیں اترتی۔ اور اسی لئے اندیشہ رہتا ہے کہ متعلم کسی وقت تارکِ عمل اور بدحال نہ بن جائے۔

ہاں اس علم اور عملِ بدن سے فراغ پانے کے بعد ضرورت ہے ان عاملین[2] کی خدمت میں رہنے کی جن کے اعمال قلب سے صادر ہوتے اور احوال بن جاتے ہیں۔ کہ اب عملی تعلیم دل میں اترے گی اور احکامِ الٰہیہ پر عمل کرنے کا وہ انس و شوق پیدا ہو جائے گا جو کہیں بھی رہو گے مگر معلم و راہبر اور نگران و منتبہ[3] بنا ہوا تمہارے ہر وقت و ہر ساعت ساتھ رہے گا۔ پس ایسا معلم اگر مدرسہ ہی میں نصیب ہو جائے تو زہے نصیب ورنہ جس طرح دو فن حاصل کرنے کے لئے دو مدرسوں میں جانا ضروری ہے اسی طرح عملِ ابدان مدارس میں حاصل کرنے کے بعد عملِ قلوب کی تحصیل کے لئے خانقاہوں میں جانا پڑے گا۔ کہ ہر کارے و ہر مردے[4]۔ جن کے

---

[1] پابندی۔ [2] عمل کرنے والے بزرگوں کی۔ [3] تنبیہ کرنے والا۔ [4] ہر کام ہر ایک مرد کا الگ الگ ہے۔

اعمال اوپری اور صرف بدن سے ہوں گے ان کی تعلیم کا اثر فقط جوارح[1] واعضا تک پہنچے گا۔ اور جن کے اعمال دل سے اور شوق ومحبت کے ساتھ ہوتے ان کے سارے کام صورۃً وہی ہوں گے جو معلم ابدان کے تھے اور نصاب تعلیم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر ان کی تعلیم فعلی دیکھنے والوں کے دلوں میں اتریگی اور مشین کے پرزوں کو چلانے والی ایک مخفی برقی قوت پیدا کرے گی جس کو محبت کی آتش[2] اور برق شوق کہا جاتا ہے ؎

از ساحتِ دل غبار کثرت رُفتن — خوشتر کہ بہرزہ در وحدت گفتن

مغرور[3] سخن مشو کہ توحیدِ خدا — واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

الحاصل تابعین رسالت جن کے قلوب میں سید المحبین والمحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکوٰۃ قلب سے وہ نور منتقل ہوا ہے جس کو عشق کی آگ اور حبِ الٰہی کی حرارت کہا جاتا ہے ان کا طبعی اقتضا خود ان کو عمل پر ایسا مجبور کرتا ہے جیسا فرہاد کو جوئے شیر لانے کے لئے کوہ کنی پر مجبور کیا تھا اور اسی میں ان کو وہ لذت آتی ہے جو ہر کوفت اور حزن وغم کو مغلوب بلکہ معدوم کردیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی چونکہ وہ بخیل وتنگ خیال نہیں ہوتے لہٰذا ان کا دل چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہمارے محبوب کی ہماری طرح محب و شیدا بن کر مال وجان اور عزت وخانماں نچھاور کرنے لگے۔ اس لئے برقی قوت دوچند ہوکر عمل کی محرک ہوتی اور مخلوق کے دلوں میں اس کی تعلیم اترتی چلی جاتی ہے۔

حضرت رائپوری قدس سرہ کا یہ رنگ عالم آشکارا ہوچکا تھا اور آپ کی ساری راحت وخوشی بس اس میں رہ گئی تھی کہ اللہ کا بول بالا ہو اور دنیا کا ہر فرد سنتِ محمدیہ پر عامل اور والہانہ شیدا۔ اس سعی میں مال اور اولاد تو کیا چیز ہے اپنا مٹنا بھی آپ کے لئے زندگی اور فنا وختم ہوجانا بھی عین حیات تھا ؎

سر بوقتِ ذبح اپنا ان کے زیر پائے ہے — کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

قصہ مختصر اپنی قوم کا بیوہ کے نکاح کو عیب سمجھنا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقتضائے طبعی کہ آپ کی اکثر ازواج مطہرات بیوگی ہی سے آپ کی زوجیت میں آئیں، مدعیانِ اسلام کے قلوب سے مٹ جانا آپ کے لئے ایسا ہی سوہانِ روح تھا کہ ماں باپ بہن بھائی اور بی بی اور اولاد سب ہی کی وفات کے درد وغم سے بڑھا ہوا تھا کہ آپ اندر ہی اندر گھُرتے اور مرجھاتے چلے جاتے تھے۔ ہرچند کہ آپ اس کی قولی تعلیم بارہا اور مدت تک دے چکے تھے مگر ضابطہ پُری تو نہ تھی کہ یہ کہہ کر الگ ہوجانے میں اپنا کام پورا کرچکا نہیں مانتے تو جاؤ جہنم میں۔ وہ تو دل میں ایک آگ لگی ہوئی تھی جو آگے بڑھا رہی اور گوشہ میں

---

[1] ہاتھ پیر وغیرہ بدن کے ظاہری اجزا۔ [2] آگ اور شوق کی بجلی۔ [3] دل کے بعد

نہ بیٹھنے دیتی تھی ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ۔۔۔ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

آخر اپنی عملی تعلیم کے لئے خود اپنے خاندان کی ایک محترمہ خاتون سے آپ نے نکاح کیا جس نے آپ پر نہیں بلکہ اپنے خلاف خاندانی ناپائیدار ناموس کو نثار کردیا۔ مگر آپ کی سوزش اندرون میں اس سے بھی ٹھنڈک نہ پڑی بلکہ آپ کا دل چاہتا تھا کہ خود عورت ہوتا اور بیوہ بنتا تو نکاحِ ثانی کرکے اس رسم بد کو توڑنے کے صلہ میں قوم کی طعن وملامت سنتا اور شادکام ہوکر خوش ہوتا اور کہتا ؎

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی[1] ۔۔۔ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

بیوہ بہو کو نکاحِ ثانی کیلئے اثر انگیز نصیحت

چنانچہ آپ مرحوم بیٹے کی بیوہ کے پاس گئے اور اس کو اس طرح تسلی دی کہ بیٹی اب تک تو بہو تھی اور آج سے میری بیٹی ہے۔ دنیا فانی ہے اور یہاں کا ہر تعلق ایک دن ٹوٹنے والا ہے۔ ہمارے عزیز ایک ایک کرکے ہم کو چھوڑتے جائیں تب اور ایک دن ہم سب کو یکلخت چھوڑ کر چلے جائیں تب بہر حال موت نے فراق وجدائی ڈال دی۔ ایک ذات وہ بھی ہے جو کبھی کسی حال جدا ہونے والی نہیں ہے، اس کی محبت میں حلاوت بھی اتنی ہے کہ کسی دوسری محبت میں اس کا لاکھواں حصہ بھی نہیں ہے۔ ہم مریں یا جئیں وہ ہم سے جدا نہ ہوگا۔ ہماری خوش نصیبی ہے اگر اغیار کی محبت دل سے نکل کر اس کی محبت دل میں سما جائے، دنیا کی عزت وذلت دونوں ہیچ ہیں اور صحابہؓ نے اپنے اللہ ورسول کا بول بالا کرنے کی خاطر کنبہ وبرادری اور وطن وقوم سب ہی سے پیٹھ پھیر لی۔ اور اس کا ان کو یہ صلہ ملا کہ آج ان کا نام بھی ہمیں پیارا معلوم ہوتا ہے اس لئے اپنے اللہ سے دل لگاؤ، آخرت کی عزت کو عزت سمجھو جو کہ شریعت کے سامنے بے زبان اور بے شعور بن جانے کا نام ہے کہ ساری دنیا کسی کام کو ذلیل کہے مگر شریعت اس کا حکم دے تو ہمیں شریعت کا ساتھ دینا چاہئے۔ کیونکہ دنیا والے موت کے بعد دفنا اور مٹی کے نیچے دبا کر سب چلے آئیں گے اور پھر اسی مالک سے واسطہ پڑیگا جس نے شریعت پر عمل کا حکم دیا ہے۔ جب وہ پوچھے گا کہ ہم تمہارے نزدیک زیادہ عزیز تھے یا برادری؟ تو اس وقت پشیمانی سے پسینہ آجائے گا اور افسوس ہوگا کہ ہائے قبر تک ساتھ دینے والوں کا ہم نے ساتھ دیکر اپنے کریم مولیٰ سے کیوں بگاڑی۔

اس کے بعد آپ نے شوہر کی تجویز میں خیال دوڑایا اور آخر ایک دن مرحوم کے خسر حاجی عبدالعزیز خاں کو

[ملہ] میں ہر ایک رات کہ کل کو یہ چھوڑ دوں گا پھر جب کل ہوتی ہے تو آج کو کل بنا دیتا ہوں۔ [1] تم نے مجھ کو برا کہا تو میں خوش ہوں اللہ تمہیں معاف کرے تم نے اچھا کیا شکر چبانے والے ہونٹوں کے لئے کڑوا جواب زیب دیتا ہے۔

کہ حضرت سے بیعت بھی تھے بلاکر تنہائی میں اپنا منہلئے مراد ظاہر فرمایا۔ حاجی صاحب کو عبدالرشید مرحوم کی یاد تازہ ہوئی تو رونے لگے مگر دیکھتے تھے کہ میں خسر ہوں اور حضرت اس مرحوم کے باپ ہیں۔ آنسو نکلے تھے کہ حضرت نے فرمایا ہا ہا حاجی عبدالعزیز خاں یہ رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا۔ آج خدا نے وہ دن نصیب فرمایا کہ اس کے محبوب پیغمبر کی مردہ سنت ہم ناکارہ گنہگاروں کے ہاتھوں زندہ ہو۔ یہ سخی کی نچھاور کا وقت ہے کہ اتفاق سے میسر آگیا پس لُوٹ لو جتنا لُوٹا جائے، نہ ہوتا عبدالرشید پیدا، یا نکاح سے قبل ہی مرجاتا، یا بیوہ چھوڑ کر نہ جاتا تو ہم کیا کرتے اور کیوں کر یہ نعمت پاتے۔ ابتک جو کچھ ہوا محض عطاءِ رب تھی جس میں ہمارے کسی فعل کو دخل نہ تھا اب ان عطاؤں کے شکریہ کا وقت آیا اور ہمارے کسب اور عمل کا دخل ہوا تو ہم سے زیادہ بدنصیب کوئی نہ ہوگا اگر اس کی قدر نہ کریں۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں اور وقت نکلے پیچھے بجز افسوس و حسرت کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا اس کا محتاج نہیں کہ تم سے اپنی مردہ سنت کو زندہ کرائے مگر تمہارے لئے فخر کا موقع ہے کہ تم کو سو شہیدوں کا اجر دینے کے لئے انتخاب فرمائے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف ۔۔۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد[1]

پھر میرے حقوقِ تعلقات ادا کرنے کا دن بھی یہی ہے کہ میں چاہتا ہوں یہ نکاح ضابطہ پُری کا اور اوپری دل سے نہ ہو بلکہ اُمنگ اور چونپ سے ہو کہ حقیقت میں مسلمان کے خوش ہونے کے قابل یہی نکاح ہے۔ چونکہ مجھے تم سے توقع ہے کہ اس وقت دین کی خاطر میرے قوت بازو بنو گے اور کر دکھاؤ گے جو مسلمان کو ایسے موقع پر کرنا چاہئے لہٰذا مجھے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ فلاں جگہ میں نے تجویز کی ہے اور زندگی کا اعتبار نہیں، میں چاہتا ہوں کہ جلد اس خوشی کو آنکھوں سے دیکھوں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا اور وہ عمل ہوا کہ عمل کرنے والے دنیا سے رخصت ہوئے مگر کارنامہ آبِ زر سے لکھا ہوا ہر دل پر ثبت ہے۔

بہو کو آپ نے باپ کے گھر پہنچایا کہ اعلانِ عام اسی میں تھا اور نکاحِ اول کا اس کو نمونہ بنانا تھا، باوجودیکہ عبدالرشید کے نکاح میں آپ تشریف نہیں لے گئے بلکہ دولہا کو چند احباب کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ اُس وقت اتباعِ شریعت اسی سادگی کو مقتضی تھا مگر اس نکاحِ ثانی میں آپ نے شرکت کا وعدہ فرمایا اور حالانکہ علیل و کمزور تھے مگر خاص اہتمام کے ساتھ وقت سے پہلے پہنچے۔

احیاءِ سنت کیلئے شاندار دعوت کا اہتمام کرانا

نکاح کا وقت آیا تو عبدالعزیز خاں کو بلایا اور چپکے سے فرمایا دل یوں چاہتا ہے کہ بستی اور نواح کی ساری قوم کو دعوت[2] دی جائے

---

[1] جنگل کے سب ہرن اپنا سر ہتیلی پر رکھے ہوئے ہیں اس امید پر کہ کسی دن آپ شکار کے لئے آجائیں گے۔ [2] تاکہ وہ سب لوگ شریک ہوں اور آنکھوں سے دیکھ لیں کہ نکاح بیوہ یوں کیا جاتا ہے اور جو نفرت رواج کی اس وقت میں بیٹھی ہوئی تھی وہ جاتی رہے۔ یہ دعوت نام و نمود کے لئے نہیں تھی بلکہ رسم و رواج کو توڑ کر سنتِ نبوی کو زندہ کرنے کی تھی۔

اگر مالی وسعت ہو تو اس خرچ کو جنت کی قیمت سمجھو کہ پھر وقت نہ ملے گا۔ عبدالعزیز خاں حیران تھے کہ پہلا نکاح تو اتنا سادہ کہ نہ خود تشریف لائے اور نہ کسی کی دعوت پسند فرمائی اور اب خلافِ عادت خود مشورہ ہے خرچ کا اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرض لیکر بھی اس ضیافتِ عامہ پر طیار ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت حق تعالیٰ نے حضرت کی جوتیوں کے طفیل سب کچھ دے رکھا ہے جیسے جیسے ارشاد ہو دعوت دیدوں۔ یہ سُن کر آپ کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑی اور فرمایا کہ آس پاس سب ہی کو بلاؤ اور ہمت ہو تو کھانا بھی میٹھا اور نمکین دونوں قسم کا پکواؤ اور دل کھول کر کھلاؤ کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ اجر و ثواب کی بکھیر لوٹنے کا کوئی موقع نہ ہوگا اس لئے ہمت نہ ہارو اور جتنا اعلان ہوسکے خوب کرو۔

چنانچہ سب کچھ ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ شادی میں نہ خرچ کرنا منع ہے نہ بخل و تنگی واجب، یہ امور دل کی خوشی کے تابع ہیں۔ دنیا داروں کے نزدیک پہلا نکاح حوصلہ و خوشحالی دکھانے کا وقت بنتا ہے مگر دینداروں کے نزدیک جس نکاح میں اللہ کا بول بالا اور رسول کی مردہ سنت زندہ ہوتی ہو اس کی خوشی کے برابر معمولی و رسمی ہزار نکاح بھی نہیں ہوسکتے کہ رسمی نکاح محض رفع ضرورت ہے جیسا بھی سادہ ہوجائے بہتر ہے مگر جس خرچ میں دینی مصلحت ہو کہ حب خدا و رسول اس کے محرک ہیں وہ سب صدقات کے حکم میں ہے اور اس کا پیسہ پیسہ ستر ستر ہزار بن کر قیامت میں ملے گا۔ غرض آپ کا حال کچھ عجیب حال تھا کہ دنیا جسے غم کہتی ہے وہ آپ کے لئے عین خوشی تھی اور دنیا کے نزدیک جس کا نام خوشی ہے وہ آپ کے لئے حزن و غم ؎

عجب حال میرا مثل ابر و برق و باراں تھا	میں رونے میں بھی خنداں تھا میں ہنسنے میں بھی گریاں تھا

آپ پر محبوبیت غالب تھی ہر کہ و مہ[1] کا دل آپ کی طرف کھنچتا تھا، آپ کی مجلس انوار و برکات کی مخزن تھی۔ آپ کی صورت دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ آپ نے چاہِ کنعان میں چھپنے کی لاکھ کوشش کی مگر قدرت نے آپ کو بازارِ مصر میں نکال کر آخر منصۂ ظہور اور تختِ عروج و شہرت پر لا بٹھایا اور آپ دانۂ تخم کی طرح لاکھ مٹے مگر کشتِ زار ہو کر مخلوق کو شکم سیر بنانے کے لئے باہر نمودار ہوئے بغیر نہ رہے۔ آپ دنیا کے لئے رحمتِ الٰہیہ تھے کہ اجابت آپ کی دعاؤں کا استقبال کرتی اور آپ منصب ارشاد و ہدایت کے تاجدار تھے کہ درخت کا پتہ پتہ اور نہر کا قطرہ قطرہ حاضرین کو ذکر اللہ کا سبق پڑھایا کرتا تھا۔ آپ کی عمر اپنے مولیٰ کی یاد میں ختم ہوئی کہ تین برس کی عمر سے آپ کے قلب میں قطبِ وقت مولانا گنگوہی کی محبت کا تخم جما اور آخر اسی میں تمام ہوگئے کہ ہڈیوں کا گودا بھی جل جل کر خشک ہوگیا ؎

وہ راز ہوں جو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا	وہ نکتہ ہوں جو بیاں ہو کے بھی بیاں نہ ہوا
رُواں رُواں مرا کیا عشق میں زباں نہ ہوا	بیاں نہ ہوتا تھا یہ حالِ دل بیاں نہ ہوا

[1] چھوٹا بڑا۔

ایک مخلص طبیب نے آپ کے آخری مرض میں نبض دیکھکر عرض کیا کہ حضرت آپ کو تو بہت پرانی تپ معلوم ہوتی ہے اور ایسی ہے جیسے کسی غلبۂ حزن وغم میں حادث ہوتی ہے اور اندر ہی اندر گھلاتی ہے۔ برسہا برس گذر جانے پر اس وقت آپ کو جوش آیا اور فرمایا ہاں حکیم صاحب سچ فرمایا مجھے تپ شروع

حضرت گنگوہی سے قلبی تعلق اور شیخ الہند سے محبت

اس دن ہوئی جس دن حضرت گنگوہی نے دنیا کو الوداع کہا اور اس کا بدن پر ظہور اس دن ہوا جس دن خبر سنی کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں قید ہو گئے۔ آج مولانا رہا ہو کر تشریف لے آویں تو کچھ نہ سہی ایک دفعہ تو جھرجھری لیکر اٹھ ہی کھڑا ہوں گا۔ اتنا فرما کر چپ ہو گئے اور آخر اسیر مالٹا کے ہندوستان آنے سے قبل ہی دنیا سے سدھار لئے ؎

مرادردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ۔ وگردم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد[1]

مولانا محمد یحییٰ سے دل کی بے چینی کا اظہار اور مولانا کا دلچسپ جواب

ایک مرتبہ بیماری میں بندہ اور مولوی محمد یحییٰ مرحوم حاضر ہوئے۔ دونوں سے حضرت کو کمال بے تکلفی تھی اس لئے جب سب اُٹھ گئے تو فرمایا مجھے ایک پریشانی لاحق ہے جس میں گھلا جاتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے بندۂ مومن کو لقاء رب کی تمنا ہوتی ہے اور میں اپنے اندر اس مضمون کو نہیں پاتا۔ مولوی یحییٰ صاحب نے کہا حضرت یہ تمنا و شوق تو عند الموت ہوتا ہے اور آپ ابھی مرنے والے نہیں۔ آپ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا کہ مرنے کو تو پڑا ہی ہوں اور اسی لئے فکر ہے کہ شوقِ لقاء کیوں نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا پھر حضرت ہمارے لئے تو مبارک ہے کہ ابھی حق تعالیٰ نے اس وقت کو مؤخر فرمایا کہ وہ وقت ہوتا تو شوق لقاء بھی غالب آتا۔"

چنانچہ آپ تندرست ہو گئے اور زندہ رہے حتیٰ کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے بھی دفعۃً انتقال فرمایا اور یہ تیسرا روح فرسا صدمہ آپ کو پہنچا جس کو آپ نے سابق صدمات کے پہلو میں رکھ لیا۔ آخر جب وہ وقت آیا جس کے آپ منتظر تھے تو باوجودیکہ کروٹ لینا دشوار تھا اور نماز کے لئے بھی دو آدمی سہارا دے کر اُٹھاتے اور پلنگ سے اتار کر مصلے پر بٹھا دیا کرتے تھے مگر آپ پر آستانۂ محمدیہ کی حاضری کا غلبہ ہوا اور آپ نے سفرِ حج کا پختہ قصد کر لیا۔

کمال ضعف کے باوجود حج و زیارت کا شوق

میں حاضر ہوا تو آپ نے بڑے اہتمام سے مجمع کو اٹھا کر تنہائی حاصل کی اور مجسم شوق بن کر فرمایا میں تو تیرا

---

[1] میرے دل میں ایک ایسا درد ہے کہ اگر کہہ ڈالوں تو زبان کو پھونک دے اور اگر سانس اندر کھینچ لوں تو ڈر ہے کہ ہڈیوں کا گودا بھی جلا ڈالے۔

[2] یہ ذوق و شوق عشق کا کرشمہ ہے اس کو قاعدوں سے نہ پرکھا جائے گا۔

انتظار ہی دیکھ رہا تھا کہ دل کی بات کہوں۔ وہ یہ ہے کہ امسال حج کا ارادہ کرچکا ہوں اور تمنا ہے کہ زندہ رہوں تو پہلے جہاز پر سوار ہو جاؤں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آفرین ہے حضرت کی ہمت پر کہ کروٹ تو لی نہیں جاتی اور قصد ہے اس کٹھن سفر کا جس میں مستعد جوان بھی چور چور ہو جاتے ہیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا حضرت بوڑھے جوان سب ہی اس راستے میں چلتے ہیں۔ پس مجھے تو کوئی پکڑ کر ریل میں ڈال دے تو پڑا پڑا انشاء اللہ چلا ہی جاؤں گا۔

میں نے دیکھا کہ یہ غلبۂ شوق دبنے والا نہیں تو موافقت کا پہلو لے لیا اور عرض کیا ہاں حضرت "ہمت کا حامی خدا ہے" جب حضرت نے قصد فرما لیا تو انشاء اللہ پہنچنا کچھ دشوار نہیں۔

حضرت سہارنپوری سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش

فرمایا الحمد للہ تو نے تو موافقت کر لی اب ایک خاص درخواست ہے وہ یہ کہ بس اب حضرت سہارنپوری کا میرے بزرگوں میں ایک دم باقی ہے جن کے حکم کے سامنے چون وچرا کی ہمت نہیں اس کا سہم چڑھا ہوا ہے کہ حضرت نے اجازت نہ دی اور منع فرمایا تو پھر کیا کروں گا۔ بس یہ خدمت تیرے سپرد ہے کہ حضرت سے بخوشی اجازت دلوا دے۔ میں چونکہ سمجھ رہا تھا کہ یہ تو سرکار کے بلاوے کی علامت ہے کہ حاضریٔ آستانہ کا شوق بیتاب بنا رہا ہے ورنہ موسم حج میں ابھی اتنا وقت ہی کہاں اس وقت تک حضرت حیات ہی رہیں تو زہے نصیب۔ پھر آپ کے دل کو پژمردہ کیوں کروں اس لئے میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت انشاء اللہ ضرور کوشش کروں گا اور امید قوی ہے انشاء اللہ حضرت انکار نہ فرمائیں گے بلکہ کیا عجب ہے حضرت بھی قصد فرما لیں اور پھر بندہ بھی ہمرکاب ہو۔ اتنا سن کر فرحت وسرور سے حضرت کا چہرہ چمکنے لگا اور "الحمد للہ الحمد للہ اب اطمینان ہو گیا" فرماتے ہوئے از خود اٹھ بیٹھے کہ تکیہ سے سہارا لگائے دیر تک اسی کی باتیں کرتے اور مزہ لیتے رہے۔

وصیت وہبہ کا اہتمام

آپ نے وفات سے قبل اپنا تمامی سامان حتی کہ بدن کے کپڑے تک وصیت وہبہ کے ذریعہ دوسروں کی ملک بنا دیئے تھے مگر تیرہ سو روپیہ نقد زادراہ بنا کر مولانا عبد القادر صاحب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اس کو محفوظ رکھو یہ میرے اور تمہارے سفر حج کا خرچ ہے۔ آخر جوں جوں حج کا موسم قریب آتا گیا آپ کا مرض وضعف بڑھتا اور وصال کا وقت قریب آتا گیا حتی کہ آپ نے سمجھ لیا کہ اب گنجائش نہیں رہی اور تیرہ سو روپیہ ترکہ بنا چاہتا ہے۔ تب آپ نے مولانا کو بلا کر وہ بھی تقسیم [illegible] کیونکہ آپ مولیٰ کریم سے ایسی حالت میں ملنے کے متمنی تھے کہ دنیا کا کوئی حبہ اور پارچہ بھی آپ کی [illegible] نہ ہو۔ بیت کے دھیان سے ہٹ کر اب آپ رب البیت کے خالص تصور میں غرق ہو گئے

اور آخر چندہی روز بعد وہ مبارک وقت آیا جس کے شوق میں آپ کا رواں رواں پکارتا تھا ؎

خرم آں روز کہ ازمنزلِ ویراں بروم[1] — راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے[2] — تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

حضرت سہارنپوری کا خواب

آپ کے مرض کو چونکہ امتداد زیادہ ہوگیا تھا اس لئے زائرین آتے اور چلے جاتے تھے، کس کو خیال تھا کہ فلاں وقت رخصت کا ہے اور ٹھہرنا چاہئے۔ حضرت سہارنپوری نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہوگیا اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ حسب معمول تہجد کے وقت حضرت اٹھے اور نفلوں سے فارغ ہو کر متفکر بیٹھ گئے۔ اہلیہ نے پوچھا آج عادت کے موافق آپ نفلوں کے بعد لیٹے کیوں نہیں اور طبیعت کچھ فکرمند معلوم ہوتی ہے کیا بات ہے؟ آپ نے خواب کا اظہار کیا اور محزون لہجہ میں فرمایا اس کی تعبیر ایک تو یہ ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں محبوس ہیں دوسرے مجھ کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں شاہ عبدالرحیم صاحب کی حالت نازک نہ ہو۔

غرض صبح کو حضرت بیلون روانہ ہوگئے جہاں تبدیلِ آب و ہوا کے لئے حضرت کا قیام تھا۔ بعد مغرب حضرت نے فرمایا آج عشا کی نماز ذرا سویرے پڑھ لیجو۔ چنانچہ یہ سمجھ کر کہ آرام کی خواہش ہوگی نماز اول وقت پڑھ لی گئی اور آپ چارپائی پر لیٹ رہے۔ حضرت دوسرے کمرہ میں جا لیٹے کہ دفعۃً آپ کو آخری کرب شروع ہوا اور حضرت اپنے کمرہ سے لپک کر پاس آئے۔ مولانا نے حضرت کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور آپ کا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا۔

انتقال ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ

حضرت نے پڑھنا شروع کیا اور رائپور کا آفتاب اپنے محبوب کا ہاتھ چھاتی پر رکھے ہوئے چند منٹ کے اندر شب کے ۱۱ بج کر ۱۹ منٹ پر غروب ہوگیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ صبح کو جنازہ رائپور کی طرف چلا اور خدام کا مجمع بحسرت واندوہ یہ کہتا ہوا پیچھے پیچھے ہولیا ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو[3] — تو کجا بہر تماشا می روی

آخر اسی باغ میں جہاں آپ کی حیاتِ شریفہ کا آخر حصہ گذرا تھا مسجد کی جنوبی سمت آپ کا وہ جسدِ اطہر جو رضا و تسلیم کے جھولے میں مدتوں پڑھا اور اترا تھا ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء

---

[1] میں خوش ہوں گا اس دن کہ اس اجڑے گھر سے چلا جاؤں گا روح کی راحت حاصل کروں گا محبوب کے لئے روانہ ہوں گا۔
[2] میں نے منت مانی ہے کہ اگر کسی دن یہ غم سر میں آجائے گا تو میکدہ کے دروازہ تک خوشی خوشی غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا۔
[3] اے وہ ذات کہ تیرا چہرہ تمام عالم کا تماشا تھا تو اب کہاں تماشے کے لئے جا رہا ہے۔

یوم سہ شنبہ کو سپرد زمین کر دیا گیا مگر تنہا نہیں بلکہ ہزاروں یادگاریں چھوڑ کر اور ہزاروں کی حسرتوں اور تمناؤں کو ساتھ لیکر ؎

اکیلا کون کہتا ہے لحد میں نعشِ حاتم کو ہزاروں حسرتیں مدفون ہیں دریا کے پہلو میں

بات بہت دور پہنچ گئی کہ سوانح خلیلیہ لکھنا ہے نہ کہ سوانح رحیمیہ مگر بے اختیاری میں قلم سے نکلا جو نکلنا تھا اور وہ بھی اس ضمن میں کہ حضرت کے شاگردوں میں کوئی بھی کامیاب نہ ہوتا تب بھی حضرت مولانا عبد الرحیم صاحبؒ کا ایک وجود باجود جس کی جوتیوں کے طفیل ہزاراں ہزار مخلوق کامگار و بامراد ہوگئی فخر کے لئے کافی تھا کہ اس کی شان یہ تھی جس پر توجہ کی اس کو مالا مال بنا دیا اور جس طرف نظر ڈالی اس کو عشق و محبت کا مزہ چکھا دیا ؎

وہ لوٹ پوٹ ہی دیکھا نگاہ کی جس پر کسی کے بس کا ترا تیر بے کماں نہ ہوا

بالخصوص جبکہ دونوں حضرات کی باہمی مخلصانہ محبت اتنی متعدی بھی ہو چکی تھی کہ اِن کے متوسلین اُن کو گویا شیخ ہی سمجھتے تھے اور اُن کے متعلقین اِن کو پیر کے حکم میں مانتے تھے۔

حضرت مولانا رائپوری کے اس رنگ کو میں نے بارہا غور سے دیکھا کہ حضرت کے تشریف رکھتے ہوئے کوئی صاحب آتے اور مصافحہ کرنے کے لئے مولانا کی طرف بڑھتے تو حضرت مولانا اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے اور حضرت کی طرف اشارہ کرکے ان کو تنبیہ فرماتے کہ گستاخ نہ بنو پہلے حضرت سے مصافحہ کرو کہ اقدم و افضل[1] ہیں اور پھر مجھ سے۔

سفرِ حج کو جانے کے وقت حضرت کے تلامذہ کی درخواست ہوئی کہ مسلسلات اور سورۂ ص کی سنا کر باقاعدہ اجازت و سند عطا فرما دیں۔ چنانچہ حضرت نے منظور فرما لیا اور کہا کہ سب لوگ اوپر چل کر بیٹھو، میں آتا ہوں۔ چنانچہ پچیس ۲۵ تیس ۳۰ طلبہ صف باندھ کر بیٹھ گئے۔ حضرت اوپر چڑھے تو بندہ بھی ساتھ ہو لیا کہ اجازت میں شریک ہوں گا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ حضرت مولانا رائپوری بھی طلبہ کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں اور حضرت استاذ کی آمد کا انتظار فرما رہے ہیں کہ جہاں ان طلبہ کو اجازت ملے وہاں مجھے بھی یہ شرف نصیب ہو۔ آہ کیا کہوں اور کس زبان سے کہوں کہ ان آنکھوں نے کہاں کہاں اور کیسا کیسا موسم بہار دیکھا اور اب وہی آنکھیں چار سو خزاں کا عالم دیکھ رہی ہیں مگر نہ بہار میں کچھ کمایا نہ خزاں میں عبرت پکڑی۔ فالی اللہ[2] المشتکی۔ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ[3] ؎

تہیدستانِ[4] قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

---

[1] اقدم و افضل۔ [2] تو اللہ تعالیٰ ہی سے شکایت ہے۔ [3] میں اپنی پریشانی و غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے ہی کرتا ہوں۔ [4] قسمت کے خالی ہاتھ والوں کو کامل راہبر سے بھی کیا فائدہ کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام چشمۂ آبِ حیات سے سکندر کو پیاسا ہی لے آئے تھے۔

حدیث اور فقہ

ایک سلیم المزاج شخص ذوق کے صحیح ہونے کی وجہ سے نمکین وشیریں ہر لذیذ غذا کا مزہ لیتا ہے مگر پھر بھی مختلف لذائذ میں کسی خاص ذائقہ کے ساتھ اس کو مخصوص رغبت ہوتی ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو نمکین چیز سے خاص رغبت ہے اور فلاں شخص کو شیرینی سے۔ اسی طرح متبحر علماء کو ہر علم کی واقفیت تامہ ہوتی ہے کہ جس فن کی جو کتاب بھی سامنے آئے اس کو ایسا پڑھاتے ہیں گویا اس فن کے موجد یا اس میں غرق و منہمک ہیں۔ مگر با ایں ہمہ تمامی علوم میں کسی ایک دو علم کے ساتھ ان کی طبیعت کو خاص مناسبت اور دلچسپی ہوتی ہے گویا تمام علوم مسکونہ مکان ہوتا ہے کہ جہاں بیٹھ جائیں وہاں بیٹھے ہوئے سجتے ہیں مگر مکان کا وہ کمرہ جس کو طبیعت نے رہایش کے لئے خاص کرلیا ہے ایک مخصوص شان رکھتا ہے کہ جو دلبستگی وانبساط اس میں بیٹھ کر نصیب ہوگا وہ مکان کے کسی حصہ میں بھی نہ ہوگا۔ حضرت کو علوم نقلیہ وفنونِ عقلیہ میں کوئی علم وفن ایسا نہیں جس کے پڑھانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ تفسیر حدیث، فقہ، اصول، معانی، کلام، منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب، ریاضی، عروض، نحو اور صرف، سب ایسے تھے جیسے مختلف برتن اور آپ کی مثال پانی کی سی تھی کہ مربع[1] مستطیل[2]، گول بیضوی، مسدس[3]، مخمس[4] جس وضع کے برتن میں بھی پڑا اس کی وضع لے لی اور ایسا معلوم ہوا گویا اس کی شکل اسی ظرف کے مناسب ہے مگر با ایں کمال حدیث اور فقہ سے آپ کی طبیعت کو ایک خاص مناسبت تھی کہ طبعاً آپ ان دو علوم سے رغبت ودلچسپی رکھتے اور ان کے درس میں آپ کی وہ کیفیت ہوتی تھی جو صاحبِ مکان کی اپنے مانوس حجرہ یا کمرہ میں بیٹھ کر ہوا کرتی ہے۔ اور یہی دو علم ہیں جن پر عمل کرنا انسان کی زندگی کا مقصود اور شریعتِ محمدیہ کا خلاصہ[5] ہے۔

سنہ ۱۳۱۴ھ میں جب حضرت مظاہرِ علوم میں صدر مدرسی پر تشریف لائے تو قدرت نے آپ کے ذوقِ طبعی کا سامان مہیا فرما دیا اور اب آپ کے سپرد حدیث ہی کے اسباق ہوئے کہ کلام الرسول کے بحرِ زخار سے دُرِّ نفیس نکالیں اور اطرافِ دنیا سے جمع ہونے والے مہمانانِ رسول پر نچھاور فرمادیں۔

سننِ ابی داؤد سے خاص اعتناء

کتبِ حدیث میں ابوداؤد شریف کو بالخصوص آپ مشکل سمجھتے اور اس کے درس میں خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات صاحبِ فن ہی سمجھ سکتا ہے

[1] چو پہلو چاروں طرف برابر [2] لمبائی والا۔ [3] چھ پہلو والا۔ [4] پانچ پہلو والا۔ [5] کیونکہ وحی الٰہی ہے جو دو طرح ہوتی ہے مع الفاظ اور بلا الفاظ اول قرآن مجید دوم حدیث ہے اور حدیث شریف قرآن مجید کا بیان ہے پھر حدیث کی گہرائیاں اور دقائق فقہ سے معلوم ہو کر مسائل بنتی ہیں اس لئے بھی دونوں علم وحی کا مفہوم ہیں۔

کہ ابوداؤد میں دیگر کتب حدیث کی بہ نسبت کیا اشکال بڑھا ہوا تھا، عوام کی فہم کو اس سے تعلق نہیں بولا محمد یحییٰ صاحب بھی اس میں حضرت کے ہمخیال تھے اور اس لئے جب سے آپ مدرسہ میں تشریف لائے ابوداؤد کا سبق آپ کے یا مولوی محمد یحییٰ صاحب کے پاس رہا اور آپ نے تیسرے کے پاس جانا اس کا گوارا نہیں فرمایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد کی بعض عبارتیں ایسی مغلق ہیں کہ مہارتِ فن کے بعد بھی ان کا حل مشکل ہے۔ نیز صاحبِ ابوداؤد نے ابوابِ فقہیہ کے جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کیا اور گویا محدث و فقیہ دونوں کا منصب پورا فرمایا ہے اس لئے اس کی شان اور دقتِ انسا بڑھ گئی۔ پھر اس کی کوئی شرح بھی ایسی شافی وکافی نہیں جو اس کے حل مطالب میں مدد دیسکے۔ غایت المقصود اور عون المعبود اگرچہ اس کی شرح کہلائیں مگر ان کے مؤلف متاخرین اہلحدیث ہیں جو مقلدین کو خاطی ٹھیراتے ہیں اور اس لئے حضرات ائمہ بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر جگہ جگہ دلیرانہ قلم چلا ہے۔[1]

زمانۂ طالب علمی سے سننِ ابی داؤد کی شرح کا خیال

بایں وجوہ مدت سے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہیں کہ زمانۂ طالب علمی سے آپ کے قلب میں اس کی شرح کا داعیہ تھا مگر کام کوئی معمولی نہ تھا۔ وقت بھی وسیع چاہتا تھا اور دماغ بھی ذکی اور تمامی افکار سے فارغ اس لئے شوق وولولہ آپ کی ہمت ابھارتا مگر چار طرف موانع ومشاغل کا ہجوم ہمت کو پست کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ تین مرتبہ آپ نے خیال کو عزم کے درجہ میں لاکر قلم اٹھایا اور کام شروع کیا مگر پورا ہونا تو درکنار معتدبہ مقدار بھی پوری نہ ہوئی اور آخر وہ لکھا ہوا مسودہ گم ہو گیا۔

تیسری مرتبہ مسودہ آپ کے کاغذات میں ملا تو دیکھا کہ اس پر لکھا ہوا تھا "حل المعقود الملقب بالتعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد مرۃ ثالثۃ ۱۳۱۱ھ"

تالیف شرح حدیث کیلئے بڑی ہمت درکار ہے

تالیف جتنا دشوار کام ہے اس کو کوئی مؤلفین کے دلوں سے پوچھے۔ بالخصوص شرح حدیث کی تالیف کہ لفظ لفظ پر ادب والتجا اور ضعفِ بشریت وہیچمدانی کی نذر پیش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ آزادی جس کو طبیعت کا چلنا بولتے ہیں کسی وقت بھی نصیب نہیں ہوسکتی اس لئے آپ کا اس اہم کام کے لئے ہمت کرنا تعجب تھا اور ہمت کرکے چھوڑ دینا کچھ بھی تعجب نہ تھا۔ مؤلف جب تالیف شروع کرتا ہے تو بس ایسی کا ہو رہتا ہے کہ درس تو درکنار کسی سے بات کرنا اور اپنے مقفل حجرہ سے باہر نکلنا بھی کام کے لئے مضر[2] اور مخل معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایسا شخص جس کی عمر کے بیالیس سال مدارس میں طلبہ کو درس دیتے گذر لئے اور

---

[1] مگر خود حضرت نے بذل المجہود شرح لکھ کر ان کو سہل کر دیا۔ [2] خلل ڈالنے والا۔

زمانۂ طالب علمی کی محنت و دماغ سوزی سے آرام نہ ملا تھا جو ساتھ ہی ساتھ پڑھانے کی تعب و مشقت کا بارِ عظیم دماغ پر پڑ گیا اور پھر اتنی مدت ممتد ہوا جو نوجوان کو بوڑھا بنانے کا معیار ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا کسی معمولی تصنیف کی طرف متوجہ ہونا بھی ہمت ہی ہمت تھی چہ جائیکہ حدیث کی شرح اور وہ بھی ابوداؤد کی جس کا عبارت کے لحاظ سے بھی صحیح نسخہ ملنا مشکل تھا۔ اس لئے ۱۳۰۱ھ کا مسودہ بھی ناتمام رہ کر ان علمی کاغذات میں جا شامل ہوا جن کی بیکسی پر افسوس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے

نہ گل ہی تھے نہ شمعیں تھیں نہ کوئی فاتحہ خواں تھا عجب حسرت کا منظر منظرِ گورِ غریباں تھا

اب مظاہر علوم میں آکر تو آپ کے ذمہ کام پر کام بڑھ گیا اور درس کے بارِ عظیم پر نظام کا بوجھ اتنا بھاری تھا جس نے دماغ کو کسی طرف توجہ کے قابل ہی نہ رکھا۔ بالخصوص جبکہ اس پر ہر شعبہ کی ترقی کا فکر اور پے در پے اسفار مرتب ہوئے جنھوں نے کار تدریس پورا کرنے لئے مولوی محمد یحییٰ صاحب کو گنگوہ سے بلا کر مدرسہ میں لا بٹھانے پر مجبور کیا۔ مگر اللہ رے ہمت کہ جوں جوں عمر زیادہ ہو کر ضعف بڑھتا جاتا تھا دن دوں آپ کے مشاغل دینیہ علمیہ بڑھتے جاتے اور فرصت و مہلت گھٹتی جاتی تھی۔ مگر ابوداؤد کی شرح کا شوق اسی امنگ کے درجہ میں تھا جو ہر طرح فارغ البال خوشحال بے فکرے نوجوان کو ہر قسم کی راحت و یکسوئی حاصل ہونے کے وقت میں ہونا چاہئے۔ عجیب وقت تھا کہ نہ شوق پورا ہو سکتا تھا نہ دل سے نکل سکتا تھا

اک عمر سے انجمن میں مری جانِ حزیں ہے یہ بھی ہے کوئی بات کہ ہاں ہے نہ نہیں ہے

ان تمامی موانع کے ساتھ ایک بڑا ہمت شکن امر یہ تھا کہ حضرت گنگوہی دنیا سے رخصت ہو لئے جن کا وجود باجود آقا ہونے کے علاوہ تبحر علمی کے درجہ میں بڑا سہارا تھا کہ جہاں کوئی اشکال پیش آئے گا اس کو شرح مجسم سے حل کر سکیں گے اور اس پر طرہ یہ کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب جو محدث گنگوہی کی بڑی یادگار تھے اور اس اہم خدمتِ تالیف میں بہت کچھ مدد دے سکتے تھے وہ بھی عالمِ خموشاں کو سدھار لئے۔ قطع نظر اس کے کہ ان صدماتِ عظیمہ نے کمر توڑ دی یوں بھی علمی تالیف میں ہمت کو پارہ پارہ کر دیا کہ پہلے ہوس کے درجہ میں اس کا نام لیتے تو اب بھول کر بھی اس کا خیال نہ لاتے۔ مگر قدرت کو آپ کے ہاتھوں ایک حیرت بخش کام لینا اور آپ کے اعمال نامہ میں صدقات جاریات اور باقیات صالحات کے اندر کلام الرسول کی اس ضروری و اہم خدمت کو زریں حروف سے درج کرنا منظور تھا اس لئے عین اس وقت جبکہ آپ کی عمر چونسٹھ ۶۴ سال پوری ہو گئی اور آپ اپنے ظاہری و باطنی جانشین مولوی محمد یحییٰ کے انتقال کی خبر سن کر سفر حج سے واپس وطن پہنچے تو اس دبے ہوئے شوق کو ابھرا ہوا لے کر پہنچے کہ ظاہری اسباب منقطع ہو چکے اور صورت و حقیقت دونوں اعتبار سے علیم و قدیر خدا پر نظر رہ گئی۔ اور در حقیقت یہ اسی رفیق اعلیٰ کی طرف سے کشش کا

ظہور تھا جو ہمیشہ اپنے محبین سے وہ کام لیتی رہی جس پر اسباب نے ہمیشہ دانتوں میں انگلیاں دبائیں اور دنیا حیران ہو کر تکتی رہی کہ ؎

اگر از جانبِ معشوق نباشد کششے　　　طالبِ عاشق بیچارہ بجائے نرسد[1]

مولوی محمد زکریا صاحب شعبان ۱۳۳۳ھ میں حدیث کے علاوہ تمام کتابوں سے فارغ ہو لئے تھے کہ شوال میں حضرت نے حجاز کا قصد فرما دیا اور انھوں نے یہ قصد کیا کہ ترمذی و بخاری جو ہمیشہ حضرت کے ہاں ہوتی تھی حضرت کی واپسی پر حضرت ہی سے پڑھوں گا مگر کامیاب نہ ہوئے اور حضرت کے پیچھے اپنے والد بزرگوار مولانا محمد یحییٰ صاحب سے دورہ پورا کرنا پڑا۔ دوسرے سال ادھر مولانا محمد یحییٰ صاحب کا وصال ہوا اور ادھر حضرت کی حجاز سے واپسی ہوئی تو حضرت کا ان کو اور ان کے رفیق مولوی حسن احمد مرحوم کو ایما[2] ہوا کہ ترمذی و بخاری دوبارہ مجھ سے پڑھو۔ تعمیلِ حکم کے درجہ میں شروع کر دی مگر یہ جتلانے کے لئے کہ پوری محنت سے پڑھ چکے ہیں اور اس توقع پر کہ حضرت دوبارہ پڑھنے کو بے ضرورت فرما کر چھوڑنے کی اجازت دیدیں گے خوب ہی مطالعہ دیکھتے اور حواشی کی کوئی تقریر ایسی نہ ہوتی جس کو رات میں از بر نہ کر لیتے تھے حضرت کے سامنے جاتے تو ایسا پڑھتے گویا چند بار پڑھا لینے والا مدرس پڑھتا ہے اور روز اس کے منتظر رہتے کہ آج چھوڑنے کی اجازت ضرور مل جائے گی مگر تین مہینے ہو گئے کہ حضرت مرحوم کے نورِ نظر جانشین کے اس تبحر و مناسبتِ حدیث کو دیکھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہوتے مگر یہ اشارہ بھی نہ فرماتے کہ چھوڑ دو پڑھنے کی ضرورت نہیں"۔

ایک دیرینہ آرزو کا اظہار

آخر ایک دن جبکہ سبق سے فارغ ہو کر یہ دونوں اپنی عادت کے موافق دار الحدیث سے حضرت کے ساتھ مدرسۂ قدیم کو آرہے تھے راستہ میں حضرت نے یہ الفاظ فرمائے "مجھے ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ابوداؤد پر کچھ لکھوں۔ کئی دفعہ شروع کر چکا مگر پورا نہیں ہوا۔ اب یہ خیال ہے کہ اگر تم دونوں اعانت کرو تو شاید پوری ہو جاوے"۔

مولوی زکریا کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ ہاں حضرت ضرور شروع فرما دیں۔ نیز یہ بھی کہا کہ حضرت یہ میری دعا کی قبولیت کا ثمرہ ہے۔ حضرت نے فرمایا یہ کیا؟ عرض کیا کہ والد صاحب نے جب مجھے مشکوٰۃ شریف شروع کرائی تو بڑے اہتمام سے غسل فرما کر دو رکعت نفل پڑھ کر شروع کرائی تھی اور بسم اللہ پڑھانے کے بعد دیر تک قبلہ رو طویل دعا مانگی تھی۔ اس کا تو مجھے علم نہیں کہ انھوں نے کیا دعا مانگی مگر میں نے اس وقت صرف یہ ایک دعا دیر تک کی تھی کہ بار الٰہا اب مجھ سے حدیث شریف کا مشغلہ ترک نہ ہو" میں نے

[1] اگر محبوب کی جانب سے کشش نہ ہو تو بیچارہ عاشق طالب کسی جگہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ [2] اشارہ۔

اس دعا کو از قبیل محالات سمجھ رہا تھا کیونکہ مدارس کا طرز یہی ہے کہ فارغ شدہ طالب علم کو ابتدا سے درجہ بدرجہ کتابوں کا پڑھانا ہوتا ہے اور برسوں کے بعد حدیث کا درس دینے کی نوبت آتی ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے شروع ہی سے حدیث کا سبق مل جاتا پس مراد پوری ہونے کی کوئی صورت تو سمجھ میں آتی نہ تھی مگر دعا ہی کرتا تھا۔ سو اس سے بہتر کیا کہ حضرت شرح ابی داؤد شروع فرما دیں اور میں کتابوں کی تلاش اور تتبع اقوال و معانی[1] میں لگا رہوں۔ حضرت یہ سن کر مسکرائے اور کتابوں کی فہرست لکھائی کہ کتب خانہ سے یہ کتابیں نکال لو۔

شرحِ سننِ ابی داؤد کا آغاز

چنانچہ ۲ ربیع الاول سنہ ۳۵ھ کو کتب خانہ سے وہ کتابیں لی گئیں جن کی شرح کے لئے ضرورت تھی اور ۳ ربیع کو دار الطلبہ کے اس کمرہ میں جہاں خزانہ محفوظ ہے بیٹھ کر بسم اللہ لکھی گئی۔

نو ماہ میں ایک جزو کی شرح

مولوی زکریا صاحب کاتب بنے کہ حضرت قدس سرہ رعشہ کی وجہ سے لکھنے سے معذور ہو گئے تھے مگر مولوی صاحب کا خط زیادہ اچھا نہ تھا اس لئے چند روز بعد کتابت مولوی حسن احمد[عہ] کی طرف منتقل ہوئی اور تتبع و تلاش مولوی صاحب کے حوالہ مگر مولوی حسن احمد کا خط گو اچھا تھا لیکن ان کو نقطے لگانے کی عادت نہ تھی اس لئے حضرت لکھوانے کے بعد ان کی تحریر دیکھتے اور مرتعش ہاتھوں سے خود نقطے لگاتے، اس وجہ سے کتابت[عہ] پھر مولوی زکریا صاحب کے حوالہ ہوئی اور اس طرح ۳۰ ذیقعدہ سنہ ۳۵ھ کو پورے ۹ ماہ میں ابوداؤد کا ایک پارہ تمام ہوا۔

ذی الحجہ سنہ ۳۵ھ میں چند ماہ کے لئے مولوی شمس الحق صاحب اس کتابت کے لئے مستقل ملازم رکھے گئے اور آخر پھر مولوی زکریا صاحب کو دونوں کاموں کا سارا بار اپنے سر پر رکھنا پڑا کہ بوقت ضرورت تتبع بھی کریں اور پھر حضرت جو فرما دیں اس کو تحریر میں لا دیں۔ چونکہ مولوی زکریا صاحب مدرسہ میں مدرس ہو چکے اور ان کو اپنے اسباق کا پورا کرانا بہت ہی دشوار ہو گیا تھا کہ دماغ ہر وقت شرح کے مضامین اور تالیف کے مباحث و ضروریات میں منہمک رہتا تھا اور دوپہر اور شب کے خارجی اوقات میں اٹھتے بیٹھتے اسباق پورے کراتے تھے اس لئے محرم سنہ ۳۶ھ سے مستقل صبح کا وقت ان کا مدرسہ سے فارغ کرایا گیا اور اب وہ سکون کے ساتھ شرح ابی داؤد میں مشغول ہو گئے۔

---

[1] مضامین و اقوال کی ڈھونڈ۔

[عہ] شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ مولوی حسن احمد بہت قابل اور ذہین تھے بذل کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد جوانی میں انتقال کر گئے تھے۔ [عہ] کبھی کبھی مولانا زکریا صاحب کاندھلہ وغیرہ چلے جاتے تو لکھنے کے لئے حضرت مجھے بلا لیتے تھے۔ آپ خود مطالعہ فرما کر زبان سے فرماتے جاتے اور میں لکھتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مولوی مسعود نے بھی بعض اوقات لکھا ہے۔ (اخلاق احمد غفر لہ)

شرح کے متعلق ابتدائی ارادہ اور رفتہ رفتہ تکمیل ہونا

شرح کے شروع کرتے وقت حضرت کو یا کسی اور کو یہ واہمہ بھی نہ تھا کہ ابوداؤد پوری ہو جائے گی۔ افتتاح کے وقت صرف ایک پارہ کی شرح کا ارادہ تھا کہ اس کی وجہ سے طلبہ کو کتاب کا انداز اور طرز وطریق معلوم ہو جائے گا اور خاص مناسبت پیدا ہو جائے گی۔ مگر جب پارہ ختم ہو لیا تو کتاب الطہارۃ ختم کرنے کا خیال ہوا اور جب وہ تمام ہوئی تو کتاب الصلوٰۃ تک پورا کرنے کا قصد ہوا اور جب وہ بھی ختم ہو چکی تو جلد اول پورا کرنے کا قصد ہو گیا۔ حتیٰ کہ شوال ۱۳۴۴ھ میں آپ حجاز روانہ ہوئے تو اس شوق میں کہ شرح کلام الرسول کی تکمیل آستانۂ رسول پر ہو آپ مولوی زکریا کو مدرسہ سے رخصت دلا کر اپنے ساتھ لے گئے اور وصال سے دو مہینے قبل ختم فرما کر خود بھی عشقِ رسول میں ختم ہو گئے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز اینکہ جان بسپارند چارہ نیست[1]

سفرِ حجاز سے قبل ختم ابوداؤد کا خیال آپ کو کبھی نہیں ہوا۔ جب فرمایا یہی فرمایا کہ فلاں جگہ تک میں پورا کر لوں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے بعد فلاں شخص تکمیل کرلے گا۔ کبھی حافظ عبد اللطیف صاحب کا نام فرما دیتے اور کبھی مولوی زکریا صاحب کا۔ ہاں سفر حجاز کا عزم ہونے پر ایسے الفاظ زبان پر آئے جو اختتام کی امید دلاتے اور اس کا متوقع بتلاتے تھے کہ کاتب ازل نے یہ زریں کارنامہ آپ کے مقدر میں لکھ دیا ہے اور آپ دنیا سے نہ اٹھیں گے جبتک کہ شرح ابوداؤد ختم نہ ہو جائے گی۔

بارگاہِ الٰہی میں تین دعائیں

ایک بار فرمایا میں نے حق تعالیٰ سے تین دعائیں کی تھیں کہ عرب میں حکومت اسلامی دیکھ لوں۔ بذل المجہود تمام ہو جائے اور جنت البقیع میں دفن ہو جاؤں۔ الحمد للہ دو کی قبولیت دیکھ لی اور تیسری کا انتظار ہے۔

بذل المجہود کی مدتِ تالیف

بذل المجہود ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں شروع ہوئی ۲۱ شعبان ۱۳۴۵ھ پورے دس برس پانچ ماہ دس دن میں یہ شرح بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات میں پانچ جلد ہو کر ختم ہوئی اور اس کے ختم پر حضرت کو اس درجہ مسرت وخوشی ہوئی کہ جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی خوشی نہیں کر سکتی۔ ہفت اقلیم کی سلطنت کا ملنا انتہا خوشی کا محل استعمال کیا جاتا ہے مگر اہل اللہ کو دنیوی لذتوں کے حصول میں تو خوشی ہی مفقود ہو جاتی ہے اس لئے میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے حضرت کی اس خوشی کا اندازہ ناظرین کو کرا سکوں۔

---

[1] عشق کا دریا بھی ایک سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں اور وہاں اس کے سوا کہ جان ہی سپرد کر دیں کوئی چارہ کار نہیں۔

بذل المجہود کی تکمیل پر کمال مسرت اور اعیانِ مدینہ طیبہ کی دعوت

آپ نے ختم پر ۲۳ شعبان یوم جمعہ کو علماءِ مدینہ اور احباب حاضرین کی ضیافت کا سامان کیا اور خاص اپنے پیسہ سے اور بڑے اہتمام کے ساتھ عربی طرز کی ضیافت کا سامان کیا کہ آپ کا رُواں رُواں شکرِ الٰہی میں چُور اور انعامِ باری تعالیٰ پر اتنا فرحان و مسرور تھا کہ اس کا اندازہ وہیں کے رہنے والے حاضر باش حضرات نے کیا ہوگا۔ دعوت کے آپ نے خطوط طبع کرائے اور ایک بڑے پیمانہ پر جیرانِ رسول[1] کی میزبانی کا شوق پورا کیا۔

اس خوشی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان دعوتی خطوط میں حضرت نے اپنے ہندی خدام کو بھی فراموش نہ فرمایا اور ہرچند کہ سمندر پار شرکت محال تھی مگر اس اطلاع کے لئے کہ حق تعالیٰ نے یہ مبارک وقت دیکھنا نصیب فرمایا جس کی بظاہر اسباب کوئی توقع نہ تھی اس کی خوشی میں اپنے جن دوستوں کو ہندوستان رہتے وقت شریک دعوت فرماتے ان کو بھی خطوط بھیجے کہ تصور و خیال میں تو وہ شریکِ ضیافت تھے ہی، چنانچہ بندۂ ناچیز کو بھی دعوتی خط بھیجا اور تحریر فرمایا کہ

"گذشتہ ہفتہ میں بحمداللہ بذل المجہود کی پانچویں جلد سے بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فراغت ہوگئی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ بدھ کو اختتام ہوا اور جمعہ کو مدینہ منورہ کے علماء و فضلا کی دعوت کا جلسہ قرار پایا۔ بجز کھانے کے اور کسی تقریر وغیرہ کا نظم نہیں کیا گیا البتہ دعوتی خطوط طبع کئے گئے جو آپ حضرات کی مسرت کے لئے آپ کے پاس بھی ارسال ہیں۔"

مولانا سید احمد صاحب مہاجر فیض آبادی[2] نے جن کے مکان پر حضرت کا قیام تھا اور وہ حضرت کی اس روحانی مسرت کا پہلے سے خوب اندازہ فرما رہے تھے بندہ کو اس طرح تحریر فرمایا۔

تعلیق[3] ابوداؤد قریب الختم ہے حضرت مدظلہ کی طرف سے سب خدام کی دعوت ہوگی۔ کاش آپ بھی رونق افروز ہوتے۔ غالب گمان ہے کہ ۲۵ شعبان سے پہلے ختم ہوجائے گی لہٰذا اس تاریخ مذکورہ تک عریضہ پہنچنا تو مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے جب بھی عریضہ پہنچ جائے آپ اس خوشی کی دعوت کی نیت سے اچھے اچھے کھانے گھر میں پکوا کر سب گھر بھر مل کر کھا لیجئے۔ ہم دور افتادوں کو بھی یاد کر لیجئے جس طرح کہ ہم آپ کو یاد کئے بغیر نہیں رہیں گے"۔ فقط۔

بہرحال اس خوشی کے وقت حضرت نے اپنے ان خدام کو جو نظروں سے دُور تھے مگر دل سے دُور نہ تھے اس طرح شریک کیا کہ دعوتی خطوط ہر ایک کے نام جُدا جُدا آئے اور لکھا کہ خیالی شرکت تم صاحبوں کی ضرور ہے اور

---

[1] حضور کے پڑوسی یعنی اہلِ مدینہ۔ [2] حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے بھائی۔ [3] کہ حضرت تواضع میں تعلیق ہی فرماتے تھے گو نہایت مستند اور مفصل شرح ہے بذل المجہود نام ہے۔

اور مسرت کے لئے خط مطبوعہ ارسال ہے وہ مطبوعہ خط جو مدینہ منورہ کے مطبعہ طیبۃ الفیحا میں طبع ہوا اور مدعو کا نام قلم سے لکھنے کے لئے جگہ چھوٹی ہوئی تھی یہ تھا۔

مطبوعہ دعوت نامہ کا مضمون

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۞ الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ عالی حضرت الشیخ .... المحترم مد فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ وبعد[1] فقد من اللہ علی الداعی ان منحہ بتالیف بذل المجہود فی حل ابی داؤد وجعل ختامہ ببلدۃ صاحب المعجزات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیمات جعلہ اللہ خالصا لوجہہ الکریم ونفع بہ الاسلام والمسلمین آمین فنؤمل تشریفکم بعد صلوٰۃ الجمعۃ فی ۲۳ شعبان ۱۳۴۵ھ الی مدرسۃ العلوم الشرعیۃ الکائنۃ فی زقاق البدور لتتناول ما حضر اتماما للمسرۃ بقدومکم وشکراً للہ تعالیٰ والسلام۔

داعیکم خادم الطلبہ خلیل احمد عفی عنہ

۱۳۳۵ھ میں جب اس کا افتتاح ہوا تو اس کی تالیف کے لئے صرف ایک گھنٹہ روزانہ تھا مگر ۱۳۴۰ھ میں صبح کا تمام وقت اس کی نذر ہوا اور شام کے وقت حضرت کے پاس ایک سبق رہا۔ اسی درمیان میں اسفار پیش آئے اور حرج مرض کی وجہ سے ناغہ ہو جاتی اور اس کے ساتھ ہی نظام مدرسہ ونگرانی شعبہ ہائے مختلفہ اور آمد ورفت مہمانان وغیرہ کے مشاغل علیہ بدستور قائم تھے۔

آستانۂ محمدیہ کی برکت

مگر آستانۂ محمدیہ پر پہنچکر تو اس کے سوا آپ کو کوئی کام ہی نہ تھا کہ ڈاک بھی دسویں دن آتی تھی۔ ادھر جگہ کی برکت اور طبیعت کا انس ولگاؤ جدا۔ لہذا طبیعت خوب چلی اور دو مہینہ میں کتاب کے سوا سو[125] صفحات کی شرح قلم سے نکلی۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت نے اس کو طبع کرانا شروع کر دیا تھا کہ خاص حضرات نے اس کی طباعت کے لئے رقم علیحدہ دی تھی اور حضرت نے اس رقم کو مد طباعت بذل میں جمع فرما کر کتاب مدرسہ کو دیدی کہ اس کا سارا نفع مدرسہ مظاہر علوم کو پہنچے چنانچہ ۱۳۵۰ھ پر کامل پانچ جلد مدرسہ سے مل سکتی ہیں۔[2]

---

[1] سلام کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس داعی پر احسان فرمایا کہ بذل المجہود فی حل ابو داؤد کی تالیف عطا فرمائی اور اس کا اختتام صاحب معجزات صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں قرار دیا اللہ تعالیٰ اس کو صرف اپنی کریم ذات کے لئے قرار دیں اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچائیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ۲۳ شعبان ۱۳۴۵ھ جمعہ کی نماز کے بعد مدرسۃ العلوم الشرعیہ واقع گلی زقاق البدور میں ماحضر تناول فرمانے کے لئے تشریف لائیں تاکہ آپ کی تشریف آوری سے مسرت کی تکمیل ہو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا ہو۔ والسلام

الداعی طلبہ کا خادم خلیل احمد عفی عنہ

[2] اب نایاب ہو رہی ہے قیمت بہت ہو گئی۔

اہلِ نظر کو بذل المجہود پر ناقدانہ نظر کی دعوت

اثنائے تالیف میں حضرت کا معمول بڑے اہتمام سے یہ رہا کہ جب کوئی نئی بحث تحریر فرماتے تو احباب اور خدام کو خاص طور پر اس کے دیکھنے کی تاکید فرماتے اور اصلاح و اشکال کا تقاضہ کیا کرتے۔ مولانا عبدالرحمٰن[1] صاحب صدر مدرس مدرسہ کو بھی مستقل نظر ثانی کا امر فرمایا اور ابتدائی اجزا پر مولانا نے بالاستیعاب نظر بھی فرمائی، اشکالات بھی پیش فرماتے اور حضرت ان کو غور سے سنتے تھے پھر ضرورت سمجھتے تو اپنی تحریر میں مراجعت فرماتے اور کبھی توضیح مضمون کے لئے عبارت ہی دوبارہ تحریر میں لاتے تھے۔ حضرت رائپوری جب تشریف لاتے تو اکثر مواقع خاص طور پر سنواتے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی مدظلہم۔ مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور مولانا صدیق احمد صاحب وغیرہم جو صاحب بھی تشریف لائے ان کو اہتمام سے حضرت نے مسودہ دکھایا اور تقاضا فرمایا کہ غور کے ساتھ ناقدانہ نگاہ ڈالیں کہ اغیار کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اپنوں ہی کے اعتراضات ذریعہ بن سکتے ہیں۔

بندہ جب حاضر ہوتا حضرت اس کی ابحاث مشکلہ کا تذکرہ فرماتے اور یہی ارشاد ہوتا کہ ناقدانہ نگاہ سے دیکھو، میں حیران ہوتا کہ حضرت کی تحریر پر اور میری ناقدانہ نظر، چہ نسبت[2] خاک را با عالم پاک۔ مگر حضرت کی بےنفسی وللہیت کہ چھوٹے بڑے کا خیال کئے بغیر ہر علم دوست وارد و صادر[3] سے یہی فرمایش ہوتی تھی۔

مولانا فیض الحسن صاحب کہ حضرت ان کے حقیقی پھوپھا تھے جلسۂ سالانہ کے موقع پر کانپور سے کہ وہاں تعلیم دینیات سے فارغ ہو کر مطبعہ اور تجارتِ کتب کے سلسلہ میں لگ گئے تھے مدت کے بعد سہارنپور تشریف لائے تو تبسم فرماتے ہوئے کھڑے ہو کر ان کو چھاتی سے لگا لیا اور پھر مولوی زکریا صاحب سے فرمایا کہ ان کو بذل المجہود کے اجزا دیدینا یہ دیکھیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت تک میں حضرت سے بیعت بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سن کر میں پانی پانی ہو گیا اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکلا۔ حضرت تو یہ فرما کر مکان تشریف لے گئے اور میں محجوب و منفعل کہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ اتنے میں مولوی زکریا صاحب مجھے وہ اجزا دے گئے اور تعمیلاً للارشاد میں نے کہیں کہیں سے کچھ دیکھا۔

دوسرے دن بھرے مجمع میں مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کیوں بھائی وہ بذل المجہود کے اجزا دیکھے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں جناب والا کے ارشاد کی تعمیل کردی۔ یہ سن کر حضرت نے ایک شفقت بھری خاص نظر مجھ پر ڈالی اور دریافت فرمایا کیسے ہیں؟ میں نے یہ سمجھ کر کہ متن کی کتابت حوض میں ہوگی اور شرح

---

[1] صدر المدرسین مدرسہ بہبودی ضلع کامل پور کے باشندہ تھے شعبان ۵۸ھ میں وفات پاگئے وطن میں دفن ہیں۔
[2] خاک کو اس عالم پاک سے کیا نسبت۔ [3] آنے جانے والے۔

بصورتِ حواشی حاشیہ پر جس فن سے مناسبت رکھتا تھا اس کا لحاظ رکھ کر عرض کیا کہ قدرے طویل ہیں مگر پُرمنفعت ہونے میں کیا شک ہے۔ فرمایا حامل المتن ہونے کی وجہ سے کچھ طول تو ضرور ہے مگر عون المعبود مطبوعہ فاروقی دہلی کے طریقہ پر طبع ہو گی نہ کہ محشی ابوداؤد کے طرز پر" اسی سفر میں مولانا ممدوح حضرتؒ سے بیعت ہوئے اور بحمداللہ آخری سفرِ حج کو روانہ ہونے سے قبل حضرت نے مجازِ طریقت بنا کر اخذ بیعت کی اجازت دی۔

اثنائے تالیف میں جب کوئی مشکل مقام آتا تو آپ حضرت گنگوہیؒ اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کو بار بار یاد فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہی کی حیات میں لکھی جاتی تو کس قدر سہولت ہوتی۔ کبھی فرماتے کہ حضرت کے سامنے سب اشکال حل ہو جاتے۔ کبھی فرماتے کہ کم از کم ہمارے مولوی صاحب (مولانا یحییٰؒ) ہی حیات ہوتے تو خوب بحث ہوا کرتی۔ بندہ حاضرِ خدمت ہوتا یا مولوی ظفر احمد صاحب جب آتے تو حضرتؒ فرماتے ذرا اس کی عربیت پر خاص طور سے نظر ڈالو کیونکہ مجھے عربی زبان پر پوری قدرت نہیں۔ ہم شرمندہ ہو کر عرض کرتے کہ حضرت آپ بھی قادر نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا۔ فرماتے میں تواضع سے نہیں کہتا دوسرے یہ کہ میں عبارت بطور املا کے لکھواتا ہوں بطور تصنیف کے خود نہیں لکھتا اور املا میں نقص رہ جانا مستبعد نہیں۔

شرح کی تکمیل مدینہ میں

مدینہ منورہ پہنچ کر جب آپ ہمہ تن اس میں مشغول ہوئے تو آپ کے قلب پر عجیب کیف تھا، قربِ آستانۂ محبوب کا التذاذ جدا اور مدتہائے دراز کی تمنا و شوق پورا ہونے کا مزہ الگ اور کلام الرسول کی خدمت میں اشتغال کا حظ علیحدہ۔ ڈاک بھی آٹھویں دسویں دن آتی تھی اور اس لئے روز و شب اسی انہماک میں گزرتا تھا۔

سعودی حکومت پر اظہارِ اطمینان

سعودی حکومت کی ابتدا تھی اور چار طرف مختلف افواہیں جس پر یہاں بعض خدام کو خیال ہوا کہ شاید حضرت مدینہ منورہ میں بسکون و راحت قیام نہ فرما سکیں اور ہندوستان واپس ہوں مگر حضرت کا والا نامہ آیا تو ہر لفظ فرحت میں ڈوبا ہوا تھا چنانچہ شیخ رشید احمد صاحب کے نام خط آیا جس میں تحریر فرمایا:۔

مکتوب گرامی

میں آپ کو مجملاً اطمینان دلاتا ہوں کہ بحمداللہ یہاں کے حالات اس قدر اطمینان بخش اور فرحت انگیز ہیں کہ ہم لوگوں کو کسی قسم کا ذرہ بھر بھی اندیشہ نہیں۔ تمام حجاز امن سے معمور ہے جدہ سے مکہ تک، مکہ سے مدینہ منورہ تک اور مدینہ منورہ سے جدہ اور ینبع تک دو دو چار چار اونٹ بھی

---

[1] اس طرح کہ اوپر عربی خط میں متن نیچے شرح مع متن اردو خط میں اور حاشیہ والی کتاب کی طرح نہیں کہ پورا صفحہ لوح میں متن کا ہو حاشیہ پر باریک شرح ہو۔

باطمینان آتے جاتے ہیں اور کوئی واقعہ پیش نہیں آتا۔ ہم یہاں تقریباً دو ماہ سے مقیم ہیں۔ ہمارے لئے بحمداللہ دن عید اور رات شب برات ہے۔ کسی امر کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ داعیہ پیدا نہیں ہوا کہ ہم یہاں سے لوٹ جاویں۔ جس قدر اس قسم کے موحش[1] حالات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں وہ بالکل غلط اور کذب ہیں۔ غالباً حجاج پہنچ گئے ہوں گے اور ان سے ان خرافات افواہ کی تردید آپ کو اور سب دوستوں کو معلوم ہو گئی ہوگی۔

تعلیق ابی داؤد باطمینان لکھی جا رہی ہے اور اس دو ماہ کے عرصہ میں انشاء اللہ سوا سو صفحات کے قریب لکھے گئے ہوں گے جو مولوی رؤف الحسن صاحب کے ہمراہ طبع ہونے کے لئے سہارنپور پہنچ جائیں گے۔ اب میرا پختہ خیال ہے کہ میں تعلیق کے اتمام کے لئے مدینہ طیبہ میں اگلے سال بھی قیام کروں گا اور حج کے لئے بھی مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ نہیں کروں گا۔ اگر مناسب ہو تو یہ مضمون بھی اخبار میں شائع کرا دیجئے۔

سچ ہے یثرب کی مٹی میں ملنے کی ہوس اور محبوب کی احادیث میں اشتغال اور شرح ابوداؤد کی تکمیل نفل حج سے بدرجہا زیادہ پیاری چیز ہے اور اس کو صاحب مذہب عاشقِ رسول حضرت امام مالکؒ کے دل سے کوئی پوچھے ؎

اے قوم بحج[2] رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

مؤلف کا دماغ تالیف کے زمانہ میں کسی دوسرے کام کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ صاحب ہدایہ نے دس برس میں ہدایہ لکھی مگر اس طرح کہ حجرہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ غلام دونوں وقت کھانا لا کر رکھ جاتا اور تھوڑی دیر بعد خالی برتن دیکھ کر لے جاتا تھا۔

اوقاتِ نماز کے سوا چوبیس گھنٹے میں حضرت ممدوح کی کسی کو صورت بھی نظر نہ آتی تھی۔ مگر حیرت ہوتی تھی جب دیکھا جاتا تھا کہ حضرت کا یہ زمانہ پیری اور یہ مجاہدہ[3] معمولہ مستمرہ اور یہ صدمات وفات احباب و متعلقین اور یہ مدارات حاضرین وغائبین اور اس پر ابوداؤد جیسی پر اشکال و مغلق[4] کتاب کی شرح جس میں دماغ ہی دماغ کا کام۔ اور سات بجے سے لیکر گیارہ بجے تک چار گھنٹے اس میں ختم ہونے کے بعد شام کو وہی درس طلبہ وہی جواباتِ خطوط، وہی فتاویٰ نویسی، وہی مہمانوں سے ملاطفت وانبساط اور وہی ہر معمول مستحب پر مواظبت کا اہتمام۔ اس سے زیادہ تعجب اس وقت ہوتا جبکہ آپ تالیف میں مشغول ہوتے اور کوئی مہمان آتا تو وہ سیدھا حضرت کے پاس دار التالیف میں چلا جاتا۔ حضرت اسی تبسم و خندہ پیشانی سے ملتے اور ذرہ برابر گرانی نہ لاتے کہ دماغی کام اور مخلِ یکسوئی اشتغال میں بلا ضرورت کیوں مخل ہوا۔ کافی

---

[1] وحشت میں ڈالنے والے۔ [2] اے حج کو گئی ہوئی قوم تم کہاں کہاں ہو محبوب یہاں ہے آؤ آؤ۔ یعنی خالی دل والوں کو اہل دل کے پاس رہ کر صاحب دل بننا اور بھر جانا چاہئے مگر فرض حج مقدم ہے۔ [3] نفس کے خلاف عمل کا دیر تک رہنے والا مجاہدہ و مشقت۔ [4] مشکل۔

مزاج پرسی کے بعد پھر اپنے کام میں لگ جاتے اور مضمون بزبانِ عربی لکھوانے لگتے تھے ۔ میں نے بارہا دیکھا کہ حضرت ادھر مہمان سے باتیں بھی کیے جاتے تھے اور حلِ عباراتِ مشکلہ بھی فرماتے جاتے تھے حتیٰ کہ مضمون ختم ہو جاتا تو کتاب بند کر دیتے اور یہ فرما کر بس اب چلو، مہمان کو ساتھ لئے نیچے تشریف لے آتے ۔ گویا مضمون کی آمد حضرت کے قبضہ کی بات تھی کہ جب چاہتے آمد شروع ہو جاتی اور جب چاہتے دماغ اور طبیعت کو اس سے ایسا خالی فرما لیتے گویا اس کا غور و فکر ہی نہیں ہے ۔ چنانچہ اس اہم اشتغال میں آپ کو نہ کسی ادنیٰ معمول کے ترک کی نوبت آئی اور نہ کسی امر میں سہو و نسیان پیش آیا، نہ احباب کی غمی و خوشی میں شرکت گئی اور نہ ان کی مخلصانہ طلب پر انکاری جواب لکھا گیا ۔ سب کام بدستور چلتے رہے اور یہ خدمتِ عظمیٰ ایک وہبی[1] نعمتِ کبریٰ بن کر اتمام کو پہنچ گئی ۔

وہ سات امور جن کا بذل المجہود میں التزام ہے

بذل میں یہ ایک عجیب کمال ہے کہ جو مضمون حضرت کے ذہن میں آیا جب تک متقدمین کے کلام میں اس کی تائید نہ مل گئی حضرت نے اس کو قلم و قرطاس کے حوالہ نہیں کیا اور ہمیشہ یہ فرمایا کہ بھئی اپنے علم پر کیا اعتماد ہے ۔ بایں التزام (۱) ہر مسئلہ میں مذاہب ائمہ اربعہ کی تشریح اور باہم محاکمہ کیا گیا ہے ۔

(۲) مذہبِ حنفیہ کی تحقیق اور کافی دلائل کے بعد دوسرے مذاہب کے دلائل کے بہترین اور متعدد جوابات دیئے گئے ہیں ۔

(۳) ہر راوی کے متعلق پوری جرح و تعدیل کی گئی ۔

(۴) جو روایات ترجمۃ الباب کے موافق نہ تھیں ان کی توجیہ و موافقت ظاہر فرمائی ہے ۔

(۵) مصنف نے جن روایات کو تعلیقاً بیان کیا ہے دوسری کتابوں سے ان کی سند اتصال لکھی گئی ہے ۔

(۶) جو روایات مختصر آئی ہیں دوسری کتابوں کا جہاں وہ مفصل ہے حوالہ دیا ہے ۔

(۷) اور کلام الرسول کا منشا ظاہر کر کے وہ محاسن و حقائق بیان فرماتے ہیں جن کا حظ وہی اٹھا سکتا ہے جس کو فنِ حدیث سے مناسبت اور صاحبِ حدیث سے انس و محبت ہو ۔

خواب میں غلطی کی اصلاح

ایک مرتبہ حسب معمول صبح کو آپ نے تشریف لا کر مولوی زکریا سے فرمایا کل فلاں بات لکھی گئی ہے اس کو دوبارہ نکالو، چنانچہ وہ نکالی گئی اور آپ نے مراجعتِ کتب فرما کر اس کو کاٹا اور دوسری عبارت لکھی اس کے بعد بڑی مسرت سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ تہجد کے بعد ذرا آنکھ لگ گئی تو ایک صاحب کو (جن کا حلیہ بھی ارشاد فرمایا) یوں کہتے سنا کہ یہ جگہ

[1] خدا کی عطا کی ہوئی بڑی نعمت ۔

غلط لکھی گئی ہے اس کو درست کرو۔" ایک بار فرمایا کہ اس قابل تو ہوں نہیں مگر ہوس تھی کہ خدام حدیث کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ اللہ کا انعام ہے کہ اس نے کام لے لیا ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل   نسیمِ صبح تیری مہربانی

۱۳۳۵ھ میں سفرِ حج اور واپسی

مولانا محب الدین صاحب مہاجر مکی خلیفہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کو کشف زیادہ ہوتا تھا اور حضرت کے ساتھ خاص محبت رکھتے تھے۔ ۱۳۳۵ھ میں ممدوح کا حضرت کو پیام پہنچا کہ اب تمہارا آخری وقت قریب آگیا ہے ہندوستان جلد چھوڑ کر مدینہ پہنچو۔ حضرت تو بچپن سے یہ تمنا رکھتے تھے اس لئے آخری امید بر آنے کے شوق میں حجاز روانہ ہو گئے۔ جنگ کا زمانہ تھا اور شریف حسین نے ترکوں سے مقابلہ کیا تھا کہ طرح طرح کے فتنے رونما تھے۔ مولوی محب الدین صاحب نے حضرت پر تقاضا کیا کہ جلد ہندوستان واپس ہو کہ یہاں قیامتِ صغریٰ قائم ہوا چاہتی ہے تمہارے آخری وقت کا مجھے جو انکشاف ہوا تھا وہ ابھی مؤخر ہے۔" چنانچہ آپ ہندوستان تشریف لے آئے اور بذل المجہود میں مشغول ہو گئے۔

۱۳۴۴ھ میں آخری حج اور مدینہ میں قیام اور وفات

اب ۱۳۴۴ھ میں مولانا کا پھر تقاضا ہوا کہ مدینہ پہنچو چنانچہ حضرت روانہ ہو گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ مولانا کو مکاشفہ میں غلطی ہو گئی مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں مکاشفہ تو صحیح تھا مگر بذل کے لئے حق تعالیٰ نے عمر بڑھا دی کہ انجام اس توسیع کا بھی وہی تقدیر مبرم ہے[1] چنانچہ ۲۱ شعبان کو بذل ختم ہوئی اور ۲۷ رمضان کو آپ پر فالج کا اثر ہوا جس میں اول کچھ معالجہ سے خفت محسوس ہوئی مگر یہی سلسلۂ مرض چلتا رہا اور آخر ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ یوم چہار شنبہ بعد عصر آپ نے دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس کا سفر فرمایا۔

وہ کتابیں جن سے شرح میں استفادہ کیا

اثناءِ تالیف میں حضرت کے سامنے ڈولچی تپائیوں پر ستر اسّی کتابوں کا ڈھیر رہتا تھا جن میں تفسیر حدیث اسماء الرجال اصولِ حدیث فقہ اصولِ فقہ لغت سیر و تواریخ اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترتیب وار پھیلی رہتی تھیں۔

---

[1] تقدیر یعنی ازل میں مقرر ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اتنی عمر ہو گی یہ تقدیر مبرم یعنی پختہ ہے فرشتوں کو اس کا علم دیا جاتا ہے دوسری یہ کہ فلاں کام یا بات کی تو اتنی عمر ہو گی یہ تقدیر معلق ہو گی کہ اس بات یا کام پر موقوف ہوتی ہے اس کا علم فرشتوں کو نہیں دیا جاتا اور علمِ الٰہی میں ازل سے ہوتا ہے کہ یہ ہو گا پھر اتنی عمر ہو گی تو وہ بھی ایک طرح پختہ و مبرم ہی ہے پہلا کشف مبرم کا تھا وہ بھی صحیح تھا اور دوسرا معلق کا کہ حقیقت میں اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مبرم ہی ہوتی ہے اس کا وقت گذرنے پر اس کا کشف ہوا جو اب فرشتوں کے علم میں آچکی اور کھلی مبرم ہو چکی تھی۔ ۱۳۳۵ھ میں تالیف کی ابتدا ہوئی ۱۳۴۵ھ میں ختم۔ یہ مدت تالیف کے لئے تھی۔

کتب تفسیر تفسیر میں ابن جریر، درمنثور، بیضاوی اور اس کے حواشی خفاجی و شیخزادہ و قنوی و عبدالحکیم اور جلالین مع شروح و تفسیر کبیر پر نظر ڈالتے تھے۔

کتب حدیث علم حدیث میں بخاری مسلم ترمذی نسائی ابن ماجہ مؤطا امام مالک مؤطا امام محمد دارمی دارقطنی مصنف ابن ابی شیبہ سنن بیہقی مسند امام احمد طحاوی مشکوۃ اور اس کی شرح علی قاری مسند ابی داؤد طیالسی منتقی الاخبار اور اس کی شرح نیل الاوطار زاد المعاد فتح الباری قسطلانی نووی اور حاشیۃ السندی مصفے مراسیل ابی داؤد عمل الیوم واللیلہ مسند امام ابی حنیفہ مسند امام شافعی مجمع الزوائد کتاب الآثار سنن الکبری جزء القراءۃ ادب المفرد جزء رفع الیدین مستدرک اور اس کی تلخیص سبل السلام عینی درجات انجاح الحاجہ آثار السنن اور اس کی تعلیق تنسیق جوہر نقی زرقانی تعلیق ممجد تلخیص الحبیر درایہ شرح مشکلات الآثار اور ترمذی کی چاروں شروح شرح الخطابی تخریج زیلعی حاشیۃ الحصین الکمال اور تکمل اللآلی المصنوعہ وغیرہ کے ساتھ مولانا گنگوہی کی وہ تقریر جس کو مولانا محمد یحییٰ صاحب نے پڑھتے وقت حضرت سے سن کر ضبط کیا تھا سب زیر نظر رہتی تھیں۔

کتب اسماء رجال اسماء الرجال میں تقریب تہذیب تعجیل المنفعہ اصابہ لسان المیزان طبقات المدلسین خلاصہ تہذیب الکمال میزان الاعتدال تذکرۃ الحفاظ تجرید اسد الغابہ استیعاب المؤتلف والمختلف طبقات ابن سعد جمع بین رجال الصحیحین تاریخ صغیر اور ضعفاء الصغیر الکمال انساب رجال جامع الاصول الکنی المغنی الجواہر المضیئہ طبقات الشافعیہ لباب الانساب اسعاف فوائد بہیہ المنفردات والوحدان اور الضعفاء والمتروکین وغیرہ کا تتبع ہوتا تھا۔

کتب اصول حدیث اصول حدیث میں شرح نخبہ شرح الشرح تدریب الفیۃ الحدیث فتح المغیث اور بستان المحدثین سامنے رہتی تھی۔

کتب فقہ فقہ حنفی میں بدائع مبسوط ہدایہ اور اس کے حواشی کفایہ بنایہ فتح القدیر کبیری بحر الرائق درمختار اور اس کے دونوں حواشی طحطاوی اور شامی مراقی الفلاح اور اس کا حاشیہ طحطاوی اور زیلعی و سعایہ سے کام لیا جاتا تھا۔ اور

شافعی فقہ میں کتاب الام اور اس کا حاشیہ اور قناع تحفۃ المحتاج روضۃ المحتاجین کتاب الانوار التوشیح

فقہ مالکیہ میں کتاب المدونۃ للامام کتاب المقدمات اور مختصر الشیخ خلیل۔

فقہ حنبلی میں اعلام الموقعین

اور شعرانی کی کشف الغمہ اور میزان الکبری کا تفحص ہوتا تھا۔

اصُول فقہ اصولِ فقہ میں نور الانوار توضیح تلویح حسامی اور اس کے حواشی تحریر اور مستصفیٰ پر غور و فکر مبذول ہوتا تھا۔

لغات لغت میں مجمع البحار لسان العرب قاموس نہایہ مصباح المنیر اور مخصص سے مدد لی جاتی تھی۔

کتب سیر سیر میں ابن ہشام، طبری تاریخ الخلفاء معجم البلدان تاریخ الخمیس اور وفیات الاعیان کی ورق گردانی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ

کتب نحو نحو میں شرح جامی اور

کتب تجوید و قرات تجوید میں شرح ابن القاصح وغیرہ بھی موجود رہتی تھیں۔

نسخ ابی داؤد اور ابو داؤد کے چھ نسخے پاس تھے ایک خاص وہ قدیم نسخہ جس میں آپ نے پڑھا اور جگہ جگہ کچھ لکھا تھا کہ متعدد نسخوں سے مقابلہ ہو کر صحیح کیا گیا تھا۔ دوم عون المعبود کے متن پر چڑھا ہوا نسخہ۔ سوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا تصحیح کردہ نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۱۸ھ۔ چہارم مطبوعہ مطبع خیریہ مصر ۱۳۱۰ھ پنجم مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ کردہ مطبوعہ اصح المطابع اور چھٹا مطبوعہ اصح المطابع ۱۳۱۸ھ

یہ بات کہ اتنی کثیر کتابوں کے بحر زخار سے کون کون موتی نکالے گئے اور بذل المجہود کس قیمت کے جواہرات کا جڑاؤ ہار ہے صرف اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں اور آج نہیں قیامت تک آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی کہ بذل المجہود کا علمی دنیا پر کیا احسان ہے چنانچہ جلد اول ص۲۰ پر مسواک کی بحث اور ص۳۲۰ پر بنا جمعہ و ظہر کی بحث اور جلد ثانی میں ص۱۳۲ پر اشارہ سبابہ کی بحث اور ص۲۲۸ پر سجدہ کی بحث اور جلد ثالث میں ص۵۵ پر غسل کی بحث اور ص۷۱ پر قران حج کی بحث قابلِ دید ہے۔ رہا اس کا صلہ سو صاحب الکلام کے دربار میں حاضری کے وقت اولین و آخرین کا بھر پور مجمع دیکھے گا کہ محبوب پیغمبر کا قدردان خدا خادم کلام پیغمبر کو کیا عطا فرما رہا ہے ولسوف یعطیک ربک فترضٰی۔[1]

بذل المجہود کے انداز پر شرح ترمذی کا خیال بذل سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے قلب میں داعیہ پیدا ہوا کہ ترمذی کی شرح بھی اسی نہج پر ہو جاوے کہ وہ بھی درسی کتاب اور اسی خدمت کی مستحق ہے۔ چنانچہ آپ نے مولوی زکریا صاحب کو لکھا بھی کہ بنام خدا اس کو شروع کر دو کیا عجب ہے کہ یہ بھی میرے اعمال نامہ کی زینت بن جائے۔ مگر مولوی زکریا صاحب چاہتے تھے کہ حضرت افتتاح فرما دیں اور حضرت جواب دیتے تھے کہ تمہارے بغیر مجھ سے اس کا انجام پانا دشوار کہ از سر نو

---

[1] اور عنقریب دیدیں گے آپ کو

کتب کثیرہ کا فراہم کرنا اور ان کے تتبع و تلاش سے مضامین کا اپنے مظان سے نکالنا تمہارا ہی کام ہے۔ آخر میں حضرتؒ نے یہ بھی لکھا کہ اچھا یوں کرو کہ ایک ورق چھوڑ کر وہیں لکھنا شروع کر دو کہ طرز و طریق سے واقف اور خدمت حدیث کے اہل بن چکے ہو، کسی وقت میری زندگی میں تمہارا آنا ہوا تو پہلا صفحہ میں لکھوا دوں گا۔ مگر عمر شریف قریب ختم پہنچ چکی تھی اور تمنا و شوق ہی کا اجر ساتھ لیجانا مقدر تھا اس لئے اس کا افتتاح نہ ہوا اور دفعۃً تار آ گیا کہ وہ دریا ہی برخاست ہو گیا جہاں علمی یاقوت و لعل نچھاور ہوا کرتے تھے۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

قلمی کتابوں کی تلاش و جستجو

چونکہ آپ کو حدیث سے طبعاً مناسبت و شیفتگی تھی اس لئے حدیث کی جس قلمی کتاب کا آپ کو کہیں پتہ چلتا آپ کوشش فرماتے کہ اس کو جس قیمت پر بھی ملے خرید لوں اور یہ طاقت سے باہر ہو تو نقل کرا لوں۔

مصنف عبد الرزاق کی جلد سوم و چہارم کی نقل

۱۳۳۸ھ میں جب آپ چھٹے حج کو روانہ ہو کر مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ کو مصنف عبد الرزاق کا پتہ چلا کہ ایک شخص کے پاس اس کی جلد سوم و چہارم قلمی موجود ہے آپ نے چاہا کہ مدرسہ کے لئے خرید لیں مگر مالک نے ۲۰ گنی قیمت مانگی جس کو آپ ادا نہ کر سکے اور نایاب کتاب کے ہاتھ سے نکلنے کا آپ کو بہت ملال ہوا۔ مولوی محمد زکریا صاحب و حاجی انیس احمد اور مولوی محمد اسحاق صاحب وغیرہ رفقاء نے حضرت کا قلق دیکھ کر عرض کیا کہ اپنا مجمع ہمت کرے تو تھوڑا تھوڑا حصہ بانٹ کر سب کی نقل کر لے۔ اول آپ کو فکر ہوا کہ دشوار ہے مگر مولوی محمد زکریا کے استقلال ہمت اور اصرار پر آپ نے مالک کتاب سے نقل کی اجازت مانگی۔ مالک کو بھی یقین تھا کہ نقل نہیں ہو سکتی پھر انکار کیوں کروں لہٰذا بخوشی اجازت دیدی کہ ہاں ضرور نقل کریں چنانچہ آپ نے رفقا پر اس کے اجزا تقسیم فرما دیئے اور چند روز میں دونوں جلدیں نقل ہو گئیں۔ اصل میں غلطیاں زیادہ تھیں تو خود حضرت نے مولوی زکریا کے ساتھ نقل کا اصل سے مقابلہ فرماتے ہوئے کچھ غلطیوں کی اصلاح فرمائی اور اصل مالک کو واپس دیکر نقل قلمی کو مدرسہ میں داخل فرما دیا۔

سنن بیہقی کی نقل

مولانا عزیز الرحمن صاحب گنگوہی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے حضرت گنگوہی کے لئے بیہقی نقل کرا کر لائے تھے اس کی ۸ جلدیں منجملہ ۱۰ جلدوں کے حضرت نے گنگوہ سے منگا کر نقل کرائیں جن میں ایک جلد مولوی عبد اللہ صاحب مرحوم نے بغیر اجرت نقل کی اور باقی باجرت نقل ہو کر مدرسہ میں داخل ہوئیں۔

لے گمان کی جگہوں سے۔

مصنف ابن ابی شیبہ کی نقل

آپ کو پتہ چلا کہ مصنف ابن شیبہ کی ایک جلد سندھ میں حضرت پیر جھنڈا کے مشہور کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہے۔ آپ نے اس کی نقل کی کوشش فرمائی اور اس شرط پر اس کا حصول میسر ہوا کہ مصنف عبدالرزاق آپ ان کو دیدیں چنانچہ دونوں کتابوں کا نقل کے لئے تبادلہ ہوا اور پھر واپسی ہو کر ہر ایک کتب خانہ میں دونوں نایاب کتابوں کے نسخے جمع ہو گئے۔ مدینہ منورہ سے آپ نے زیلعی تخریج ہدایہ کا مطبوعہ نسخہ جو اس وقت بالکل نایاب[عہ] ہے خرید کر مدرسہ میں بھیجا۔

نیز محیط برہانی کامل جو ۸ جلدوں میں فقہ کی مشہور کتاب ہے نہایت خوشخط قلمی ۱۰۳۰ھ میں آپ نے خریدی کہ دو سو روپیہ اس کے آپ کو ملتے تھے مگر آپ نے فروخت نہیں کیا اور مدرسہ میں بھیجدی۔

شرح ابن رسلان کی نقل

ابوداؤد کی مشہور شرح ابن رسلان جس کے متعلق اکابر لکھتے ہیں کہ ہمیں زیارت نصیب نہیں ہوئی جلد اول و دوم مکتبہ محمودیہ میں آپ کو نظر پڑی تو آپ نے اجرت پر اس کی نقل کرا کے مدرسہ میں بھیجی اور نویں جلد سے بذل میں کام لیا کہ وہی مقام زیر تالیف تھا وہ گویا بذل المجہود میں نقل ہوگئی اور سوم چہارم پنجم ششم آپ کے رفیق سفر مولوی احتشام الحق کو ایک کباڑی کی دکان سے ردی کے مول سے دستیاب ہو گئیں اور وہ ان کو لے آئے۔ اسی طرح علم کلام کا ایک قلمی نایاب رسالہ آپ نے خرید کر مدرسہ میں بھیجا جو عقائد نسفی سے بہتر ہے مگر طبع نہ ہو سکا۔

لندن سے خریداری

اسماء الرجال میں طبقات بن سعد جو ۹ جلدوں میں ہے آپ نے لندن سے منگوائی اور انساب سمعانی جس کو قلمی سے عکس لیکر فوٹو میں طبع کیا گیا تھا اور بڑی ضخیم کتاب ہے نیز لندن سے آپ نے بقیمت منگوا کر ہر دو کتب خانہ میں داخل کر دیا۔ کرمانی شرح بخاری کی قلمی دو جلدیں لمعات شرح مشکوٰۃ کی جلد اول مشکوٰۃ پر حاشیہ میر سید شریف کامل اور موطا کی شرح محلی جو مشہور ہے اس کے علاوہ دوسری شرح کہ اس کا نام بھی محلی ہے جلد ثانی قلمی نیز حاصل فرما کر آپ مدرسہ میں پہلے داخل فرما چکے تھے۔ حجاز کے قاضی القضاۃ شیخ عبداللہ بن بلیہد نے چند کتابیں جن میں مغنی فقہ حنابلہ کی جلد اول بھی تھی آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کیں اور آپ نے قبول فرما کر ان کو بھی مدرسہ میں بھیجدیا۔

جمع الفوائد کا قلمی نسخہ

۱۳۳۸ھ میں مصری ٹائپ خریدنے کیلئے بندہ جب مصر گیا اور واپسی براہ شام و عراق ہوئی تو دمشق میں مجھے پتہ لگا کہ سید بدر الدین محدث کے پاس جمع الفوائد کا قلمی نسخہ

عہ میاں رسول کو مناسب ہے کہ اس کا نسخہ کسی مدرسہ میں وقف یا کسی عالم کو ہبہ کر کے حضرت کو یا جسے مناسب سمجھیں ایصال ثواب کریں کہ متعدد جگہ منتشر ہو کر حفاظت کتاب کا مقصود بھی پورا ہو جائے اور کم خرچ بالا نشین تحفہ صدقہ جاریہ بن کر ارواح کو مسرور بنا تا رہے قیمت عہ مجلد ... مقرر کیا ہے۔

کامل تھا اور ٹرکی و فرانس کی جنگ میں ممدوح کا مکان نذرِ آتش ہوا تو وہ نایاب نسخہ بھی جل گیا۔ مگر اس کی ایک نقل قصبۂ کفرسوسہ کے قدیم کتب خانہ میں جو دمشق سے شرمیل فصل پر ہے شیخ محمود بن رشید کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے شوق ہوا کہ اس کی حفاظت کا شرف ہندی مسلمانوں کو نصیب ہو اس لئے مولانا محمود سے ملا اور کتاب کو ہندوستان لاکر حضرت کے سامنے پیش کیا۔

آپ نے بڑے شوق اور غور سے اس کو دیکھا اور مسرور ہوکر اس کے طبع ہوجانے کی خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ جامع الاصول اور مجمع الزوائد کا مجموعہ تھا جس میں علامہ محمد بن محمد رودانی نے بخاری[۱] مسلم[۲] ترمذی[۳] ابوداؤد[۴] ونسائی[۵] ابن ماجہ[۶] مؤطا امام مالک[۷] مسند ابویعلیٰ موصلی[۸] مسند ابوبکر بزار[۹] مسند دارمی[۱۰] اور طبرانی[۱۱] کی معجمات ثلاثہ کبیر[۱۲] واوسط[۱۳] وصغیر[۱۴]۔ چودہ کتابوں کی تمام حدیثوں کو بحذف مکررات وترک اسانید ایک عجیب ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے۔

چنانچہ بندہ نے اس کی تخریج وتصحیح میں تین سال محنت اٹھاکر مصری ٹائپ میں اس کو طبع کردیا۔ حضرت مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ کتاب کے تیار ہونے کا مژدہ آپ کو پہنچا مگر افسوس کہ مطبوعہ کی زیارت نہ فرماسکے اور دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ خدمت بھی اس لحاظ سے کہ حضرت کے ایماء اور برکتِ دعا سے تکمیل کو پہنچی آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہے۔

غرض جس طرح درس حدیث اور تالیف شروح احادیث کا آپ کو شغف تھا اسی طرح حدیث کے قلمی ونایاب نسخوں کے محفوظ کرنے کا بھی حد درجہ شوق تھا کہ یہ ثمرہ ہے صاحب جوامع الکلم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبتِ صادقہ کا جس میں آپ فنا تھے اور چاہتے تھے کہ سرورِ عالم وعالمیان کا کوئی قول بھی ایسا نہ رہے جس کے علم وعمل سے محروم رہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی اشاعت کا عشق تھا کہ تمامی امتِ محمدیہ تک پہنچ کر اس کا نفع متعدی ہو اور مختلف مقامات کے صدہا کتب خانوں میں جمع ہوکر اضاعت سے ہر طرح محفوظ ہوجائے۔ مجنوں صحرا میں بیٹھ کر بھی انگلیوں سے ریت پر لیلیٰ کا نام لکھا کرتا تھا کہ اسی سے اس کی طبیعت کو تسلی ہوتی تھی۔ پھر کیا پوچھنا محبتِ رسول کا کہ کلام الرسول کی خدمت جس نوع کی بھی ہو عین ثمرۂ ایمان ہے۔[عہ]

اہلِ علم کا سندِ حدیث کی درخواست کرنا

دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والوں کو آپ سند دیا کرتے تھے۔ ان کے سر پر دستار باندھنے کی عادت

عہ طباعت کے بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ نے جمع الفوائد کے بہت سے نسخے فارغ التحصیل طلبا کو انعام میں دینے کیلئے مدرسہ کو دیئے تھے چنانچہ اس احقر کو بھی یہ بیش بہا کتاب مدرسہ کی طرف سے انعام میں عطا ہوئی۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ (اخلاق احمد غزلی)

تھی۔ بیرونی علماء آپ سے مسلسلات اور صحاح ستہ کی سند و احادیث حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے تو آپ جن کو اہل سمجھتے اوائلِ حدیث سن کر اور مسلسلات خود سنا کر ان کو بھی سند دیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں جب آپ شملہ تشریف لے گئے تو مولوی محمد فاضل صاحب ترجمان سفیر افغانستان نے حاضر ہو کر سند حدیث کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت نے کتابیں منگوا کر جگہ جگہ سے احادیث سنیں اور فرمایا کہ جب تم نصاب ختم کر چکے اور بمبئی و کلکتہ و دہلی وغیرہ جانے کا بارہا موقع ہوا تو اب تک کسی سے سند حاصل کیوں نہیں کی؟ عرض کیا کہ جیسا میں چاہتا تھا صاحبِ علم و فضل بزرگ مجھے کوئی نہیں ملا۔ اور کوئی ملا تو مجھے ان کے اعمال کی طرف سے اطمینان نہ ہوا، اب گھر بیٹھے حق تعالیٰ نے یہ دولت عطا فرمائی تو اجازت حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ فرمایا یہ تو تمہارا میری نسبت حسنِ ظن ہے کہو تو مدرسے سے مطبوعہ سند منگوا دوں اور کہو یہاں دستی لکھوا کر دستخط کر دوں۔ انھوں نے دستی کو ترجیح دی تو آپ نے مولانا قاری احمد حسن صاحب خطیب جامع مسجد شملہ[1] سے عربی عبارت میں سند لکھوا کر اپنے دستخط کئے اور ان کو عطا فرمائی۔

اِن علماء کو بھی اگر حضرت کے تلامذہ میں شمار کیا جائے تو صدہا کی تعداد کا اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اکثر مدارس ہندوستان کے سند یافتہ علماء بھی ہر سال اس نوع کی اجازت لینے حاضر ہوا کرتے اور عرب میں بھی علماءِ حرمین اور دیگر بلاد کے علماء بکثرت آپ سے سند اور اجازتِ حدیث حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ بندہ نے بھی حالانکہ ساری کتابیں میرٹھ میں مولانا عبد المومن صاحبؒ سے پڑھی تھیں مگر دل چاہا کہ حضرت سے بھی حدیث کی اجازت اور سند حاصل کروں۔ الحمد للہ حضرت نے اوائل سن کر اور مسلسلات خود سنا کر سند عطا فرمائی جس پر اپنے قلم سے دستخط فرمائے اور مہر ثبت کی۔ اس کو تبرکاً درج کرتا ہوں کہ محفوظ ہو جائے اور حضرت نے حدیث کی اجازت جن علماء کو دی ہے وہ اس کی نقل بھی کر سکیں۔

سندِ حدیث | بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العلمین۔ والصلوۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد فخر الاولین والاٰخرین۔ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ واولیائہ اجمعین۔ اما بعد فیقول المفتقر الی رحمۃ ربہ القوی خلیل احمد ابن الشاہ مجید علی الانصاری الایوبی الانبہٹوی عفی اللہ عنہ۔ ان اخی فی اللہ مولانا الشیخ عاشق الٰہی میرٹھی قد قرأ علیّ من اوائل الصحاح الستۃ فی جماعۃ وسمع منی المسلسلات لشاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی قدس سرہ وطلب منی اجازتھا۔ وقد حصل لی القراءۃ والسماع لجمیع کتب الحدیث وغیرھا علی شیخی واستاذی البحر الکامل والبحر الفاضل الفائض بانوارہ علی النیرین الشمس والقمر مولانا الشیخ محمد مظہر

[1] از قاضی عبد المجید صاحب کلرک سکرٹریٹ آفس شملہ۔

النانوتوی الصدیقی. ثم قرأت بعض الصحاح اعنی الجامع الصحیح للبخاری من اوله الی آخره والشمائل للترمذی والمسلسلات ومسند الجن المسمّٰی بالنوادر والدر الثمین واوراقاً معدودة من صحیح الامام مسلم وشیئاً من مسند الدارمی علی مولانا الشیخ عبد القیوم بن مولانا الشیخ عبد الحی المرحوم البوفالی ثم البدھانوی فحصل لی منه الاجازة العامة سنة الف ومائتین وثلث وتسعین من الهجرة النبویة علی صاحبها افضل الصلوة والتحیة۔ وذلك حین کنت مقیماً فی بوفال علی خدمة التدریس بالمدرسة السلیمانیة[1]. ثم لما حضرت خیر بلاد الله مکة المشرفة زادها الله کرامة ونوراً الزیارة بیت الله الحرام اول مرة سنة الف ومائتین وثلث وتسعین حصل لی الاجازة العامة من مولانا الشیخ سید احمد بن زینی دحلان المکی مفتی الشافعیة بها۔ ثم لما اکتحلت بغبار طیبة وتشرفت بزیارة قبر سید المرسلین نبینا محمد النبی الامین علیه وعلی آله الصلوة والسلام الی یوم الدین وحضرة عتبة مولانا الشیخ عبد الغنی المهاجر المدنی قرأت علیه سنہ ۱۲۹۴ھ شیئاً من اوائل الکتب الستة فاجازنی باجازة عامة۔ وقد اجزت الاخ المذکور کما اجازنی مشائخی الاعلام بکل ما یجوز لی روایته من کتب الحدیث الصحاح الستة والمؤطاین للامام مالك بن انس والامام محمد بن الحسن الشیبانی ومسند الدارمی والمسلسلات لشاہ ولی الله المحدث الدهلوی قدس سره والمسلسل باجازة الدعاء عند الملتزم وغیرها من کتب الفقه والتفسیر والمنقول والمعقول۔ اجیزه ان یجیز غیره ممن تاهل لهذا الفن الشریف بالشرائط المعتبرة عند علماء هذا الشان واوصیه بتقوی الله فی السر والعلانیة وان یجتنب عن الامور المحدثة فی الدین وعن طلب الدنیا ولذاتها وان لاینسانی فی دعواته الصالحة وصلی الله تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آله واصحابه وسلم

حرره العبد الحقیر الاثیم خلیل احمد وفقه الله للتزود لغد

مُہر

حرم مدینہ میں درس حدیث واجازت مسلسلات

محرم ۱۳۴۵ھ میں جب آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو علماءِ مدینہ نے شرف تلمذ اور سندِ حدیث کی خواہش کی چنانچہ آپ نے مکان پر درس شروع کر دیا اور وہاں جگہ کافی نہ ہوئی تو مسجد نبوی میں بعد عصر آپ درس دینے لگے۔ مسلسلات کی اجازت کے لئے مجمع کثیر ہو گیا اور آپ نے

[1] ملازمت بھوپال کے گذشتہ باب میں بندہ نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی مگر اس سند سے پتہ چلا کہ آپ بھوپال میں مدرسہ سلیمانیہ کے مدرس ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ (مؤلف)

مسلسلات پڑھ کر ہر ایک کو باقاعدہ اجازت عطا فرمائی۔ بندہ بھی شریک جماعت تھا اور تقریباً چالیس علماء بصورتِ طلبا حضرت کے سامنے سماعت کر رہے تھے۔

ایک حاسد بریلوی کی حرکت

ایک حاسد بریلوی نے خدام حرم نبویؐ کے افسرِ اعلیٰ کو کہ ایک ترکی تھا حضرت کی طرف سے اس طرح مشتعل کیا کہ اس وقت حرم نبوی میں بیٹھا ہوا ایک شخص درس دے رہا ہے جو (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اچھا اعتقاد نہیں رکھتا بلکہ گستاخی کرتا ہے۔ ترکی افسر یہ سُن کر جھلّا گیا اور غصہ میں سرخ ہو کر باب الرحمہ کے قریب پہنچا جہاں حضرتؒ درس دے رہے تھے۔ حضرت کا چہرۂ مبارک دیکھ کر ترکی افسر کا غصہ یکلخت ٹھنڈا ہو گیا اور وہ کچھ دیر کھڑا ہوا درس سنتا رہا۔ پھر بیساختہ بولا یا شیخ اس وقت ایک شخص نے مجھ سے اس طرح شکایت کی ہے مگر میں آپ کی صورت دیکھ کر سمجھ گیا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے وماھذا وجہ کذاب اور آپ کا چہرہ جھوٹوں کا سا نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا اولئك یفترون علینا وعلی اکابرنا ویحرفون اقوالنا ونفوض امرھم وامرنا الی اللہ۔ وہ لوگ ہم پر اور ہمارے اکابر پر بہتان لگاتے اور ہماری باتوں کو اُلٹ پلٹ کر غلط طور سے مشہور کرتے ہیں ہم اپنا اور ان کا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں"۔

اس کے بعد افسر نے کہا کہ آپ مطمئن رہیں اور اپنا بابرکت درس جاری رکھیں مگر آپ کے مدنی تلامذہ نے کہ خوشحال و نازک مزاج تھے اس قصہ کا اتنا اثر لیا کہ دوسرا بڑا مکان خالی کرا کے حضرت کو مجبور کیا کہ ہم کو وہاں درس دیں تاکہ آئندہ ہم اپنے شیخ کے متعلق کوئی لفظ ایسا نہ سُن سکیں جس کی برداشت نہ ہو سکے اور مسجد شریف میں زبان یا ہاتھ سے جواب دینے کی نوبت آوے چنانچہ اگلے دن سے حضرت نے وہاں درس دیا اور سب کو اجازت و سند عطا فرمائی۔

آخر عمر میں بذل المجہود سے فارغ ہو کر اہلِ مدینہ کے اصرار پر مدرسۃ الایتام مدینہ منورہ میں درس دینا شروع کیا مگر چند اسباق سے زیادہ نہ ہونے پائے کہ آپ نے داعی حق کو لبیک کہا اور بلا واسطہ سلسلۂ درس ظاہری ہمیشہ کے لئے ختم ہو لیا۔

دیگر دینی مدارس کی سرپرستی

چند مدارس دینیہ بھی آپ کی سرپرستی میں تھے اور ان کی علمی و مالی ترقیات کا فکر آپ کے افکار میں ایک مستقل اضافہ تھا چنانچہ اجراڑہ ضلع میرٹھ کا مدرسہ جس کو حافظ حاجی محمد حسین صاحب نے متوکلانہ طریق پر محض اپنی ہمت سے قائم کیا تھا بالخصوص آپ کی سرپرستی میں تھا اور اس کے علاوہ مدرسہ انبہٹہ مدرسہ گلاؤٹھی مدرسہ کاندھلہ

اور علاقۂ میوات کے ۲۸ مکاتب جو مولانا محمد الیاس صاحب کی محنت و توجہ سے جگہ جگہ قائم ہوئے اور بحمد اللہ اس علاقہ جہل و ظلمت کو علم دین سے مالا مال بنا رہے ہیں۔ اور اخیر زمانہ میں مدینہ منورہ کا مدرسہ شرعیہ جس کا نام پہلے مدرسۃ الایتام والمساکین تھا آپ کی سرپرستی میں آیا اور ماشاء اللہ خوب پھلا اور پھولا۔

حل شبہات حل شبہات میں آپ کی تقریر و تحریر سادہ اور عام فہم ہوتی تھی۔ مولوی عبد المعبود چاٹگامی نے ایک شبہہ لکھا کہ شیخ عبد الرحمٰن فتح آبادی اپنی مثنوی گنج راز میں لکھتے ہیں ؎

گر کسے[1] مر پیر خود را باز گوید ایں چراست	رستگاری کہ نماید گرچہ باشد اہل راست
گر بگوید[2] پیر شب را روز طالب شک نه دید	راست ایں تمثیل از پیرست و ایماں از مرید
یا کند امرے[3] خلاف شرع سر تا پا خطا	مر ورا تسلیم کن آں کار بیچون و چرا
ار چہ[4] باشد در نماز و یا کہ باشد روزہ دار	چوں بخواند پیر آید در گزارد جملہ کار

حالانکہ حدیث میں ہے کہ[5] لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق اور حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ امر ناجائز شیخ کے فرمانے سے کبھی جائز نہیں ہو سکتا اور مولانا تھانوی نے تکشف میں لکھا ہے۔ شیخ کو خلافِ شرع کام کرتا دیکھے تو مرید اپنے پیر کو نصیحت کرے۔

تقریر جواب اس کا جواب آپ نے تحریر فرمایا۔ شیخ عبد الرحمٰن نے جو مثنوی گنج راز میں فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب معلوم ہو جائے کہ پیر کامل مکمل ہے اور اتباعِ شریعت میں اعلیٰ درجہ پر پہنچا ہوا ہے اس کے بعد اگر اس سے شریعت کے خلاف کوئی امر پایا جاوے تو اس پر انکار میں جلدی نہ کرے کہ ضرور اس میں کوئی ایسی توجیہ[6] اور عذر ہوگا کہ جس سے وہ فعل خلاف شرع ہی نہ ہوگا۔ اور جو امر کہ قطعاً خلافِ شرع ہے اور اس کی کوئی توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی وہ کسی کے لئے جائز نہیں اور نہ کسی کے کہنے سے جائز ہو سکتا ہے۔ فقط خلیل احمد سہارنپور۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ

خطِ[7] مستقیم کے ہمیشہ دو پہلو ہوں گے کہ ذرا اختلاف سے یا داہنی جانب بعید ہو تا جائے گا یا بائیں جانب دور پڑتا جائے گا۔ پس رسول کے سوا کسی کا اتباع جائز نہیں؛ یہ اسلام کا زریں اصول ہے جس کو

---

[1] اگر کوئی اپنے پیر کے لئے لوٹ لوٹ کر کہے کہ یہ کیوں ہے یہ کیوں ہے وہ نجات کس جگہ پا سکتا ہے اگرچہ وہ درست بات والا ہی ہو یعنی جلدی سے بے تحقیق حکم لگاتا ہو۔ [2] اگر پیر رات کو دن کہدے تو طالب شک نہ دیکھے پس صحیح ہے یہ مثال پیر کی اور مرید کے اعتقاد کی جبکہ تحقیق کامل نہ ہو۔ [3] یا پیر کوئی بات خلافِ شرع سر سے پیر تک غلط کرے تو تم سر جھکا دو تسلیم کر لو کیسے اور کیوں کے بغیر مان لو بے تحقیق رد نہ کرو۔ [4] اگرچہ مرید نماز میں ہو یا کہ روزہ دار ہو جب پیر پکارے آجائے اور سب کام چھوڑ دے۔ [5] کسی مخلوق کی فرمانبرداری خالق کی نافرمانی میں نہیں ہے۔ [6] وجہ ہو نا جس سے وہ ناجائز نہ رہتی ہو اور چوتھے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ان نفل نماز و روزہ کا ارادہ کرتا ہو اور پیر حق رسیدہ بلائے تو پہلے اس کی سن لے ممکن ہے وہ عبادت کی عمدگی کا سبب بن جائے۔ [7] خطِ مستقیم حضور کی سنت کہ ادھر ادھر ہٹنا ہے۔

خطِ مستقیم سمجھو مگر اس پر چلنے کے لئے ضرورت ہے افعال و احوالِ رسولؐ کے علم کی کہ حضراتِ صحابہؓ کو
حاصل ہوا تھا مشاہدہ سے اور ہم کو حاصل ہوگا ناقلینِ اقوال اور متبعین احوال کے روایات اور اعمال
سے۔ بس جس متبع رسول کا تدین[1] و تبحر خواص[2] امتِ محمدیہؐ کے نورانی قلوب نے تسلیم کرلیا اور رات
دن صدہا امور میں اپنی آنکھوں نے بھی دیکھ لیا اس کے متعلق یہ حکم لگانا کہ جو کچھ بھی کہے یا کرے
وہ یقیناً حق ہے گویا اس کو معصوم اور رسول کے مساوی سمجھ لینا ہے جو خطِ مستقیم کا داہنا[3] خط ہے۔
اور کسی امر میں ظاہری مخالفت دیکھ کر فوراً غلطی کا حکم لگا دینا[4] کہ خطا کر گیا گویا اپنے کو معصوم اور
رسول کے برابر سمجھ لینا ہے جو کہ خطِ مستقیم کا بایاں خمیدہ خط ہے۔ لہٰذا فعل رسولؐ کی تحقیق میں خود
بھی جد و جہد کرنے اور متبعین رسولؐ کو اس کا واسطہ و آلہ[5] کار بھی بنائے کہ یہی وہ بال سے باریک راستہ
ہے جس پر چلنے کا مسلمان مامور ہے اور اسی کی صورت[6] مثالیہ پلصراط ہوگی جس پر چلنا دنیا میں اعتدال
پر چلنے کا تمثل[7] ہوگا۔ جو شخص یہاں اعتدال پر چلنے کا جس درجہ میں عادی و مشاق تھا وہ اسی بے تکلفی
سے قیامت کے دن اس پر چلے گا۔ پس محبتِ الٰہی جس کے امتحان کی خاطر شریعت وضع ہوئی ہے
نہ تو متبعین شریعت کا ہر امر میں دامن پکڑ لینے سے بے نیاز[8] بناتی ہے کہ اندھوں کے لئے راہبر اور وکلاء
عدالت کی طرح قانون کی سمجھنے والی جماعت یہی ہے، اور نہ ان پر اتنا اعتماد ہونے دیتی ہے کہ ان کو
رسول کا منصب دیکر معصوم[9] سمجھ لیں، کہ کوئی بیرسٹر کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو ممکن ہے کہ عدالت میں اس
کی فہم و رائے غلط ثابت ہو۔ لیکن اس احتمال پر اپنے نازک معاملات اس کے حوالہ کرنے کو چھوڑا بھی نہیں
جاتا۔ جب تک کہ صلحاءِ امتِ محمدیہؐ کے قلوب[10] اس کے راہزن ہونے پر مجتمع نہ ہوجاویں یہ اجماع امت
بمنزلہ رسول کے حکم لگانے اور رشد و کالت کے چھین لینے کے قائم مقام ہے ؎

دوگونہ رنج[11] و عذاب است جانِ مجنوں را　　بلائے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ

فقہ میں درک

حدیث کے بعد درجہ ہے علمِ فقہ کا اور اس میں آپ کی مجتہدانہ استعداد اور وسعتِ نظر
تمامی ہمعصر علماء میں مسلّم تھی کہ جن مسائل میں علماء کے اختلاف ہوتے وہ محاکمہ کیلئے

---

[1] تابع سنت کی دینداری اور علمِ دین کی مہارت۔ [2] اولیاء وقت۔ [3] غلو ہے سنت سے ہٹنا ہے۔
[4] اپنی رائے کو مضبوط قرار دینا ہوا جبکہ تحقیق نہیں کی گئی۔ [5] کہ اس کے موافق کام دیکھ کر عبرت پکڑے۔
[6] قیامت میں تشبیہی شکل جیسے کہ صوفیہ حضرات نے بتائی ہے۔ [7] مشابہ ہونا۔ [8] کہ بغیر ان کے کام بن سکے یہی رہبری و
ہدایت کریں گے۔ [9] اور سنت سے نہ پرکھ لیا کریں۔ [10] صرف اپنی رائے سے نہیں اولیائے وقت کی پرکھ دیکھنی ہوگی
[11] مجنوں کی جان کو تو دوہرا عذاب و رنج ہے۔ لیلیٰ کی جدائی کی مصیبت بھی اور صحبت کی نزاکت بھی۔

آپکے پاس بھیجے جاتے اور جن معرکۃ الآرا مباحث میں قلم اٹھاتے اہلِ علم گھبراتے تھے وہ آپ کی خدمت میں لائے جاتے تھے۔ مدرسہ میں چار[1] ضخیم جلدیں موجود ہیں جن میں کئی ہزار فتاوے نقل ہیں اور یہ سب وہ ہیں جو خود حضرت کے لکھے ہوئے یا لکھوائے ہوئے ہیں یا دوسروں کے لکھے ہوئے اور آپکے تصدیق کیے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ عام خطوط میں جو مسائل آپ سے پوچھے جاتے اور خط ہی میں آپ ان کا جواب لکھوا دیا کرتے تھے وہ علیحدہ ہیں کہ ان کو جمع کیا جائے تو ایک بڑی کتاب بن جائے مگر چونکہ یہاں مسائل کا استیعاب منظور نہیں بلکہ نمونہ دکھانا ہے اس لئے چند مسائل نقل کرتا ہوں۔

ذبیحہ گاؤ

خلافت[1] کے زمانہ میں ہندو مسلم کے اتحاد کی کوششوں پر ذبیحہ گاؤ کے ترک کرنے کی تحریک ہوئی اور بہتیرے علما بھی اس خیال پر چلنے لگے مگر آپ نے بلاخوف[2] لامۃ لائم ترک کی حرمت کا فتوی دیا جو اخبار وکیل امرتسر ۲۶ اپریل ۱۹۱۱ئہ میں بھی شائع ہوا۔ اس وقت آپ پر بہتیرا سب و شتم ہوا اور مشہور کیا گیا کہ آپ گورنمنٹی آدمی ہیں اور تنخواہ پاتے ہیں۔ مگر حق آخر حق ہی ہے چند ہی دنوں بعد موافقت کرنے والوں کو رجوع کرنا پڑا اور آخر صادق آیا ع چرا کارے[3] کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ وہ فتوی بجنسہ درج کرتا ہوں۔

اسلامی شریعت کے قواعد اور اس کے ضروری احکام میں سے یہ ہے کہ ترویج[4] شعار کفر اور اس کی اعانت سخت حرام ہے۔ دیکھو زنار پہننا وغیرہ امور کہ جن میں شعار کفر کی ترویج ہو کفر ہیں یا حرام۔ اسی طرح شعار[5] اسلام کے ترک کی اعانت بھی حرام ہے۔ خصوصاً جن بلاد میں مخالفت کفر کی وجہ سے جو کوئی امر اگرچہ مباح ہی کیوں نہ ہو عرفاً شعار اسلام قرار پا چکا ہو اس کا بالکل ترک کرنا حرام ہوگا اور اس کے ترک کی اعانت بھی حرام ہوگی۔ مثلاً ہندوستان میں اہلِ ہنود اپنے لباس میں انگرکھا وہ پہنتے ہیں کہ جن کے داہنے جانب پردہ کھلا ہوتا ہے اور اہلِ اسلام کے یہاں رفع تشبہ کے لئے یہ امر قرار پایا کہ ایسا انگرکھا پہنیں کہ جس کی بائیں جانب کھلی ہو۔ پس اگر کوئی قوم اس کو ترک کرکے کفار کا طریق اختیار کرے اور اہلِ اسلام کا طریق چھوڑدے تو یہ حرام ہوگا اگرچہ فی حد ذاتہ یہ دونوں امر مباح ہیں۔ بناءً علیہ گائے کا ذبح کرنا اور اس کی قربانی گو فی حد[6] ذاتہ مباح ہے لیکن ہندوستان میں یہ امر بحیثیت ایک اسلامی شعار کے اہلِ اسلام میں مروج ہے اس لئے کہ گائے کا ذبح نہ ہونا ہندوستان میں شعار کفر میں داخل ہو چکا ہے۔ پس ایسی صورت میں اس کا ترک ہونا

---

[1] سلطان عبدالحمید خاں ترکی کے آخری بادشاہ کی معزولی پر پورے ملک میں خلافت کے لئے ہنگامہ ہوا تھا۔
[2] ملامت کرنے والے کی ملامت کے خوف کے بغیر۔ [3] کیوں عقلمند آدمی ایسا کام کرے کہ پھر پشیمانی حاصل ہو۔
[4] کفر کی خصوصی باتوں کو رواج دینا۔ [5] اسلامی خصوصیات۔ [6] اپنی ذات کے اعتبار سے۔

اسلامی شعار کو یقیناً صدمہ رساں ہے اور شعارِ کفر کی ترویج[1] اور اس کی اعانت ہے لہذا ہر ایک مسلمان کو ایسی درخواست پر دستخط کرنا اور انسداد[2] گاؤکشی کے امر میں اعانت کرنا سخت حرام قریب کفر ہے مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس سے نہایت پرہیز کریں اور جن لوگوں نے ناواقفیت سے یا طمع نفسانی سے دستخط کر دیئے ہیں یا اور کسی طرح کی اعانت کی ہے ان پر واجب ہے کہ وہ توبہ کریں اور اپنے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کریں کہ ہم سے خطا ہوئی اور ہم اس میں شریک نہیں۔ فقط۔

سید شیر محمد صاحب ساکن گھوٹکی نے ایک اہم سوال جس میں علماءِ سندھ کو بڑا اختلاف تھا محاکمہ کی غرض سے مع تحریراتِ علماء کے حضرت کے پاس بھیجا تو آپ نے اس کو مدلل طریق سے حل فرمایا اور وہ المغتنم فی زکوٰۃ الغنم[3] کے نام سے شائع ہوا۔ اسی طرح ایک مسئلہ مذبوح فوق العقدہ کا آیا جس میں علماء کو بہت اختلاف تھا۔ آپ نے اس کا مدلل و مبسوط جواب لکھا جو فتاوائے مدرسہ میں درج ہے۔

آپ کو جب تک شرح صدر نہ ہو جاتا اپنی جماعت کے بھی کسی مفتی کی رائے کا اتباع نہ فرماتے تھے چنانچہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا تھانوی کی رائے سے آپ نے بارہا اختلاف کیا مگر یہ اختلاف چونکہ عالمانہ رائے کا ہوتا تھا لہذا تعلق محبت و عظمت میں کچھ بھی فرق نہ آتا تھا۔

ریلوے ڈاک کے ملازمین بحالتِ سفر قصر کریں

محمد حنیف بنارسی ریلوے ڈاک میں ملازم تھے کہ لکھنؤ میں قیام رہتا مگر ہر تیسرے دن لکھنؤ سے بنارس جانا پڑتا تھا نماز کے متعلق ان کا سوال ہوا کہ قصر کریں یا اتمام؟ تو آپ نے تحریر فرمایا "ریلوے ڈاک کے ملازمین ہمیشہ مسافر ہی رہیں گے محلِ اقامت[4] پر جب تک پندرہ روز مسلسل کی نیت نہ ہوگی اس وقت تک نماز قصر پڑھیں گے"

سفرِ شرعی کی مقدار حضرت کے نزدیک

اسی طرح سفرِ شرعی کی مقدار کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک چھتیس کوس نہیں بلکہ چھتیس میل پر قصر ہو جاتا ہے لوگ چاہتے تھے کہ سب حضرات کی رائے ایک امر پر متفق ہو جائے۔

چنانچہ حاجی وجیہ الدین صاحب میرٹھی نے مختلف فتوے منگا کر حضرت کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ حضرت جواب تحریر فرما دیں۔ مگر حضرت نے لکھا کہ "مسئلہ سفر کے متعلق روایات میں کوئی اختلاف نہیں۔ صرف راویوں کا اختلاف ہے کہ اقصر ایام[5] کے نصف اقل میں متوسط رفتار والا مسلسل کتنا چل سکتا ہے؟ دوسرے حضرات کے نزدیک ۱۲ کوس ہوئے اور میرے نزدیک ۱۲ میل) چنانچہ مشائخ حنفیہ میں بھی رائے کا اختلاف ہوا۔

[1] رواج دینا۔ [2] گائے کے ذبح کے بند کرنے میں۔ [3] یہ رسالہ ۲ر قیمت پر سید شیر محمد صاحب سرگھوٹکی ضلع سکھر (سندھ) کے پتہ پر مل سکتا ہے مگر اب نایاب ہے۔ [4] لکھنؤ وغیرہ کام کی وجہ سے رہنے کے مقام پر جو وطن نہیں تھا۔ [5] سال کے چھوٹے دن کے نصف سے کچھ کم میں۔

(کہ کسی نے ۵ فرسخ[1] یومیہ لیا کسی نے ۶ فرسخ اور کسی نے ۷ فرسخ) اور باہم اتفاق نہ ہو سکا۔ لہٰذا اتفاق رائے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ اس کو مبتلیٰ بہ[2] کی رائے پر رکھنا چاہئے کہ جو شخص سفر کرتا ہے اگر وہ اس کو تین منزل سمجھتا ہے تو قصر کرے اور اگر اس کے نزدیک تین منزل نہ ہو تو قصر نہ کرے۔"

اور صاحب رائے نہ ہو تو میرے نزدیک اگر منازل معین ہوں تو ان کا اعتبار کرے ورنہ جس عالم سے عقیدت[3] ہو اس پر عمل کرنا کافی سمجھے کہ بحمد اللہ سب فقیہ اور اہلِ حق ہیں اور ترجیح کے لئے اپنا میلان کافی ہے۔ واللہ اعلم۔

امداد الفتاویٰ مع تتمات میں کئی مسئلے حضرت کے محققانہ فیصلے کے مذکور ہیں جن میں چند خوانِ[4] خلیل کی توضیح میں صاحب المظاہر سہارنپور شائع کر چکے ہیں۔

فتویٰ میں شرح صدر کا اہتمام

فتویٰ میں اعتماد اور شرح صدر کا اہتمام حضرت میں اتنا غالب تھا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے فتیے میں بھی اس کے محتاج ہوتے تھے بجز اگر موافقت و مخالفت دونوں میں شرح صدر نہ ہوا تب تو ادباً فتوے دینے میں حضرت ہی کی موافقت فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا کہ ماموربالحج[5] کے لئے تمتع جائز نہیں، اپنے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوے میں مجھے شرح صدر نہیں ہوا بلکہ میں اِذنِ آمر[6] کے بعد اس کو جائز سمجھتا ہوں مگر حضرت کے خلاف فتوے دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت کی رائے معلوم ہونے کے بعد اس خیال سے کہ مجھے اپنے شیخ کا اتباع کافی ہے۔ تھانہ بھون میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا مگر جب تصدیق کے لئے سہارنپور حضرت کے پاس آیا تو آپ نے اس کی تردید لکھی اور تحریر فرمایا کہ جواز کے جو دلائل مجیب نے لکھے وہ سب مخدوش ہیں" البتہ اگر خلاف آپ کو روایات فقہی سے محقق ہو جاتا تو پھر آپ اس کا اظہار فرض سمجھتے اور یہ فرما کر کہ معصوم بجز رسول کے کوئی نہیں اتباعِ فقہاء کو اتباعِ شیخ پر ترجیح دیتے تھے۔

چنانچہ مقیم مقتدی کسی مسافر کے پیچھے دوسری رکعت میں شریک ہو تو کس طرح نماز پوری کرے؟ آیا دو رکعت سکوت سے اور رکعت قرأت سے یا تینوں بالقرأۃ؟ جیسا کہ مقیم امام کے ساتھ چوتھی رکعت شریک ہونے والا اپنی تینوں چھوٹی ہوئی رکعات ادا کرتا۔ حضرت کو حکم ثانی محقق ہوا اور آپ نے اس کو مدلل قلمبند فرما کر بھیج دیا۔ اپنی جماعت کے تمام علماء پہلی رائے پر جمے ہوئے تھے لہٰذا خلاف کیا اور یہ بھی لکھا کہ حضرت گنگوہی کی رائے بھی ہمارے موافق ہے۔ وہ فتویٰ پھر حضرت کے پاس آیا تو آپ نے

---

[1] ایک فرسخ تین میل ہوتا ہے۔ [2] جو اس میں مبتلا ہو۔ [3] عام طور سے سولہ میل روزانہ سے تین دن کے اڑتالیس میل احتیاطی مانے گئے ہیں۔ [4] حضرت تھانوی کا رسالہ جو حضرت سہارنپوری کی وفات پر لکھا تھا۔ [5] حج بدل کرنے والے کیلئے۔ [6] حج بدل کرنے والے کی اجازت۔

دوبارہ مبسوط تحریر لکھی کہ مجھے بھی معلوم ہے ہمارے حضرت کی رائے اس کے خلاف تھی مگر کتب فقہیہ کی روایات جب صاف اور واضح ہیں تو پھر ان کو چھوڑا نہیں جاسکتا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ اس مسئلے کو جس نے دیکھا صلوٰۃ مسافر میں دیکھا۔ حالانکہ یہ تحقیق مسبوق و لاحق کی بحث میں ہے جس پر مفتی کی نظر نہیں گئی چنانچہ آپ اپنی رائے سے نہ ہٹے۔ ہاں حضرت مولانا رائپوری نے ساری تحریر دیکھ کر حضرت سے موافقت فرمائی اور تحقیقِ حق سے نہایت مسرور ہوئے۔

جھینگا مچھلی

جھینگا مچھلی کے متعلق بھی آپ کی رائے تھی کہ مچھلی نام پڑ گیا حقیقت میں وہ مچھلی نہیں کہ اس کے گلپھڑے نہیں ہوتے لہٰذا آپ اس کو دریائی جانور سمجھتے اور حلت کا فتویٰ دیتے تھے۔

مولانا حکیم مصطفےٰ صاحب بجنوری نے کہ علم الابدان[1] و علم الادیان کے جامع ہیں ادویات کی حلت و حرمت کے حکم میں ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ ستائیس[۲۷] سوال اس میں ایسے رہ گئے جن کو مولانا حل نہ کرسکے اور تھانہ بھون بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ چند مسائل کا جواب حضرت مولانا نے دیا اور باقی کے متعلق فرمایا کہ مولانا انور شاہ صاحب یا حضرت مولانا سہارنپوری سے حل کرو۔ حکیم صاحب دیوبند آئے اور شاہ صاحب کے سامنے سوالات پیش کئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ایک مہینے سے کم میں جواب نہیں لکھ سکتا کہ بہت کتابوں کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے۔ حکیم صاحب کا رسالہ زیرِ طبع تھا عرض کیا کہ بہت حرج ہوگا۔ فرمایا پھر میں کیا کروں کہ اس سے کم میں جواب دینا مجھ سے ناممکن ہے۔ حکیم صاحب نے وہ سوالات حضرت کی خدمت میں بھیجے اور عجلت کی وجہ بھی لکھ دی تاہم حضرت کا ضعفِ بصر اور اشتغالِ کثیرہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ زیادہ حرج اوقات نہ فرمادیں تھوڑا تھوڑا کرکے کسی سے لکھوادیں۔ مگر حضرت نے ان کو دیکھا تو ایک ہی مجلس میں سب کے جوابات لکھوا کر حکیم صاحب کے پاس بھیج دیئے۔ حکیم صاحب حیران ہوگئے اور اب تک فرمایا کرتے ہیں کہ ایسا متبحر فقیہ میری نظر سے نہیں گذرا۔

اس کے بعد پانچ اہم مسائل اور لکھے کہ ان کا جواب بھی مرحمت فرمادیں تو اسی بے تکلفی و آسانی سے ان کا جواب بھی لکھوادیا کہ گویا پہلے سے مستحضر تھے۔ یہ جوابات مع دیگر فتاویٰ کے انشاء اللہ مستقل رسالہ میں طبع کئے جائیں[2]

رسالہ المہند

مدینہ منورہ میں آپ کے مخالفین نے جب شورش برپا کی تو وہاں سے ۲۷ سوالات عربی میں آئے اور جن مسائل میں علماءِ دیوبند کو متہم[3] کیا جاتا ہے سب کی تحقیق و تفصیل دریافت کی تو آپ نے عربی میں مدلل جوابات لکھ کر بھیجے جو المہند کے نام سے طبع ہوکر مصر و شام و فلسطین بھی گئے اور بلادِ اسلامیہ کے علماء کی اس پر تصدیق ہوئیں۔

[1] بدنوں کا علم یعنی طب اور دینوں کا علم یعنی دین۔ [2] افسوس کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ [3] تہمت لگایا ہوا۔

رسالہ تنشیط الآذان

جمعہ کی اذان خارجِ مسجد ہونے کا مسئلہ بریلی سے چلا تو آپ نے اس کا فوراً محققانہ جواب لکھا جو تنشیط الاذان کے نام سے طبع ہوا اور کوئی اس کا جواب اب تک نہ دے سکا۔

شامی کے متعلق حضرت کی رائے

فتوی لکھتے ہیں حضرت اکثر شامی ملاحظہ فرمایا کرتے مگر جس قول کے وہ ناقل ہوتے اس کو تو حضرت حجت سمجھتے اور جو صاحبِ شامی کی ذاتی رائے ہوتی اس کو حجت قرار نہ دیتے بلکہ تنقید و تحقیق کرتے اور فرمایا کرتے کہ یہ معاصر ہیں ہم رجال و نحن رجال[1] ان کی رائے ہم پر حجت نہیں جب تک کہ اسلاف کے قول سے مؤید نہ ہو۔

بدائع الصنائع کا مطالعہ

اوقاتِ فراغ میں حضرت بدائع[2] کو اکثر دیکھا کرتے۔ بارہا سنا ہے کہ حضرت اس کے مصنف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فقہ ہی کے واسطے پیدا فرمایا تھا۔

مولوی ظفر احمد صاحب نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرماویں۔ فرمایا مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتا آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعۂ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہئے۔

حضرت گنگوہیؒ کا شامی کو کئی بار بالاستیعاب مطالعہ فرمانا

ہمارے حضرت گنگوہیؒ نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے اس وقت بدائع مطبوع نہیں ہوئی تھی۔ اب میں شامی کے ساتھ اس کے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

بدائع الصنائع میں اصول اور فقہ کی لِم زیادہ ہیں اور شامی میں جزئیات

حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے۔ ایک بار فرمایا۔ جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں مگر اصول اور فقہ کی لِم زیادہ بدائع میں کہ اس سے مناسبت ہو جائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے۔

حضرتؒ کی شانِ تفقہ

ایک بار آپ فتاوی حمدویہ مصریہ ملاحظہ فرما رہے تھے اس میں اتفاقاً یہ مسئلہ نظر سے گذرا کہ "دو ذمی[3] مدعی و مدعا علیہ نے قاضی اہل الذمہ[4] کی عدالت میں

---

[1] یہ بھی انسان ہیں ہم بھی انسان۔ [2] بدائع الصنائع فقہ حنفی مع دلائل کی عجیب و غریب مستند و معتبر قدیم کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔
[3] اسلامی حکومت کی رعیت بن کر رہنے والے کافر ذمی ہیں۔ [4] رعایا کافروں کا کافر قاضی جو ان کے مذہب کے موافق فیصلے کرے۔

مرافعہ کیا اور اس نے فیصلہ دیا جو ایک فریق کو ناپسند ہوا۔ اس نے قاضی مسلم کی عدالت میں مرافعہ کیا اور قاضی مسلم نے قاضی اہل الذمہ کے فیصلہ کو توڑ کر شریعت کے موافق فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق علماءِ مصر سے استفتا کیا گیا کہ قاضی مسلم کا یہ فعل یعنی حکم سابق کا توڑنا صحیح تھا یا نہیں؟ ایک عالم نے جواب دیا کہ صحیح نہ تھا کیونکہ قاضی اہل الذمہ بھی سلطان کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا فیصلہ اگر اہل الذمہ کے مذہب کے موافق صحیح تھا تو اس کا توڑنا اس کو جائز نہ تھا۔ دوسرے عالم نے جواب دیا کہ توڑنا صحیح تھا کیونکہ قاضی مسلم کے پاس جب مقدمہ آئے گا تو وہ شریعتِ اسلام کے موافق فیصلہ کرے گا۔ اس کا محاکمہ علامہ مہدی مفتی مصر کے پاس بھیجا گیا کہ ان دونوں فتووں میں کون صحیح ہے؟ علامہ نے پہلے جواب کو رد کیا اور دوسرے کی تصویب کی۔

حضرت نے سارا قصہ سنا کر مولوی ظفر احمد سے فرمایا بتلاؤ ان میں کونسا جواب صحیح ہے؟ عرض کیا حضرت بظاہر وہی صحیح ہے جس کی علامہ مہدی نے تائید کی ہے۔ فرمایا نہیں علامہ نے محاکمہ صحیح نہیں کیا کیونکہ قاضی مسلم اہل ذمہ کے بارے میں شریعت کے موافق فیصلہ اس وقت کر سکتا ہے جبکہ فریقین نے اس کی طرف مرافعہ کیا ہو اور صورتِ مسئولہ میں فریقین نے مرافعہ نہیں کیا بلکہ صرف ایک فریق نے مقدمہ قاضی مسلم کے یہاں دائر کیا ہے جس کے خلاف قاضی ذمی نے فیصلہ کیا تھا۔ دوسرے فریق نے فیصلۂ سابق سے ناگواری ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اسی پر راضی ہے اور وہ قاضی مسلم کے پاس مقدمہ نہیں لایا پس مرافعہ نہیں پایا گیا اس لئے قاضی ذمی کا فیصلہ منقوض نہیں ہو سکتا لہٰذا جواب موجبِ اول کا صحیح ہے مگر اس نے دلیل بیان کرنے میں غلطی کی۔ عدمِ جوازِ نقض کی یہ وجہ نہیں کہ قاضی ذمی مقرر کردہ منجانب السلطان ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مرافعہ کا تحقق نہیں ہوا اور جواب ثانی غلط ہے۔ البتہ مجیب ثانی کا یہ قول صحیح ہے کہ جب قاضی مسلم کی طرف اہلِ ذمہ مرافعہ کریں تو اس کو شریعتِ اسلامیہ کے موافق فیصلہ کرنا چاہئے مگر اس نے مرافعہ کی حقیقت میں غور نہیں کیا۔ مرافعہ کے یہ معنی نہیں کہ ایک فریق مقدمہ لے آئے بلکہ مدعی و مدعا علیہ دونوں کا اسلامی فیصلہ پر راضی ہو کر مقدمہ لانا شرط ہے بدون اس کے مرافعہ و ترافع کا تحقق نہ ہوگا۔ اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے مسئلہ کا جس میں علماءِ مصر کا باہم اختلاف ہو اور مفتیٔ اعظم کے پاس محاکمہ کے لئے بھیجا گیا ہو ایک سرسری نظر میں اس طرح مدلل و مستحکم اور ایسی جلد فیصلہ کر دینا کس شانِ تفقہ کو ظاہر کر رہا ہے۔

۱؎ دونوں لفظوں میں ایک کا دوسرے کے ساتھ مل کر دفع کرنا لازم ہے اس لئے دونوں مسلمان قاضی کے یہاں لائیں تو شرعی حکم جاری کرنا ہوگا۔ ۲؎ زیادہ احتیاط ذاتی۔

اختلافی صورت میں احوط قابلِ ترجیح ہے

عمل کے لئے اختلافی روایات میں ہمیشہ آپ احوط[1] صورت کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ جب میرے بھتیجے نے قرآن مجید ختم کیا تو عمر چودہ سال کی تھی میں نے چاہا کہ رواج کے موافق فقہا مجوزین کی روایت پر اس کا قرآن مجید تراویح میں سنوں مگر حضرت نے تحریر فرمایا "عالمگیریہ میں ہے: واما الصبی العاقل فی التراویح والنوافل المطلقہ یجوز عند بعضھم ولا یجوز عند عامتھم کذا فی محیط السرخسی[2]۔ جبکہ اکثر مشائخ عدم جواز امامت کا حکم فرما رہے ہیں تو مناسب نہیں ہے کہ ایسی عبادت کے اندر جو سال بھر میں ایک ہی دفعہ آتی ہے قولِ ضعیف پر عمل کر کے راجح قول کے بموجب ضائع کیا جائے۔ لہٰذا اس سال بچہ کا قرآن نوافل میں سن لیجئے سالِ آئندہ میں اللہ خیر رکھے تراویح میں سن لیجئے گا۔ فقط والسلام۔

حاج شیخ رشید احمد صاحب کے بچوں کے ختم قرآن پر آپ تشریف لائے تو اپنی تراویح علیحدہ پڑھیں ان کا اقتدا نہیں کیا۔

ایک بے سند اشتہار پر حضرت کی تنقید

بے سند اور بے دلیل بات آپ کو بہت گراں گذرتی تھی چنانچہ وہ اشتہار جو فرمانِ مصطفویؐ کے نام سے بار بار جگہ جگہ شائع ہوتا ہے کہ خادم روضہ شیخ احمد کو بشارت ہوئی کہ "اتنے لاکھ میری امت میں مرے مگر بجز چند نفر کے سب کافر مرے"۔ میری وصیت ہے کہ اعمال درست کریں کہ توبہ کا دروازہ بند ہونے والا ہے اور مسکینوں کو چاول شکر کھلائیں اور یوں کریں یوں کریں۔ ہمیشہ آپ کو گراں گذرا کہ توبہ اور اصلاحِ اعمال بیشک ضروری اور مسلمانوں کی حالتوں میں کمزوری بھی مسلّم مگر حضرت روحی فداہٗ کی طرف بے دلیل انتساب کرنے پر سخت وعید آئی ہے اور شیخ احمد کا پتہ نہیں کوئی شخص ہے بھی یا نہیں۔ مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ بغیر تحقیق اس کو فرمانِ مصطفویؐ سمجھ کر لگے اشاعت کرنے اور کارِ ثواب سمجھے۔ یہ تو یہودی یا غیر مسلم کی کارروائی ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام لانے سے روکے کہ بنے بنائے جدی مسلمان جب اتنے کافر مرے تو غیر مسلم کس توقع پر اسلام قبول کرے۔ اور مسلمانوں کو وحشت دلاتا ہے کہ جب اسلام سے کوئی نفع ہی نہیں تو دنیا کا مزہ اور تنعم کیوں چھوڑا۔ یہ بات اگر صحیح بھی ہو مگر حضرتؐ کی طرف منسوب ہونا اس کا صحیح نہ ہو تو اس کو حضرتؐ کی طرف منسوب کرنا حرام ہے اور ثواب سمجھ کر شائع کرنا تو بڑی ہی حیرت کی بات ہے۔

اخیر زمانہ میں جب آپ مدینہ منورہ مقیم تھے تو حافظ فخرالدین صاحب نے ایک اشتہار آپ کے پاس

---

[1] زیادہ احتیاط والی۔ [2] نابالغ مگر صاحب عقل بچے کی امامت تراویح اور ہر طرح کی نفلوں میں بعض فقہا کے نزدیک جائز ہے مگر عام فقہا کے نزدیک ناجائز ہے جیسے امام سرخسی کی محیط میں ہے۔

بھیج کر استفسار کیا کہ اس خواب کی کیا اصل ہے ؟ تو آپ نے جواب لکھا کہ یہاں روضۂ اقدس کا خادم اس نام کا کوئی بھی نہیں اور تحقیق کر لیا کہ یہاں کسی شخص نے بھی ایسا خواب نہیں دیکھا اور نہ مدینہ منورہ کا کوئی شخص اس خواب یا قصہ سے واقف۔ یہ اشتہار قطعی بے بنیاد ہے اور اس کی بعض باتیں تو بالکل قابل اعتماد نہیں۔ اس تحریر پر آپ نے علماء مدینہ کے دستخط بھی کرا دیئے اور حافظ صاحب کے پاس بھیج دیا کہ کوئی مانے یا نہ مانے مگر تبلیغ کا فرض ادا ہو جائے۔

اپنے کسی ذی علم خادم کو اگر حضرت کی رائے سے خلاف ہوتا تو حضرت اس پر گرانی نہ لاتے اور عامیانہ تقلید میں اپنی موافقت پسند نہ فرماتے تھے بلکہ ان کو بلا کر گفتگو فرماتے۔ ایک بار کسی استفتا کا جواب حضرت نے لکھوا کر دستخطوں کے لئے مدرسین کے پاس بھیج دیا۔ مولوی ظفر احمد صاحب کو شرح صدر نہ ہوا اور دستخط نہ کئے حضرت نے ان کو بلوایا اور فرمایا اپنا شبہ ظاہر کرو ممکن ہے ہم ہی غلطی پر ہوں۔ ایسا ہوا تو ہم رجوع کریں گے ورنہ تم موافق ہو جاؤ گے، عرض کیا کہ حضرت کے سامنے ہم جاہلوں کی ہستی کیا مگر دستخط کا مفہوم چونکہ اظہار اطمینان ہے اور وہ حاصل ہوا اس لئے میں نے عذر کر دیا تھا۔ فرمایا یہ تو عین مقصود ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ کوئی فتویٰ یہاں سے ایسا جاوے جس پر اپنوں ہی میں سے کسی کو اطمینان نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے شبہ عرض کیا اور حضرت نے اس کا جواب دیا۔ دو تین بار پھر اشکال کئے اور حضرت جواب دیتے رہے حتی کہ ان کو اطمینان ہو گیا اور جب دستخط کر دیئے تب حضرت نے فتویٰ روانہ کیا۔

مولوی ظفر نے عرض کیا کہ حضرت اس وقت تو تفقہ حضرت والا پر ختم ہے کہ حق تعالیٰ نے اسی کے لئے حضرت کو پیدا فرمایا ہے۔ بیساختہ فرمایا میاں ظفر یہ سب گنگوہ کی حاضری کی برکت اور اپنے حضرت کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ اگر میں گنگوہ حاضر نہ ہوتا تو نہ معلوم کس کھیت کا بتھوا ہوتا۔ اس کلمہ کا جو اثر مجھ پر ہوا بس میرا دل ہی جانتا ہے۔

اختلاف میں بھی اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ

باایں تفقہ آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فساد صلوٰۃ بمحاذات النساء[1] کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا۔ حضرت رح تو حنفیہ کے قول کو قوی فرما رہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف۔ حضرت نے فرمایا تم پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا۔ مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آ گئی۔ مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آ گئے۔ تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہو گئے

[1] عورت کے برابر ہو جانے سے مرد کی نماز ٹوٹ جانا۔

جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتدا بالسلام کی اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر فرمایا اگر مجھ سے کچھ گستاخی آپ کی شان میں ہوگئی ہو تو معاف فرما دینا۔ ان بندۂ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہیں کی۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ

ایک بار آپ ٹونک تشریف لے گئے اور بندہ ہمراہ تھا۔ چند اہلِ حدیث ملنے آئے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا حضرت نے مصافحہ میں حسب عادت دونوں ہاتھ بڑھائے اور مسکرا کر فرمایا کہ مصافحہ اس طرح سے ہونا چاہئے۔ وہ بولے حدیث میں ہے صحابی کہتے ہیں وکان یدی فی یدیہ صلے اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ حضرت کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ آپ نے بیساختہ فرمایا پھر متبع سنت ہم ہوئے یا تم؟ آنحضرتؐ کے ہوتے ہوئے صحابی کے اتباع کی ضرورت؟

نماز میں آنکھیں بند کرنا

ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! آنکھ بند کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے؟ لیکن بغیر آنکھ بند کئے یکسوئی نہیں ہوتی۔ فرمایا شروع سے آخر تک نماز میں آنکھ بند رکھنا مکروہ ہے اور کبھی آنکھ بند کر لینا کبھی کھول دینا مکروہ نہیں۔

رسول اللہؐ کے ساتھ لفظ سیدنا کے استعمال پر قاضی مدینہ سے مدلل گفتگو

آپ روضۂ مسجد نبویؐ میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن بلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اس زمانے میں جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے اور چاروں طرف حرم نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی۔ حضرت نے موقع غنیمت پا کر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور کہا فرمایا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ ہاں حدیث میں آیا ہے۔ قاضی صاحب ہمہ تن گوش ہو کر حیرت کے ساتھ پوچھا کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر[۳] قاضی صاحب نے کہا ہاں اس طرح تو آیا مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک

---

[۱] حالانکہ مولوی صاحب حضرت تھانوی سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی خود حضرت سہارنپوری کا بے انتہا ادب کرتے تھے۔ بعد میں ان کا میلان اہلِ حدیث کی طرف کھل گیا تھا اور تھانہ بھون سے الگ کر دیئے گئے تھے۔

[۲] صحابی کا دوسرا ہاتھ کہاں تھا اس کا ذکر نہیں ہے ذکر نہ ہونے سے یہ دلیل لینا کہ صرف ایک ساتھ کیا تھا صحیح نہیں احتمال ہے کہ دوسرا ہاتھ ساتھ ہو مگر حضورؐ کے ہاتھوں کے درمیان ایک ہی ہو سکتا ہے دوسرا باہر اگر ساتھ ہو اور صحابی نے صرف ایک ہاتھ سے کیا ہو تو فعل صحابی سے حضورؐ کا فعل مقدم ہے۔

[۳] میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں۔

کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے؟ قاضی صاحب نے کہا نہیں قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آگیا کافی ہے۔

سلطان اس مکالمہ کو بغور سن رہے تھے۔ اب انھوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا ممانعت نہیں آئی۔ سلطان نے فرمایا کہ ایک جگہ آگیا اور ممانعت کہیں نہیں آئی، تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت کی قاضی صاحب اور سلطان سے یہ پہلی ملاقات تھی جس میں حضرت نے اپنا حق ادا کیا۔ اگلے دن نجدیوں میں حضرت کی گفتگو کا شور برپا رہا اور پھر مشرک کی صدا کبھی کان میں نہ آئی۔

سلطان عموماً عصر کی نماز میں شریک ہوتے اور اسی جگہ بیٹھا کرتے جو حضرت کا شروع سے بیٹھنے کا مقام تھا۔

قاضی القضاۃ کا مسائل میں رجوع کرنا

اس قصہ کے بعد قاضی بن بلیہد کے دل میں حضرت کے تبحر و تقوی کا ایک خاص احترام پیدا ہوگیا کہ اکثر مسائل میں حضرت سے مراجعت کرتے اور اپنے اساتذہ کے مثل حضرت کا ادب فرماتے تھے۔ کبھی حضرت کے مکان پر بھی تشریف لاتے اور دیر تک علمی مکالمہ ہوتا تھا۔

شافعی امام کے پیچھے نماز اور دیگر مذاہب کی رعایت کی درخواست

سلطان کی تشریف آوری سے قبل ایک قصہ یہ پیش آچکا تھا کہ شافعی امام نے صبح کی نماز میں سجدۂ تلاوت پڑھ کر رکوع کردیا کہ یہی قائم مقام سجدہ کے ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد حضرت نے امام صاحب سے فرمایا کہ یہ سجدہ ہم حنفیوں کے یہاں واجب ہے اور رکوع سے جب تک کہ اس کو سجدہ کے قائم مقام بنانے کی نیت نہ کرے ادا نہیں ہوتا اور بہتیروں کو معلوم بھی نہیں کہ یہاں سجدہ کرنا ہے اور یہ آیت سجدہ ہے لہٰذا احناف کے مذہب کی رعایت آپ پر واجب ہے۔ امام نے روکھا جواب دیدیا کہ ہم پر کسی کے مذہب کی رعایت واجب نہیں۔ ہم اپنے مذہب کے موافق عمل کریں گے۔

حضرت نے فرمایا ایسا ہے تو آپ کے پیچھے ہماری نماز نہیں ہوتی اور حضرت نے اعلان فرمادیا کہ جس شخص نے رکوع میں سجدہ کی نیت نہ کی ہو وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھے۔ چنانچہ بہتیروں نے نمازیں لوٹائیں۔ اس کے بعد حضرت نے مدرسہ میں اپنی علیحدہ جماعت کا اہتمام کرلیا۔ حکومت کو اس کی خبر ہوئی تو امام سے باز پرس کی اور سوء ادب پر زجر کیا اور یہ الفاظ کہے کہ حضرت کے مقابلہ میں تمہارے علم کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اس کے بعد تمام ائمہ کے نام حکم جاری ہوا کہ جملہ مذاہب کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھائیں اور حضرت سے معذرت کی

اور اطمینان دلایا کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا چنانچہ آپ پھر حرم شریف میں جانے لگے۔

سلطان کے یہاں دعوت

خود سلطان کے دل پر بھی حضرت کے تقدس کا اثر پڑ چکا تھا۔ ایک بار سلطان نے فرمایا حضرت! کبھی مکان پر تشریف نہیں لاتے؟ فرمایا میری عمر اتنی مسافت پیدل قطع کرنے کی متحمل نہیں ہوتی۔ سلطان نے فرمایا جب حضرت ارشاد فرمادیں موٹر حاضر ہوجایا کرے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ پیدل چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ سوال کروں اور موٹر کے انتظار میں بیٹھا رہوں۔ تاہم ایک مرتبہ سلطان نے حضرت کو مدعو کیا اور حضرت تشریف لے گئے۔ سلطان سے فرمایا کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ سلطان ہمہ تن گوش ہوگئے کہ فرمائیے۔ فرمایا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جمرک[1] کے محصول کا جواز آپ کے ہاں کس دلیل سے ہے کہ شریعت تو تمام مُکوس[2] کو ظلم بتاتی ہے۔ سلطان نے سکوت کیا اور پھر جواب دیا کہ حضرت جواز تو کسی طرح نہیں مگر مصارفِ سلطنت آخر کس طرح نکلیں اور حجاز میں تو آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا بس میرا مطلب حل[3] ہوگیا اب ملکی معاملات سے مجھے بحث نہیں نہ میں ان کے سمجھنے کا اہل ہوں۔

حضرت کو امراء اور حکام سے ملاقات میں طبعاً وحشت ہوتی تھی۔ لیکن اگر ملنا ہوا تو نہ حضرت کبھی مرعوب ہوئے نہ کچھ نہ امر بالمعروف سے چوکے اور نہ دینی نفع اٹھائے بغیر رہے۔ آپ چاہتے تو بھوپال بہاولپور اور حیدرآباد سے وظائف کا تقرر کچھ بھی دشوار نہ تھا۔ خطاب یا عہدہ کا وسوسہ تو کیا ہوتا بڑوں کی کسی ملاقات سے آپ نے دنیا کا قلیل فائدہ اٹھانا بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ ایسی ملاقات میں آپ کا مطرحِ نظر ہمیشہ دینی پہلو رہا خواہ مدرسہ کی اعانت یا مضرت اسلام و مسلمین کا دفع، یا شرعی غلطی کی اصلاح اور مردہ سنت کا احیا جس کیلئے حضرت کی طبیعت صرف موقع کی منتظر اور ہر وقت چشم براہ رہتی تھی۔

حرم میں جمعہ کی اذانوں کے مابین سنتوں کے لئے وقفہ

ایک مرتبہ قاضی بن بلیہد آپ کو ہاتھ پکڑ کر اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ مختلف باتیں ہوتی رہیں جب انبساط تام ہوگیا تو حضرت نے فرمایا قاضی صاحب مسجد مبارک میں جمعہ کی پہلی اذان کے بعد متصل ہی دوسری اذان خطبہ کی شروع ہوکر خطبہ شروع ہوجاتا ہے جمعہ کی سنتوں کے پڑھنے کا وقت[4] ہی نہیں ملتا۔ مالکی اور حنبلی حضرات ان سنتوں کو ضروری نہیں سمجھتے مگر ہم احناف کے نزدیک تو موکدہ ہیں۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر حضرت سے پوچھا کہ کس قدر فصل کافی ہے؟ حضرت نے فرمایا دس منٹ۔ قاضی صاحب نے

[1] چونگی جو آنے جانے مال لانے لیجانے پر لی جاتی ہے حالانکہ راستے وقف ہوتے ہیں۔ [2] ٹیکس و تاوان [3] یہ کہ یہ شرعی نہیں کہ۔
[4] کیونکہ وہاں پہلی اذان زوال ہوتے ہی ہوجاتی ہے پھر فوراً دوسری ہوتی تھی تو سنتوں کا وقت نہ پہلی اذان سے پہلے مل سکتا تھا نہ بعد میں۔ (مترجم)

نائب الحرام کو جو وہاں اتفاق سے موجود تھے حکم دیا کہ پہلی اور دوسری اذان میں ۱۰منٹ کا فصل کیا جائے اتفاق سے اگلے ہی روز جمعہ تھا اور نائب الحرام اس حکم کو باقاعدہ جاری نہ کر سکے مگر جب پہلی اذان ہو چکی تو خطیب کو منبر پر جانے سے ذرا ٹھیرائے رکھا اور حضرت کو دیکھتے رہے۔ جب حضرت نے چار سنتیں حسب عادت پورے اطمینان سے ادا کرلیں تب خطیب کو خطبہ کے لئے روانہ کیا اور دوسرے جمعہ سے باقاعدہ اس حکم کا اجرا ہو گیا کہ سنتیں پڑھنے والے بڑے سکون سے قبل الخطبہ سنتیں پڑھنے لگے۔

ایسی خلوت اور امراء کی ملاقات پر بنراز خلوت وگوشہ نشینی قربان کہ ع[۱] ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند، مگر اللہ کی شان کہ اس کی مخلوق میں ایسے بھی سطحی نظر والے تعداد میں زیادہ ہیں جو ہنر کو عیب بتاتے ہیں حالانکہ آپ ٹکوں کی خاطر امراء سے تو کیا ملتے آپ کی دقیق نظر نے تو مخلصین کے ہدایا اور تحائف میں بھی پس وپیش کا فلفشار قائم رکھا اور ذرا شبہ ہوا تو رد فرما دیا۔

مدینہ میں ہدایا قبول کرنے سے گریز

یہ آخری زمانہ اور مدینہ منورہ کا قیام کہ ہند سے جانے والے مخلصین نذر پیش کرتے مگر آپ اکثر انکار فرما دیتے اور کہا کرتے تھے کہ میں کوئی ایسا ہدیہ قبول نہیں کرتا جس سے اہلِ مدینہ کے نقصان[۲] یا حق تلفی کا اندیشہ ہو" لہٰذا کوئی کچھ نذر کرتا تو فرماتے مجھے ضرورت نہیں کہ بحمد اللہ کوئی حاجت بند نہیں اس پر بھی اس کا اصرار ہوتا تو آپ اپنے دل کو ٹٹولا کرتے تھے کہ جو رقم آپ کو ہدیہ میں دی جا رہی ہے اگر میں نہ لوں تو اہلِ مدینہ کو دی جائے گی یا واپس جائیگی درصورت اول آپ اس کو اہل مدینہ کا حق سمجھ کر ہاتھ روک لیتے تھے کہ اہل مدینہ کی نقصان رسانی جیرانِ[۳] رسول کو ایذا پہنچانے کے حکم میں ہے۔ ہاں جس رقم میں اطمینان ہوتا کہ اہلِ مدینہ کو جو دینا تھا وہ دے چکے اور اب میں نے نہ لیا تو دلشکنی کے ساتھ گھر واپس لیجائیں گے تو اس کو قبول فرما لیا کرتے تھے اللہ رے نظر باوجود خود مدنی بن جانے کے ہمسائیگانِ محبوب کی اتنی رعایت ؎

کشند[۴] از برائے دلے بارہا　　خورند از برائے گلے خارہا

قاضی شویل کی ہٹ دھرمی اور عہدہ سے تنزلی

مدینہ منورہ میں شویل نامی ایک مصری عالم مالکی المذہب ۲۰ گنی تنخواہ پر وکیل قاضی تھے جو زائرین کو بہت تنگ کرتے تھے کہ جہاں کسی نے دوسری جماعت کی جھٹ اس کو حوالات بھیجدیا ایک مرتبہ قاضی القضاۃ کے مکان پر حضرت نے ان سے فرمایا کہ جماعتِ ثانیہ کو ہم بھی مکروہ کہتے

---

[۱] یہ کام آپ　　　　اور　　　　مرد ایسا ہی کرتے ہیں۔ [۲] کہ آپ نہ لیں گے تو وہ اہل مدینہ کو دے کر جائیں گے واپس ہمراہ نہ لے جائیں گے اور آپ لے لیں گے تو اہل مدینہ کا نقصان ہوا۔ [۳] حضور کے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچانا ہے [۴] ایک دل کے ہوتے بہت سے بوجھ اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کے لئے بہت سے کانٹے کھاتے ہیں۔

اور سمجھتے ہیں مگر جب شوافع کے یہاں اس کا جواز ہے تو اس قدر سختی مناسب نہیں کہ آخر صاحب مذہب ہیں۔ یہ تو ہو لیا۔ مدینہ منورہ ہی میں ایک شامی حاجی مقیم تھے جن کا ارادہ دوسرا حج کرنے کے بعد وطن جانے کا تھا۔ شامی شافعی المذہب تھے اور حضرت کے ساتھ ان کو محبت ہو گئی تھی کہ اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن عصر کی نماز سے فراغت کے بعد حضرت حرم میں بیٹھے ہوتے تھے کہ شوبل صاحب نے اس شامی حاجی کو کشاں کشاں لاکر حضرت کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ اس نے دوسرا اسلام امام سے پہلے پھیر دیا جب اس کو منع کیا تو اس نے کہا میں نے تو حضرت کو ایسا کرتے دیکھا ہے کیا آپ ایسا کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا ہاں کر سکتے ہیں۔ شامی غریب کا تو پیچھا چھوٹ گیا۔ شوبل نے کہا کہ نماز کا امام حنبلی تھا اور حنابلہ کے یہاں دوسرا اسلام بھی واجب ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ حنبلی ہو یا شافعی ہم نے امام کا اقتدا کیا ہے نہ کہ تقلید۔ اس کے بعد حضرت نے پوچھا اور تمہارے مذہب میں کیا ہے؟ کہا ہمارے مذہب میں تو ایک ہی قول ہے کہ امام سے پہلے اگر دوسرا اسلام پھیر دیا تو نماز فاسد ہو گئی دوسرا قول ہی نہیں۔ حضرت نے فرمایا اصول کے بالکل خلاف ہے میں دوسرے علماء سے استفسار کروں گا۔ کہا جس سے چاہے پوچھ لیجئے یہ ایک ہی قول ہے۔

حضرتؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور مولانا الفا ہاشم عالم مالکی کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے طلبہ میں بیٹھ گئے۔ مولانا اپنی مسند سے کھڑے ہو گئے اور حضرت کو اس پر بٹھانا چاہا۔ حضرت نے فرمایا میں سائل ہو کر آیا ہوں اور سائل کے بیٹھنے کی جگہ یہی ہے۔ مولانا بھی مسند چھوڑ کر برابر آ بیٹھے۔ حضرت نے مسئلہ پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کے مذہب میں کیا حکم ہے؟ جواب دیا کہ نماز تو فاسد نہیں ہوئی البتہ اسارۃ ہوئی کہ ایسا کرنا نہ چاہئے تھا۔ حضرت نے فرمایا مجھے کتاب میں دکھا دو۔ وہاں کتاب موجود نہ تھی ایک طالب علم کو حکم دیا کہ گھر سے فلاں کتاب لے آؤ۔ اس کے بعد خود ہی مکان پر گئے اور کتاب لے کر تشریف لائے اور مسئلہ نکال کر حضرت کے سامنے پیش کیا۔ حضرت کتاب لیکر اٹھے کہ مولانا شیخ عمری تشریف لے آئے۔ حضرت نے ان سے بھی یہ مسئلہ دریافت فرمایا اور انھوں نے بھی مولانا الفا ہاشم کے مثل جواب دیا۔

حضرت کتاب سمیت مکان تشریف لے آئے اور اپنے دارالتصنیف میں رونق افروز ہوئے کہ ذرا دیر بعد مولوی شوبل ایک رسالہ لئے ہوئے آئے۔ حضرت کو اطلاع کی گئی اور حضرت نے ان کو وہیں بلا لیا حضرت نے کتاب کھول کر وہ مسئلہ دکھایا اور دونوں علماء کا قول نقل فرمایا۔ مولوی شوبل غیظ میں بھر گئے

عہ تذکرۃ الرشید جلد اول ص۷۹ میں یہ مسئلہ غلط لکھا گیا صحیح یہ ہے کہ جو یہاں مذکور ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی۔ (عاشق الٰہی)

اور غصہ میں سرخ ہو کر کہا واللہ عمری اجہل من بغلی۔ اور اپنا رسالہ لیکر وہاں سے چلدیئے۔ دو تین روز گذر گئے اور اس کے بعد مولوی شویل حضرت کے پاس آکر بیٹھے تو حضرت نے نہایت نرمی سے فرمایا ایک مسئلہ دریافت طلب ہے۔ ایک شخص نے قسم کھائی واللہ فلاں اجہل من بغلی۔ وہ بعد الحلف حانث ہوا اور کفارہ واجب ہوا یا نہیں؟ مولوی شویل اپنا مقولہ بھول گئے ہوں گے کہ بیساختہ بولے ہاں حضرت وہ تو حانث ہوگیا۔ اتنا کہتے ہی ان کو اپنا مقولہ یاد آیا اور سمجھے کہ اپنی زبان سے اپنے اوپر حجت قائم ہوگئی تو لگے تاویلات کرنے اور غضبناک ہو کر جہالت پر اتر آئے۔ حضرت نے تحمل فرمایا اور خاموش ہو کر سب کچھ سنا اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر رفقاء سے کہا کہ اب روضہ شریف میں جھگڑا ہونے لگا آئندہ محراب سلیمانی میں نماز پڑھا کریں گے چنانچہ مغرب کی نماز محراب سلیمانی میں پڑھی۔

عشاء کے وقت اجیمی صاحب مدیر حرم جو مولوی شویل کے محکمہ کے تھے حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت کو کس نے ایذا دی جو روضہ میں نماز پڑھنا ترک فرمایا۔ اگر مجھے معلوم ہوجاتا تو میں اس کا خصم بنتا۔ حضرت نے فرمایا مجھے کسی نے ایذا نہیں دی۔ روضہ میں زائرین کا ازدحام ہونے لگا اور میں زحمہ کا متحمل نہیں ہوسکتا اس لئے یہاں نماز پڑھنے لگا۔ غرض آپ نے فتنہ کو دبا دیا مگر خدا کی شان کہ مولوی شویل اپنے عہدہ سے معزول ہوئے اور بہ گنی پر تنزل ہو کر مدرس حرم بنا دیئے گئے۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے حضرت کی حدیث و فقہ کے متعلق وسعت نظر اخلاص بے نفسی تبحر تواضع حلم ارشاد توافق اور اظہار کلمۃ الحق والنصح للمسلمین کا محض نمونہ کے درجہ میں اظہار کیا گیا ہے ورنہ عمر شریف کے فقہی و علمی ان گنت قصے جو گویا ہر لحظہ نئی صورت میں پیش آتے تھے نہ کسی کو مستحضر اور نہ کسی کی طاقت کہ تقریر یا تحریر میں لا سکے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حضرت نے کبھی غلطی نہیں کی کیونکہ نہ میں حضرت کو معصوم سمجھتا ہوں نہ بے خطا۔ مگر یہ ضرور کہونگا کہ حضرت کا وجود باوجود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ میں اپنے نرالے انداز کا ایک ایسا پر اثمار شجر تھا جس کا جڑ سے لے کر پھلنگ تک ہر جزو کار آمد اور ہر موسم کے مناسب مجسم منفعت تھا۔

آپ حنفی تھے مگر مجتہدانہ شان رکھتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نور سے بھر دے امام ابو حنیفہؒ کی قبر کو کہ بڑا کام کر گئے۔ اور فرمایا کرتے کہ احناف کی ہر جزی مجھے آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

اور فرمایا کرتے کہ امام اعظم درحقیقت اعظم ہی ہیں اور ان کی ذکاوت و حسن ادب اور دقت استنباط تک

۱؎ بخدا عمری میرے خچر سے بھی زیادہ جاہل ہے ۱۲ مولانا شیخ عمری مالکی نے کہ حرم نبوی کے مدرس تھے تبرکاً حضرت سے ابوداؤد شریف کی اوائل سنا کر اجازت لی۔ ۲؎ مقابل رد کرنے والا۔ ۳؎ ہجوم۔

بڑوں بڑوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

اور فرمایا کرتے کہ آٹھ مسئلوں کی ظاہری صورت پر کوئی اہلِ حدیث بن جائے یا غیر مقلد، مگر آگے چل کر حضرت امام کا خوشہ چیں بنے بغیر کسی کو بھی چارہ نہ ہوا۔ اور فرمایا کرتے کہ اشرف العلوم حدیث ہے مگر فقہ ہے کہ نجات کا مدار عمل پر ہے اور عمل کا مدار ان دو پر۔

اور فرمایا کرتے کہ حق تعالیٰ کو دھوکا یا غلطی نہیں ہوسکتی کہ نااہل کو اپنے محبوب کی امت کا مقتدا بنادے اور تمامی صلحا و اولیا کے قلوب میں ایسے کی عظمت ڈال دے جو اہلیت نہ رکھتا ہو۔

حدیث دانی کی شرط اور فرمایا کرتے کہ حدیث دانی محض الفاظ کے ترجمہ کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے تمامی علوم و فنون کی مہارت کے بعد ایک وہبی حذاقت درکار ہے جس کو تفقہ کہتے ہیں اور اسی نعمتِ الٰہیہ نے فقہ کو شرح حدیث بناکر دریائے ناپیدا کنار بنادیا کہ صدہا ضخیم کتابیں مدون ہوچکیں اور جب دیکھو اخلاف کے لئے اس کی ضرورت قائم۔ وللہ درالقائل ؎

گر مصورِ[1] صورتِ آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

صورت و سیرت اور عادات و معمولات

شکل و شمائل حضرت کو حق تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ بے نظیر حسن صورت بھی عطا فرمایا تھا کہ قد طول کی طرف مائل رنگ صاف جس میں سرخی جھلکتی تھی۔ بدن دہرا، جسم چھریرا نہایت نرم اور نازک۔ آپ مصافحہ فرماتے تو معلوم ہوتا کہ ریشمی کمخواب ہاتھوں میں داب لیا ہے اور معانقہ کرتے تو گویا نرم و نازک روئی نے چھاتی سے لگالیا۔ آپ کا چہرہ بدر کی طرح چمکتا اور بلا مبالغہ ایک تازہ گلاب کا پھول معلوم ہوتا تھا۔ آپ کے بدن کا ہر عضو متناسب تھا اور کسی حصہ کے متعلق بھی حسن شناس کو حرف گیری کا موقع نہ تھا۔ آپ خندہ پیشانی تھے اور ہر وقت آپ کے دہن پر مسکراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آواز آپ کی نہایت پیاری اور مردانہ تھی۔ گو ضعفِ پیری کے سبب آواز میں رعشہ اور خفیف لرزہ تھا مگر تقریر بے تکان اور مسلسل ہوتی تھی۔ کوئی مضمون آپ ادا فرماتے تو مقدمہ اور تمہید کو اول دلنشین کرتے اور پھر مافی الضمیر ادا فرمایا کرتے۔

---

[1] اور اللہ کے لئے خوبی ہے کہنے والے کی یعنی وہی جزا دیں گے۔ [2] اگر تصویر بنانے والا اس دلربا کی صورت بنا سکتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اس کے ناز انداز کیسے تصویر میں لاسکتا ہے۔

طرزِ تفہیم اور صاف گوئی آپ کی صاف گوئی مشہور تھی کہ جب کہتے بے لاگ لپیٹ بات کہتے تھے۔ اسی وجہ سے جن لوگوں کو آپ سے زیادہ سابقہ نہیں پڑتا تھا وہ اچنبے اور گھبراتے تھے مگر جو حضرات اس خوبی وکمال کے قدر شناس تھے وہ آپ کے شیدا تھے اور آپ کی صاف گوئی پران کا رُواں رواں کھِل جاتا تھا حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے متصل ہی مولوی محمد احمد کرسوی کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے اپنا صدمہ ظاہر کیا کہ مولوی صاحب یہاں تشریف لائے تو میں پیربھائی سمجھ کر شوق میں بھرا ہوا سخت گرمی اور لُو کی دوپہر میں دو میل مسافت قطع کر کے ان کی قیام گاہ پر پہنچا مگر میری کمر ٹوٹ گئی جب میں نے ان کے دربان سے یہ جواب سُنا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں۔ شام کو آنا" حضرتؒ کو اس پر بہت صدمہ ہوا اور ان کو تسلی کا خط لکھدیا مگر اتفاق کی بات کہ چند ہی روز بعد مولوی .... صاحب گنگوہ سے واپس ہوتے ہوئے آپ کی زیارت کے لئے مدرسہ میں آگئے جسب عادت مُسکرا کر اور معانقہ فرما کر آپ نے اُن کو اپنے پاس بٹھالیا اور پہلی بات جو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی وہ یہ تھی کہ مجھے تم سے رنج پہنچا اور وہ یہ کہ مولوی احمد کرسوی محض اللہ واسطے اپنے پیر کی تم کو نشانی سمجھ کر ملنے کے لئے سخت لُو میں دو میل چل کر تمہاری قیام گاہ پر آئے اور تمہارے اس طرز نے کہ دروازہ پر دربان رکھتے ہو اُن کو تم تک پہنچنے نہ دیا۔ بھلا کیا جواب دوگے حق تعالیٰ کو جب سوال ہوگا کہ ہمارے رسول کے دروازہ پر دربان نہ تھا تم نے یہ طریق کہاں سے اختیار کیا؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ حضرت مجھے تو کچھ معلوم نہیں کون مولوی محمد احمد اور کیسا ان کا آنا۔ فرمایا ہاں یہی تو سوال ہے کہ جب دربان تعینات ہے تو آنے والے کا علم کس طرح ہو؟

مولانا نے فرمایا کہ حضرت بات یہ ہے ہر کہہ ومہ سے ملنے پر قلب ظلمت کا اثر لیتا ہے اور اپنے رنگ میں تغیر آتا ہے اس پر حضرت کا غصہ تیز ہو گیا۔ پیشانی پر رگ کھڑی ہو گئی آواز میں رعشہ پڑ گیا اور آپ نے فرمایا چولھے میں جائے وہ رنگ جو رسول کے خلاف ہو۔ نہ معلوم وہ کون نار ہے جس کو نور سمجھ بیٹھے اور وہ مسلمانوں سے ملنے پر متغیر ہوتی ہے۔ میاں طالب و معتقد ہی کیا کافر بھی آئے تو اس کو عزت سے لینا چاہئے اور مسلمان تو وہ چیز ہے جس کی دلداری پر سو نفلیں بھی قربان خصوصاً ذاکر شاغل مسلمان۔ ہمیں تو ہر وقت اس توقع میں رہنا چاہئے کہ خدا جانے کس آنے والے مسلمان کی بدولت بیڑا پار ہو جائے نہ یہ کہ اپنے کو نورانی سمجھ کر دنیا دار پیروں کا سا طریقہ لے لیں اور بدنام کریں حضرت گنگوہی کے مشرب کو بھائی تم ناراض تو ہوگے مگر مجھے یہ طریق پسند نہیں اور بُرا مانو یا بھلا یہ رنگ تمہارا سنت کے خلاف اور[1]

---

[1] اوقات کا مقرر کردینا الگ چیز ہے وہ خلاف اور بدگمانی ظلمت کا شیطانی دھوکا ہے۔

شیطانی دھوکا ہے جو نہایت خطرناک ہے۔ مجھ پر حق تھا اس لئے متنبہ کرچکا اب تم جانو تمہارا کام۔

مولوی صاحب کو حضرت کی صاف گوئی اس وقت گراں ضرور گذری کہ خاموش ہو کر چلے گئے مگر متاثر ضرور ہوئے کہ دوسرے موقع پر حاضر ہو کر حضرتؒ کا ملبوس بغرض تبرک طلب کیا اور حضرت نے سرِدال[^1] مبارک ان کے حوالہ فرمادی۔

نصیحت و خیر خواہی ایک مرتبہ بابو غلام محمد صاحب صابری سب پوسٹماسٹر پشاور آئے جو پنجاب کے تمامی ڈاکخانہ والوں کی کانفرنس کے سکریٹری تھے اور انھوں نے اپنی کارکردگی جس سے ملازمین ڈاکخانہ کو طرح طرح کا نفع پہنچایا دلچسپ طریقہ سے بیان کی۔ حضرت اس کو سنتے رہے اور مسکرا کر دعا دی اس کے بعد فرمایا بھائی حصول دنیا کے لئے تو اس قدر منہمک ہو کہ کچھ ٹھکانا نہیں مگر کچھ دوسرا بھی خیال ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہے۔ ذرا ادھر بھی رغبت بڑھاؤ۔ کبھی غور بھی کیا کہ نام تو غلام محمد اور داڑھی کا صفایا۔ اس کے بعد دیر تک مزاح و انبساط ہی کے درجہ میں آپ نے بہت کچھ نصائح فرمائیں۔ آپ عوام کی جہالتوں کا بہت تحمل فرماتے تھے مگر ان کی خلافِ تہذیب حرکت پر نرمی سے تنبیہ بھی فرماتے کہ دیکھو ایسا نہیں کیا کرتے۔ ہاں اہلِ علم کی غلطیوں پر ترشی[^2] کے ساتھ اظہار نفرت فرمایا کرتے تھے۔

اکثر آپ کا طرز نصیحت نرم اور مزاح آمیز ہوا کرتا تھا۔ شملہ میں نائب پیش امام نے بعد نماز مسجد کی پالش کی نفاست و عمدگی کا ذکر کرکے حضرت کو اس کا معائنہ کرایا۔ خوشی خوشی پالش پر ہاتھ پھیرتے اور تعریف کرتے جاتے تھے۔ حضرت نے نہایت متانت سے فرمایا پالش تو بہت اچھی ہے مگر یہ تو بتلاؤ کہ یہ زیبائش جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور کبھی یہ سب چندہ جمع کرکے کی گئی ہوگی۔ بھلا چندہ دہندگان سے ایسا کرنے کی اجازت بھی لے لی گئی تھی یا نہیں؟ نائب صاحب اور تمام نمازی دنگ رہ گئے۔ ذرا دیر بعد نائب صاحب نے فرمایا حضرت یہ تو پیش امام جانیں۔ فرمایا واہ کیا خوب آرائش کی تعریف تو آپ کریں اور جواب دیں مولوی صاحب۔ مثل ہے "دھیونا کرے اور دادا جی بھرے"

روز و شب کے معمولات حضرت کا معمول اخیر شب میں دس یا بارہ نفلیں اور ان میں تقریباً دو پارے تلاوت فرمانے کا تھا۔ اس کے بعد آپ چارپائی پر داہنی کروٹ لیٹ جاتے اور کوئی پاس ہوتا تو اس سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ آخر میں چاء پینے کا معمول بھی اسی وقت ہو گیا تھا۔ فجر ہوتے ہی دو سنتیں پڑھ کر مدرسہ میں تشریف لاتے اور حجرہ کے قریب دیوار سے لگ کر خاموش بیٹھ جاتے۔

[^1]: جامہ کو سردال شلوار کو کہتے ہیں مگر حضرت پاجامہ پہنتے تھے جو ستر بھی خوب کرتا ہے اور ضرورت سے زائد بھی نہیں ہوتا وہی دیا ہوگا اور ممکن ہے لفظ شال ہو کاتب نے سرال بنا دیا ہو ظاہر لفظوں کی یہ زیادہ مناسبت ہے۔
[^2]: ان کیلئے ترشی ایک سزا تھی کر اصلاح کا ذریعہ بھی اور عوام کے لئے نفرت دین کا سبب ہونے کا شبہ تھا۔

مہمان اور خدام بھی حاضر ہو جاتے اور سکوت کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ یہ مجلس عجیب پُرانوار ہوتی تھی کہ قلب مبارک سے بقعہ ہائے نور نکل کر اہل مجلس کو ڈھانپتے اور سکینہ ورحمتِ الٰہیہ کی ٹھنڈی پھوار سب پر برسا کرتی تھی کوئی ضروری بات ہوتی تو حضرت مختصر لفظوں میں فرمادیا کرتے ورنہ یہ پندرہ بیس منٹ خالص سکوت میں گذرتے اور جب اسفار ہو جاتا تو آپ مسجد میں پہلی صف اور یمینِ امام اختیار فرما کر نماز ادا کرتے۔

صحیح اور صاف پڑھنے والا امام آپ کو پسند تھا اور اس لئے اکثر قاری عالم کو آپ امام تجویز فرمایا کرتے تھے شروع میں مولانا عبداللطیف صاحب امام رہے اور پھر مولانا ظفر احمد صاحب قاری عبدالعزیز صاحب وغیرہ اور اخیر میں قاری سعید احمد۔ باہر کہیں تشریف لے جاتے تو خدام کے اصرار پر کبھی آپ خود امامت فرما لیا کرتے ورنہ اکثر مقتدی بنتے اور ضعفِ دماغ و رعشۂ صوت کا عذر فرمادیا کرتے تھے۔

مولوی عبداللہ جان صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرتؒ میری عیادت کے لئے میرے وطن لدھیانہ میں تشریف لائے، حافظ عبداللطیف صاحب ہمراہ تھے میرے اہل وطن نے یہ سن کر کہ حضرت میرے پیر ہیں۔ حضرت سے التجا کی کہ نماز میں امامت آپ فرمادیں۔ حضرت نے فی البدیہہ جواب دے کر کہ یہ (یعنی حافظ صاحب) تو سہارنپور میں بھی میرے امام ہیں۔ حافظ صاحب کو آگے بڑھا دیا۔ حضرت کے اس جواب سے کہ سچا لطیفہ تھا مجھے بہت ہی لذت آئی کہ درحقیقت ان ایام میں امامت حضرت حافظ صاحب کے سپرد تھی۔

حالتِ سفر میں جماعت کا اہتمام

حالتِ سفر میں بھی آپ جماعت کا اہتمام فرماتے اور حتی الوسع ریل ٹھیرنے پر نیچے اُتر کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ مگر ایسی صورت میں اکثر مولوی زکریا صاحب کی امامت کو پسند فرماتے کہ وہ نہایت مختصر قراءت و قیام و قعود کے عادی تھے۔ باہر نماز پڑھنے میں دشواری معلوم ہوتی تو ریل ہی میں جماعت کرتے اور استقبالِ قبلہ کی ہر حال صورت نکال لیا کرتے تھے۔

مدینہ طیبہ کے راستہ میں نماز کا اہتمام

آپ نے مدنی راستے میں اونٹ کی سواری سے اُترنے اور جماعت کا اہتمام کرنے میں بھی کبھی تکاسل نہیں فرمایا۔ اچھے اچھے جوان اور مستعد اونٹ سے اُترتے ہوئے گھبراتے مگر آپ ہمیشہ وقتِ مستحب پر اُترتے اور راستہ وضو کرتے آپ کا اونٹ دُور نکل جاتا تو آپ لپکتے اور اس سے اتنا آگے بڑھ جاتے جتنا وہ وضو کرتے میں آگے نکلا تھا۔ وہاں پہنچکر باجماعت نماز ادا کرتے اور جب دیکھتے کہ اونٹ اب آگے نکل لیا تو پھر لپکتے اور زیادہ آگے نکل کر سننِ موکدہ ادا فرماتے اور پھر لپک کر اونٹ پکڑتے اور اس پر سوار ہو جاتے تھے۔ اور اگر دوسری نماز کا وقت قریب دیکھتے تو پیدل چلتے رہتے اور وقت پر اس کو بھی باجماعت ادا فرما کر اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ اس طرح کئی کئی میل آپ کو پیادہ چلنا پڑتا مگر آپ تکان نہ مانتے تھے اور فرمایا کرتے قصر کی قدر یہاں آکر ہوتی ہے کہ

دو رکعت میں جب اتنا بھاگنا پڑتا ہے تو چار میں کیا کچھ ہوتا۔

بڑھاپے میں آپ کی یہ ہمت جوانوں کو غیرت دلاتی اور وہ نیچے اتر کر ساتھ ہولیا کرتے تھے۔ اپنے لوگوں میں اگر کسی کو کاہل پاتے تو غصہ ضبط نہ فرما سکتے اور تیزی کے ساتھ نماز کے اہتمام کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

حافظ سلیمان راندیری ایک سفر میں ساتھ تھے جب آپ کے پاس ان کا اونٹ گذرا تو آپ نے پوچھا کہ حافظ صاحب نماز پڑھ چکے؟ عرض کیا کہ حضرت اوپر ہی پڑھ لی۔ شغدف میں میرے ساتھ بوڑھی ماں ہے اور اس کو میرے اُترنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ نے بیساختہ فرمایا ماں وہاں تو ساتھ نہ ہوگی جہاں نماز کا سوال ہوگا جوان ہو کر خود ہی ہمت ہاردو تو اس کا کیا علاج، ہم تو جب جائیں کہ پاخانہ کی ضرورت ہو اور ماں کا عذر کر کے شغدف میں بیٹھے رہو۔ حج کرنے چلو اور نمازیں کھوؤ، اس سے تو بہتر تھا کہ گھر بیٹھے وقت پر نمازیں پڑھتے۔ بھائی تم کو حضرت گنگوہی سے تعلق ہے اس لئے مجھے تمہاری اس بے احتیاطی سے تکلیف ہوتی ہے، یا تو سفر میں رفیق نہ ہوئے ہوتے اور رفاقت کی ہے تو نماز کا اہتمام کرو چنانچہ وہ اُترے اور پھر ہمیشہ اہتمام کرتے رہے۔

تیز رفتاری اس ضعف پیری پر آپ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے باوجودیکہ اپنی تیز رفتاری پر ناز تھا کہ چودہ[۱۴] منٹ میں پورا ایک میل چلتا ہوں مگر حضرت کے ساتھ چل کر گھبرا گیا کہ حضرت تیز چلتے اور مجھے ساتھ دینے کے لئے دوڑنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ دیوبند تشریف لائے اور بندہ ہمراہ تھا۔ قبل صبح صادق چلنا تھا کہ ریل قبل طلوع چھوٹتی تھی۔ سواری کا انتظار کیا مگر نہ ملی تو حضرت نے فرمایا چلو پیدل کہ ریل نہ چلی جائے مدرسہ کا حرج ہوگا اسٹیشن قریب ایک میل تھا اور گھٹا کی وجہ سے کچھ تاریکی تھی مگر حضرت آگے اور میں پیچھے۔ چاہتا تھا کہ حضرت کے ساتھ ساتھ رہوں مگر نہ ہو سکا اور آخر اسٹیشن پر پہنچکر حضرتؒ نے اسفار میں باجماعت نماز فجر باطمینان ادا فرمائی۔

مدنی راستہ میں دو مرتبہ مجھے حضرت کی ہمرکابی نصیب ہوئی اور سمجھتا تھا کہ حضرت ہندوستان ہی کی پختہ سڑک، یا کچی بٹیا پر تیز چل سکتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ عرب کا ریگستان تو حضرت کی تیز رفتاری کو بڑھاتا اور سنگستانی نشیب و فراز آپ کی رفتار میں کچھ فرق نہیں ڈالتا۔

ایک مرتبہ آپ نے رابغ کے راستہ سے سفر کیا کہ سارا قافلہ صرف آپ کے رفقاء کے سولہ[۱۶] اونٹوں کا تھا۔ آپ وضو بھی کرتے تو قافلہ دور نکل لیتا اور سنسان جنگل میں کھڑے رہ جاتے تھے۔ جمالین نے ڈرایا کہ یہاں جان کا خطرہ ہے مگر آپ نے پروا نہ کی۔ آخر مغرب اور عشاء کے وقت جمال تو نہ رکے مگر مقوم یہ دیکھ کر کہ رات کا وقت ہے اور شیخ کہنا مانتے نہیں خود اتر کر ساتھ ہوا اور جب جماعت کھڑی ہوئی تو وہ بندوق لئے ہوئے

چاروں طرف نظر ڈالتا اور پہرہ دیتا رہا حتیٰ کہ آپ غسل سے فارغ ہو کر تیز چل کر قافلہ میں آئے اور اونٹ پر سوار ہو گئے مدینہ منورہ تک اس کا یہی معمول رہا کہ نہ بدوؤں کو قیام پر مجبور کیا اور نہ خود پہرا دینے میں سست ہوا مقوم بھلا آدمی اور ہنس مکھ تھا حضرت کی تیز رفتاری دیکھ کر کہتا تھا الشیخ یطیر بڑے میاں تو اڑتے ہیں۔

مراقبہ کا وقت فجر سے فارغ ہو کر آپ حجرہ میں تشریف لے جاتے اور اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ نوافل اشراق سے فارغ ہو کر جب آپ باہر تشریف لاتے تو چہرۂ مبارک پر بے انتہا انوار ہوتے اور چاند کی طرح دمکتا تھا۔ باہر سفر میں بھی آپ کا یہ معمول اکثر قائم رہتا کہ مسجد ہی میں نماز کے بعد مراقب ہو جاتے اور بعد اشراق مجمع میں تشریف لاتے تھے اس کے بعد قضاء حاجت کو تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرما کر درس شروع فرما دیا کرتے تھے۔ اخیر شب میں حضرت کو صرف پیشاب کی عادت تھی کہ بہت مختصر وقت صرف ہو۔

مسواک کا اہتمام مسواک سفر میں بھی کرتہ کی جیب یا تکیہ کے غلاف میں رہتی تھی اور کوئی وضو آپ کا مسواک کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ درسگاہ میں تشریف لا کر اسباق متعلقہ کا درس دیتے اور آخر زمانہ میں بذل کی تالیف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اسی دوران میں ڈاک آجاتی اور آپ اس کو ملاحظہ فرماتے سارے مدرسہ کی ڈاک کا لانا آپ نے فراش کے ذمہ کر رکھا تھا کہ وہ لا کر آپ کے حوالہ کرتا اور آپ اپنے خطوط نکال کر باقی مدرسین و طلبہ کے خطوط مہتمم صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے کہ وہ مکتوب الیہم کو پہنچا دیں۔ گرمی میں گیارہ بجے سے کچھ قبل اور سردی میں گیارہ بجے کے کچھ بعد نیچے اترتے اور مکان تشریف لے جاتے تھے جبتک دانت سالم رہے کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے اور آخر میں جب دانت کمزور ہو گئے تو مکان میں تناول فرماتے تھے کہ چپاتی گرم گرم توے سے اترتی اور آپ کے سامنے آجاتی تھی، ذرا ٹھنڈی ہونے پر چبانا مشکل ہو جاتا اور پھر ہضم نہ ہوتا تھا۔ ہاں کوئی خاص مہمان آجاتا تو اس کے ہمراہ باہر ہی نوش فرماتے اور ایک خادم جلدی جلدی مکان سے گرم روٹی کپڑے میں لپیٹ کر لاتا رہتا تھا۔

مرغوب طبع کھانا شوربہ چپاتی آپ کو سب سے زیادہ مرغوب تھی کہ نوالہ ڈبو کر نرم ہو سکے گھی زیادہ پسند نہ تھا اگر کبھی سالن میں زیادہ تر ہوا تو دوسرے برتن میں آپ نے نتھار دیا اور فرمایا گھی ہی گھی ہے مصالحہ کا مزہ بھی تو نہیں آتا۔ چاولوں سے زیادہ رغبت نہ تھی مگر پلاؤ کبھی تناول فرماتے بشرطیکہ نرم ہوتا۔ مرچ اول ہی سے مرغوب نہ تھی اور اسقاط حج کی کثرت نے تو بالکل ہی چھڑا دی تھی۔ پھلوں اور گاجر کی سویاں مرغوب تھیں۔ خصوصاً آخر عمر میں کہ قبض کی شکایت بڑھ گئی تھی جس سے درد گردہ کا اندیشہ رہتا تھا اس لئے صبح کو چاء کے ساتھ بھی اکثر دہی نوش فرمایا کرتے کہ اس سے ہلکی سی تلیین ہو کر طبیعت صاف ہو جاتی تھی

شروع میں میٹھے سے زیادہ شوق تھا اور نیز میٹھا پسند تھا مگر آخر میں رغبت جاتی رہی اور نمکین کی طرف بڑھ گئی تھی۔ مولوی زکریا صاحب کا مذاق مشہور تھا کہ نمکین سے رغبت ہے اور میٹھے سے وحشت۔ حضرت رح کو ان کے ساتھ اولاد سے زیادہ محبت تھی کہ اجنبی آدمی ان کو حضرت کا بیٹا ہی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے پوچھا بھی کہ حضرت یہ آپ کے بیٹے ہیں؟ فرمایا بیٹے سے بڑھ کر۔ حضرت رح کھانے میں اکثر ان کو بُلا لیا کرتے تھے وہ کہا بھی کرتے کہ حضرت میں تو کھا چکا مگر آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے تم تو طالب علم ہو، کباب تو چکھ لو، اس کے لئے بھوک کی ضرورت نہیں۔ لطافت کے درجہ میں یہ بھی فرمایا کرتے میاں زکریا اتنے دنوں سے پاس بیٹھتے ہیں ان کو تو میٹھے کا شوق نہ ہوا مجھے نمکین کا ہو گیا۔ ہاں بھئی زور اور قوت کی بات ہے۔

مرغوب پھل پھلوں میں آپ کو آم سے زیادہ شوق تھا۔ خصوصًا دیسی ٹپکا کہ اس کے سامنے قلمی آپ کے نزدیک کچھ نہ تھا۔ آپ کے جدی باغ میں چند درخت دیسی آم کے تھے وہ آپ تڑوا کر منگواتے اور ان کی پال ڈالی جاتی تھی۔ کھانے کا جتنا شوق تھا اس سے زیادہ کھلانے کا تھا اس لئے ہر موسم میں ایک تاریخ مقرر فرما کر آپ اپنے مخلصین واحباب کو مدعو فرمایا کرتے اور بڑے برتن میں قسم قسم کے پالی اور ٹپکے کے آم بھروا کر بیچ میں رکھدیتے۔ خود بھی کھاتے اور جو آم مزہ کا نکلتا چکھ کر خدام کو عطا فرماتے جاتے کہ لو یہ کھاؤ مزہ کا ہے۔

انبہ کے تمام موسم میں کسی دن آپ کا مکان آموں سے خالی نہ رہتا خصوصًا لال پٹری ایک درخت کا نام تھا اس کا آم آپ کو نہایت مرغوب تھا اور خصوصیت سے آپ اس کو انبہٹہ سے منگایا کرتے تھے۔

انجیر اور پنیر کا شوق انجیر سے بھی آپ کو رغبت تھی۔ پنیر آپ بالخصوص شوق سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے شروع میں پنیر سے رغبت نہ تھی اس لئے جب مجھے محبت وشفقت کے ساتھ حضرتؒ عطا فرماتے تو لے لیتا مگر کھا نہ سکتا تھا۔ ایک بار عرض کیا کہ حضرت چیز ایسی جس سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رغبت تھی مگر میری گندی طبیعت اس سے موافقت نہیں کھاتی اس کا مجھے بڑا افسوس ہے فرمایا اچھا میاں یہ تو بڑی لذیذ چیز ہے کھا کر تو دیکھو۔ حکمًا کھایا تو حضرت کی کرامت تھی کہ لذیذ معلوم ہوا اور پھر رغبت بڑھ گئی۔

بلا نمک کی چائے چائے آپ بے نمک کی پیتے تھے جس میں دودھ غالب اور شکر زیادہ ہوتی تھی بعض جگہ اس میں نمک ملاتے ہیں کبھی ایسی چائے سامنے آئی تو پی نہ سکے اور فرمایا چائے کو سالن بنا دیا۔

قیلولہ کی عادت بعد اکل[1] گھنٹہ سوا گھنٹہ قیلولہ[2] فرما کر آپ اُٹھتے اور وضو فرما کر سنت ظہر مکان ہی پر پڑھتے اور نماز کے وقت معینہ سے دس منٹ قبل مدرسہ میں تشریف لا کر حجرہ کے متصل

---

[1] کھانا کھانے کے بعد۔ [2] لیٹ کر آرام کرنا سونا ہو یا نہ ہو۔

اپنی جگہ بیٹھ جایا کرتے۔ اور جب نماز کا وقت ہوتا کہ گرمی میں تقریباً ۲ بجے اور سردی میں ڈیڑھ بجے تو آپ نماز پڑھتے اور بعد فراغ درس میں مشغول ہو جاتے۔ اخیر زمانے میں اس وقت کا تقریباً پون گھنٹہ تلاوت میں صرف ہوتا تھا اور اس کے بعد صبح کے آئے ہوئے خطوط کے جوابات اور فتاوی لکھواتے تھے۔
عصر سے قبل چار نفل پڑھنے کا آپ کا اکثر یہ معمول تھا بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ آپ ان کو ترک فرمادیں۔

ہمہ وقت باوضو رہنا آپ ہر وقت باوضو رہتے اور اس لئے عصر سے قبل وضو کرنے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔

بعد عصر جلوۂ عام بعد عصر جلوۂ عام کا وقت تھا کہ گرمی میں صحن مدرسہ اور سردی میں سہ دری کو آپ زینت بخشتے اور خدام چار طرف آبیٹھتے تھے۔ تسبیح آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ حاضرین سے ہر قسم کی لطافت و بے تکلفی کے ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے اور تسبیح بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی وقت میں کوئی اخبار آتا تو اس کو دیکھتے یا پوچھتے تھے کہ کہو بھئی کوئی نئی خبر تو نہیں؟ جنگ کے زمانہ میں اسلامی خبروں کے معلوم کرنے کا آپ کو زیادہ اہتمام رہا اس کے بعد کبھی کوئی خبر دیکھ یا سُن لی ورنہ محض سرخیاں دیکھ کر اخبار رکھدیا کرتے تھے۔
مغرب کے بعد اوابین میں ایک یا سوا پارہ پڑھتے اور پھر کھانا نوش فرمانے کے لئے تشریف لیجاتے عشا کی اذان کے بعد تک مکان میں رہتے اور جو مستورات مہمان آئی ہوئی ہوتیں ان کی سنا کرتے تھے۔ پھر مدرسہ میں آکر ذرا ٹھیرتے اور مسجد میں تشریف لاکر دو یا چار رکعت پڑھتے تھے۔ بعد عشا کوئی خاص مہمان ہوتا تو ذرا دیر ٹھیرتے ورنہ مہمانوں کے بستر و چارپائی کو دریافت فرما کر کہ کافی انتظام ہو گیا یا کسی چیز کی ضرورت ہے مطمئن ہو جانے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے۔ نماز عصر ہمیشہ دو مثل کے بعد حنفی متفق علیہ وقت پر پڑھتے اور عشا میں بھی کافی تاخیر فرماتے تھے۔

قاری کے پیچھے نماز اور نقص پر تنبیہ نماز فجر بالعموم طلوع شمس سے ۵۰۔۴۵ منٹ قبل شروع فرماتے۔ چونکہ تجوید سے خاص محبت تھی اس لئے قراء کو امامت کے لئے پسند فرماتے اور قرأت میں کچھ نقص رہتا تو بعد نماز فوراً متنبہ فرماتے۔
ایک بار جبکہ امامت صلوٰۃ مولوی ظفر احمد صاحب کے ذمہ تھی فرمایا کہ مولوی ظفر تم مد میں کمی کرتے ہو ذرا اور بڑھایا کرو۔ ایک بار فرمایا تم کبھی تو ضاد کو صحیح نکالتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے صحیح مخرج پر قادر ہو[1] اور کبھی دال مفخم پڑھتے ہو یہ کیا واہیات ہے۔ جب قادر علی المخرج ہو تو اس کو ہمیشہ صحیح

[1] صحیح مخرج سے نکالنے پر قدرت رکھتے ہو۔

کیوں نہیں نکالتے۔ اس کی پوری طرح مشق کرو۔ پھر فرمایا کہ مخرج ضاد حضرت مولانا تھانوی کا بہت صحیح؟ کبھی تو تمہاری قراءت میں مولانا کا رنگ آجاتا ہے کبھی ایسی جلدی کرتے ہو کہ ضاد کا مخرج تو بگڑ ہی جاتا ہے اور دوسرے حرف بھی اچھے نہیں نکلتے، حضرت کو اس کا بھی اہتمام تھا کہ وقف و وصل میں رموزِ مصحف کا اتباع کیا جائے کہ جہاں آیت یا علامت وقف ہے وہاں وقف کیا جائے اور جہاں وقف ہی منع کیا ہے وہاں نہ کیا جائے اور فرمایا کرتے تھے کہ آج کل قراء اس کی رعایت نہیں کرتے مگر خیر و برکت اتباع سلف میں ہے۔

ایک مرتبہ مولوی ظفر احمد صاحب نے فلما اتٰھا نودی یا موسیٰ انی انا ربک فاخلع نعلیک[1] میں یا موسیٰ پر مد کر کے انی انا ربک سے وصل کر دیا تو بعد نماز حضرت نے فرمایا تم نے یا موسیٰ پر وقف نہیں کیا؟ عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے وصل بھی جائز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نے حمائل شریف کھولی اور دیکھنے کے بعد فرمایا ہاں صحیح کہتے ہو۔

حالانکہ تہجد آپ کا دائمی معمول تھا اور نیند گویا قبضہ کی تھی مگر وتر آپ عشا کے بعد مسجد ہی میں پڑھتے اور یہ کمال احتیاط تھی کہ آخر شب میں اٹھنے پر اعتماد نہ فرماتے تھے۔ فجر کی سنتیں آپ ہمیشہ گھر میں پڑھتے اور سفر میں ہوتے تب بھی قیامگاہ پر پڑھ کر مسجد میں جاتے تھے کہ کمال اتباعِ سنت اسی میں تھا۔

نماز میں سنت و استحباب کی رعایت

حضرت کو نماز کے ہر جزو میں سنت و استحباب کی رعایت اور فقہاءِ حنفیہ کے اتباع کا اہتمام تھا۔ ایک مرتبہ مولوی ظفر احمد صاحب سے فرمایا مولوی ظفر تم ظہر کی نماز میں طوالِ مفصل[2] نہیں پڑھتے؟ عرض کیا کہ نہیں بلکہ اوساط پڑھتا ہوں۔ فرمایا کہ فقہاءِ حنفیہ تو فجر و ظہر دونوں میں طوال کو سنت فرماتے ہیں اس کی رعایت کیا کرو۔ اس روز مولوی صاحب نے نماز ظہر میں سورۂ قٓ پڑھ دی جو نمازیوں پر بار ہوئی۔ بعد نماز حضرت نے فرمایا میرا یہ مطلب نہ تھا کہ فجر و ظہر کی قراءت برابر کرو بلکہ فجر کی اطول[3] ہونا چاہئے اور ظہر کی کم۔ دیکھو طوال میں سورۃ التکویر اور سورۃ الانفطار بھی تو ہے ظہر میں طوال کی ایسی ہی سورتیں پڑھا کرو۔

ایک بار فرمایا کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ الٓمٓ تنزیل السجدہ اور سورۃ الدہر پڑھا کرتے تھے شافعیہ نے تو اس کا واجب کی طرح التزام کر لیا کہ کبھی ترک ہی نہیں کرتے اور حنفیہ نے اس کے ترک کا التزام کر لیا کہ کبھی نہیں پڑھتے۔ دونوں فعل سنت کے خلاف ہیں اولیٰ یہ ہے کہ جمعہ کے دن ان کو اکثر پڑھا جائے، احیاناً[4] ترک

[1] جب طور پر آئے تو ندا دیئے گئے اے موسیٰ بیشک میں ہی تمہارا رب ہوں تو تم اپنے جوتے نکال دو۔ آیت آگے تک ہے۔
[2] سورۂ حجرات سے سورۂ بروج تک طوال مفصل ہیں جو فجر و ظہر میں مستحب ہیں بعض سنت بھی کہتے ہیں۔
[3] زیادہ طویل۔
[4] کبھی کبھی تاکہ واجب ہونے کا کلیہ نہ ہو سکے اور بدعت نہ ہو سکے۔

بھی کردے" مولانا نے کہا حضرت میرے نہ پڑھنے کا سبب یہ ہے کہ مجھے سورۃ الم تنزیل حفظ نہیں ہنس کر فرمایا پھر حفظ کر لو کوئی بڑی سورت نہیں ہے تیس ہی آیتیں ہیں"۔ غرض حضرت کو نماز کی تعدیل[1] و تحسین کا خاص اہتمام تھا جس کی وجہ سے حضرت کی نماز قابلِ دید تھی جس کو ہر وارد[2] و صادر تعجب سے دیکھتا اور سبق لیا کرتا تھا کہ نماز ایسی ہونی چاہئے۔

نماز میں حضور اور خشوع و خضوع

مولوی عبداللہ جان لکھتے ہیں ایک خاص واقعہ جو میں نے حضرت کے متعلق ہمیشہ نوٹ کیا اور وہ میرے دل پر نہایت موثر رہا ہے یہ ہے کہ ادائے نماز کی حالت میں بمصداق کانک تراہ[3] حضرت پر وقار اور خشوع و سکینہ کی ایک خاص حالت طاری رہتی تھی۔ بحمداللہ بچپن سے میری تعلیم و تربیت اور نشست برخاست علماء کرام کی صحبت میں رہی ہے مگر حضرت کے سوا میرے ذہن میں اور کوئی مثال نہیں جس کو حضرت کی نماز کے مماثل کہہ سکوں بدن میں کھجلی لگے تو ہر شخص کو کھجاتے دیکھا ہے۔ مگر حضرت کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ نماز کی حالت میں کوئی خارجی ضرورت ہی پیش نہیں آتی بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی حضرت کو زکام یا کھانسی کی شدت ہوئی تو نماز کے شروع کر دینے کے بعد ختم نماز تک حضرت کو کبھی کھانسی[4] بھی نہیں آئی۔

بارہا دیکھا کہ فارغ ہونے کے بعد حضرت کو فوراً کھانسی اٹھی اور حضرت اٹھ کر نالی پر جا بیٹھے وہاں خوب کھانسے بلغم تھوکا اور سب ضروریات کو دفع کیا لیکن جب پھر نماز شروع فرمادی تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی مرض کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ حضور قلب[5] اس کا نام ہے۔ اس کیفیت کا جب ابتداءً مجھے احساس ہوا تو اس کے بعد میں ہمیشہ حضرت کی نماز کا غور سے مشاہدہ کیا کرتا اور برسوں اس کا نظارہ یکساں کرتا رہا کبھی حضرت کو صحت و علالت میں بیٹھ کر نماز پڑھتے بھی میں نے نہیں دیکھا بجز ایک دفعہ کے کہ دو آدمیوں نے پکڑ کر حضرت کی خواہش کے موافق مغرب کی نماز ادا کروائی۔ اس وقت حضرت ایسے علیل تھے کہ جانبر ہونے کی ظاہری توقع بالکل جاتی رہی تھی۔

ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ حضرت کی نماز جس نے دیکھی وہ کہہ سکتا ہے کہ شاید عمر بھر میں ایسی نماز نہ دیکھی ہو گی قیام کی حالت میں کیا مجال کہ ادھر ادھر میلان ہو۔ سیدھے ایسے سکون کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ حرکت نام کو نہ تھی پھر قیام بھی طویل ہوتا تھا اور عمر بھی ضعیفی و پیری کی تھی مگر آپ کا سکون دیکھ کر جوانوں کو شرم آتی تھی ؎

ہر چند[6] پیر و خستہ و بس ناتواں شدم　　　　ہر گہ نظر بہ سوئے تو کردم جواں شدم

---

[1] ٹھہر ٹھہر کر ادا کرنا اور عمدہ بنانا۔ [2] آنے جانے والا۔ [3] حدیث شریف میں ہے کہ نماز ایسی پڑھو گویا تم حق تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ [4] فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے روکا کرے۔ [5] دل کا حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا۔ [6] اگرچہ بوڑھا خستہ اور بہت کمزور ہو گیا ہوں ... نظر کر لیتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

اس کے بعد رکوع بھی موافق سنت سجدہ بھی موافق سنت ہر رکن میں پوری تعدیل اور ہر جزو میں کامل سکون، سنن و آداب و مستحبات کی پوری رعایت کہ جی چاہتا تھا حضرت کی نماز کو دیکھے جاؤ اور کتابوں میں جو تفصیل پڑھی ہے اس کا مجموعہ مفصل نظر میں ڈال لو۔

آپ کی نماز دیکھ کر کفار کو بھی اس کا احساس ہوتا تھا کہ حضرت نماز میں ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے خدا کے سامنے کھڑا ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک بار آپ سفر میں تھے اسٹیشن پر ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور جماعت کا انتظام کیا گیا۔ آپ نے ظہر کی سنتیں حسب عادت کمال اعتدال کے ساتھ پڑھیں اور پھر فرضوں کی جماعت ہوئی۔ چند انگریز بھی نماز کے منظر کو دیکھ رہے تھے جماعت سے فارغ ہو کر سب نے سنتوں کی نیت باندھی اور جب اس سے فارغ ہو گئے تو ایک انگریز نے ایک نمازی سے پوچھا کہ تم کس کی نماز پڑھ رہے ہو؟ کہا خدا کی نماز پڑھتے تھے۔ انگریز نے حضرت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اور یہ کس کی نماز پڑھ رہے ہیں؟ کہا یہ بھی خدا کی نماز پڑھتے ہیں تو وہ انگریز بے ساختہ بولا کہ ہاں یہ پادری تو بیشک خدا کی نماز پڑھتا ہے مگر تم خدا کی نماز نہیں پڑھتے معلوم نہیں کس کی پڑھتے ہو۔

ایک بار آپ نے خود فرمایا کہ نماز پڑھتے ہوئے نہ مجھے شور و غل پر التفات ہوتا ہے نہ گانے بجانے پر البتہ اگر کوئی قرآن پڑھنے لگے تو منازعت ہونے لگتی ہے اور اس طرف التفات میں مضطر ہو جاتا ہوں۔" اس کا راز حب کلام اللہ تھا کہ اس کو سن کر خود بخود طبیعت کھچتی اور مالی نازع القرآن[1] کی حقیقت کا انکشاف کیا کرتی تھی۔

جمعہ کے دن بعد اشراق کوئی خاص خط یا مسئلہ یا مضمون جو ہفتہ کے دوران میں آیا ہوا ہوتا تو اس کو تحریر فرماتے اور پھر خط بنواتے اور غسل کیا کرتے تھے۔ عموماً آپ کی عادت شریفہ حلق[2] راس کی تھی اور اس میں جانب[3] راست کی تقدیم ملحوظ رہتی تھی۔ لبوں کا بھی آپ حلق کراتے اور کبھی مقراض سے اتنی باریک کہ گویا حلق کی ہوئی ہیں۔ ڈاڑھی آپ کی گنجان اور بھری ہوئی نہ تھی مگر اس میں بھی آپ کنگھا کرتے اور قبضہ سے زائد کتر[4] وا دیا کرتے تھے۔

ناخن ترشوانے میں ترتیب مسنون کا پورا لحاظ فرماتے کہ داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت سے شروع فرما کر چھنگلیا تک پہنچتے اور پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے انگوٹھے تک پہنچ کر آخر میں داہنے انگوٹھے کا ناخن ترشواتے تھے کہ ابتدا و ختم یمین[5] پر ہوتا تھا۔ پاؤں کے ناخن جب بڑھ جاتے تو وہ بھی ترشواتے اور بغل کا حلق کرایا کرتے تھے۔

---

[1] حدیث شریف میں جو آیا کہ مقتدیوں کو پڑھتے پر حضور نے فرمایا تھا کہ مجھے کیا ہے کہ قرآن میں مزاحمت کیا جاتا ہوں۔ اب حقیقت کھلی کہ قرآن شریف کی محبت کی وجہ سے التفات ہو کر مزاحمت ہوتی تھی دوسری کسی چیز سے نہ التفات ہوتا تھا نہ مزاحمت۔
[2] سر منڈانے کی۔ [3] داہنی جانب کے پہلے کرنے کی رعایت۔ [4] حنفیہ کی تحقیقات میں یہی سنت ہے۔
[5] داہنے پر۔ گو اس کی روایت ضعیف ہے مگر موضوع نہیں ہے۔ حدیث شامی جلد ۵ میں ہے۔

غسل اکثر نیم گرم پانی سے فرماتے اور سخت گرمی میں ٹھنڈے پانی سے۔ بعد غسل کھانا تناول فرما کر قیلولہ کرتے اور بارہ بجے اٹھ کر وضو فرما کر مدرسہ میں تشریف لاتے۔

عطر سے رغبت

کپڑے بدلتے جو غیر پہنتے اور اعلیٰ سے اعلیٰ عطر لگاتے، کوئی مہمان ہوتا تو مختلف قسم کے عطر کی شیشیاں اس کے سامنے کر دیتے کہ جو پسند ہو وہ لگائے۔ عطر آپ کو عنبر کا زیادہ پسند تھا۔ اس کے بعد گلاب، مشکی حنا اور راگمہ۔ ایک بجے کے قریب مسجد دارالطلبہ میں تشریف لے آتے اور صفِ اول میں امام کی داہنی جانب منبر کے سامنے کھڑے ہو کر سکون کے ساتھ اول تحیۃ المسجد اور پھر جمعہ کی چار سنتیں پڑھتے اور پھر تسبیح پڑھنا شروع فرما دیتے تھے۔

غسل اور کپڑے بدلنے کا اہتمام اسقدر تھا کہ پنجشنبہ کو اگر سفر فرماتے تو دُھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑہ اور جبہ ساتھ رکھتے تھے اور قیامگاہ پر غسل فرما کر بدلا کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اول مغسول[1] اور پھر مستعمل کپڑے باندھنے کی دشواری سمجھ کر کپڑے بدل کر سفر کیا ہو۔

لباس

لباس آپ کا سادہ تھا کہ نیچا کرتہ، ٹخنہ سے اونچا پاجامہ اور صدری مگر نظافت زیادہ پسند تھی اس لئے سفید شفاف کپڑا پہنتے تھے۔ موٹا کپڑا بھی آپ کی نزاکتِ بدن برداشت نہ کر سکتی تھی اس لئے باریک ململ یا تن زیب کا کرتہ ہوتا تھا اور لٹھہ کا پاجامہ۔

سفر میں بستر کا اہتمام

سفر میں بستر ساتھ رکھنے کا آپ کو اہتمام تھا کہ میزبان کو فکر و پریشانی نہ ہو۔ بالخصوص تکیہ آپ بہت نرم رکھتے تھے کہ ذرا سخت ہوتا تو نیند نہ آتی تھی اس لئے چھوٹا تکیہ سینبھل کی روئی کا اور مصلیٰ جاڑے میں قالین ایرانی کا اور گرمی میں سوتی ضرور ساتھ ہوتا تھا۔

سودیشی تحریک

سودیشی کی تحریک[2] میں آپ نے ولایتی کپڑے کا استعمال کبھی حرام نہیں فرمایا۔ ہاں مُلکی نفع کی خاطر سیاسی درجہ میں کوئی ترجیح دیتا تو برا نہ سمجھتے تھے۔ جو لوگ دین کی محبت سے محروم اور نصرانیت سے انس کی طرف مائل ہیں ان کی یہ حرکت کہ اپنی ہر تجویز کو دین کی چادر پہنانے کی کوشش کرتے ہیں آپ کو ہمیشہ ناپسند ہوئی کہ سوڈا واٹر کی اُبھان یا پھونس کی آگ کی طرح دبنے والا ہوتا ہے چنانچہ بارہا تجربہ ہوا کہ وہ لوگ کل جس چیز کو اپنی زبانوں سے فرض کہہ رہے تھے آج وہی اس کو حرام کہنے لگے اس لئے آپ نے کسی شورش کے وقت بھی حقیقت الامر اور اعتدال سے باہر قدم نہیں رکھا۔ خود کسی کی پھٹی چادر میں پاؤں ڈالنا بھی پسند نہ کیا کہ نقارخانہ میں طوطی کی آواز تھی۔

---

[1] دھلے ہوئے پھر بعد بدلنے کے مستعملہ باندھنے کی۔ [2] خلافت کمیٹی کے زمانے میں یہ تحریک چلی تھی کہ انگریزی فیکٹریوں کے بنے ہوئے حرام اور دیسی حلال ہیں جس کی کوئی شرعی دلیل نہ تھی گو سیاسی مصلحت ہو۔

حق گوئی و بیباکی

اسی طرح جس وقت گائے کے ذبح کا ترک شروع ہوا اور بہتیرے مولویوں نے بھی اس کو مباح قرار دے کر مصالح دینیہ ترجیح ترک پر فتوے دیدیئے تو آپ نے سکوت پسند نہیں کیا اور شعارِ اسلام ہونے کے لحاظ سے اس کی ضرورت علماً و عملاً محقق فرمائی۔ اس وقت آپ پر سب و شتم ضرور ہوا مگر چند ہی روز بعد اس کا نتیجہ دیکھ کر ممانعت کا فتوے دینے والے خود فرضیت کا فتوے[1] دینے لگے غرض اس اصول کے ہمیشہ آپ پابند رہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ دنیوی ضروریات پر جس طرح اول نظر لیڈران قوم کی جائے گی۔ اسی طرح دینی ضروریات پر اول نگاہ پڑنا علماء و مشائخ کا منصب ہے کہ لیڈرانِ قوم کا فتویٰ جس میں وہ علماء کو متفق کرنے کی کوشش کریں کسی طرح دین نہیں ہو سکتا۔

ایک بار آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا مسلمان اس شورش میں ہلاک ہو جائیں گے کہ لیڈران کو کر لیا آگے اور مولوی ہو لئے ان کے پیچھے۔

سر پر عمامہ آپ کی اکثر عادت تھی اور زیادہ گرمی میں ہلکی ٹوپی کم قیمت سر سے مڑھی ہوئی اوڑھتے تھے جو اکثر میرٹھ سے تیار کرا کر بھیجدیا جاتا تھا۔ چوغہ آپ کا ادنیٰ کشمیری بیش قیمت تھا اور جاڑے میں اکثر اس کو پہنا کرتے تھے۔ پاجامہ میں کمر بند خاص بناوٹ کا ہوتا تھا جس کا بننا آپ نے مولوی زکریا کی اہلیہ کو کہ بیٹی کے برابر سمجھتے تھے سکھلوایا اور وہ بُن کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا کرتی تھی۔ اچکن[2] پہنے ہوئے میں نے حضرت کو کبھی نہیں دیکھا۔

جوتہ سادہ یا ایک پھول کا پہنتے تھے مگر نہایت نرم جو اکثر لدھیانہ یا انبالہ سے آجاتا تھا۔

بڑا رومال ہاتھ میں رکھنے کی عادت تھی اور اخیر زمانہ میں لاٹھی بھی رکھتے تھے۔

عزم و ہمت

ہمت آپ کی نہایت وسیع تھی اور استقامت کا اثر دنیا کے ہر کام پر بھی پڑتا تھا کہ جس کام کا جس طریق پر عزم فرما لیا اس سے ہٹتے نہ تھے۔ جس وقت پر کہیں پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور جس وقت کے متعلق واپسی کا گھر والوں سے ذکر فرما گئے کتنا ہی کسی کا اصرار ہو مگر اس میں

---

[1] ہر کام ہے اور ہر مرد یعنی اس کے اہل۔ فتوی کام علمائے دین کا ہے نہ کہ لیڈروں کا۔

[2] اچکن شیروانی مراد ہے گو وہ مسلمانوں کا لباس ہے مگر صلحا کا لباس نہیں ہے اس لئے اس سے بھی بزرگوں نے پرہیز کیا ہے۔ ہاں چھ کلی کا انگرکھا جو عام تھا فاسق فاجروں کا لباس نہ تھا وہ بارہا پہنا ہے۔ اور جوتا انگریزی بوٹ گرگابی چپل وغیرہ بھی صلحاء کا طور نہیں ہے گو عام ہو جانے کی وجہ سے وہ خصوصیت کفار سے اور بعض خصوصیاتِ فساق سے بھی نکل چکے ہوں اس لئے وہ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ احقر کو انگریزی جوتا پہنے دیکھ کر فرمایا تھا یہ کیا کھونسڑے سے پہن رہا ہے پچاس برس ہو گئے دل میں ایسا چبھا کہ کبھی سلیپر یا چپل بھی نہیں پہنا۔ حضرت گنگوہی کی طرح حضرت بھی اظہارِ نعمت میں خوش لباس تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نہایت سادہ تھے کسی نے حضرت گنگوہی کی خوش لباسی کا ذکر کیا تو فرمایا اس شخص کا نفس ایسا ہے کہ وہ جو بھی پہن لے اثر نہیں لیتا۔

تخلف نہیں ہوتا تھا کہ دوسروں کو انتظار کی تکلیف ہوگی، اور اس بارے میں حضرت کو میں نے اتنا تشدد پایا کہ صدہا واقعات پر نظر رکھی اور برسوں مشاہدہ میں کبھی ایک دفعہ بھی خلاف نہیں ہوا۔ ناواقف نا قدردان اس کو ضد یا رکھاوٹ و بے مروتی سمجھتے تھے کہ مشتاقوں کی الحاح پر بھی نہیں پسیجتے مگر جو سمجھتے تھے کہ عزم و صدق اور وفاء وعدہ کی حقیقت کیا ہے[1] وہ حضرت کے اس عمل سے سبق لیا کرتے تھے۔

ایک بار آپ نے صوفی محمد علی صاحب کی طلب پر پوٹھ تشریف لانے کا وعدہ فرمایا مگر راستہ میں گاڑی کا میل نہ ہونے کے سبب آپ نہ پہنچ سکے دوسری گاڑی سے تشریف لائے مگر ہم خدام انتظار دیکھ کر واپس ہولئے تھے۔ ہاپوڑ کے اسٹیشن پر کہ پوٹھ وہاں سے تین میل تھا حضرت کی زیارت ہوئی اور مجبور چند گھنٹہ وہیں ایک مسجد میں قیام کیا۔ اتفاق سے وہاں کے تھانہ دار میرے دوست تھے ان کو معلوم ہوکہ میں اور میرے حضرت مسجد میں مقیم ہیں تو فوراً حاضر ہوئے اور اصرار کیا کہ مکان پر کھانا تناول فرما کر جائیں حضرت نے مان لیا اور فرمایا کہ واپس جانا اسی گاڑی سے ہے انھوں نے کہا بہتر اور اسباب اٹھوا کر مکان پر لے آئے کھانے کا اہتمام شروع کر دیا کہ کئی قسم کا ہو، اس میں دیر ہوئی اور حضرت نے گھڑی دیکھی کہ وقت قریب آگیا۔ دو تین بار حضرت نے تقاضا فرمایا کہ بھئی جو پکا ہو وہ لے آؤ گاڑی ہاتھ سے نہ جاتی رہے۔ مگر وہ ہاں حضور ابھی آتا ہے کہہ کر ٹلاتے رہے کیونکہ طیار نہ ہوا تھا۔ جب وقت بہت تھوڑا رہ گیا تو حضرت سے ضبط نہ ہو سکا اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا چلو بستر اٹھاؤ کہ اب وقت میں گنجایش نہیں ہے۔ میں ایسی صورت میں دوست کی رعایت کیا کرتا فوراً اٹھ کھڑا ہوا کہ بہتر۔ میزبان نے یہ دیکھا تو کچا پکا جو کچھ تھا جلدی سے لا کر سامنے کر دیا حضرت بیٹھ گئے اور تناول فرماتے ہوئے کہا کہ تمہارے اس تکلف ہی نے تو تمہیں اور ہمیں دونوں کو پریشان کیا۔ ایک شخص کی خاطر میں کو انتظار میں پریشان کرنا مجھے پسند نہیں خصوصاً جب عرض کر دیا تھا کہ اسی گاڑی سے جانا ہے تو محبت و اخلاص کا تقاضا یہ تھا کہ وقت کی گنجائش دیکھ کر جتنا ہو سکتا وہ پکواتے۔ شریعت نے اسی سادگی کی تعلیم دی ہے نہ کہ دوسروں کو حرج میں ڈالنا کہ اسی کا نام تکلف جو ممنوع ہے۔

ایک مرتبہ آپ احباب کی درخواست پر منصور پور تشریف لے گئے جو اسٹیشن منافی سے تین میل تھا۔ مولوی ظفر احمد صاحب ساتھ تھے۔ حسب وعدہ ایک دن قیام فرما کر اگلے دن واپسی کا قصد کیا تو گاؤں والے مزید قیام پر مصر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ بس اتنا ہی قصد کر کے چلا تھا مدرسہ کا حرج ہوگا اور آنے والے مہمان پریشان ہوں گے۔ گاؤں والوں نے ایک نہ سنی اور سواری کا انتظام نہ کیا۔ جب ریل کا وقت آیا تو حضرت نے مولوی ظفر احمد صاحب سے فرمایا چلو بھئی سامان اٹھاؤ اور کچھ مجھے دیدو اور پیدل ہی چلو۔ انھوں نے

[1] اور جہاں جس وقت کی اطلاع ہے ان کا انتظار اور خلاف ہونے پر تکلیف کسقدر ہے۔

عرض کیا حضرت سامان کچھ نہیں صرف ایک بستر ہے وہ میں لے لوں گا۔ چنانچہ حضرت نے گاؤں والوں سے کچھ نہ فرمایا اور پیدل چل پڑے۔ گاؤں والوں نے دیکھا کہ حضرت روانہ ہولئے تو جلدی جلدی سواری کا انتظام کیا اور پیچھے ہولئے مگر اس وقت پہنچے جبکہ حضرت تین میل کی مسافت قطع فرما کر اسٹیشن پر پہنچ لئے۔ حضرت نے فرمایا اب سواری کس کے لئے لائے ہیں تو ریل پر بھی آگیا اور دیکھو اس طرح کسی کو تکلیف نہیں دیا کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ یہاں آنے کی مجھے ہمت نہ ہوگی۔

بے تکلفی وسادگی آپ نشست و برخاست اور حرکت و سکون میں سادہ اور بے تکلف تھے مجلس میں جہاں جگہ پاتے بیٹھ جاتے۔ کوئی صدر پر بیٹھنے کا اصرار کرتا تو اس میں بھی تکلف نہ تھا اور سب کے پیچھے جگہ ملتی تو اس میں بھی گرانی نہ تھی۔

بدوؤں کے مشاعرہ میں شرکت ۷رذی الحجہ کو منیٰ میں مجھے اطلاع ملی کہ یہاں بدوؤں کا مشاعرہ اور قومی مفاخرہ جو کبھی جاہلیت میں ہوا کرتا تھا اب بھی ہوتا ہے مجھے شوق ہوا کہ عرب کی فصاحت وادبیت جس کا قرآن مجید سے مقابلہ کیا گیا ہے کاش دیکھتا کہ کیا رنگ ہے چنانچہ حضرت سے عرض کیا اور عشاء کے بعد حضرت بھی میرے ساتھ ہولئے جگہ دریافت کرتے ہوئے بستی سے دور منحر اسمٰعیلؑ کے مقابل کھلے میدان میں بدوؤں کا اجتماع دیکھا اور اجنبی تماشائی بنے ہوئے اس میں گھس گئے، بدّو دائرہ بنائے ہوئے کھڑے تھے اور وسط میں دری کا فرش تھا جس پر چند سرداران بدّو بیٹھے ہوئے تھے، ان میں حقہ کا دور چل رہا تھا اور دو مختلف قبیلوں کے جن میں مفاخرہ ہوتا تھا دس دس بدّو بالمقابل کھڑے تھے۔ ایک بدّو آگے بڑھا اور اس نے عربی شعر پڑھا اور اس کی قوم نے اس کو متفقہ آواز میں گانا شروع کردیا۔ یہ گویا دعویٰ اور سوال تھا کہ فریق مقابل سے اس کے جواب کا مطالبہ ہے۔ اس شعر میں اپنی قومی شرافت کا بلیغ تذکرہ کرتے ہوئے دوسرے پر طعن کیا گیا تھا۔ دو منٹ نہ گذرنے پائے تھے کہ فریق مقابل کا ایک بدو اپنے جتھے سے نکل کر آگے آیا اور چھڑی ہلائی۔ اس کے نکلتے ہی سارے بدّو خاموش ہوگئے، اور اس نے اسی بحر اور اسی قافیہ میں شعر پڑھا جس میں خصم کے لعن کا بلیغ جواب دیتے ہوئے اپنے قومی مفاخرہ کا تذکرہ اور ترجیح تھی، اب اس کی قوم اس شعر کو متفقہ زبان میں گاتی اور گویا بار بار خصم سے مطالبہ کرتی تھی کہ جواب لاؤ۔ چنانچہ جماعتِ اولیٰ میں سے پھر کوئی شخص جلد از جلد آگے بڑھ کر چھڑی ہلاتا اور سب کو خاموش کرکے اسی بحر اور اسی ردیف میں جواب الجواب سناتا اور اس کے جتھے والے اس کو گانا شروع کردیتے۔ وسط میں بیٹھے ہوئے سرداران قوم گویا حکم و سرپنچ تھے کہ شعر قابل مدح ہوتا تو بخ بخ کہہ کر تحسین کرتے اور مذموم و ناقص ہوتا تو تھو تھو کرکے تہجین[1] وتنقیص کردیتے تھے۔

[1] تحقیر

حضرتؒ کس مپرسی کے عالم میں عامی بنے ہوئے دیر تک بندہ کے ساتھ جھرمٹ میں کھڑے رہے اور حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ نہ پہلے سے کوئی مضمون دیا ہوا ہے نہ بحر معین کی ہوئی ہے نہ ایک فریق کو یہ معلوم ہے کہ خصم کیا طعن دیگا اور اپنا کونسا فخر ظاہر کرے گا جس کے لئے تیار ہو کر آئے ہوں۔ فوراً سوال اور فوراً ہی اسی طرز میں جواب اور پھر جواب الجواب اور پھر اس کا جواب کہ یہ سلسلہ چلتے ہوئے گھنٹہ بھر سے زیادہ گذر لیا جواب میں کسی فریق کو دیر ہو جاتی تو پنچوں کی طرف سے عجلت کا تقاضا شروع ہوتا ورنہ ہار اور مغلوبیت سمجھی جاتی تھی۔ کیا حال ہوگا پہلی فصاحت کا جس کے متعلق سنا ہے کہ فی البدیہ کھڑے کھڑے پچاس ساٹھ شعر بنا دینے کوئی بات ہی نہ تھی، گویا پہلے سے بنائے ہوئے سنا رہے ہیں اور اشعار بھی وہ جن سے جنگ میں شراب کا کام لیا جاتا کہ سامعین مست و بیخود ہو کر جانیں لڑا دیا کرتے تھے۔ اب اتنا ضعف ضرور ہے کہ دعوی اور جواب کے لئے ایک شخص کی تحدید نہیں ہے بلکہ قوم کے دس شاعر ایک کے حکم میں ہیں کہ جس کی طبیعت جلد رسائی کر جائے وہ جواب دیدے۔ مگر شعر میں صرف وزن و قافیہ ہی نہیں بلکہ تمام رعایتیں ضروری ہیں کہ الفاظ مہذب ہوں بندش دلربا ہو مضمون سلیس ہو مفہوم بے غبار اور آسان ہو، پھر اس میں مدعی کے دعوے کا نقض مدلل ہو، اس کے طعن و اعتراض کا جواب ہو، اس کی مفاخرت کی تردید ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی مفاخرت کسی واقعہ سے مبرہن اور خصم پر طعن باقاعدہ ہو۔ اتنی کثیر رعایتیں اور چند منٹ کی تاخیر پر خصم کا اپنے لاجواب شعر کو بار بار گاتے ہوئے اس پر زبان حال طعن کرنا کہ بس جواب بن نہ پڑا۔ اونٹ چرانے والے ان پڑھ بدوؤں میں یہ ایسا دلکش نظارہ تھا کہ قرنِ اولیٰ کی دشواریاں یاد دلا کر مجسم حیرت بنائے ہوئے تھا۔ آخر وقت ختم ہو گیا اور مفاخرہ آئندہ شب پر ملتوی ہوا کہ فیصلہ کے لئے تیسری شب یعنی وہ رات ہے جو ۱۲ تاریخ گذر کر آئے گی۔ میںؒ نے دیکھا کہ گھنٹہ بھر میں حضرت نے بیٹھنے کا بھی قصد نہیں فرمایا، نہ اجنبیت محضہ سے اکتائے اور نہ اُجڈ بدوؤں کی دھکا پیل سے گھبرائے۔ جب تھک گئے تو فرمایا چلو بھئی اب رات زیادہ ہو گئی اور مخدوم و خادم دونوں اُسی راستے سے قیامگاہ پر واپس آگئے۔

سفر حج میں آپ پیدل چلنے پر سواری کو ترجیح دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہاں کی سواری میں آرام تو رہا ملتا نہیں بلکہ ہچکولوں سے ہڈیاں تک دُکھنے لگتی ہیں۔ اس لئے مالی اور بدنی مشقت مجتمع ہو جاتی ہے جس کے لئے حج کی وضعیت ہوئی ہے۔ اور پیدل چلنے میں نہ مالی شفقت ہے نہ زیادہ بدنی۔ ہاں سواری ساتھ لئے ہوئے کبھی آپ پیدل بھی چلتے بالخصوص مدنی راستہ میں نمازوں کیلئے یا آخری منزل میں دارِ محبوب کے قریب پہنچکر۔

آخری سفر میں مدینہ سے چار میل ورے ایک کوئیں پر قافلہ کو روکا، غسل کیا کپڑے بدلے خوشبو لگائی اور آستانۂ محبوب پر حاضری کے لئے تیار ہو کر اونٹ پر سوار ہوئے۔ چند قدم چلے تھے کہ مولوی سید احمد صاحب نظر آئے

جو استقبال کے لئے یہاں تک آگئے تھے ان کو دیکھتے ہی آپ اونٹ سے اتر لئے اور خاص رفقا نے بھی ساتھ دیا مگر جب دیکھا کہ جگہ دور ہے تو اکثر لوگ تو دوبارہ سوار ہوگئے مگر حضرت نے یہ چار میل نہایت بشاشت کے ساتھ پیدل ہی قطع کئے کہ جو رفیق ساتھ رہ گیا تھا جگہ پر پہنچکر بدحال ہوگیا اور بیٹھ کر اٹھنا مشکل پڑ گیا مگر حضرت نے باوجود زمانہ پیری کے کچھ بھی تکان نہ مانا۔

زکوٰۃ آپ پر بجز آخری چند سال کے کبھی فرض نہیں ہوئی کہ کبھی صاحب نصاب ہی نہیں ہوئے بلکہ مقروض رہتے تھے۔ اور جب کچھ حصہ جائداد وغیرہ کی یکمشت رقم مل جاتی تو حاضری حرمین میں خرچ فرمادیا کرتے تھے یا صدقات میں۔

مرحومہ دختر کے ترکہ میں آپ کو حصہ ملا تو آپ نے سب کا سب مدرسہ میں دیدیا۔ مرحومہ کی کوئی چادر یا استعمال شدہ کوئی اور کپڑا جس کے متعلق داخلہ مدرسہ کے بعد اس کی ماں کو خیال آیا کہ یادگار کے درجہ میں خود رکھ لیتی مگر حضرت نے فرمایا اب تو اللہ کی ملک بن چکا مجھے واپسی کا حق نہیں ہے۔ والدہ نے اپنے بھائی کی معرفت مہتمم صاحب سے کہلوایا تو انھوں نے بھی صاف جواب دیدیا کہ واپسی نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نیلام کرتے وقت قیمت بڑھاؤ اور لے لو۔ بھائی نے کہا بھی کہ نیلام میں جو قیمت قرار دو وہ ہم دیدیں مگر مہتمم صاحب حد سے زیادہ محتاط تھے فرمایا مجھے قیمت کا اندازہ کرنے میں غلطی کرجانا ممکن ہے کہ شاید اس سے زیادہ مل سکے اور مدرسہ کی چیز ہے جس میں مجھے رعایت جائز نہیں۔ ان کو غصہ بھی آیا اور حضرت سے کہا بھی کہ مہتمم بہت ہی بے مروت ہیں مگر حضرت نے فرمایا ان کا منصب یہی ہے اور آخر اس میں کیا حرج ہے کہ نیلام کے وقت تم جاؤ اور لینا ہو تو اجنبیانہ حیثیت سے جس قیمت پر پہنچے بڑھا کر لو۔ چنانچہ نیلام ہوا اور بولیاں بولی گئیں۔ اتفاق کی بات کہ ان کی بولی پر چند پیسے کسی نے بڑھائے تھے کہ یہ سوچتے ہی رہے اور نیلام ایک روپیہ ہوگیا۔ ان کو بہت ہی رنج ہوا مگر حضرت نے وہی جواب دیا جو مہتمم دے چکے تھے کہ اس میں کسی کا کیا قصور، کوتاہی تمہاری تھی کہ جب لینا تھا تو قیمت کیوں نہ بڑھائی، اب خریدار سے نہیں کہا جاسکتا کہ تمہاری بہن کی رعایت میں تم کو دیدے۔

ماہِ رمضان میں حضرت کے معمولات

ماہِ رمضان میں آپ کی تقلیل طعام زیادہ بڑھ جاتی تھی مگر معمولات میں کوئی فرق نہ آتا تھا نہ فتاوے بند ہوتے تھے نہ خطوط کی آمد رکتی تھی نہ زائرین کی ملاقات میں کمی آتی تھی۔ ہاں مدرسہ کی تعطیل رہتی تھی اور درس کا وقت تلاوت کلام اللہ کی نذر ہوجاتا تھا آپ افطار میں تعجیل فرمایا کرتے تھے اور سحور میں تاخیر کہ طلوع فجر کے پندرہ منٹ قبل نوافل معمولہ سے فارغ ہوکر کھانا تناول فرماتے اور پانچ منٹ قبل پہلے گولے کی آواز پر کلی کرلیا کرتے تھے، روزہ

کی حالت میں آپ کے چہرہ یا آواز سے کسی کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ روزہ سے ہیں یا بھوک پیاس کی تکلیف ہے۔
افطار میں آپ تمر مدینہ یا ماء زمزم سے کرتے اور کبھی گھنگی دال وغیرہ کچھ افطاری بھی مکان سے آتی اور سب کو ساتھ بٹھا کر آپ کھاتے تھے۔ مغرب کی نماز کو اتنا مؤخر فرماتے تھے کہ روزہ دار اطمینان سے کچھ کھا پی لیں کہ اس حدیث کا صحیح محمل اور قدر و منزلت سب پر واضح ہوجائے جس میں ارشاد ہے کہ نماز پر کھانے کو مقدم کرو۔
مختصر افطار[1] کے بعد آپ باجماعت فرض پڑھتے اور پھر اس تطویل کے ساتھ صلوٰۃ الاوابین جس کے آپ عادی تھے باطمینان فارغ ہوکر مختصر سا کھانا کھاتے اور پھر وضو فرما کر عطر وغیرہ لگا کر تراویح کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔ رمضان کے لئے جانماز بھی عمدہ نکالی جاتی تھی اور خوشبو کا بھی اکثر زیادہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔

ختمِ قرآن کا اہتمام ختمِ قرآن کا بڑا اہتمام تھا مگر یا خود پڑھتے یا صحیح پڑھنے والے خوش الحان کا سنتے اور لیالی قدر میں اور راتوں سے زیادہ جاگتے تھے۔ ایک سال ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹ کی پانچ راتوں میں آپ نے مولانا محمد یحیٰی صاحب کا پورا قرآن تہجد کی نفلوں میں سنا مگر جماعت میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ ہوتے تھے کہ مکروہ ہے۔ اور جماعت شروع ہونے سے پہلے دو[2] دو رکعتیں ہلکی پڑھ لیا کرتے تھے۔

اعتکاف کا اہتمام عشرہ اخیرہ میں اعتکاف کا آپ کو بڑا اہتمام تھا کہ بجز آخری ایک دو سال کے جس میں آپ پر ضعف کا زیادہ غلبہ تھا کبھی آپ کا اعتکاف نہیں چھوٹا۔
معمولات کے متعلق جو آپ کی سادہ اور دائمی ایک عادت تھی بس وہ ایک عجیب چیز تھی کہ نہ رمضان میں بدلتی تھی نہ شوال میں۔ کسی خاص یوم یا مہینے میں کوئی خاص اضافہ ممکن نہ تھا مگر دائمی حالت میں ترمیم مفقود کہ نہ اس میں کوئی شے کم ہوتی تھی نہ وقت بدلتا تھا۔ ضرورت ہوتی تو آپ رمضان میں بھی سفر کیا کرتے مگر حافظ کو ضرور ساتھ لے جاتے تھے کہ تراویح یا تہجد خود پڑھیں تو وہ سامع بنیں ورنہ ان کو امام بنا کر سنیں کہ ختمِ قرآن یا اس کی ترتیب میں فرق نہ آوے۔
شیخ رشید احمد صاحب سے آپ کو بہت محبت تھی ان کے بچوں کے ختمِ قرآن کی خوشی میں آپ تشریف لائے۔ اپنی تراویح تو علیحدہ پڑھیں مگر ختم کے وقت مسجد میں تشریف لا کر بیٹھ گئے۔ اپنے خدام کی خوشی اور غمی میں شریک ہونے کا آپ کو زیادہ اہتمام تھا اور اس لئے ولادت عقیقہ بسم اللہ نکاح دکان بنیاد مکان ختمِ قرآن وغیرہ کی جس خوشی میں آپ بلائے جاتے تو شرکت فرماتے اور کوئی معصیت دیکھتے تو روکتے ورنہ خندہ روئی کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔

ایک شادی کی تقریب میں حلال وحرام کا خاص خیال

آپ کسی تقریب نکاح میں میرٹھ صدر تشریف لائے۔ لڑکے والے نے درخواست کی کہ تبرکاً دولھا کو کپڑے حضرت پہنادیں۔ آپ وہاں تشریف لے گئے جہاں دولھا غسل کے بعد کپڑے پہننے کا منتظر کھڑا تھا، بندہ بھی ساتھ تھا۔ کرتہ پاجامہ تو آپ نے اٹھاکر دیدیا۔ اچکن کا نمبر آیا تو آپ نے کہا دیکھنا کیا ریشم کی ہے؟ میں نے غور سے دیکھ کر عرض کیا کہ جی حضرت ریشم ہی معلوم ہوتا ہے آپ نے اس کو رکھدیا اور فرمایا اس کا پہننا اور پہنانا حرام ہے۔ پھر ٹوپی دیکھی تو وہ بھی مغرق[1]۔ اس پر حضرت نے تیز لہجہ میں فرمایا یہ بھی حرام۔ لڑکے والے کچھ محتاط نہ تھے انھوں نے حضرت کے انکار کی پرواہ نہ کی اور خود اٹھاکر دولھا کو پہنادیا۔ حضرت کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا مگر تحمل فرمایا اور مجھ سے یہ کہہ کر "چلو" وہاں سے واپس ہوگئے۔

آپ قیامگاہ پر بھی نہ آئے اور رنج وافسوس میں بھرے ہوئے حاجی وجیہ الدین صاحب کے مکان پر آبیٹھے فرمایا یہ کیا تعلق ہے کہ معصیت میں شریک کرنے کو بلاتے ہیں۔ اس نکاح میں شریک ہونے والے سب گنہگار ہوں گے جہاں دولھا حرام لباس پہنے بیٹھا ہو کوئی عامل ہے اور کوئی اس پر راضی۔ یہ سنکر سب میں ہل چل مچ گئی کہ برادری کا قصہ تھا اور حضرت کے ساتھ کئی لوگوں کو تعلق تھا کہ نہ حضرت کو چھوڑ سکیں نہ برادری کو دوڑے ہوئے گئے کہ کسی طرح دولھا کے کپڑے بدلوادیں مگر بہتیرے تھے جن کو نہ حضرت سے تعلق تھا نہ اتباع شریعت کا اہتمام اس لئے وہ تبدیل لباس کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے اور کہتے تھے کہ جو دُلہن کے ہاں سے جوڑا آیا ہے وہی پہننا ضروری ہے۔ مگر یہ دوڑ دھوپ کرنے والے سربرآوردہ اور مدبر تھے آخر کامیاب ہوئے اور حاجی وجیہ الدین صاحب مصری کپڑے کی بیش قیمت اپنی اچکن نکال کر جلدی سے پہنچے کہ اس سے بہتر تو دولھا کو یہ جوڑا کیا ہندوستان میں بھی کہیں نصیب نہ ہوگا۔ وہ پہناکر اور ٹوپی کے بجائے عمامہ بندھواکر حضرتؒ کے سامنے لے آئے کہ حضرت اب تو تشریف لے چلیں، اس وقت آپ اٹھے اور شریک عقد ہوئے۔

ایک اور تقریب دہلی میں

ایسا ہی ایک قصہ دہلی میں پیش آیا کہ بندہ اس وقت بھی ساتھ تھا اور گو عقد کی شرکت میں مدعو ہوکر حضرت نہیں گئے تھے مگر قیام دہلی میں اس عقد کا اتفاق ہوا اور دولھا کے اعزہ نے شرکت پر اصرار کیا۔ وہی دولھا کے کپڑے پہننے کا وقت آیا تو حضرت کو بلایا گیا اور حضرت نے ریشمی لباس دیکھ کر اس کو جھٹک جھٹک دیا۔ یہاں اتنا اضافہ اور ہوا کہ حضرت نے جب کپڑا جھٹک دیا تو فوراً دوسرے نے کھڑے ہوکر پہنادیا۔ حضرت وہاں سے اُٹھ کر حکیم جمیل الدین صاحب کے مطب میں آبیٹھے اور مجھ سے فرمایا کہ تانگہ لاؤ کہ چلیں اسٹیشن پہ یہاں صرف چند ہی تھے جو قوم اور شریعت کے

[1] زری کے کام سے بالکل غرق کہ کپڑا نظر نہیں آتا تھا ایسی جائز نہیں اگر زری سچی یعنی سونا یا چاندی ہو۔

مقابلہ کے امتحان میں پختہ اترے کہ وہ برادری کو چھوڑ کر حضرت کے پاس آبیٹھے ورنہ اکثر دیندار صورتوں نے کوشش ضرور کی کہ کپڑے تبدیل ہوجاویں مگر فریق ثانی کا پلہ بھاری تھا اور حضرت پر طعن وتشنیع ہونے لگا تو وہ بھی چپ ہوگئے، آخر دولہا کے ساتھ ہولئے۔ اللہ جزائے خیر دے حاج اسمٰعیل پٹنہ والوں کو کہ ایسا باہمت عالی حوصلہ شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہرچند کہ ان کے قریبی رشتہ دار کا قصہ تھا مگر ذرہ برابر پروانہ کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسی ادب وانبساط کے ساتھ حضرت کے پاس بیٹھے حضرت کا دل بہلا رہے تھے گویا کوئی قصہ ہی نہیں ہوا۔ حضرت نے کمال تاسف کے ساتھ فرمایا ہم لوگ اسی لئے امراء کی تقریبات میں شرکت کے قابل نہیں ہیں۔ وہ لوگ اپنی رسومات میں اتنے پختہ کہ حلال حرام کا لحاظ نہ کریں اور ہم شریعت پر پختہ ہو کر ان کی خوشی وناراضی کی پروانہ کریں تو ہم کو طعن کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ہم دعوتوں کے بھوکے نہیں اور نہ کسی کی تقریب میں شرکت کی امنگ۔ دلداری کو بھی جی چاہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ معصیت کے مرتکب ہوں جس کا دل چاہے ہم کو چھوڑ دے مگر ہم سے توقع نہ رکھے کہ خدا اور رسول کو چھوڑ کر ان سے ملاپ کی خواہش رکھیں گے۔"

حاجی اسمٰعیل صاحب اپنی عادت کے موافق مُسکراتے اور عرض کرتے تھے کہ حضرت بالکل صحیح ہے اور یہ نئی پود تو ایسی آزاد اٹھی ہے کہ قوم کے بڑوں کا بھی ان کو لحاظ نہیں رہا جہاں شریعت کا احترام گیا وضعداری کا بھی نام جاتا رہا۔ ان سے کوئی درخواست ہی کرنا حماقت ہے"۔ میں تانگہ لینے اٹھا تو حاجی صاحب نے فرمایا سواری موجود ہے حضرت اس میں جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا نہیں آپ کو تکلیف ہوگی۔ عرض کیا کہ حضرت میرا گھر تو اسٹیشن کے راستہ میں ہے میں ساتھ چل کر وہاں اتر لوں گا اور حضرت اسٹیشن پر چلے جائیں گے چنانچہ ریل کا وقت جب قریب آگیا تو حاجی اسمٰعیل صاحب حضرت کو اور مجھے لیکر اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور خود مکان کے قریب سڑک پر اُتر کو چبان سے کہا اسٹیشن پر لے جاؤ۔

حضرت کی یہ شرکت ودلداری اکثر جگہ بہتیری خرافات کی اصلاح کا سبب بن گئی اور جہاں ضد ہوئی وہاں اقل درجہ[1] تبلیغ اور امر بالمعروف کے ساتھ اس کی تعلیم ضرور ہوگئی کہ دیندار کو کس پختگی واستقلال کا برتاؤ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مستحب معاشرت ودلداری کونسی چیز ہے جس پر اجر کی توقع ہو اور مداہنت[2] وکمزوری سے ممتاز ہے۔

معاشرتی تقریبات کے متعلق حضرت کا حکیمانہ طرز عمل

خوشی کے مواقع پر مٹھائی وغیرہ کی تقسیم یا احباب واعزہ کے جمع کرنے کو آپ منع نہ فرماتے اور سرور کی ان صورتوں پر آپ کو تشدد نہ تھا۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ جس بات کو دین سمجھ کر کیا جائے

[1] کم از کم درجہ۔ [2] چکنا پن یعنی گناہ کو دیکھ کر خاموشی۔

حالانکہ وہ دین نہیں اس کا نام بدعت ہے اور اس پر تشدد ضروری ہے۔ مگر جن باتوں کو دنیا ہی سمجھ کر کیا جاتا ہے ان کو بدعت کا درجہ دینا فرق مراتب سے غفلت ہے۔

نیز فرمایا کرتے کہ شرعی گنجائش پر عمل کرکے ملا جلا رہنا صلۂ رحمی کو بھی قائم رکھتا ہے اور اکثر اصلاح کا بھی سبب بن جاتا ہے ورنہ اس زمانہ میں آزادی ایسی آگئی کہ ہم علیحدہ ہوکر بیٹھیں تو دوسروں کو پرواہ بھی نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے تم روٹھے ہم چھوٹے۔ اور اس طرح معاصی میں اور زیادہ ڈوبیں گے۔

اور فرمایا کرتے کہ پہلے زمانہ میں عوام محتاج تھے اور نائبین رسالت محتاج الیہ کہ جتنا بھی ان پر تشدد ہوتا وہ اس کا اثر لیتے پریشان ہوتے اور توبہ ورجوع کیا کرتے تھے۔ مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ خود طالب بن کر لگے لپٹے رہو اور کچھ کام اصلاح کا نکال لو تو نکال لو ورنہ عوام کو اصلاح کی پروا تو کیا حس بھی نہیں ہے۔ پس اصلاح امت کے لئے اللہ و رسول کی خوشی کی خاطر سب ہی رنگ بدلنے پڑیں گے کہ "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر"[1] ہاں معصیت کا ارتکاب کسی حال جائز نہیں۔

اور فرمایا کرتے کہ پہلا سا رنگ اختیار کرے تو آج کوئی پاس بھی نہ پھٹکے۔ اس لئے ہمارے حضرت نے رسمی امور میں کبھی تشدد نہیں برتا۔ ذرا بھی کسی میں طلب پائی تو اپنے سے چمٹائے رکھنے کی کوشش فرمائی۔ ہاں اپنے امور میں کسی خاص صورت کے پابند نہ تھے موقع ہوا خرچ بھی کیا دعوت بھی دی زیورات اور کپڑے بھی دیئے اور اگر نہ ہوا تو سادہ طریق پر نکاح کردیا۔ خدام آپ کی اس سادگی کا نظارہ کرتے اور اس اصل کو سمجھ لیا کرتے تھے کہ انسان دنیا میں اپنے اللہ کی طاعت کے لئے آیا ہے اور یہی ایک شے ہے جو ہر طرح مواظبت واہتمام و پابندی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ باقی دنیا محض اس لئے ہے کہ بقاء جسم اور حصول انبساط کا آلہ بن کر طاعت کی ماندگی وکسل کو کھودے۔ اس کا کوئی جز بھی اہتمام کے قابل نہیں جیسا وقت پائے گزرے اور مزاح وخوش طبعی کے درجہ میں کوئی خوشی بھی منالے تو مضائقہ نہیں مگر طاعت کا معمول ترک نہ ہو اور قلب کا سکون جس پر حلاوت ولذت دینی کا مدار ہے جانے نہ پائے کہ آلہ آلہ بنا رہے اور مقصود مقصود۔

مولوی ظفر احمد کا نکاح

مولوی ظفر احمد صاحب کا نکاح ہوا تو آپ نے فرمایا مولوی ظفر تمہارے گھر سے تو شاید ہم کو نہ بلایا جائے گا کہ کسی کو بھی نہیں بلایا گیا مگر ہم ولیمہ کے دن خود ہی آئیں گے۔ چنانچہ جمعہ کو نکاح ہوا اور شنبہ کو حضرت خود ہی تھانہ بھون پہنچ گئے۔ یہاں ولیمہ بھی نہ تھا کہ دینی مصالح[2] کی بنا پر حضرت مولانا تھانوی کا رنگ ان امور میں بھی تشدد کا ہے جیسا کہ ہمیشہ اکابر میں

---

[1] عاشقی میں اور دوسرے بہت غموں کے ساتھ ایک یہ بھی ہی۔ [2] کہ ان رسموں میں نرمی برتنا ہمیشہ جاری رہنے کا سبب ہوجاتا کہ جس قدر سختی سے روک سکیں بالکل بند کردیں اور آج کل ولیمہ بطور سنت نہیں نام ونمود کی رسم بن گئی ہے۔

رنگ کا اختلاف رہا ہے۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا میاں ولیمہ تو سنت تھا یہ بھی نہ ہوا۔ عرض کیا حضرت ولیمہ بھی آجکل سنت کے موافق نہیں ہوتا اس لئے عملاً ظاہر کیا ہے کبھی ضروری نہیں ہے۔ ہاں خوشی کے طور پر مٹھائی تقسیم ہوئی تھی وہ حضرت کے لئے خاص اہتمام سے الگ لایا ہوں۔ مولوی ظفر احمد صاحب شادی کے لئے جب سہارنپور سے چلنے لگے تو حضرت نے ان کو ایک صدری عطا فرمائی جو ان کے شادی کے لباس سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔

ابراہیم خاں کے نکاح میں شرکت کیلئے ٹونک کا سفر

مولوی ابراہیم خاں نے آپ کو اپنے نکاح کی شرکت کے لئے ٹونک بلایا تو آپ تشریف لے گئے۔ وہاں رسم ہے کہ جب دولھا نکاح کے لئے دلہن کے گھر جاتا ہے تو دولہن والے ساری بارات کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جب تک منھ مانگا حق نہ دوگے جانے سکوگے۔ چنانچہ حضرت بھی روک لئے گئے۔ بندہ ساتھ تھا مسکرا کر فرمایا بھئی یہ مہمانوں کی اچھی قدر ہے کہ دو تو رہائی ملے ورنہ قید۔ ایک بوڑھے بزرگ عالم بھی ساتھ تھے وہ آگے بڑھے اور دلہن والوں سے کہا حضرت کو تو چھوڑ دو اور تم دونوں فریق نمٹتے رہو۔ چنانچہ حضرت اور بندہ نورہائی پاکر مکان پر آبیٹھے اور دولہا بیچارہ گھنٹہ بھر بعد پہنچا۔

یہ واہیات باتیں حضرت کو ناگوار ضرور گذرتی تھیں مگر ہنس کر ٹال دیتے اور ان کا خرافات ہونا ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔

حاج احمد حسن صاحب کی دعوت پر آپ انبالہ گئے اور لڑکے ولڑکی کا نکاح جو بہت ہی سادہ ہوا تھا خود پڑھایا۔ اسی طرح آپ دوستوں کی غمی میں شرکت فرماتے اور صرف تحریر پر اکتفا نہ کرتے بلکہ جلد از جلد تشریف لانے کا اہتمام فرماتے کہ اس سے مصدوم کو تسلی بھی زیادہ ہوتی تھی اور اس کو حضرت سے تعلق بڑھ جاتا تھا جس کی وجہ سے تدریجاً رسومات میں بہت کچھ اصلاح ہو جاتی تھی۔

میری اہلیہ کا جس زمانہ میں انتقال ہوا تھا تو وبا پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت خود علیل تھے اور جگہ جگہ سے اعزہ واحباب کی وفات کی اطلاعیں آرہی تھیں۔ آپ فوراً تشریف نہ لاسکے مگر آپ کا یہ والا نامہ آیا

گرامی نامہ مکرم ومحترم مدفیوضکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج فجر منشی حمید الدین کی زبانی اطلاع حادثہ انتقال والدہ محمود الٰہی مرحومہ معلوم ہو کر موجب کلفت ہوئی۔ اس کے بعد ڈاک میں آپ کا خط پہنچا اور جس قدر خطوط ڈاک میں پہنچے کوئی بھی ایسا خط نہیں تھا جس میں کسی عزیز یا دوست کے حادثہ کی اطلاع نہ ہو۔ خطوط پڑھ کر طبیعت اس قدر بے حس ہو گئی کہ کچھ صدمہ کا بھی احساس نہ رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری حالت یہ ہے کہ ہر وقت بخار کی حرارت رہتی ہے جس کی وجہ سے

چلنا پھرنا کیا اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہے ورنہ کیا ممکن تھا کہ میرٹھ نہ آتا۔ اب سب کچھ سن رہا ہوں اور افسوس کہ ہل نہیں سکتا۔ بچوں کو سخت صدمہ ہوگا۔ ابھی آپ تشریف آوری میں جلدی نہ کریں اور سب عزیزوں کو دعوات سلام فرماویں۔ والسلام۔

فراست وذکاوت آپ کی بے نظیر تھی۔ خدام اپنے تجارتی صنعتی معاملات اور طرح طرح کے مقدمات میں آپ سے مشورہ لیتے تو آپ یہ لکھ کر کہ بندہ ان معاملات میں کیا مشورہ دے جن سے مناسبت وواقفیت نہیں ان کی تسلی کے لئے تحریر فرما دیتے کہ میرے خیال میں یوں کرلو۔ بارہا تجربہ ہوا کہ حضرت کی رائے ہمیشہ صائب ہوئی اور انجام کار اسی میں فلاح ومنفعت نکلی کہ اچھے اچھے تجربہ کار وعقلا حیران ہوگئے۔ یادداشت آپ کی اتنی قوی تھی کہ پچیس پچیس سال قبل صرف ایک مرتبہ ملاقات کرنے والے کو صورت دیکھتے ہی فوراً آپ نے پہچان لیا۔ ایک بار بندہ حاضر تھا کہ ایک عرب آئے آپ ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور بغلگیر ہو کر ملے۔ پھر تعجب کے ساتھ مجھ سے فرمایا مولوی عاشق الٰہی پہچانا بھی؟ میں نے ان کو بغور دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے نہیں پہچانا۔ فرمایا بھائی فلانے ہیں جو ۲۳ھ کے سفر حج میں فلاں جگہ ہم سے ملے تھے۔ وہ خود بھی حیران ہوگئے اور عرض کیا حضرت آپ نے خوب پہچانا حالانکہ اسوقت کی سرسری ملاقات کے بعد آج پچیس برس میں ملنا ہوا ہے۔ فرمایا ہاں بھئی بعض کو ایک دفعہ دیکھ لیا تو عمر بھر نہیں بھولا اور بعض کو بیس مرتبہ دیکھتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں۔

مزاح خدام کے ساتھ آپ بہت بے تکلف رہتے اُن کو ہنساتے قصّے سناتے خوشدل بناتے اور کبھی کبھی مزاح بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار فرمانے لگے ہمارے ایک چچا تھے بڑے زندہ دل اور مسخرے۔ زمین کے متعلق اپنے رشتہ داروں سے مقدمہ تھا۔ عدالت سہارنپور میں مقدمہ ان کے حق میں فیصل ہوگیا کچہری سے باہر نکلے تو ایک شخص جو فریق ثانی کا خیر خواہ تھا انہیں جاتا ہوا ملا اس نے دریافت کیا میر جی آج مقدمہ میں کیا ہوا؟ سوکھا سا منھ بنا کر کہا میاں ہمارے گھر جا کر کہدیجو کہ جو اللہ کی مرضی تھی وہ ہوگیا صبر کریں۔ وہ سمجھا کہ یہ مقدمہ ہار گئے۔ دل میں بہت خوش ہوا انہیں پہنچ کر ان کے ہاں پیام پہنچا دیا کہ مقدمہ ہار گئے اور فریق ثانی کے ہاں جا کر مبارکباد دیدی۔ ان کے ہاں تو رونا پیٹنا شروع ہوگیا اور فریق مخالف نے اگلے دن دعوت کا سامان کرکے دیگیں چڑھوا دیں۔ ہارے ہوئے فریق جو گھر پہنچے تو دیگیں دیکھ کر حیران۔ لوگ آآکر مبارکباد دیتے تھے اور یہ ان کو گالیاں دیتے تھے۔ اور ہمارے چچا کھڑے ہنستے تھے۔

ایک دعوت میں حضرت کے ہمراہ بعض مخلصین کھانا کھا رہے تھے۔ ایک صاحب تبرک کے زیادہ شوقین تھے کہ جہاں حضرت نے ایک تشتری میں سے ذرا سا کھا کر دوسری تشتری کی جانب توجہ کی انھوں نے

حضرت کے سامنے سے جھٹ تشتری اٹھا خود کھانا شروع کر دیا اور کہا حضرت کا تبرک"۔ اس طرح زردہ پلاؤ قیرنی کئی تشتریوں پر انھوں نے ہاتھ صاف کیا۔ آخر میں حضرت نے دال کی تشتری بھی انھیں کے آگے سرکا دی اور فرمایا لو دال کا تبرک بھی تو کھاؤ۔

مولوی ظفر احمد صاحب کے لڑکا تولد ہوا تو حضرت نے فرمایا مولوی ظفر ہم نے تمہارے بچہ کا تاریخی نام سوچا ہے مرغوب[1] احمد، مگر حساب کر کے تم خود دیکھ لو کتنے عدد ہوتے ہیں۔ انھوں نے حساب لگایا اور عرض کیا حضرت آٹھ عدد زیادہ ہیں۔ بیساختہ فرمایا بس ب اور و کو حذف کر دو مرغ محمد تاریخی نام ہے۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے تو فرمایا میاں کلب علی سے تو مرغ محمد بہر حال اچھا ہے۔

شعر تصنیف کرنے کی یا پڑھنے کی[2] آپ کو عادت نہیں تھی حالانکہ ادب میں آپ کو مہارت کاملہ تھی کہ صدہا اشعار عربی کے آپ کو یاد تھے۔ ایک بار عمرہ لانے کے لئے آپ پیدل مسجد تنعیم تشریف لے گئے اور مجھے ساتھ لیا۔ راستہ میں آپ نے بیسیوں اشعار حماسہ اور متنبی کے سنائے اور ادبیت و فصاحتِ عرب کا کمال بیان فرماتے چلے گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ یوں کبھی حضرت کو شعر پڑھتے نہیں سنا مگر اشعار حضرت کو خوب یاد ہیں۔

نحوی اور بدوی عربی زبان پر قدرت

عربی بولنے پر حضرت کو پوری قدرت تھی اور کمال تھا کہ علماء و اشراف سے نحوی عربی بولتے تھے اور بدوؤں سے بدوانی۔

آپ کو کسی تعب کے بعد بدن دبوانے کی عادت تھی اور وہ بھی زور و قوت کے ساتھ کہ جو شخص دبانا جانتا تھا بس وہی دبا سکتا تھا ورنہ بجائے راحت کے تکلیف ہوتی تھی۔ ایک بار بندہ نے بدن دبانا شروع کیا فرمایا بھئی تمہیں بدن دبانا نہیں آتا رہنے دو۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے معلوم ہو کہ بدن دبانا نہیں آتا مگر برکت کے لئے ہاتھ مس کرنے کو اور اس زمرہ میں شامل ہونے کو دل چاہتا ہے۔ فرمانے لگے ایک ملا تھے اپنے شاگردوں سے بدن دبوانے کے بڑے عادی تھے، وہ حج کو گئے اور جب واپس آئے تو خادموں نے پوچھا حضرت ہمیں یاد بھی رکھا تھا؟ فرمایا ہاں تمہیں تو کسی وقت بھی نہیں بھولا۔ عرض کیا حضرت ہمارے لئے دعا بھی فرمائی؟ کہا ہاں دعا بھی کرتا تھا اور کوستا بھی تھا۔ عرض کیا حضرت یہ کیوں؟ فرمایا جب بدن میں درد ہوتا اور کوئی دبانے والا نہ ملتا تو کوستا تھا کہ نہ تم عادی بناتے نہ یہ تکلیف ہوتی۔

---

[1] یہ لفظ مرغوب محمد ہوگا کسی کی غلطی سے مرغوب احمد بن گیا ہے کیونکہ اسی میں ب و حذف کرکے مرغ محمد بنتا ہے اور اسی کے عدد ۱۳۴۰ یعنی ۱۳۳۲ سے ۸ زائد رہتے ہیں۔ [2] مگر قدرت تھی کہنے کی بھی اور اصلاح کی بھی [illegible] بذل المجہود کی تالیف کے زمانہ میں کچھ عرصہ لکھنے کا کام کیا ہے تو ایک قصیدہ تاریخیہ لکھا وہ کتاب میں تھا شیخ الحدیث مولانا زکریا کے سفر جانے سے واپسی تک ہوتا تھا جب دوسری دفعہ حاضری ہوئی کام کیا تو اس قصیدہ پر جگہ جگہ حضرت کی اصلاح تھی رعشہ والا خط تھا مگر میں نے طبع کے ناقابل قرار دیکر پیش نہیں کیا تھا۔

مزاج میں نفاست آپ اسپرٹ آمیز چیزوں سے وحشت کھاتے تھے۔ جب آپ کے دانت گر گئے اور تلاوت و درس میں صحیح الفاظ نکلنے دشوار ہو گئے تو آپ نے مصنوعی دانت بنوائے سانچہ دہن کا لینے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ یہ اسپرٹ سے پکایا گیا ہے۔ تو آپ نے نفرت ظاہر فرمائی اور پانی منگا کر کلیاں کیں۔ آپ آپ بہت کم کھاتے تھے اور وہ بھی نہایت کم چونہ کا۔ ہاں الائچی آپ کو زیادہ مرغوب تھی کہ بعض دفعہ چھالیا کی جگہ اس کے دانے استعمال فرماتے اور جب خطبۂ نکاح پڑھتے یا کسی کو بیعت کرتے تو کلّی ضرور کر لیا کرتے۔ پان کھائے ہوئے ذکر اللہ آپ کو پسند نہ تھا۔ طبیعت آپ کی اس درجہ لطیف تھی کہ تمباکو کھانے والوں سے بات کرنا آپ کو مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ دہن سے نکلنے والی بو برداشت نہ کر سکتے تھے اور زبان سے بھی کچھ نہ فرما سکتے تھے۔

قیلولہ کا بھی آپ کو زیادہ اہتمام تھا کہ اس سے شب کے جاگنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

امانت کی حفاظت آپ کی مشہور تھی کہ بجنسہ پوٹلی یا پوڑیہ میں باندھ کر مالک کا نام اس پر لکھ دیتے اور کہیں سفر میں مدرسہ کے لئے کچھ ملتا تو جلد از جلد اس کو مدرسہ میں داخل فرما دیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ کو کسی نے ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے تو بحمد اللہ ضرورت نہیں ہاں مدرسہ کو بیشک ضرورت ہے۔ عرض کیا بہتر مدرسہ میں دیدیجئے۔ مجلس سے اٹھتے ہی آپ اول مولوی سید احمد صاحب کے پاس آئے اور رقم عطا فرما کر کہا اس کو جمع کر لو۔

وعظ و تقریر کرنے کی آپ کو عادت نہ تھی۔ میں نے آپ کا صرف ایک وعظ سنا ہے جو سردھنہ میں خدام کے اصرار پر گھنٹہ بھر ہوا تھا۔ ہر امر میں اتباع سنت آپ کی عادت تھی کہ کسی وقت بھی ذہول نہ ہوتا تھا۔ مدرسہ کی ایک ضرورت کے لئے آپ نے بندہ کے ساتھ ایک بار مولوی یحیٰی صاحب سہسرامی کو کلکتہ بھیجا تو میرے نام تحریر فرمایا۔

مکتوب گرامی السلام علیکم قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا۔ فقط والسلام خلیل احمد عفی عنہ

کاندھلہ میں کسی خادم نے اپنے باغ کے درخت کا پہلا پھل آپ کو پیش کیا تو آپ نے حدیث کی دعا پڑھی اور چھوٹا بچہ سامنے کھڑا دیکھا اس کو عطا فرما دیا۔ آپ کی نواسی کی عمر تین سال کی تھی گھٹنیوں

ؔ تمباکو کھانے میں کراہت ہے اگر اس کو مسواک اور خوشبو سے زائل کر لیا جائے تو نہ رہے گی اور حقہ وسگرٹ میں دوسری دھواں کھانے سے دوزخ والوں سے مشابہت کی کراہت ہے وہ کسی طرح زائل ہی نہیں ہو سکتی اور عذر میں معاف ہے۔

ؔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آسانی کیا کرو تنگی نہ کیا کرو خوشخبری دیا کرو نفرت نہ دلایا کرو اور ایک دوسرے کی تابعداری کیا کرو اختلاف نہ کیا کرو۔

چلتی تھی۔ کسی نے گھر میں سے لاکر اس کو مدرسہ میں فرش پر بٹھا دیا اور وہ گرتی پڑتی لڑھکتی آپ کی طرف چلی۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھایا اور گود میں بٹھا کر خوب پیار کیا پھر گود میں لئے اس کو مکان لے گئے۔

شب کو سرمہ آپ اہتمام سے لگاتے اور ہر آنکھ میں تین تین سلائی یک رخی استعمال فرماتے تھے۔

حجرہ میں آپ کے بخور[1] روشن کی جاتی اور کواڑ بند کر دیئے جاتے تھے۔ یہ آپ کو عطر سے زیادہ پسند تھی کہ کئی کئی دن حجرہ مہکتا رہتا تھا۔

بچوں کو آپ بے تکلف گود میں بٹھاتے اور وہ پیشاب کر دیتے تو غصہ نہ ہوتے تھے۔ رحمتی آپ کی خادمہ گھر میں روٹی پکاتی تھی۔ اس کا شیرخوار بچہ روتا تو آپ اس کو پاس بٹھا لیتے۔ وہ روٹی پکانے میں رہتی اور آپ بچہ کو بہلایا کرتے۔ گھر والے کہتے بھی کہ پیشاب کر دے گا فرماتے کیا حرج ہے دھو ڈالیں گے۔

ایک بار آپ مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے اور بچہ کو پاس بٹھا رکھا تھا کہ اس نے پیشاب کیا اور کپڑوں کے ساتھ مصلے پر بھی چھینٹیں پڑیں۔ کسی نے بچہ کو دھمکایا اور تیزی سے کہا بھلا اب قالین کا مصلے کیسے دھلے گا۔ آپ کو یہ غصہ گراں گزرا اور فرمایا بچہ کیا جانے کہ مصلے ہے یا ٹاٹ۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو میں خود دھو لوں گا۔

کھانے کے اول کوئی ہاتھ نہ دھوتا اور کہتا کہ میرے ہاتھ پاک یا دھلے ہوئے ہیں یا ابھی وضو کر کے آیا ہوں تو فرماتے یہ تو کھانے کی سنت ہے۔ طہارت یا نظافت[2] کے لئے نہیں ہے مسلمان جب کھانا کھاوے تو بہ نیت ادائے سنت اول بھی ہاتھ دھووے اور بعد میں بھی۔

اسی طرح پانی یا چاء کوئی بائیں ہاتھ سے پیتا تو آپ کو بہت گراں گزرتا اور وہ عذر کرتا کہ حضرت داہنا ہاتھ کھانے میں ملوث تھا تو اور زیادہ خفا ہوتے کہ عذر گناہ بدتر از گناہ وہی کھا رہے ہیں اور اسی کا گلاس کو لگنا عیب سمجھتے اور گھناتے ہیں۔

دسترخوان آپ کا چمڑہ کا تھا یا مدنی گول چٹائی کا جس کو سفرہ کہتے ہیں اور اسی پر کھانا آپ کو مرغوب تھا سیب انگور خوبانی یا اور کوئی پھل کوئٹہ وغیرہ کی طرف سے آتا تو آپ دوستوں کا انتظار دیکھتے اور باہر سے مخلصین آتے تو باہتمام گھر سے لاکر ان کے سامنے رکھتے۔ کبھی خود چھیلتے اور تراش کر دوستوں کو دیتے اور بمحبت و پیار و اصرار کے ساتھ کھلاتے۔

ہمیشہ سوتے وقت چراغ گل کر دیتے[3] اور دیا سلائی کا بکس سرہانے رکھتے تھے۔ مٹی کے تیل کی بو ناگوار تھی اس لئے صرف راستے میں آتے جاتے اس سے کام لیتے اور آخر شب میں موم کی بتی روشن فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] خوشبو آگ میں جلائی جاتی ہے۔ [2] پاکیزگی۔ اس سنت سے بہت لوگ غفلت کرتے ہیں۔ [3] حدیث میں بھی گل کرنے کو فرمایا ہے ورنہ خطرات ہیں بجلی میں بھی یہی چاہئے۔

سفر میں استنجے کے ڈھیلے اور ٹین کا ہلکا سفری لوٹا ضرور ساتھ ہوتا تھا اور نا واقف کو لوٹا دینا آپ کو ناپسند تھا۔

ایک دفعہ ریل کے سفر میں آپ وضو کر رہے تھے کہ کسی نے لوٹا مانگا۔ آپ نے فرمایا میں آپ کو کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے لوٹا تپائی کے نیچے رکھدیا اور نماز کی نیت باندھلی۔ وہ تاک میں تھے اور جب دیکھا کہ نماز شروع کر دی تو تپائی کے نیچے سے لوٹا اٹھایا۔ آپ نے نیت توڑ[1] ان کا ہاتھ پکڑلیا کہ یہ کیا بے عنوانی ہے؟ وہ بولے واہ واہ ذرا لوٹا دینے میں اتنا بخل کہ نماز توڑدی۔ فرمایا نماز تو ٹوٹنے کے بعد پھر جڑ جائے گی مگر لوٹا جانے کے بعد آنا مشکل ہے اور اس کے بغیر سارے سفر میں مجھے جو تکلیف ہوگی وہ مجھی کو بھگتنا پڑے گی۔ بخل کا طعن سننا منظور مگر وضو نماز کی تکلیف منظور نہیں آخر کھسیاتے ہو کر بڑبڑاتے چلے گئے اور آپ نے پھر نماز کی نیت باندھلی۔

ملاقات میں اکثر آپ معانقہ فرمایا کرتے اور مسکراتے ہوئے اٹھ کر آنے والے کو چھاتی سے چمٹا لیتے تھے سلام میں ابتدا اکثر آپ کی طرف سے ہوتی اور کوئی اُس کا جواب آہستہ سے دیتا کہ آپ نہ سنتے تو ناراض ہوتے . . . . . اور فرماتے کہ سلام کا جواب دینا واجب[2] ہے۔ ایسا تو ہو کہ دوسرا سُن لے[3]۔ کوئی بچہ سلام کر کے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھدیتے اور دعا دیتے بارک اللہ وعمرک اللہ واصلحک اللہ[4]۔

گھر میں تشریف لے جاتے تو اس خیال سے کہ شاید کوئی اجنبی عورت[5] ہو دروازہ پر کھڑے ہو کر فرماتے میں آؤں، اور جب پردہ ہو جاتا تو السلام علیکم کہتے ہوئے اپنے کوٹھے میں تشریف لے جاتے۔ عورتوں میں اس مسنون سلام کا رواج بہت کم ہے اس لئے آپ اس کی اصلاح فرماتے اور کہتے کہ کسی نے ہمارے سلام کا جواب نہ دیا؟ ایک نے کہا کہ شرم آتی ہے فرمایا دین میں کیا شرم۔ یہ تو ضعفِ[6] ایمان ہے اس کا نام شرم کس نے رکھا۔ چنانچہ رواج چل نکلا اور عورتیں بھی وعلیکم السلام سے جواب دینے لگیں۔

ایک مرتبہ آپ سلام کرتے ہوئے گھر میں تشریف لائے تو عورتوں نے بجائے وعلیکم السلام کے السلام علیکم کہا۔ گویا پیر کو خود سلام کیا۔ فرمایا کیوں ہمارا سلام قابل قبول نہیں تھا جو اس کا جواب نہیں دیا؟ عرض کیا حضرت چھوٹوں کو سلام میں ابتدا کرنا چاہئے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ حضرت کے آتے ہی

---

[1] فقہا نے لکھا ہے کہ ایک درہم کے نقصان کے خطرہ پر نماز توڑ دینا جائز ہے جس کی قیمت آجکل ۸-۱۰ آنے ہوگی۔
[2] گو خود سلام کرنا سنت ہے مگر جواب بحق مسلم واجب ہے۔ [3] ہاں دور ہو تو زبان سے جواب دیکر ہاتھ سے اشارہ کردینا چاہئے۔ [4] اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی اور حالات میں برکت دے۔ عمر دیں۔ نیک بنائیں۔
[5] ہاں نوجوان نامحرموں میں نہ ہونا چاہئے فقہ میں مکروہ ہے۔
[6]

خود سلام کریں گے مگر حضرت اس کا موقع ہی نہیں دیتے اور ہم اپنے عزم پر جلدی سے السلام علیکم کہتے ہیں۔ فرمایا اس میں چھوٹا بڑا کیا تھا سنت تو یہ ہے کہ آنے والا اول سلام کرے اس لئے اس کا جواب دو علیکم السلام۔

آپ کو پردہ میں تشدد تھا اور جب گھر میں عورتوں کا مجمع ہوتا تو باوجود پردہ ہوجانے کے آپ منھ پر رومال ڈال کر آتے اور پیٹھ پھیر کر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عورتوں نے حضرت کی اہلیہ سے کہا کہ حضرت تو اطلاع کرکے اور پردہ کرا کے آتے ہیں پھر پردہ کے پیچھے پیٹھ پھیر کر کیوں بیٹھتے ہیں؟ یہ بات حضرت کے کان میں بھی پڑی تو آپ نے فرمایا بعض جاہل عورتوں کا خیال ہوتا ہے کہ پیر کی صورت دیکھنا ضروری ہے اور ثواب ہے۔ بلکہ بعضی تو دلیل بھی لاتی ہیں کہ صورت نہ دیکھی تو قیامت کے دن پیر کو پہچانیں گے کیسے؟ اس لئے میں احتیاط کرتا ہوں۔ اور اب تو اس کا ثبوت بھی مل گیا کہ میرا خیال ٹھیک ہے ورنہ بغیر جھانکے انھیں خبر کیسے ہوئی کہ میں پیٹھ پھیرے بیٹھا ہوں؟ ہاں پردہ کے پیچھے سے بات کر لینے کی اجازت تھی اس لئے جو کچھ کہنا یا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ حضرت سے خود کہہ لیتیں مگر اس میں بھی اتنی احتیاط تھی کہ یا باجی پاس ہوتیں تب آپ بات کرتے یا عورت کا محرم حضرت کے پاس بیٹھا ہوتا۔

عورتوں کو وعظ و تفہیم فرمانا

عورتوں کو بات سمجھانے میں حضرت ان کے فہم کی رعایت زیادہ فرماتے اور بہت سادہ و صاف لفظوں میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا کھڑا جوتا یا مردانہ صدری پہننا اور نامحرم کے سامنے آنا حضرت کو بہت ناگوار گذرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے کھڑا جوتا پہننے کی بابت دریافت کیا آپ نے فرمایا حرام ہے۔ انھوں نے بہتیرے عذر پیش کئے کہ سفر میں پھٹی جوتی سے چلنا مشکل ہے کہ پاؤں سے نکل نکل جاتی ہے۔ مگر حضرت نے ایک نہ سنی۔ آخر میں فرمایا اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں اگر ایڑی میں زخم ہوجائے تو کیا کروگی؟ عرض کیا وہ مجبوری ہے ایڑی دبا کر دھجی سے باندھ لیں گے فرمایا پھر آخرت کا عذاب تمہارے خیال میں دنیا کے الم سے بھی کم ہے۔ حدیث میں آیا ہے ایک شخص ایسا ہوگا کہ قیامت کے دن اس کو صرف آگ کے جوتے پہنائے جائیں گے اور دوزخ میں نہ ڈالیں گے۔ اس کا حال یہ ہوگا کہ دماغ اس کا مثل ہانڈی کے پکے گا اور وہ سمجھے گا کہ میرے برابر کسی کو بھی تکلیف نہیں۔ یہ مضمون حضرت نے اس طرح بیان فرمایا کہ سننے والیاں رونے لگیں اور توبہ کی کہ آئندہ مردانہ جوتا کبھی نہ پہنیں گی۔ اس کے بعد واسکٹ اور مردانہ صدری کا ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ بھی ناجائز ہے اور جس میں بھی مردانہ صورت وضع حاصل ہو وہ عورت کے لئے حرام ہے۔ کسی نے ایک عالم کی بیوی کا حوالہ دے کر فلانی کو ہم نے پہنے خود دیکھا ہے۔ فرمایا کسی کا نام لینے سے کیا حاصل۔ جو چیز ناجائز ہے وہ کسی کے بھی پہننے سے جائز نہیں ہوسکتی۔ اگر دنیا میں ایک نفس بھی حلال و حرام پر عمل کرنے والا نہ رہے تب بھی جو چیز حلال ہے

وہ حلال ہے اور جو حرام ہے وہ حرام ہے۔ صرف جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل اور عمل البتہ حجت ہے۔ آپ کی بیبیوں کا فعل بھی حجت نہیں۔ پھر مولانا کی بی بی اور میری بی بی کی تو ہستی کیا ہے۔ اللہ میاں کے سامنے کوئی یہ کہہ کر سرخرو نہ ہو سکے گا کہ میں نے ازواج مطہرات کے فعل پر عمل کیا تھا۔

پردہ کے ایک شبہ کا مؤثر جواب

ایک عورت نے مسئلہ پوچھا کہ حضرت پھوپی اور خالہ کی زندگی میں تو پھوپا اور خالو کے سامنے آجانے میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیئے کیونکہ پردہ تو اُن سے کرنا چاہیئے جن سے نکاح جائز ہو۔ حضرت نے فرمایا اچھا اگر سارے مرد چار چار نکاح کرلیں کہ ان کے ہوتے ہوئے پانچویں سے نکاح کرنا ناجائز ہے تو ان سب کے سامنے آنے لگو گی؟ عرض کیا حضرت یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ فرمایا پھر اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ خالو اور پھوپا کے سامنے آؤ۔

عورتوں کو کوسنے سے باز رہنے کی تاکید

عورتوں کا اپنی اولاد کو کوسنا آپ کو نہایت ناگوار تھا اور آپ تشدد کے ساتھ اس کی نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ زبان سے جب کوئی لفظ نکالو تو اچھا لفظ نکالو۔ بددعا اگر پوری ہوگئی تو سر پکڑ کر روؤگی۔ عورتیں عرض کرتیں کہ حضرت جب بچے کلساتے ہیں تو کوسنا ہی زبان سے نکلے ہے۔ فرمایا تمہیں بھی تمہاری ماؤں نے پالا ہے وہ تم کو کوستیں تو آج نہ تم زندہ ہوتیں نہ اولاد کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی۔ اور موت زندگی تو اللہ کے اختیار ہے مثل مشہور ہے کوّوں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرتے مگر بُری بات زبان سے بکنے کی جب عادت ہوجاتی ہے تو اس کی نحوست سارے گھر کو گھیر لیتی ہے اور ایسی بدزبان عورت کبھی خوش حال نہیں رہ سکتی۔

شوہر کی اطاعت کی ہدایت و تاکید

شوہر کی اطاعت کا آپ عورتوں کو خاص طور پر امر فرماتے اور اس کی زیادتیوں پر صبر و تحمل کی تلقین فرمایا کرتے کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے یہاں نہیں تو آخرت میں اس کا مزہ پاؤگی۔ عورتیں اکثر آپ سے اپنے دکھ درد کی لمبی چوڑی کہانیاں گھنٹوں کہتی تھیں۔ آپ سب کی سنتے اور تسلی و تسکین دلاتے۔ بلکہ خاص تعلق والوں سے نام لے کر خود پوچھا کرتے کہ کہو بیٹی کوئی بات تو کہنا نہیں۔

آخری سفر سے قبل جگہ جگہ سے حضرت کی خادمات حاضر ہوئیں اور آپ نے شفقت پدرانہ کے ساتھ رخصتی وصیتیں ان کو فرمائیں۔ میری اہلیہ بھی حاضر تھی مگر خاموش۔ بعد تہجد اس کو حضرت نے پردہ کے پیچھے بلا کر فرمایا بھئی تم نے کچھ نہ کہا تم بھی تو کچھ کہہ لو۔ عرض کیا حضرت مجھے تو کچھ کہنا نہیں اور کہنا ہے بھی تو ہمت نہیں۔ حضرت نے باصرار فرمایا کہ نہیں ضرور کہو۔ عرض کیا حضرت کہنا یہ ہے کہ یہاں تو آپ کی پدرانہ شفقت دیکھکر ماں باپ کو بھول گئی کہ جب چاہتی ہوں بے تکلف آتی اور میکہ سمجھ کر رہتی ہوں، اب اپنے اللہ سے ملنے کا

وقت قریب آگیا بس یہ دعا فرما دیجئے کہ وہاں بھی اس قابل رہوں کہ جب چاہوں اسی یگانگت کے ساتھ حضرت کے محل میں آسکوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں ہوں اور میں کہیں۔ یہ سن کر حضرت پر ایک کیفیت طاری ہو گئی چشم نم ہوئے اور چند منٹ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد فرمایا بھئی خدا کرے دونوں کو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھنا نصیب ہو تو انشاء اللہ وہاں بھی ایک ہی جگہ رہیں گے۔"

چھوٹی لڑکیاں آپ کے پاس آجاتیں تو آپ ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر ان کو پاس بٹھا لیتے نام پوچھتے اور میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے۔ ان کے لباس میں کوئی غیر مشروع یا نصرانیت کی وضع پاتے تو انھیں سے فرماتے یہ کپڑے تمہاری اماں نے پہنائے ہوں گے؟ ہا بری وضع ہے اماں سے کہو ہمیں مسلمانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پھر مٹھائی وغیرہ کوئی چیز ہوتی تو آپ ان کو دیتے اور یہ لینے میں جھجکتیں تو ماں سے کہتے بھئی انھیں اجازت دو ہماری درخواست تو منظور نہیں ہوتی۔

لڑکیوں کو آپ بیعت نہ فرماتے البتہ حامد یار خاں بریلوی کی لڑکی نفیسہ کو جس کی عمر چھ برس تھی جب والدین کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہوئی تو یہ فرما کر میں نے لڑکیوں کو کبھی بیعت نہیں کیا مگر تجھے ضرور کروں گا بیعت میں شامل فرما لیا جس پر وہ فخر کیا کرتی ہے۔

عملیات سے حضرت کو مناسبت نہ تھی

عملیات سے آپ کو مناسبت نہ تھی ہاں کوئی درخواست کرتا تو تعویذ لکھ دیا کرتے اور سائل کی ضرورت کے موافق جو آیت شریف یا حدیث اس وقت ذہن میں آتی وہ کاغذ پر تحریر فرما کر ان کو دے دیتے تھے کہ موم جامہ کر کے گلے میں ڈال لو یا بازو پر باندھ لو۔

ایک دفعہ کوئی صاحب آئے اور عرض کیا گھر والی کو چھاتی میں دودھ رک جانے کی وجہ سے کل تمام دن اور رات بھر تکلیف رہی اور اس وقت تو درد و کرب کا ٹھکانا ہی نہیں۔ حضرت کوئی عمل بتادیں فرمایا بھائی مجھے عمل وغیرہ تو آتا نہیں صرف اللہ کا نام آتا ہے کہو تو پڑھ دوں ورنہ کسی عامل کو تلاش کرلو۔ انھوں نے معافی مانگی اور عرض کیا حضرت عجلت میں زبان سے نکل گیا مقصود صرف دعا کرانا ہے۔ آپ نے پانی منگا کر اس پر دم کیا اور ان کو دیدیا۔ وہ کہتے تھے کہ دو ہی دفعہ کے پلانے سے مریضہ کی تکلیف رفع ہو گئی اور دودھ جاری ہو گیا۔ پانی پر دم کرنے کے بعد آپ اس میں سے ایک گھونٹ خود پی لیا کرتے تھے کہ سُؤر بن جائے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفا فرمایا ہے۔

اکثر آپ بچوں کی بدخوابی دودھ نہ پینا اور زیادتی گریہ وغیرہ کی شکایت پر یہ لکھا کرتے تھے:۔

اعوذ[1] بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق وصلے اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد والہ وبارک وسلم

اور عام امراض کے لئے اکثر آپ حروفِ سُریانی کا یہ مشہور تعویذ لکھتے تھے ٥ ااا ح ∺ اااا ھ ۶

جس کو عامل ۱۵ کا تعویذ بتاتے اور اس رباعی سے ادا کرتے ہیں ؎

صفر[2] وسہ الف سائبانے بر سر   جیم کج وکور نردبانے بدو در

چہار الف مساوی ہاؤ واو معکوس   این ست ز اسماء اللہ اکبر

کبھی قول جمیل[3] سے کوئی گنڈہ بھی بنادیتے یا اجازت دیدیا کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں یہی معمول ہے اس کو دیکھ کر خود گنڈا بنالو۔

ایک مرتبہ ردّ سحر کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپ نے مجھے اس کی اجازت دی۔ کوئی شخص معوذتین برابر تین شب بہ نیت زکوٰۃ پڑھے اور تین روزہ بھی رکھے۔ اگر ان ایام میں ایک اناج کھاوے تو اچھا ہے۔ بعد زکوٰۃ صبح وشام بہ نیت ردّ سحر تین تین بار پڑھ کر مریضہ پر دم کرے انشاء اللہ سحر دفع ہوگا اور ساحر ہلاک۔ آپ خود پڑھیں یا کسی محتاط سے پڑھوائیں۔ نیز اس کے ساتھ دوسرا عمل تحریر فرمایا سبحان[4] اللہ القادر القاہر القائم الکافی اعوذ من شر عدو ھو اقوی منی برب ھو اقوی منہ۔ یہ دعا اگر مریضہ پڑھ سکے فبہا ورنہ آپ پڑھ کر اس پر دم کریں۔ تعداد ۱۱ بوقت دفع ہر بلا اور ردِ سحر کیلئے بھی نافع ہے فقط۔

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ حضرت کا وجود باوجود مستقل تعویذ تھا اور کوئی مشکل کیسی ہی ان حل ہو جب آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی اور آپ کا اس سے دل دکھتا تو ایسی جلد حل ہوتی تھی گویا بادل پھٹا اور غبار صاف ہوتا گیا۔

میرا انیس سال کا تجربہ ہے کہ جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو کچھ نہ سوجھتا بجز اس کے کہ حضرت کو صاف صاف لکھوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ خط لکھ کر ڈاک میں ڈالا اور قلب کو سکون ہو کر بادل پھٹنا شروع ہوگیا۔ ورنہ حضرت کا جواب آنے پر امن وبسیر نصیب ہو ہی جاتا تھا۔

ایک مرتبہ اہلِ وطن شیعہ میں میرے خلاف شورش برپا ہوئی اور اتفاق سے کوتوال شہر شیعہ آگیا جس پر نازاں ہو کر انھوں نے کوشش کی کہ مجھ پر آفت آئے۔ میں نے پریشان ہو کر وطن چھوڑنا چاہا اور حضرت کو لکھا

---

[1] میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے پورے کلمات کی ان تمام چیزوں کی بدی سے جو پیدا فرمائی ہیں اور اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائیں ساری مخلوق کے بہترین حضرت محمدؐ پر اور ان کی آل پر اور برکت اور سلامتی نازل فرمائیں۔ [2] نقطہ ٥ اور تین الف ااا۔ اور ایک سائبان سر پر ــــ جیم ٹیڑھا گھوما ہوا۔ سیڑھی دو درجے کی ∺ چار الف برابر اااا۔ پھر ھ اور الٹی واو کا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے۔ [3] حضرت شاہ ولی اللہ کا رسالہ ہے۔ [4] پاک ہے اللہ جو قدرت والا ہے غلبہ والا ہے سب کا ذمہ دار ہے کافی ہے میں پناہ مانگتا ہوں اس دشمن کے شر سے جو مجھ سے قوی ہے ایسے رب کی جو اس سے بھی زیادہ قوی ہے۔

تو جواب آیا بالکل نہ ڈرو ؎ دشمن[1] اگر قوی ست نگہباں قوی تراست"۔ وطن کیا محلہ بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں انشاء اللہ بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور دشمن خائب و خاسر ہوگا۔ بس میرے لئے تو لاکھ تعویذ کا یہی ایک تعویذ تھا کہ دل کو اسی وقت سکون ہوگیا اور چند ہی روز گذرے تھے کہ کوتوال کا بدنامی کے ساتھ تبادلہ کا حکم آگیا۔

مولوی لطیف احمد صاحب لکھتے ہیں بندہ جب ۱۳۴۰ھ میں ضلع سورت میں ملازم ہوکر آیا تو ایک دیندار شخص حافظ عبدالرحیم نام آئے اور کہنے لگے تم مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی واقف ہو؟ میں نے کہا خوب اچھی طرح۔ کہنے لگے مولانا کی ہستی اس وقت بے نظیر ہے۔ بارہ سال ہوئے مجھے ایک مصیبت پیش آئی اور میں گھبرا گیا۔ غیبی مدد کہ ایک ردی کاغذ پڑا پایا۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا مولوی خلیل احمد مستجاب الدعوات[2] ہیں اور ان کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی۔ اس وقت میں نے مولانا کو جوابی خط لکھا اور اپنی مصیبت کا حل چاہا، ادھر جواب آیا اور ادھر میری مشکل حل ہوگئی"۔ اس وقت مجھے پھر حضرت کو خط لکھوانا اور دعا کرانی ہے۔ چنانچہ میں نے ان کی طرف سے خط لکھا اور چونکہ میں بھی اس وقت سخت مشکلات میں مبتلا تھا اس لئے وہ بھی لکھیں۔ حالانکہ اس وقت تک مجھے حضرتؒ سے بیعت کا تعلق نہ تھا مگر حضرت کا جواب مسرت بخش آیا اور اس کے آنے کی ہی دیر تھی کہ ان کا اور میرا کام ایسا ہوا کہ خود مجھے بھی تعجب ہے۔ پھر بندہ بیعت بھی ہوا اور کچھ مدت بعد حضرت راندیر تشریف لائے تو حضرت نے اتنی شفقت فرمائی کہ آدمی بھیج کر مجھے اطلاع دی اور یاد فرمایا۔ بندہ زیارت کے لئے حاضر ہوا اور اس علاقہ کی بدعات و حشت کا تذکرہ کیا۔ فرمایا بھائی تم لوگ تو اب بڑے آرام میں ہو، پہلے اس علاقہ میں ہوکر ہم لوگوں کا جانا بھی مشکل تھا۔

بے روزگاری یا قرض کی شکایت پر آپ ۱۱۱ بار یا مغنی[3] پڑھنے کو فرمایا کرتے کہ اول آخر گیارہ بار درود شریف اور مقدمہ وغیرہ کی پریشانی پر حسبنا اللہ ونعم الوکیل[4] بعد عشاء ۵۰۰ بار۔ مرض لاعلاج کے متعلق فرماتے کہ سفید طشتری پر سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ لکھ کر یا حی[5] حین لا حی فی دیمومۃ ملکہ وبقائہ یا حی۔ لکھا جائے اور آب جاری یا زمزم میں گھول کر قبل طلوع آفتاب چالیس دن متواتر مریض کو پلایا جائے۔

ایک شخص پر کوئی سنگین مقدمہ تھا آپ نے فرمایا کچہری میں جانے سے قبل تین یا سات دفعہ سورۂ قریش پڑھ کر سینہ پر دم کرو اور پھر بسم اللہ کہہ کر اندر قدم رکھو۔ آپ کا کسی کو کچھ بتا دینا ہی علامت تھی کہ انشاء اللہ

---

[1] دشمن اگر طاقتور ہے تو حفاظت کرنے والا بہت ہی طاقتور ہے۔ [2] جن کی دعائیں مقبول ہوتی ہوں۔
[3] اے غنی بنانے والے۔ [4] ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہیں اور وہی بہترین ذمہ دار ہیں۔ [5] اے زندہ کہ جس وقت کوئی زندہ نہ ہوگا اس کے ملک اور بقا کی ہمیشگی میں اے زندہ

کامیابی مقدر ہے اور ان سب کی اصل آپ کی دعا و توجہ تھی کہ ایک مقبول بندہ اپنے آقا سے عرض کرتا اور قبولیت اس کا استقبال کیا کرتی تھی۔[1]

حافظ فخر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں ایک جوان لڑکا اپنے والدین سے بیزار ہو کر نکل گیا اور مدت سے پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ اس کی ماں بیحد پریشان تھی میں نے حضرت کی خدمت میں لکھا تو آپ نے ایک آیت تحریر فرمادی کہ اس کو مکان میں کسی اونچی جگہ پر لٹکا دیں یا رکھ دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور دوسرے تیسرے دن لڑکا آگیا اور کہنے لگا دو روز سے طبیعت بے چین تھی کہ کسی طرح گھر چل کر ماں سے ملوں۔ آج بازار میں کسی ضرورت سے نکلا تھا کہ بے اختیار اسٹیشن کی طرف کو ہولیا۔ اسی وجہ سے نہ کوئی سامانِ سفر ساتھ ہے نہ کپڑے بدل سکا۔

ایک شخص اپنی عورت کو بہت مارتا اور تکلیف پہنچاتا تھا۔ بندہ نے حضرت کی خدمت میں لکھا حضرت نے ایک تعویذ روانہ فرمایا کہ عورت اس کو بازو پر باندھ لے۔ یکدم شوہر کی حالت بدل گئی اور ہر طرح کا پیار اخلاص ہونے لگا مگر عرصہ گذر جانے پر عورت نے وہ تعویذ بے پروائی سے گم کر دیا تو پھر وہی حالت لوٹ آئی اور رات دن بیچاری کی درگت ہونے لگی۔

ایک بار میں نے اپنے ایک عزیز کی اہلیہ سے ناموافقت کا تذکرہ کر کے حضرت سے دعا کی درخواست کی مگر حضرت نے جواب دیا کہ بھائی اپنے ہی قلب پر قابو نہیں ہے دوسرے کے قلب کو کوئی کیونکر پھیر سکے جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ سن کر بندہ بالکل مایوس ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر طلاق و انقطاع کلی کی نوبت پہنچی۔

حضرت کے ایک ذاکر شاغل خادم ایک مدرسہ میں مدرس تھے ان کو امرد لڑکے[2] سے تعلق ہو گیا کہ اس کی صورت دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا ہر چند کہ معصیت کا وسوسہ بھی نہ تھا مگر رات بھر گھر سے باہر یا جنگل میں ٹہلا کرتے کہ اس تصور نے ان کے قلب کو گھیر لیا۔ میں نے ان کو میرٹھ بلایا اور اتفاق سے وہ میرے جبر اور اصرار پر عین اس وقت پہنچے کہ حضرت تشریف فرما تھے۔ شرم و خوف کے مارے وہ حضرت کے سامنے نہ گئے اور واپسی کا عزم کیا۔ میں نے ان کو نیچے مسجد میں بٹھایا اور طرح طرح کی ملاطفت کی۔ پھر حضرت کو سارا حال سنایا اور بالحاح[3] عرض کیا کہ حضرت ان کے ساتھ مجھے محبت ہے اور مرض لاعلاج ہے اللہ واسطے خاص توجہ فرماویں بار بار عرض کیا مگر حضرت ٹلتے رہے آخر ارشاد فرمایا ممکن ہو تو میرے پاس بھیج دو کہ چند روز سہارنپور رہیں چنانچہ

---

[1] اصل بات یہ تھی لیکن برکت آج بھی موجود ہے ان پر عمل ان شاء اللہ مفید ہو گا۔ [2] بے ڈاڑھی والا اس مرض سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے اسی لئے امام اعظم درس میں اس کو سامنے نہ بیٹھنے دیتے تھے جس کے ڈاڑھی نہ ہو۔ [3] اصرار سے۔

بہزار تدبیر میں نے ان کو سہارنپور پہنچایا اور آخر مہینہ بھر بعد حضرت نے ان کو رخصت کیا کہ وہ مطلوب[۱] کو دیکھنے اور وحشت کھاتے تھے۔ چند روز بعد وحشت بھی جاتی رہی اور وہ بھی ایسا ہو گیا جیسے سب لوگ۔

الحاصل اکل وشرب سکوت وتکلم بول وبراز نوم ویقظہ اور ہر حرکت وسکون آپ کا سانچہ اتباع سنت میں گویا ڈھلا ہوا تھا اور اس بنا پر طاعت کے حکم اور عبادت کے تحت میں داخل تھا۔ شریعت پر عمل آپ کی طبیعت ثانیہ بلکہ فطرتِ اصلیہ بن گیا تھا کہ کبھی ذہول بھی ہوتا تو فطرت[۲] کا نور آپ کو فوراً متنبہ کر دیا کرتا تھا۔

عدن پر جہاز ٹھہرا تو کشتی والے طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے لائے۔ مینڈک جیسا ایک جانور جس کو بیچ میں سے چاک کر کے گوشت کا عضلہ سا بنا لیتے ہیں بکثرت فروخت ہوتا اور عرب اس کو خاص رغبت سے کھاتے ہیں۔ حضرت کو مچھلی سے رغبت تھی اور عرب نے شوق دلایا کہ اس کو کھا کر دیکھئے مچھلی سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو خریدنے کے لئے مجھ سے فرمایا چنانچہ میں نے ۲ر کشتی میں ڈال دیئے کہ جتنا آوے دیدے۔ وہ جہاز پر آنے نہ پایا تھا کہ آپ دفعۃً گھبرائے اور فرمایا مولوی عاشق الٰہی ذرا ٹھیر میرے خیال میں تو یہ حرام ہے کہ مچھلی نہیں ہے کوئی دریائی جانور ہے۔ مگر احناف کے نزدیک سوائے مچھلی کے کوئی بحری جانور حلال نہیں ہے۔ چنانچہ تحقیق ہوا کہ حضرت کا خیال صحیح ہے اور عرب چونکہ زیادہ تر شافعی المذہب ہیں اس لئے اس کو حلال سمجھتے اور ان کی دیکھا دیکھی سب خرید کر بے تکلف کھاتے ہیں کہ حلت حرمت کی تحقیق کا واہمہ بھی نہیں ہوتا۔

ایک بار حرم شریف میں تلاوتِ قرآن مجید کی آواز آئی جس کی طرف بے اختیار دل کھنچتا تھا۔ ذرا دیر میں ڈھٹ لگ گئے آپ بھی چلتے چلتے رک گئے اور سننے لگے مگر شاید ایک منٹ پورا نہ ہوا تھا کہ آپ یہ فرما کر کہ پڑھنے والی عورت معلوم ہوتی ہے سننا جائز نہیں ہے وہاں سے چل دیئے۔ منہ پر چونکہ نقاب تھا اس لئے عورت مرد کی شناخت ناممکن تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے عرض کیا حضرت نے کیسے سمجھا کہ یہ عورت ہے؟ فرمایا اس کی گٹکری بتا رہی ہے کہ مرد کی آواز نہیں ہے۔ مجھے کرید ہوئی اور معلوم ہوا کہ بیشک وہ عورت مصریہ تھی۔

غرض قدرت نے آپ کو عاداتِ طبیعیہ اور معمولاتِ جسدیہ کا کچھ ایسا بہترین مشغلہ[۳] نصیب فرمایا تھا کہ حاضرین وزائرین علماء وعوام کو آپ کے ہر لمحہ اور ہر آن کے حرکت وسکون میں اس کا علمی وعملی سبق

---

[۱] اس لڑکے کو۔ [۲] تخلیق الٰہی کا جو مجاہدات اور ریاضتوں سے حاصل ہو جاتا ہے۔ [۳] شریعت میں ڈھلا ہوا یہ تو ظاہر کا تھا اور باطنی نور بے انتہا تھا۔

ملتا تھا کہ انسان دنیا میں کس غرض کے لئے آیا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حیاتِ طیبہ کی تعلیم کے لئے یہاں تشریف لائے تھے۔ آپ کے مشاغل حسنہ دیکھ کر غبطہ[1] ہوتا اور بے اختیار زبان سے نکلتا تھا[2]

کل امرءٍ فی امور الدّھر مشتغل　　　وانت عن کلھا فی احسن الشغل

کمالات[3] وکرامات

حضرت رحؒ کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے کہ ان کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت ہے بڑوں کو بھی مشکل تھا۔

مولوی ظفر احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں حضرت مولانا تھانوی نے ایک بار فرمایا کہ جب حضرت مولانا گنگوہی کا وصال ہو گیا تو میں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحؒ سے عرض کیا کہ مجھے اب تک جو کچھ بھی دریافت کرنا ہوتا تھا حضرت مولانا گنگوہی سے دریافت کر لیا کرتا تھا حضرت کے بعد اب جو کچھ مجھے دریافت کرنا ہو گا وہ جناب والا سے دریافت کیا کروں گا اور حضرت والا کو جواب کی تکلیف کرنا ہو گی۔

اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میاں ظفر آج جتنے بھی تمہارے سامنے بزرگ ہیں گنگوہ میں ان سب کے ساتھ میری دل لگی اور ہنسی رہا کرتی تھی بجز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے کہ ان کا ادب میں اس وقت بھی بہت کرتا تھا حالانکہ خود حضرت مولانا مجھ سے بہت بے تکلف تھے مگر میں کبھی بے تکلف نہیں ہوا۔

ایک بار فرمایا تم سمجھ سکتے ہو کہ میں حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں بارہ سال رہا ہوں اور حضرت کے ساتھ جو تعلق مجھے اور جو حضرت کو مجھ سے تھا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس صورت میں غور کر لو کہ مجھے حضرت گنگوہی کی معرفت[4] کس قدر ہو سکتی ہے۔ اس پر جو میں نے حضرت کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب کو اپنا شیخ بنایا اور ان کی طرف رجوع کیا ہے اس سے جو کچھ نتیجہ نکلتا ہے تم خود سمجھ سکتے ہو۔ میاں ظفر بات یہ ہے کہ

[1] یہ شوق کہ ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں۔ [2] ہر آدمی زمانہ کے طرح طرح کے امور میں مشغول ہے اور آپ ہیں کہ ان امور میں سے بہترین شغل میں منہمک ہیں۔ [3] کمال تو علم و عمل کا پورا ہونا ہے صحیح معیار پر ٹھیک اترنا ہے۔ اور معیار صرف وہی ہے جو حق تعالیٰ نے دین کی شکل میں بھیجا ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور خود ہر بات میں نمونہ بنا کر دکھا گئے اس سے ہٹنے والا ناقص ہے۔ اور کرامت غیر نبی صالح شخص کے وہ معمول و عادت عام سے بالا ہوں دوسرے اس سے قاصر ہوں۔ بزرگوں نے استقامت دینی کو سب سے بڑی کرامت قرار دیا ہے۔ [4] حضرت تھانوی نے قائم مقام شیخ حضرت کو ہی منتخب کیا تھا اس سے کمال کا اندازہ ہوتا ہے جو حضرت کے دادا پیر سے اجازت یافتہ تھے اور وقت کے مجدد ہوئے ہیں۔ [5] کمالات کی پہچان۔

خدا کے نزدیک مراتب کا کم زیادہ ہونا تو کسی کو معلوم نہیں لیکن میرے نزدیک معرفت و سلوک میں مولانا خلیل احمد صاحب کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

جلالتِ قدر میں نے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا ایک والا نامہ حضرت کی بیاض میں خود دیکھا ہے جس میں حضرت کی نسبت تحریر فرمایا تھا تم میرے سلسلہ کے فخر ہو مجھے تم سے بہت خوشی اور مسرت ہے۔

حج پنجم میں جس وقت حضرتؒ مسجد الحرام میں طواف قدوم کے لئے تشریف لائے تو احقر مولانا محب الدین صاحبؒ کے پاس (جو کہ اعلیحضرت حاجی صاحب کے خاص خلفا میں تھے اور صاحب کشف مشہور تھے) بیٹھا تھا۔ مولانا اس وقت درود شریف کی کتاب کھولے ہوئے اپنا ورد پڑھ رہے تھے کہ دفعۃً میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے اس وقت حرم میں کون آگیا کہ دفعۃً سارا حرم انوار سے بھر گیا میں خاموش رہا کہ اتنے میں حضرت طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لئے چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کے نشست کی تھی۔ مولانا کھڑے ہو گئے اور ہنس کر فرمایا میں بھی تو کہوں آج حرم میں کون آگیا" یہ کہہ کر مصافحہ و معانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لئے آگے بڑھ گئے۔ مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا میاں ظفر مولانا خلیل احمد صاحب تو نور ہی نور ہیں ان میں نور کے سوا کچھ نہیں۔

پھر فرمایا کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحب کو نہیں دیکھا اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ قطب الارشاد تھے مگر میں نے مولانا کے خلفاء کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ واقعی وہ قطب الارشاد تھے جو ایسے ایسے کامل بنا گئے۔ میں نے جرأت کر کے دریافت کیا کہ مولانا عبد الرحیم صاحب کیسے ہیں؟ فرمایا بڑے قوی النسبت ہیں کہ ان کے پاس چاہے کوئی کیسا ہی دل لے کر آئے سب جھاڑ جھنکاڑ کو ایک دم صاف کر دیتے ہیں۔

* مولوی عبد اللہ جان صاحب جرمن انگلستان مصر حجاز وغیرہ ممالک دیکھے ہوئے سہارنپور کے مشہور وکیل اور مردم شناسی اور استقلال رائے میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ برسوں حضرت کی خدمت میں آنے اور درجہ میں کچہری سے شام کو فارغ ہو کر مدرسہ پہنچنے کے عادی رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے ماموں ڈپٹی علاء الحسن صاحب میرے دوست تھے جو میرے ہی پاس قیام کیا کرتے اور ان کی وجہ سے مولوی محمد یحییٰ صاحب کا آنا جانا میرے مکان پر ہو گیا پھر یہاں تک مراسم بڑھے کہ مولانا کا معمول ہو گیا جمعرات کی شام کو میرے مکان پر تشریف لاتے اور رات یہیں گذارتے۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھے ترغیب دیتے رہتے تھے کہ میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت ہو جاؤں مگر ان کی تلقین کا میرے دل پر کبھی کچھ اثر نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ ڈپٹی علاء الحسن صاحب تشریف لائے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ سے ان کو بیعت کرایا۔ میں نے معترضانہ لہجہ میں مولانا سے کہا کہ اپنے ماموں کو تو آپ نے ان بزرگ سے

بیعت کرایا اور مجھے آپ ہمیشہ یہ تلقین فرمایا کرتے ہیں کہ میں مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت کر لوں۔ مولانا نے ایک جوش کے ساتھ جواب دیا تم نے تو میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ ارے میاں یہ ماموں تو ابھی بنڈی ہیں۔ میں نے ان کو اسکول کی ابتدائی جماعت میں جس کے قابل ان کو سمجھا داخل کرا دیا اور تم کو تو میں اپنے ساتھ بی اے کا طالب علم سمجھ کر کالج میں داخل کرانے کا ساعی ہوں۔ تم نہیں دیکھتے کہ میں گھر بار چھوڑ کر حضرت کی خدمت میں پڑا ہوا ہوں اور تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں مولانا کے اس حوصلہ افزا جواب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

بیعت کی حقیقت اور اگلے دن جمعہ کو اپنے زعم میں رسم بیعت کی مخالفت پر تیار ہو کر حسب معمول مدرسہ میں پہنچ کر حضرت سے پوچھا کہ حضرت بیعت کی حقیقت اور ضرورت کیا ہے؟ میں نے تو خیال میں مخالفت پر کمر باندھ کر یہ سوال کیا تھا مگر حضرت نے اس کو نہایت معمولی سوال قرار دے کر جواب دیا کہ بیعت میں مرید اللہ تعالیٰ سے اجتناب منہیات اور تعمیل اوامر شرعیہ کا عہد کرتا ہے اور مراد اس عہد کا گواہ بنتا ہے اور بس۔" مراد کا لفظ پیر کے مضمون میں اسی روز میں نے پہلی دفعہ سنا۔ اس جواب پر میں مبہوت سا ہو کر دم بخود رہ گیا مگر دل میں یہ خدشہ گذرا کہ خداوند کریم کو جس کی شان ہے یعلم[1] خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور کسی گواہ کی کیا ضرورت ہے مگر فوراً ہی منجانب اللہ یہ آیت کریمہ ذہن میں آئی الیوم[2] نختم علی افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون اور خیال ہوا کہ وہ ذات پاک فعال[3] لما یرید ہے اگر وہ قیامت کے دن انسان کے ہاتھ پیروں سے استشہاد[4] کرے گا تو یہاں اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی صالح شخص کا استشہاد کیوں بیجا ہو۔ یہ سوچ میں چپ ہو گیا اور میرے سارے خیالی اوہام و اعتراضات کا خاتمہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آج جمعہ ہے اور قبل مغرب میں حضرت سے بیعت کر لینا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا میرے خیال میں تو اس کی زیادہ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ بیعت سے جو مقصود اصلی ہے ان میں اکثر چیزیں اللہ تعالیٰ نے وہبی[5] طور پر تم کو عطا فرما رکھی ہیں مگر میں اپنے ارادہ پر تلا بیٹھا تھا میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے تو کبھی کوئی کام ضرورت دیکھ کر نہیں کیا۔ انگریزی معاشرت رکھتا ہوں انگریزی لباس پہنتا ہوں انگریزی کھانا کھاتا ہوں کوٹھی بنگلہ میں رہتا ہوں انگریزوں سے بہت زیادہ

---

[1] وہ جانتے ہیں آنکھ کی خیانت کو اور ان باتوں کو جن کو سینے چھپاتے ہیں۔ [2] آج ہم مہر لگاتے ہیں ان کے مونہوں پر اور ہم سے کلام کریں گے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر اس کی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے
[3] بہت کرنے والے ہیں اس کے جو ارادہ کرتے ہیں۔ [4] گواہی دلوانا یعنی گو ان کو سب کچھ معلوم ہے مگر ہاتھ پیر سے پھر بھی گواہی دلوائیں گے تو کسی بزرگ کی گواہی کیوں نہ ہو۔ [5] خود عطائی۔

ملتا جلتا ہوں یہاں تک کہ ایک مہم سے بلاضرورت شادی بھی کر لی تھی۔ جہاں اور ہزاروں کام بلاضرورت کرتا ہوں ایک بیعت بھی سہی مگر آج اس کا سرانجام کر لینا ضرور ہے حضرت خاموش ہو رہے۔

نماز عصر کے بعد صحن میں حسب عادت تشریف فرما تھے اور احباب کا مجمع جمع تھا کہ حضرت اٹھے اور اشارہ سے مجھے طلب فرمایا میں پیچھے پیچھے ہو لیا حضرت مسجد میں تشریف لائے اور میں ساتھ تھا حضرت نے فرمایا آؤ پھر وہ کام کر لیں۔ چنانچہ بالکل تنہائی میں حضرت نے مصافحہ کے طور پر میرے اور اپنے ہاتھ ملا کر مجھے بیعت کیا اور آخری جملہ یہ کہہ کر کہ میں بیعت کرتا ہوں (حضرت مولانا) خلیل احمد کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور فرمایا کہ بس یہ ہے بیعت۔

میرے دل پر دوران بیعت میں مطلق کوئی اثر کسی قسم کا نہ تھا مگر اس آخری جملہ پر دفعۃً میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور مجھے خود محسوس ہونے لگا کہ میرا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ حضرت فوراً مدرسہ میں اپنی جگہ تشریف لے آئے اور پیچھے پیچھے میں چلا آیا مگر میری صورت دیکھ کر احباب تاڑ گئے کہ بیعت کر کے آیا ہوں۔ پھر مولوی محمد یحییٰ صاحب کے اصرار پر جب میں نے حضرت سے ورد وظیفہ پوچھا تو فرمایا تم کو اور کسی ورد و وظیفہ کا وقت کہاں ہے، تم صرف اسم ذات باری تعالیٰ کو جب بھی وقت ملا کرے ورد کیا کرو اور اشراق و اوابین وغیرہ جو نوافل مسنون ہیں جو چاہو شروع کر لو مگر شروع کرنے سے پہلے اپنی حالت کا اندازہ کر کے یہ مصمم عزم کر لو کہ جن نوافل کو شروع کرو ان کو مرتے دم تک نہایت التزام اور ثبات و استقلال سے نباہ دو۔

مولوی عبداللہ جان صاحب کی شہادت کوئی عالمانہ شہادت نہیں مگر دنیا چھانے ہوئے اور اکثر ممالک دیکھے ہوئے تھے۔ عدم تقلید کی طرف مائل بلکہ تشدد لئے ہوئے تھے۔ کتب بینی کے عادی و خوگر اور ذکی و فہیم تھے کہ ہر مذہب کی کتابوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے اپنے پیشہ اور زمانہ کے رنگ سے متأثر انگریزی معاشرت میں غرق تھے اور تصوف کے ہر پہلو کو مخالفانہ و معترضانہ نگاہ سے دیکھتے تھے لہٰذا ان کی عقیدت و بیعت اس درجہ میں ایک وقیع شہادت ہے کہ الفضل ما شھدت بہ الاعداء۔[1]

تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے سب سے اول حضرت کی خدمت میں حاضری کا موقع اپنے پیشہ میں کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے مسئلہ طلاق کے متعلق روایات فقہیہ کی پوچھ گچھ کی ضرورت سے نصیب ہوا کہ میرا مؤکل حضرت کا رشتہ دار تھا اور میں اپنے اشکالات حل کرنے کے لئے مدرسہ مظاہر علوم میں پہنچا حضرت نے جس اطمینان و بشاشت کے ساتھ میرے ہر سوال کا جواب دیا اور اس کی سند کے طور پر مختلف اور مستند کتب فقہیہ سے

[1] فضل وہ ہے کہ دشمن بھی گواہی دیں۔

اس کی تائید ثابت کر کے دکھلائی اس سے حضرت کے تبحر علمی اور صدق نیت کا میرے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ عین اسی صحبت میں حضرت کی عظمت و محبت کا میرے دل میں گویا بیج بو یا گیا۔ میری اور میرے موکل کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ جس طرح ہو ہم کو مقدمہ میں کامیابی حاصل ہو مگر حضرت نے ہماری ایسی تمام کوشش کی مخالفت فرمائی جس کو حضرت اعانت علی الاثم والعدوان یا برسرِ ناحق سمجھتے تھے اور ہم کو ہر قسم کی حیلہ جوئی اور واقعات اصلیہ کے اخفاء سے یہ فرما کر روک دیا کہ یہ صداقت کے خلاف ہے حضرت کی محبت و عظمت کا یہ اثر ہوا کہ میں روزمرہ عادی ہو گیا کہ کچہری سے واپسی پر سیدھا حضرت کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ تکان و ضعفِ پیری اور مرض کی وجہ سے مجھے لیٹنے کی ضرورت ہوتی اور حضرت میری یہ حالت دیکھ کر فرطِ شفقت سے مجھے تکیہ دیدیا کرتے تھے کہ اس پر آرام کرو۔ میری جسارت کا یہ عالم تھا کہ بلا تکلف تکیہ پر لیٹ کر اپنا داہنا پیر بائیں گھٹنے پر رکھ لیا کرتا شام کو چاء معمولاً حضرت کے یہاں سے ملتی اور میں بلا حجاب پی لیا کرتا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ حضرت نمازِ مغرب کے بعد فرمادیا کرتے کہ ذرا ٹھیر جاؤ میں ٹھیر جاتا اور اس روز رات کا کھانا حضرت کے ہمراہ کھا کر گھر آنا ہوتا۔ جب اس معمول کو میں نے اکثر اور متواتر دیکھا تو حضرت کے اس ارشاد پر کہ ذرا ٹھیر جاؤ میں فوراً سمجھ لیتا تھا کہ آج یہیں کھانا ہوگا۔ جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے شاید صرف دو دفعہ حضرت کی دعوت کر کے حضرت کو اپنے یہاں بلانے اور کھانا کھلانے کی تکلیف دی ہے اور میں نے بہت ہی دفعہ حضرت کے ہاں کھانا کھایا ہے جس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوگی۔ فقط [ع]

کمال استقامت و علوہمت

بندۂ ناچیز نے جہاں تک غور کیا حضرت میں بڑا کمال استقامت اور عزم و علوِ ہمت پایا کہ موسم پلٹتے تھے کبھی جاڑہ کبھی گرمی اور کبھی برسات حالات بدلتے تھے کبھی صحت کبھی مرض کبھی سفر کبھی حضر کبھی خلوت کبھی جلوت کبھی عسر[2] کبھی یسر کبھی اشتغال کبھی فرصت زمانہ گردش کرتا تھا کبھی جوانی کبھی بڑھاپا کبھی ضعف کبھی قوت، انقلاباتِ حوادث اپنا اثر دکھلاتا تھا کہ کبھی خوشی کبھی رنج کبھی کسی کی ولادت کبھی کسی کا مرنا غرض سب ہی کچھ ہوتا تھا مگر آپ کے معمولاتِ شرعیہ میں کوئی فرق نہ آتا اور کسی ایک امر پر کبھی کوئی اثر قوی نہ پڑتا تھا۔ مجھے آپ کے ساتھ سفر

---

[1] گناہ اور زیادتیوں پر امداد۔ [2] تنگی کبھی فراغت۔

[ع] مولوی عبداللہ جان وکیل لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ سہارنپور میں اسٹیشن کے قریب ایک مرتبہ مدرسہ قدیم کے صحن میں ہم لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے۔ دوران گفتگو میں کہنے لگے کہ تفسیر کبیر کا میں نے سات بار مطالعہ کیا ہے۔ یہ بات سن کر ہم لوگ حیران رہ گئے کہ یہ انگریزی میں تو بڑا عالم ہے۔ جس مقدمۂ طلاق کا مولوی صاحب نے ذکر کیا ہے وہ حسینہ بنت مولوی سلطان احمد کا ہے۔ ان کے شوہر نے غصہ میں تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی کی بازیابی کے لئے عدالتی چارہ جوئی کی تھی۔ عدالت نے شوہر کی موافقت میں فیصلہ کیا جو غیر شرعی تھا اس لئے مجبوراً حسینہ کو بہاولپور بھیج دیا گیا جہاں ان کی شادی کرنل عبداللہ سے ہوئی۔ (اخلاق احمد غفرلہ)

ہیں بارہا معیت نصیب ہوئی۔ ریل اور جہاز اونٹ اور بہل سب آپ کے معمولاتِ لیلیہ و یومیہ کے لئے ایک حکم رکھتے تھے۔

انسان ایک مٹی کا پتلا ہے جس کی مشین کے پرزے ہاتھ پاؤں ایک خاص عادت اور سکون و راحت کے محتاج ہیں کہ جب اس عادت و راحت میں فرق آئے گا تو ان کی رفتار سے جس کا نام عمل ہے ضرور فرق آئے گا۔ اچھی اچھی قابلِ اعتماد مشینیں کسی غیر معتاد حادثہ پر بند ہو جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے منتظم محکمے اور کارخانے اتفاقیات کے ہاتھوں چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ قوی سے قوی ہستیوں کو بھی آرام کرنے کے لئے تعطیل کی ضرورت ہوتی ہے اور مستعد سے مستعد نوجوانوں کو بھی راحت حاصل کرنے کے لئے اپنے معمول میں فرق ڈالنا پڑتا ہے مگر نہیں فرق دیکھا تو حضرت کے معمولات میں کہ چھ چھ مہینے متواتر و مسلسل سفر میں ساتھ رہنے کا مجھے اتفاق ہوا مگر میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ نماز باجماعت ترک یا وقت مستحب سے ہٹی ہو یا ایک شب بھی تہجد کے لئے وقتِ معمول پر اٹھنے میں چند منٹ کی تاخیر ہوئی ہو۔

قرنطینہ کامران[1] میں شب کو میری آنکھ کھلی اور میں نے گھڑی دیکھنے میں غلطی کھائی کہ دو بجے کو چار سمجھ لیا۔ گرمی کا موسم تھا چاندنی رات تھی میں سمجھا صبح صادق ہوا چاہتی ہے اٹھ کر حضرت کو دیکھا کہ بے خبر سو رہے ہیں۔ سمجھا کہ آج داخلۂ قرنطینہ میں کامل آٹھ گھنٹے تعب کا اثر حضرت نے لیا ہے اس لئے آنکھ نہیں کھلی اس خیال سے کہ برسوں کا معمول ترک ہونے کا حضرت کو قلق زیادہ ہوگا اٹھ کر حضرت کے پاؤں دبانے لگا کہ حضرت کو جگانے کا طریق یہی تھا۔ پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہی حضرت نے آنکھ کھولی اور گھڑی اٹھائی جس کو حضرت ہمیشہ تکیہ کے پاس رکھ کر سویا کرتے تھے۔ کیا بتاؤں کہ اس وقت میری شرم کے مارے کیا حالت ہوئی جب حضرت نے گھڑی دیکھ کر فرمایا کہ ابھی تو ڈھائی گھنٹہ رات باقی ہے، شاید چاندنی سے تم کو دھوکا ہوا اور یہ فرما کر پھر سو گئے۔

نیند موصوف کے اختیاری تھی

یہ بات حضرت کے پاس چند روز رہنے والے کو بھی محقق ہوگئی تھی کہ حضرت کی نیند اختیاری تھی کہ پانچ منٹ کے لئے سونے کا ارادہ فرماتے تو پانچ ہی منٹ میں آنکھ کھل جاتی اور آپ اٹھ بیٹھتے تھے[ع]۔

جہاز میں بندہ نے اپنا بستر حضرت کے سامنے اور متصل بچھایا تھا کہ آخر شب میں وضو کے لئے پانی

---

[1] کامران جزیرہ میں حاجیوں کو کچھ دیر کے لئے روک دیا جاتا تھا وہ قرنطینہ کہلاتا تھا۔

[ع] باوجودیکہ حضرت کو اپنے سونے اور جاگنے پر کافی قابو تھا لیکن تہجد کے لئے الارم ٹائم پیس کو کوک دیکر پلنگ کے قریب یا اس کے نیچے ضرور رکھا کرتے تھے۔ (اخلاق عفی عنہ)

دیکھوں۔ میں نے بارہا دیکھا کہ حضرت کی آنکھ کھلی اور گھڑی دیکھ کر یہ فرمایا کہ ابھی تو پانچ منٹ باقی ہیں پھر فوراً سو گئے اور دوبارہ آنکھ کھلی تو شاید چھٹا منٹ شروع ہو گیا ہو مگر ختم نہ ہوتا تھا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سونے کے لئے صرف ارادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ بعض دفعہ نیند کا ارادہ کرنے کے بعد تکیہ پر سر رکھنے کی بھی مجھے خبر نہیں ہوتی۔ آپ نے شب کو سفر حجاز جاتے ہوئے ریل کا سفر کیا اور جگہ جگہ اسٹیشنوں پر خدام کا زیارت و مصافحہ کے لئے ہجوم تھا مگر اسٹیشن آتے ہی گاڑی ٹھیرنے نہ پاتی تھی کہ آپ اٹھ جاتے اور اکثر نیچے اُتر کر حاضرین کو چھاتی لگانے اور حال پوچھتے اور جو ضروری بات کہنا ہوتی وہ کہہ کر ریل میں سوار ہو جاتے اور پھر ریل اسٹیشن کو چھوڑنے نہ پاتی تھی کہ سو جاتے تھے۔ رات میں دس دس مرتبہ ایسا جاگنا اور سونا ہوتا مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ رفقا سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جاگنے میں تعب نہیں ہوتا اور نہ پھر سونے میں دیر لگتی ہے اس لئے جب ضرورت ہو بے تکلف جگا لینا سفر میں ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ناوقت کھانا کھایا اور کئی کئی راتیں مسلسل ایسی گذریں کہ گھنٹہ سوا گھنٹہ سے زیادہ آپ کو سونا نہیں ملا اور وہ بھی متفرق بار بار جاگ کر۔ مگر صبح صادق سے دو گھنٹہ قبل اٹھنے کا آپ کا جو معمول تھا اس میں کبھی فرق نہیں آیا۔

نوجوان بیٹے اور بیٹیوں کی وفات کے متواتر تین صدمے آپ کو پیش آئے اور ممتد تیمارداری بھی ہوئی کہ گھر میں یا آپ تھے یا آپ کی اہلیہ مگر تہجد کا معمول نہ تیمارداری میں چھوٹا نہ موت کی شب میں۔ مدنی راستہ میں آپ کو بخار ہوا اور شدید ہوا کہ بدن پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا۔ آپ شغدف میں تھے اور فرطِ حرارت سے گویا بیہوش تھے مگر نصف شب میں بخار ہلکا ہوا اور آخر شب میں حسب معمول آپ ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے، کچھ کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر نفلیں ادا کیں اور لیٹ رہے۔ شب میں قافلہ چلتا تو آپ شغدف ہی پر وضو کرتے اور پورے نوافل ادا فرماتے۔ رات کے بارہ ایک بجے آپ کو ریل میں بیٹھنا ہوا کہ نہ ادھر اطمینان سے سونے کا وقت نہ اُدھر آرام کا کافی وقت۔ مگر نصف شب کے بعد کا وقت ریل میں ہوتا تو اندر ورنہ باہر اسٹیشن پر آپ آٹھ دس نوافل ادا فرماتے اور ریل آنے پر اس میں سوار ہو جاتے۔ اگر میری آنکھوں کا اور وہ بھی بیسیوں دفعہ کا مشاہدہ نہ ہوتا اور کوئی مجھ سے لاکھ کہتا کہ ایک ایسا بھی انسان ہے جس کی نیند اختیاری ہے اور اس پر تغیرات عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا اور میں کہتا کہ ناممکن و محال[1] ہے عادت کے خلاف تغیر ہو اور طبیعت اس سے متاثر ہو کر معمولات میں فرق نہ ڈالے۔ مگر حضرت کے متعلق اس مشاہدہ نے میرے دعوے کو توڑ دیا اور اب تک جب تصور آتا ہے میں حیران ہو جاتا ہوں کہ آخر وہ کون قوت اندرونی تھی جو طبیعت انسانیہ پر غالب آ گئی تھی۔

---

[1] مگر یہ سب خدام کا مشاہدہ رہا ہے۔

ایک مرتبہ شب کو ۱۲ بجے بغیر اطلاع آپ میرٹھ تشریف لائے اور میرے مکان کے سامنے مسجد ہے اس کے فرش پر لیٹ رہے۔ آخر شب میں مجھے خواب نظر آیا کہ حضرت کنوئیں پر کھڑے اپنے ہاتھ سے پانی کھینچ رہے ہیں فوراً آنکھ کھلی اور ڈول کے پانی پر پڑنے کی آواز آئی سمجھ رہا تھا کہ خواب ہے مگر جلدی سے اٹھ کر باہر آیا تو دیکھا واقعہ ہے کہ حضرت پانی کھینچ رہے ہیں، جلدی سے لپک کر میں نے رسی تھام لی پانی کھینچا اور حضرت سے خواب عرض کیا کہ بھی کیا عجیب اور سچا خواب ہے، اور حضرت نے نہ تشریف آوری کی اطلاع دی نہ آواز ہی دی کہ حاضر ہو جاتا۔ مسکرائے اور فرمایا خواب مبارک ہو۔ سفر میں میرٹھ کو عبور ہوا تو دل نے نہ چاہا کہ ملے بغیر جاؤں اور جگانے کی تکلیف کیوں دیتا گرمی کا موسم تھا فرش پر لیٹ کر خوب نیند آئی کہ خمار رفع ہو گیا۔

ایک مرتبہ لاہور جلسہ میں جانا تھا اور ڈاک گاڑی کا سفر تھا جو شب کو ۱۲ بجے چل کر صبح ۷ بجے لاہور پہنچتی تھی۔ زحمہ بھی تھا اور گرمی بھی مگر حضرت ذرا سی جگہ میں پاؤں سمیٹ کر سوئے اور اپنے وقت پر اٹھ کر وضو کرکے اس تنگ جگہ میں نفلیں پڑھنے لگے۔ مولوی اسحاق مرحوم حضرت کے خادم ساتھ تھے اور معلوم تھا کہ حضرت کو نوافل سے فارغ ہو کر چاء پینے کی عادت ہے، دودھ مصری اور خشک چاء وسماوار ساتھ لائے تھے خدا ان کو غریق رحمت کرے آفرین ہے ان کی ہمت پر جس کا سبق حضرت سے لیا تھا کہ تیز چلتی گاڑی میں انھوں نے اپنا پلندہ کھول کر کوئلہ سلگایا اور سماوار گرم کیا اور پوری مقدار چاء تیار کی کہ حضرت کے فارغ ہوتے ہی انھوں نے فنجان بچھا دیئے اور حضرت نے مع چار پانچ رفقا کے چاء نوش فرمائی۔ لاہور میں دن بھر جلسہ کے اندر گذرا کہ دن کو بھی لیٹنا نہ ملا مگر شب کو پھر وہی وقت تھا اور وہی معمول۔

نوافل پر مداومت نوافل پر جس کو اتنی مواظبت ہو اس کے سنن وواجبات کے اہتمام کا کیا پوچھنا۔ مولوی ظفر احمد صاحب جو مدت تک مدرسہ میں مدرس رہے ہیں لکھتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں چھ سال رہا ہوں مجھے یاد نہیں کہ حضرت کی تکبیر تحریمہ کبھی فوت ہوئی ہو۔ البتہ ایک دن صبح کو وضو کرتے کرتے ہوئے آپ کے دانتوں میں سے خون آنے لگا اور دیر تک اس کا سلسلہ چلتا رہا تو مسجد میں خادم کو بھیجا کہ نماز میں میری وجہ سے دیر نہ کی جاوے میرے دانتوں سے خون جاری ہے جو بند نہیں ہوتا۔ اس روز بیشک عذر کی وجہ سے حضرت کی تکبیر تحریمہ فوت ہوئی مگر رکعت اس روز بھی فوت نہیں ہوئی۔ احقر کو اس چھ سال میں حضرت کے ساتھ سفر وحضر کا بارہا اتفاق ہوا مگر میں نے حضرت کا تہجد ناغہ ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک بار آپ کو بخار تھا

ؔ حضرت کے سامان سفر میں بستر تکیہ کے علاوہ ایک کنڈی ضرور ہوتی تھی جس میں ضرورت کی کئی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ مولوی اسحاق مرحوم حضرت کے سفروں میں سب چیزوں کا انتظام رکھتے تھے۔ (اخلاق عفی لہ)

اور گھر میں مہمان مستورات کی وجہ سے حضرت نے مدرسہ ہی میں آرام فرمایا تھا۔ اس بخار کی حالت میں بھی آپ نے تہجد پڑھا کہ کچھ رکعتیں کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر۔

حاجی احمد حسن ڈپٹی مجسٹریٹ انہار گنگ جو حضرت مولانا رائپوری سے بیعت اور ماشاء اللہ نہایت سلیم القلب صالح الاحوال شخص ہیں جس طرح اپنے فرائض دنیوی میں ضرورت سے زیادہ مستعد اور محتاط و ہوشیار ہیں کہ قدردان افسروں نے صوبہ کا منتخب کارگذار سمجھ رکھا ہے اسی طرح دینداری و معمولاتِ شرعیہ میں صاحب استقامت اور ہر شعبہ میں متورع و مستعد ہیں کہ دنیاداروں بالخصوص ان ملازم پیشہ مسلمانوں کو ان کی پابندی جماعت و تہجد و وظائف و زکوٰۃ و صوم و حج سے سبق لینا چاہئے جو فرائض کے متعلق بھی عذر کر دیتے ہیں کہ ملازم بن کر ادا، فرائض مشکل ہے۔ ان کو سہارنپور میں ڈپٹی مجسٹریٹی پر کئی سال تک حضرت کے قریب ہی کرایہ کا مکان لیکر رہنے کا اتفاق ہوا وہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت کے پاس خلوت میں جلوت میں حضر میں سفر میں حاضر رہنے کا اکثر اتفاق پیش آیا ہے لیکن کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت کے معمولات میں ذرا بھی فرق پایا ہو۔ میں نے اپنی عمر میں نماز اس وقار کے ساتھ پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا جیسا حضرت پڑھا کرتے تھے۔ ایک موقع پر میں نے اپنا یہ خیال حضرت کے سامنے ذکر کر دیا بیساختہ فرمایا ہمارے حضرت اس سے بھی زیادہ وقار سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ (یعنی حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ)

مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کو اخیر سفر میں حضرت کے ساتھ معیت کا مدینہ منورہ میں اتفاق ہوا وہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ مجلس میں تذکرہ ہوا کہ سفر حجاز بالخصوص مدنی راستہ میں نماز پڑھنا دشوار ہے کہ بدّو اونٹوں کو ٹھہراتے نہیں اور اونٹ سے اُترنا کارے دارد۔ حضرت نے فرمایا الحمد للہ میں نے ہمیشہ اونٹ سے اُتر کر باجماعت نماز پڑھی ہے۔ احقر نے عرض کیا حضرت آپ کی وجاہت کے سبب سے آپ کو سہولت رہتی تھی فرمایا میں نے اس زمانے میں بھی تو سفر کیا ہے جب کوئی خصوصیت اور وجاہت نہیں تھی۔

نیز فرماتے ہیں احقر جس زمانے میں مدینہ منورہ میں مقیم تھا گرمی نہایت شدید تھی اور مسجد نبوی کی پہلی اور دوسری صف میں نماز پڑھنا نہایت دشوار تھا مغرب اور عشا بلکہ فجر کی نمازیں بھی ہزارہا نمازی اندرونِ مسجد کو چھوڑ کر صحنِ مسجد میں نماز ادا کرتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت ہمیشہ پنجوقتہ صفِ اول میں منبر مبارک کے متصل نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد جب احقر مکان پر حاضر ہوتا تو بطور خوش طبعی و لطافت کے فرماتے کہو سید صاحب آج کونسی صف میں نماز پڑھی؟ احقر مطابق واقعہ چوتھی یا پانچویں صف میں نماز پڑھنا بیان کرتا اور کہتا تھا کہ حضرت پہلی اور دوسری صف میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ فرماتے کہ بھائی یہاں تو ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے گرمی کا احساس ہی نہیں ہوتا"۔ یہ حضرت کی لطافتِ طبع تھی کہ احساس

نہ ہونے کا سبب ضعف و پیری کو قرار دیا ورنہ شوق و محبت اور استحضار فضائل کثیرہ احساس نہ ہونے دیتا تھا یا باوجود احساس کے برداشت اور تحمل تکالیف پر مستعد کرتا رہتا تھا۔

ایک مخلص ہندوستانی نے جو موٹر کمپنی میں کارکن تھے ایک موٹر لاری عصر کی نماز کے بعد ایک روز ہوا خوری کے لئے حاضر کی سب متوسلین ہمراہ ہوئے۔ مدینہ منورہ سے باہر پندرہ بیس میل نکل گئے۔ ایک باغ میں تھوڑی دیر ٹھیرے، واپسی میں خلاف امید اتنی تاخیر ہوگئی کہ مسجد نبوی میں جماعت شروع ہوگئی۔ کچھ بازار کے ہجوم کی وجہ سے مسجد تک پہنچنے میں دقت ہوئی بلکہ احقر نے ہاتھ پکڑ کر احتیاط سے جماعت تک پہنچایا۔ دو رکعتیں رہ گئیں اور صرف تیسری رکعت امام کے ساتھ ملی۔ اگلے روز احقر نے عرض کیا حضرت پہلے بھی کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے؟ فرمایا کبھی نہیں (یعنی بیماری کی وجہ سے بعض مرتبہ مکان پر نماز پڑھنے کی نوبت تو ضرور آئی مگر یہ نہیں ہوا کہ مسجد میں آنا ہوا اور کوئی رکعت رہ گئی ہو) احقر نے عرض کیا کہ بمقتضائے عجز[1] و عبدیت ایک واقعہ ایسا بھی ہونا چاہئے تھا۔ تبسم فرما کر خاموش ہوگئے۔

آپ مرض کی وجہ سے جب مسجد میں حاضر ہونے سے معذور ہوتے تو مولانا سید احمد صاحب مہاجر کو نماز کے وقت طلب فرما کر گھر میں جماعت سے نماز ادا فرماتے۔ واردو صادر[2] اور غیر مہاجر لوگوں کے لئے حاضری مسجد کو ضروری سمجھ کر خاص طور سے خیال رکھتے یہاں تک کہ حاجی مقبول احمد صاحب کو بھی اپنی جماعت کیلئے گھر میں نہیں روکتے تھے کیونکہ انھوں نے اس وقت تک ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔

حج و زیارت آپ کو حق تعالیٰ نے سات حج نصیب فرمائے جن میں پہلا سفر حج ۱۲۹۳ھ میں تنہا بھوپال سے اور دوسرا ۱۲۹۷ھ میں بمعیت مولوی شمس الدین صاحب بھاولپور سے مذکور ہو چکا۔ باقی پانچ حج آپ کے ملازمت مظاہر علوم کے زمانے میں سہارنپور سے ہوئے۔

تیسرا حج پہلا ۱۳۲۳ھ میں اہل کو ساتھ لیکر کہ ان کے پاس شوہر اول کا عطیہ زیور تھا جس کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ میں فروخت کرکے زمین خریدلی تھی اور پھر ۱۳۲۳ھ میں اس کو بعوض پانچسو روپیہ فروخت کردیا۔ بیع کا تمام ہونا تھا کہ حضرت نے فرمایا تم پر حج فرض ہوگیا اس کے ادا کرنے کا اہتمام کرو۔ اگرچہ محرم بن کر صرف حج آپ بھی اس رقم میں کرسکتے تھے مگر آپ کے لئے سفر حج کا محرک جب کبھی ہوا وہ آستانۂ محمدیہ کی حاضری کا شوق ہوا ہے اس لئے آپ نے مطرقۃ الکرامہ کے نسخے یکمشت فروخت کرنے کی سعی کی کہ صرف وہی آپ کا راس المال تھا اور اس کی رقم لیکر آپ مع اہلیہ اور اپنی بڑی لڑکی کے کہ شوہر کے مجنوں ہو جانے کے سبب محزون و مضمحل زیادہ رہتی اور اپنے بدن کا زیور فروخت کرکے والدین کے ساتھ عرب

---

[1] بندہ کے عاجز اور بندگی کے تقاضے سے۔ [2] آنے جانے والے۔

جانے کو تیار ہوگئی تھی آخر شوال میں روانہ ہوئے اور بعد حج تئیس دن مدینہ منورہ میں قیام فرما کر صفر میں واپس وطن تشریف لے آئے۔

چوتھا حج پھر ۱۳۲۸ھ میں جب حضرت مولانا رائپوریؒ کو آپ نے دہلی تک مشایعت فرما کر حجاز روانہ کیا تو شوق حاضری حرمین کا پھر غلبہ ہوا اور شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہیٹ نے آپ سے خواہش کی کہ ساتھ تشریف لے چلیں تو آپ نے منظور فرما لیا اور مولوی یحییٰ صاحب کو اپنا قائم مقام بنا کر اہلیہ کو مکان پر چھوڑ کر وسط ذیقعدہ میں بمبئی روانہ ہوگئے۔ ۶ ذی الحجہ کو آپ مکہ پہنچے اور ۱۰ محرم کو براہ رابغ مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ بائیس ۲۲ دن قیام فرما کر وطن کو مراجعت فرمائی اور آخر صفر میں سہارنپور تشریف لے آئے۔ ان دونوں سفر میں بندہ کو ہمرکابی کا شرف نصیب ہوا اور دوسرے سفر میں میرٹھ سے حافظ فصیح الدین صاحب مرحوم مع اہل اور ان کے بھائی حاجی وجیہ الدین مع والدہ واہل ودیگر حضرات تقریباً سولہ نفر حضرت کے ساتھ ہوئے جنھوں نے حضرت کا فوری قصد سن کر دفعۃً ارادہ کیا اور چل کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب و مولانا عبد اللطیف صاحب بھی مکہ مکرمہ میں حضرت کے ساتھ ہوگئے کہ روانگی دونوں صاحبوں کی رائپوری قافلہ سے بھی قبل ہو چکی تھی۔ حکیم حافظ یعقوب صاحب اور آپ کی والدہ محترمہ دختر اعلیحضرت گنگوہی نے جو حضرت مولانا رائپوری کے ساتھ گئی تھیں مکہ مکرمہ سے حضرت کی بیعت اختیار کی۔

پانچواں حج تیسرا سفر ۱۳۳۳ھ میں بماہ شوال اس وقت ہوا جبکہ ترکی و برطانیہ میں جنگ عظیم برپا تھی اور طرح طرح کے فساد رونما تھے۔ دہلی سے آپ کے پاس ایک استفتا[1] آیا تھا جس میں مسلمانان ہند کا ترکی سے جنگ کرنا جائز لکھ کر حضرت سے تصویب چاہی گئی اور آپ نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور آپ نے خاص لوگوں سے کہا کہ اگر یہ دھمکی صحیح ہے اور گورنمنٹ مجبور کرتی ہے کہ اسلام کے خلاف فتویٰ دیں تو ہندوستان میں رہنا جائز نہیں اور ہجرت کرنا فرض ہے۔ اپنے اس خیال کو آپ نے شائع تو نہیں کیا مگر خود ارادہ پختہ کر لیا کہ میں ایسی حالت میں ہندوستان کو دار الامن نہیں سمجھتا۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ بھی سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور حضرت کا قصد مولانا کی معیت کا تھا مگر مولانا کے سفر میں کچھ تاخیر ہوئی تو حضرت نے بایں اندیشہ کہ دستخط کرنے سے انکار کرنے پر کوئی فتنہ پیدا نہ ہو جائے انتظار کو پسند نہ کیا اور وسط شوال میں روانہ ہو کر ۲ ذیقعدہ کو مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ بعد حج ۷ محرم کو مدینہ منورہ پہنچ کر قیام فرما لیا مگر وقت اتنا نازک تھا کہ آپ کے ساتھ خفیہ پولیس کی نگرانی تھی جو ہر حرکت و سکون کو قلمبند کرتی رہتی تھی اور ادھر گورنمنٹ ترکی کو ان حضرات کی طرف سے برطانوی رعایا ہونے کی بنا پر بدگمانی ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ترکی افسر سے فرمایا بھی کہ

[1] جو انگریزوں نے علماء کے پاس بھجوایا تھا یا کسی نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے بھجوایا تھا۔

عجیب بات ہے برطانوی حکومت ہم کو بحیثیت اتحاد مذہب ترکی کا خیرخواہ سمجھ کر بدگمان ہے اور ترکی حکومت محض ہندی باشندہ ہونے کے لحاظ سے ہم پر مطمئن نہیں پھر آخر مسلمان اپنی مذہبی زندگی عافیت کے ساتھ گذارنے کے لئے کونسا ملک ڈھونڈیں؟ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا اور آخر آپ کو نو مہینے بعد شوال ۱۳۳۸ھ میں ہندوستان واپس آنا پڑا۔ بمبئی بندر پر اترے تو آپ کو روک لیا گیا اور سیاسی تحقیق کے لئے مع اہلیہ کے بالا بالا نینی تال بھیجدیا گیا۔ وہاں آپ سے طرح طرح کے سوالات ہوئے اور یہ بھی پوچھا گیا کہ کیا آپ نے ہندوستان کو دارالحرب بتایا ہے کہ یہاں رہنا مسلمانوں کو حرام اور ہجرت کرنا واجب ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ضرور کہا مگر اس وقت جبکہ دہلی سے اطلاع ملی کہ گورنمنٹ ہم کو ہمارے مذہب اسلام کے خلاف حکم دینے پر مجبور کرتی ہے مفتش نے کہا یہ آپ کو غلط باور کرایا گیا، نہ وہ استفتا گورنمنٹ کی طرف سے تھا اور نہ گورنمنٹ کسی کو خلاف مذہب پر مجبور کرتی ہے آپ اس کا اعلان کردیں کہ یہ خبر غلط تھی اور مسلمانوں کو اطمینان دلادیں کہ وہ خلاف مذہب قول یا فعل پر ہرگز مجبور نہ کئے جائیں گے۔ چنانچہ ہر قسم کی صفائی کے بعد آپ کو آزاد کردیا گیا اور آپ بعافیت وطن تشریف لائے کہ آپ کی گرفتاری سے خدام کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً جو اضطراب تھا وہ رفع ہوا۔ دفعتہً یہ خبر سن کر کہ آپ کو گرفتار کرکے نینی تال بھیجدیا گیا خدام میں کہرام مچ گیا اور بعض باوجاہت ذی مقدرت متوسلین نے وہاں پہنچنا چاہا مگر آپ نے بذریعہ تحریر سب کو تسلی دے کر ممانعت لکھی کہ یہاں آنے کا کوئی صاحب قصد نہ کریں مقدر پر شاکر رہیں۔

حضرت کی مراجعت چونکہ براہ میرٹھ ہوئی اس لئے بندہ بھی سہارنپور تک کے لئے ہم رکاب ہوگیا تھا جس وقت حضرت اسٹیشن سہارنپور پر پہنچے ہیں تو سارا پلیٹ فارم زائرین سے لبریز تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دس ہزار کا مجمع تھا یا بیس ہزار کا مگر مجھے یہ اندیشہ تھا کہ ازدحام میں دوچار کا پس جانا بعید نہیں۔ میری تو کیا ہمت تھی کہ زحمہ کے دھکوں کا تحمل کرتا اس لئے الگ کھڑا ہوگیا مگر اللہ رے حضرت کا استقلال کہ سفر پر سفر کا تعب اٹھاتے آرہے تھے مگر سب ہی سے مسکرا کر مصافحہ و معانقہ کیا اور باہر سواری میں بیٹھتے وقت اسی طمانیت سے دریافت کیا کہ میرے رفقا بھی سوار ہولئے یا نہیں۔ اور جب اطمینان ہوگیا کہ سب بیٹھ گئے تب آپ کی سواری آگے بڑھی، دوسرے دن آپ نے بھرے مجمع میں اپنے واقعات سفر و گرفتاری مفصل سنائے اور مسٹر برن کا پیام کہ اس دھمکی کا انتساب گورنمنٹ کی طرف غلط تھا تمام حاضرین کو پہنچایا۔ اس قصہ میں بھی آپ پر بہت کچھ بدگمانیاں اور گورنمنٹ سے تنخواہ ملنے کی بہتان بندیاں ہوئیں جن کا تذکرہ فضول ہے کہ ہر شخص اپنے افعال و اقوال کا جواب دہ ہے اور جزاء و سزا مرتب ہونے کا وقت قریب آلگا ہے۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ حضرت کو خفیہ کا ملازم کہنے والوں سے جب پوچھا جاتا کہ تم کو علم کیونکر ہوا تو ان کا راوی صرف خفیہ پولیس ہی ہوتی تھی پس اگر خفیہ میں ہونا ثقاہت و صداقت پر اثر نہیں ڈالتا تو حضرت پر کیا الزام؟ اور اگر اس سے ثقاہت و دیانت و صداقت باطل ہوتی ہے کہ اس عہدہ کا مدار ہی اخفاء حال و کتمانِ حقیقت پر ہے تو پھر ان کی روایت و نقل کیونکر معتبر ہوئی چہ جائیکہ اس پر اتنا یقین کہ ایک بری و مقدس ہستی کے علمی و عملی غرض تمامی کارنامے یکلخت حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ ایک وقت تھا کہ شبہ کا نفع مجرم کو دیا جاتا اور مسلمان کو بری کرنے کے لئے احتمال و شک بھی کافی سمجھا جاتا تھا اور ایک یہ وقت تھا کہ ذہنی اختراع اور شیطانی افواہ کو وحی ربانی کے حکم میں لاکر اس کی پروا بھی نہیں کی جاتی کہ یہ بے دلیل بہتان کس مقدس پر باندھا جا رہا ہے۔ مگر آپ کا استقلال عجیب تھا۔ جب آپ کے سامنے ذکر ہوتا کہ لوگ یوں کہتے ہیں تو آپ ہنس دیا کرتے، زیادہ سے زیادہ آپ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میاں معاملہ بندہ کا خدا سے صاف ہونا چاہئے دنیا کو کہنے دو جو چاہے کہے۔ میرا کیا بگڑتا ہی کچھ گناہوں میں ہی کمی ہوگی۔

چھٹا حج

چھٹا حج ۱۳۳۸ھ میں ہوا کہ آپ شعبان میں روانہ ہوئے اور شہرت ہوگئی کہ بہ نیت ہجرت تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اس لئے عام بے چینی پھیل گئی اور مہمانوں کی وہ کثرت ہوئی کہ الامان مولوی محمد زکریا صاحب مولوی منظور احمد صاحب قاری عبدالعزیز صاحب اور مولوی لطیف الرحمٰن صاحب نے بھی عزم کر لیا۔ مولوی محمد اسحاق مرحوم مولوی حبیب احمد نانوتی بھی ساتھ ہوئے اور حضرت مع اہلیہ و حاجی مقبول احمد اپنے قافلہ کو لیکر شعبان میں بمبئی روانہ ہوگئے۔ شیخ محمد یسین صاحب بریلوی بھی بمبئی میں جا ملے۔ یہ صاحب داروغہ آبکاری تھے اور انگریزی لباس و وضع کے دلدادہ۔ ہیٹ لگاتے پتلون پہنتے تھے۔ بیعت ہونا تھا کہ کایا پلٹ گئی۔ نوکری بھی چھوڑی اور لباس بھی چھوڑا اچھے خاصے ملا بن گئے۔ بمبئی میں اتفاق سے ایک پرانے دوست مل گئے غور سے دیکھ کر بولے کیا آپ مسٹر محمد یسین صاحب ہیں؟ بولے اب تو مسٹر نہیں صرف محمد یسین ہوں۔ حضرت کی روانگی سن کر بیتاب ہوگئے اور چل کھڑے ہوئے۔ قصد تھا کہ رمضان مکہ مکرمہ میں گذاریں مگر جہاز کی روانگی میں تاخیر ہوئی کہ جہاز میں چاند نظر آگیا اور ۱۱ رمضان کو مکہ مکرمہ پہنچے۔

یہ زمانہ شریف حسین کی حکومت کا آخری نازک زمانہ تھا کہ استبداد و خودداری اپنا سکہ جما رہی اور علماء ہند کی مقدس ہستیاں مشتبہ نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ مولانا محمود حسن صاحب گرفتار ہو کر مالٹا بھیج لئے تھے اندرون ملک میں عام ناراضی پھیلی ہوئی تھی اس لئے آپ نے اپنے قافلہ کو مدینہ منورہ بھیجدیا کہ معلوم کیا مقدر ہے تم لوگ پہلی مرتبہ آئے ہو زیارتِ آستانہ سے محروم نہ جاؤ اور خود مکہ مکرمہ ٹھیرے رہے۔

ایک دن حرم شریف میں نماز کا سلام پھیرا اور ایک شخص نے کہ نہ معلوم مجنوں تھا یا مغلوب الحال شور مچانا شروع کیا "قیامت ٹوٹے اور آسمان پھٹے اس حکومت پر کہ مولوی خلیل احمد جیسے محترم مقتدی ہوں اور ایسا ویسا شخص امام بنے" وغیرہ وغیرہ جو منہ میں آیا کہا۔ اس شخص کے تو اگلے دن مرنے کی اطلاع ملی اور حضرت کے متعلق اندیشہ ہوا کہ شریف کو سب اطلاع مل چکی ہے عجب نہیں آپ پر بھی ہاتھ صاف ہو۔ آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ مسلمان حاکم کی شکایت انگریزی قنصل سے کر کے پناہ لیں اور نہ سکون سے رہنا نصیب تھا کہ خدا جانے اس کے بعد کیا فتنہ برپا ہو۔ اس لئے مولوی محب الدین صاحب[1] کے اصرار پر کہ ہندوستان جلد جاؤ آپ آخر محرم ۳۹ھ میں روانہ روانہ ہو کر شروع صفر میں سہارنپور پہنچ لئے۔ آپ کا شوق وفات فی المدینہ میں بار بار حجاز جانا اور مشیت الہیہ عوارض پیش آنے پر واپس ہندوستان آنا آپ کے امتحان رضا برقضا[2] کا عجیب حیرت بخش منظر تھا کہ کبھی آپ اداس ہو کر فرماتے بھلا اس قابل کہاں کہ اس مٹی میں ملوں۔ اور کبھی منامی بشارات پر آپ کو امید بندھتی کہ قدرت کے نزدیک کیا بعید ہے وہ اہلیت بخشے اور خوش نصیب بناوے۔"

جہاں ان واپسیوں میں آپ کی یہ ترقیاتِ باطنی مضمر تھیں وہیں یہ برکات مستتر تھیں کہ یہاں کے قیام میں علمی و عملی عام نفع کے علاوہ بیسیوں ناقصینِ سلوک کی تکمیل اور صدہا محروین کو داخلِ سلسلہ ہو کر ہدایت و تلقین ہوتی تھی۔

۱۳۴۵ھ میں ساتواں حج

حتی کہ آپ پانچویں حج کو جو کہ عمر شریف کا ساتواں حج تھا ۱۲ شوال کو حیدرآباد ہوتے ہوئے بمبئی پہنچ لئے اور تقریباً دو سو رفقا کے امیر بن کر بادبانی جہاز میں حجاز روانہ ہوئے۔ بعد حج ۱۲ محرم کو مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور یہ داخلہ وہ تھا جس کے بعد خروج کا صرف وہی وقت[3] ہے جبکہ سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پڑوسیوں کے امیر بن کر صلہ و انعام دلانے کے لئے بارگاہ واہب العطیات[4] کی طرف قدم اٹھائیں گے۔

ان ساتوں حج میں حضرت کے ساتھ صدہا خدام و متوسلین کا مجمع رہا جن کو حضرت نے حج مبرور و مسنون کا عملی سبق پڑھایا۔ زیادہ تر حضرت کے رفیقِ سفر علما ہوئے اور یہ دیکھ کر کہ حج جیسی عبادت میں جو کہ عمر بھر میں ایک دفعہ فرض ہے حضرت کو ان جزئیات کا ہر وقت اور تمامی سنن و مستحبات کی پوری رعایت کا اہتمام رہتا ہے جن کی طرف اچھے اچھے مولویوں کی نظر بھی نہیں جاتی وہ حیران ہو جایا کرتے تھے۔ طواف کی دو رکعت کے بعد استلام حجرِ اسود گویا آج کل متروک ہے مگر فقہاء نے اس کے استحباب کی تصریح کی ہے

[1] حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ بڑے صاحب کشف تھے۔ [2] حق تعالٰی کے فیصلہ پر راضی ہونا۔ [3] ترقیات کا۔
[4] تمام عطائیں بے عوض کرنے والے۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت نے ترک فرمایا ہو ۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ سے واپسی میں محصب پر نزول حضرت کا کبھی نہیں چھوٹا حالانکہ اکثر حجاج محصب سے واقف بھی نہیں کہ کہاں ہے۔ ۹ کو منیٰ سے چلنے میں آپ کی نظر ثبیر پر رہتی اور جب سورج کی شعاع اس پر چمکتی اور اشرق ثبیر[1] کا مصداق نظر آتا تو آپ عرفات کی طرف متوجہ ہوتے۔ اسی طرح واپسی میں مزدلفہ پر صبح کی نماز غلس میں پڑھتے اور بیٹھے رہتے حتیٰ کہ اسفار ہوتا اور اسوقت آپ منیٰ ہوکر سیدھے جمرۃ العقبہ پر رمی کے لئے پہنچتے تھے۔

ایک مرتبہ باب مکہ کے قریب پہنچکر آپ نے فرمایا کہ مسنون راستہ حجون کا ہے چلو سنت ادا کریں چنانچہ آپ نے قافلہ چھوڑ دیا اور پہاڑیوں کو قطع کرتے ہوئے جنت المعلیٰ کے متصل نکل کر باب السفلی سے مکہ میں داخل ہوئے۔ مجھے اسی دن علم ہوا کہ حجون کیا ہے اور اس کا راستہ کونسا ہے۔ دخول[2] کے لئے غسل کا آپ نے اہتمام فرمایا اور شہر سے باہر قہوہ خانہ میں ٹھیر کر ہم کو ایک کنستر پانی خرید فرما کر غسل کیا۔ ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں بھی غسل کا اہتمام فرمایا اور روزہ تو رکھا نہیں مگر ایک پیالی چاء کے سوا کچھ کھایا بھی نہیں کہ صوم عرفہ[3] اور افطار فی العرفات کو جمع فرمایا۔ رمی جمار کے بعد آپ کا وقوف دعا کے لئے باوجود اتنی دھکا پیل کے کہ جوانوں کا پاؤں جمانا مشکل تھا ہمیشہ ہوا اور مسنون مقدار تک ہوا کہ کمی نہیں آئی۔ فتنہ وسکون اور قلت وکثرت حجاج گرمی سردی برسات غرض ہر موسم میں اور مختلف طبیعت والے اشراف ووالیان کے زمانہ حکومت میں آپ کو اسفار حج پیش آئے مگر یہ امر مشترک کہ حج بطریق مسنون ادا ہو کسی وقت کے کسی حج میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا نماز تو آپ کی ہر جگہ آپ کی قرۃ العین[4] تھی پھر کیا پوچھنا نماز مسجد الحرام کا کہ آپ کے صدہا رفیقوں میں کوئی ایک بھی نہیں بتا سکتا کہ فلاں نماز میں آپ کی تکبیر تحریمہ یا صف اول یا امام کی جانب یمین آپ سے فوت ہوئی ہو سخت گرمی میں جبکہ فرش صحن پر پاؤں رکھنے سے چھالے پڑتے تھے آپ ٹھہریں انگلیوں کے بل تیز چل کر مصلے حنفی پر پہنچتے اور صف اول میں امام کا قرب لیا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے ایک مرتبہ بعد مغرب بارش خوب زور کی ہوئی اور رفقاء کی زبانوں پر آیا کہ الا صلوا فی الرحال[5] پر عمل کا وقت حق تعالیٰ نے دکھایا مگر حضرت نے اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی مجھ سے فرمایا چلو بھئی نماز کو۔ ہر چند کہ میری ہمت بھی پست تھی مگر لالٹین ہاتھ میں لیکر ساتھ ہولیا اور حضرت نے پانی بھرا ہوا

---

[1] ثبیر پہاڑ چمک گیا۔ [2] مکہ شریف میں داخل ہونے کے لئے غسل مستحب ہے۔ [3] عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ کا روزہ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہے مگر عرفات کے قیام میں نہیں ہے۔ [4] آنکھوں کی ٹھنڈک جسے حضورؐ نے فرمایا ہے۔ [5] حدیث شریف کا جملہ خبردار گھروں میں نماز پڑھ لو۔
[6] یہ ثبیر پہاڑ مزدلفہ کا ہے اور وقت بتانا مقصود ہے یہ نہیں کہ حضرت نے یہ لفظ فرمائے ہوں۔ بخاری کی حدیث میں یہ جملہ کافروں کا ہونے سے شبہ نہ کیا جائے (شیخ الحدیث)

لوٹا ہاتھ میں اٹھالیا میں بالکل نہ سمجھا کہ باوضو ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت ہے مگر حضرت نے فرمایا ممکن ہے پاؤں کو کیچڑ لگے اس لئے دروازے پر پاؤں دھولیں گے کہ حرم شریف مُلطّخ[1] نہ ہو۔ اس سے قبل مجھے مکہ کی کیچڑ اور بارش کا منظر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ نیچے اُتر کر سڑک پر آئے تو زمین پاؤں کو پکڑے لیتی تھی۔ ہر قدم پر میری تمنا ہوتی تھی کہ کاش حضرت رخصت پر عمل فرماویں اور سمجھا تھا کہ حضرت بھی اس تکلیف کو برداشت نہ کرسکیں گے مگر ہر قدم حضرت کا مجھ سے آگے رہا۔ ہر ایک کے سر پر چھتری جدا تھی اور میرے ہاتھ میں لالٹین تو حضرت کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا۔ بازار ختم ہوا تو سڑک پر نادیوار مسجد الحرام پچیس تیس فٹ پھاٹ کا دریا بہہ رہا تھا اور اس زور سے پانی چل رہا تھا کہ دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ یہاں حضرت ٹھیرے اور میں سمجھا کہ اب واپسی کا حکم فرمائیں گے۔ مگر حضرت بولے چھتریاں تو اب بند کرلو اور پائینچے لو چڑھا جوتے لے لو بغل میں اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لو کہ سنا ہے رَو میں پتھریاں آتی ہیں اور گر جانے کا ڈر رہتا ہے۔ وہ پیارا منظر بھی اب تک نظر کے سامنے ہے کہ برہنہ پا گھٹنوں تک پائینچے چڑھائے قینچی کی طرح باہم ہاتھ ملائے چھتریاں بازو پر لٹکائے چلے اور بسم اللہ مجریها[2] کہہ کر رَو میں قدم ڈال دیئے۔ چونکہ نشیب کا رخ تھا اس لئے چھوٹی بڑی کنکریاں پانی کے ساتھ بہتی ہوئی اس زور سے آتی تھیں جیسے مٹھیاں بھر کر کوئی گولیاں مارتا ہے۔ آگے بڑھے تو گھٹنوں تک پانی آگیا اور قریب تھا کہ میرا پاؤں پھسلے مگر حضرت نے بازو تھام رکھا تھا کہ گرنے نہ دیا اور خدا خدا کرکے باب الصفا پر چڑھے۔ وہاں پہنچکر پہلی سیڑھی پر اول پاؤں دھوئے اور تواب کی الماری میں جوتے رکھے اس کے بعد بسم اللہ اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك[3] پڑھ کر حضرت نے مسجد میں قدم رکھا اور میں حضرت کا اتباع کرتا رہا۔

مکہ کی ہر چیز میں تغیر آگیا مگر حجر اسود، غار ثور اور غار حرا وہی ہے جس کو رسولِ خدا نے مس کیا

نماز پنجگانہ کے اہتمام کی خاطر حضرت کبھی جبل ثور پر نہیں گئے حالانکہ شوق ظاہر فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ بھئی ہر چیز بدل گئی اور تیرہ سو برس میں وہ زمین جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑا کرتے تھے خدا جانے کے گز نیچے دب گئی مگر دنیا میں دو[ع] چیزیں ابھی موجود ہیں جن کو جسدِ محمدی کے مس کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ ایک حجر اسود دوم غار ثور کے پتھر کہ یہی حجر اسود ہے جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبہائے مبارکہ لگے تھے اور غار ثور کے پتھر بھی

[1] آلودہ و خراب۔ [2] اللہ کے ہی نام سے ہے اس کا جاری ہونا۔ [3] مسجد میں داخل ہونے کی دعا۔ میں اللہ کے نام کے ساتھ داخل ہوتا ہوں اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

[ع] یہاں مولانا عاشق الٰہی سے ایک چیز شمار سے رہ گئی وہ غار حرا ہے (چشتی)

ابھی تک وہی پتھر ہیں جن سے مس کرتا ہوا آپ کا بدن غار میں پہنچا تھا۔ مگر جگہ دور ہے اور فجر کے بعد چل کر ظہر تک آجانا کہ حرم شریف کی نماز فوت نہ ہو طاقت سے باہر ہے اس لئے ہمت نہیں ہوتی؟ میں نوجوان تھا اور سمجھتا تھا کہ تیز چلنا کون دشوار ہے ایک قدم رکھا اور دوسرا اٹھایا اس لئے حضرت سے عرض کیا کہ مجھے اجازت ہو تو میں ہو آؤں۔ حضرت کو معلوم تھا کہ تیز رفتار ہوں اس لئے ذرا سکوت فرما کر کہا بہتر ہے مگر دیکھو ایک لاکھ نماز کا ثواب نہ جاتا رہے۔ میں نے کہا نہیں حضرت انشاء اللہ سویرے واپس آؤں گا۔ غرض صبح کو راضی کیا کہ راہبر بن کر چلے اور دس بارہ نوجوان مستعد رفقا ساتھ ہوئے تو ان سے بھی کہہ دیا کہ فجر شافعی کا سلام پھیرتے ہی چل پڑیں گے۔ مگر صبح ہوئی تو صبی ندارد۔ چونکہ عزم کر چکا تھا اس لئے بنام خدا رفقا کو ساتھ لے خود نکل کھڑا ہوا۔ کہیں کہیں راستہ پوچھا اور آخر انصاب دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ راہ ثور کی علامات ہیں تو قدم تین میل چل کر تین ہی میل جبل کی چڑھائی ختم کی اور نصف گھنٹہ غار میں لیٹ بیٹھ کر واپس ہوا اور اپنی انتہائی رفتار پر قدم ڈالے کہ ایک رفیق بھی ساتھ نہ رہ سکا۔ مگر افسوس کہ دروازۂ حرم پر قدم رکھتے ہی مکبر کی آواز آئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گھٹنے ٹوٹ گئے اور وہیں بیٹھ گیا۔ بعد میں حضرت سے ملا تو فرمایا بس اسی اندیشہ سے تو میری ہمت کبھی نہ ہوئی۔

مکہ کی گرمی مشہور ہے اور ایسی گرمی کا زمانہ حضرت نے وہاں گذارا ہے جو ناقابل برداشت تھی۔ ہر چند آپ کے مطوف[1] اور رفقا نے اصرار کیا کہ چند روز کے لئے طائف تشریف لے چلیں۔ مگر آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا کہ بھئی ہندوستان چھوڑ کر تو مسجد الحرام ہی کی خاطر آتے ہیں، اس کو چھوڑ کر طائف جائیں تو ہندوستان ہی چھوڑنا کیا ضرور تھا۔ سیر کے لئے تو وہاں بھی شملہ و منصوری موجود ہے۔ ہم تو کہیں جاتے نہیں۔ دکھم سکھم گذر ہی جائے گی؟

میں نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت حرم شریف میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت فرماتے اور اس کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے کہ حرم شریف کو راستہ بنایا جائے کہ چکر سے بچنے کے لئے مثلاً باب العمرہ کے پاس والے مسجد میں عبور کر کے سوق شامی یا باب السلام کے راستہ نکل کر بازار میں جائیں۔ اسی طرح کسی مسجد کو تماشا گاہ بنانا حضرت کو بہت ناپسند تھا۔ دارالطلبہ کی مسجد کلثومیہ تیار ہونے پر بعض عورتیں پردہ کرا کے دیکھنے آئیں تو آپ نے فرمایا جو وہاں جائے تحیۃ المسجد ضرور پڑھے[2]۔

جیپور میں بعض احباب کے اصرار پر آپ مشہور قلعہ[3] جو پہاڑ پر بنا ہوا ہے دیکھنے کو تشریف لے گئے اس کے قریب

---

[1] مطوف یا معلم کا ملازم۔ [2] عام طور سے حاجی صاحبان اس کی رعایت نہیں رکھتے اس سے کم درجہ کی چیزوں کے دیکھنے میں یہ دولت ضائع کر دیتے ہیں ان کو سبق لینا چاہئے کہ محبت کا کام اتنے بڑے ثواب سے کم ہے۔

[3] وہ آمیر کا قلعہ کہلاتا ہے۔ (چشتی)

ایک پرانی یادگار شاہی مسجد ہے اس میں آپ نے قدم رکھا تو فرمایا

مسجد عبادت کے لئے ہے یادگار سمجھ کر دیکھنے کیلئے نہیں

مولوی عاشق الٰہی وضو کر لو کہ دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کر لیں کیونکہ مسجد کو تماشہ گاہ بنانا جائز نہیں۔ یہ عبادت کے لئے ہے نہ کہ یادگار سمجھ کر دیکھنے کے لئے۔

ہر سفر میں ایک دو دن کا اعتکاف مسنون بھی آپ مسجد الحرام میں ضرور کرتے اور زمزم شریف خاص رغبت و احترام کے ساتھ چاہ پر حاضر ہو کر ڈول سے چھک کر پیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ مولوی محب الدین صاحب کے خلوہ میں معتکف تھے اور بندہ ساتھ تھا کہ تہجد سے فارغ ہو کر فرمایا چلو آج زمزم کا سب سے پہلا ڈول پئیں گے، سُنا ہے اس میں خالص کچے دودھ کا مزہ آتا ہے چنانچہ چاہ پر پہنچکر دیر تک انتظار کیا اور قفل کھلتے ہی اندر تشریف لے جا کر پہلا ڈول اول خوب شکم سیر ہو کر خود پیا اور پھر مجھے پلایا۔

حرم میں زمزم پلانے کی اجرت

زمزم پلانے والے جو مسجد میں پھرتے تھے کہ پلا کر پیسے مانگتے تھے ان سے پانی لینا آپ کو پسند نہ تھا اور فرمایا کرتے کہ یہ تو بیع و شرا ہے جو مسجد میں حرام ہے خصوصاً مسجد الحرام میں۔ کاش جبر نہ کیا کریں کہ پلانا ان کے لئے ثواب ہو اور صدقہ دینا معطی کے لئے سبب اجر۔ مگر جبر کی صورت نے اس کو خرید و فروخت بنا دیا جس سے معطی بھی غافل ہیں کہ نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق بنتے ہیں۔ اپنے دوستوں کو صاحبزادہ مولانا محمد حسن[1] کی طرف متوجہ فرماتے کہ مسائل حج میں جو کچھ پوچھنا ہو صرف مولانا سے پوچھنا اور خود بھی پابندی کے ساتھ مولانا کے پاس آتے اور کسی مسئلہ میں کوئی اشکال پیش آتا تو حل فرمایا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ مولانا کو مسائل حج کے جزئیات اتنے مستحضر ہیں کہ آج کوئی نظیر نظر نہیں آتی۔

رسالہ غنیۃ الناسک

مولانا نے مناسک حج میں سات برس کے اندر ایک رسالہ غنیۃ الناسک تالیف فرمایا تھا حضرت نے اس کو تقاضہ کے ساتھ نقل کروایا اور جب بندہ حاضر حرمین ہوا تو تاکید فرمائی کہ نقل اپنے ساتھ ضرور لیتے آنا۔ چنانچہ بندہ نے نقل کا خود مولانا کے ساتھ اصل سے مقابلہ کیا اور ساتھ لا کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے بعض احباب کو ترغیب دے کر سو سو نسخے کا حصہ دار بنایا اور ایک حصہ خود لیا اور اس کو طبع کرایا کہ محفوظ و نافع بنے کیونکہ موجودہ

---

[1] حضرت ممدوح علاقہ سوات کے باشندے حضرت گنگوہی کے شاگرد عرصہ سے مہاجر و مقیم مکہ تھے۔ فقہ میں بالخصوص مناسک حج کی واقفیت میں بے مثل تھے۔

ضروریات کے لئے مناسکِ حج میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں. حضرت فرمایا کرتے تھے کہ حج میں مسلمان اتنا روپیہ خرچ کرتے اور اتنی مشقت اٹھاتے ہیں مگر افسوس ہے کہ حج کو بطریقِ مسنون ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ سارا روپیہ اور محنت ٹھکانے لگے۔ عوام جب حج کو جاتے تو حضرت تاکید فرماتے کہ کسی دیندار فقیہ عالم کی مرافقت تلاش کرو، اور علماء جاتے تو آپ وصیت فرماتے کہ یہ جدید مطبوعہ مناسک[1] ضرور اپنے ساتھ رکھو اور شروع سے جس نسک کا وقت قریب ہو اس کا باب دیکھنا اور بار بار مطالعہ کرنا لازم کرلو۔

مولانا محمد حسنؒ مولانا محمد حسن صاحبؒ کا زہد کہ سال بھر میں ۵۰ سے زیادہ خرچ نہیں رکھتے اور توکل کہ کسی سے بطمع ملنا بھی پسند نہیں کرتے اور استقامت کہ باوجود ضعفِ بصر اور زمانہ پیری کے نماز کی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی تھی. حضرت کی نظروں میں بڑا پیارا تھا اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ بس ہجرت تو ایسے لوگوں کی ہے. حضرت کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا نے بھی وصال فرمایا اور غنیۃ المناسک اپنی یادگار باقیات الصالحات چھوڑ کر جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے فرحمہ اللہ واطاب ثراہ۔

حضرت نے باوجودیکہ حج سات کئے مگر اس لحاظ سے کہ آپ کا دل ہر سال حاضری حرمین شریفین کا متمنی و مشتاق رہتا اور زندگی کا ہر لمحہ اسی تمنا و شوق میں گذرتا تھا گویا آپ کا بدن بھی دل کی طرح بیت اللہ و بیت الرسول ہی پر پڑا رہتا تھا۔ آپ کے واقفین میں جب کوئی حج کو جاتا تو آپ اس کو اجازت دیتے اور بحسرت فرماتے کاش مجھے بھی یہ دن نصیب ہوتا ؎

جب کبھی سنتا ہوں جاتا ہے کوئی حج کیلئے   حسرت آتی ہے کہ یہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

بندہ نے ۱۳۲۸ھ میں جب مع اہل کے حج کا قصد کیا اور حضرت کی اجازت کے بعد دعا کی درخواست لکھی تو حضرت کا جواب آیا. آپ اس مبارک سفر میں جا رہے ہیں اب بھی دعا کرتا ہوں اور انشاء اللہ تاواپسی آپ کے لئے دعا کرتا رہوں گا اللہ تعالیٰ شانہ آپ کو دینی اور دنیوی مکارہ سے محفوظ رکھے اور صحت و عافیت و استقامت مرافق بناوے اور تمام اعمال قبول فرماوے۔ بمبئی میں جب میں میاں ضیاء الاسلام وغیرہ سے ملنے گیا تھا جہاز طیار دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا تھا کہ ساتھ ہولوں۔ اب آپ کی روانگی پر بھی طبیعت میں یہی رغبت ہوتی ہے. خوابوں میں بھی یہی خیالات ہیں لیکن جب کشش ہوگی اسی وقت ظاہری حاضری ممکن ہوگی ہر حال آپ جا رہے ہیں اور بے اختیار آپ کے ہمراہ دل بھی کشاں کشاں جا رہا ہے۔ اللہ معکم حیث ما کنتم۔

---

[1] غنیۃ المناسک اردو میں معلم الحجاج مفتی مظاہر علوم کی لکھی ہوئی بہترین کتاب ہے۔ [2]

[2] منافع و فوائد۔ [3] اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہوں جہاں بھی آپ ہوں۔

آپ کو اپنے متبعین کے ساتھ باپ سے زیادہ شفقت تھی کہ سفر میں بالخصوص آپ کا دھیان انھیں میں پڑا رہتا تھا۔ حافظ فخر الدین صاحب مع اہلیہ رمضان شریف مکہ مکرمہ میں گذارنے کی نیت سے اسی سال حج کو روانہ ہوئے مگر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے مسافر خانہ بمبئی میں اتنا قیام کرنا پڑا کہ اہلیہ کا دل گھبرایا اور قصد کیا کہ یہاں پڑے رہنے سے کیا حاصل گھر ہی چلیں کہ بچوں سے مل کر بعد عید جہاز جانے کے وقت آجائیں گے حضرت نے منع کیا اور تحریر فرمایا کہ تم سفر حج میں ہو گویا حج ہی میں ہو واپسی کا قصد نہ کرو اور میں ان شاء اللہ تم سے وہیں آکر ملوں گا۔ چنانچہ آپ کو راندیر کا سفر پیش آیا اور آپ گنجایش نکال کر بمبئی پہنچے۔ حاج ضیاء الاسلام کاندھلوی بھی جارہے تھے اور انھوں نے ڈاک کے جہاز کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ بمبئی اسٹیشن پر اترتے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ ضیاء الاسلام جہاز پر روانہ ہولئے چنانچہ آپ سیدھے بندر پر آئے اور بصد کوشش و تدبیر جہاز پر پہنچ کر ان سے ملے۔ جب جہاز چھوٹ لیا تو آپ مسافر خانہ میں آئے اور حافظ فخر الدین صاحب سے مل کر ان کی اہلیہ کو تسکین دلائی اور بچوں کی طرف سے ہر طرح مطمئن و مسرور بنا کر دیر کے بعد اپنی قیام گاہ پر آکر آرام فرمایا۔

وہ سال کچھ زیادہ شورش و بدامنی کا تھا کہ ہمارا قافلہ مدینہ منورہ جاتا ہوا منزل خیف میں محبوس ہو گیا اور پورے اٹھائیس دن ہم پانچ سو اونٹوں کے مسافر کھلے میدان میں قید رہے کہ جب تک دس گنی فی شغدف نہ دیں گے آگے نہ جاسکیں گے۔ قافلہ میں چارطرف سے عورتوں کے نوحہ و بین کی آوازیں آتیں اور اچھے اچھے مرد سراسیمہ دکھائی دیتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں میری وجہ سے سب میں زیادہ پریشان ہونے والا صرف روحانی باپ کا دم ہے کہ خلافِ عادت خط نہ پہنچنے سے خدا جانے کیا کیا واہمے لائے گا مگر مجبور تھا کہ خود گرفتار تھا پھر خط ڈاکخانہ میں کیسے پہنچاتا۔ خط لکھنا پہلے ہی دن شروع کر دیا اور روزانہ کے حالات قلمبند کرتا رہتا تھا مگر حضرت تک پہنچانا قابو کی بات نہ تھی۔ ایک سانڈنی سوار بدو کو معاوضہ دیکر خط بھی دیا کہ ینبع کے ڈاکخانہ میں ڈالدے مگر واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خط نہیں پہنچا۔ میرا خیال صحیح نکلا کہ حضرت کو جب ولایتی ڈاک میں یکشنبہ کے دن کوئی خط نہ ملا تو پریشان ہو گئے اور ہفتہ میں کئی بار فرمایا اس ڈاک سے عاشق الٰہی کا خط نہیں آیا معلوم کیوں۔ دوسرا ہفتہ خالی گیا تو اور پریشانی بڑھی حتیٰ کہ تیسرے ہفتہ حجاز کی خبر افواہ کے درجہ میں پھیلی کہ مدنی قافلہ کو بدوؤں نے قید کر لیا اور بہت آدمی مارے گئے۔ اس خبر پر تو حضرت کی پریشانی کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ حضرت اکثر مغموم و متفکر بیٹھے رہتے اور کبھی کبھی ٹھنڈے سانس بھرا کرتے تھے میرے مکان پر بھی اعزہ کو پریشانی تھی اور انھوں نے تین ہفتہ خط نہ آنے پر حضرت کو لکھا کہ حضرت کے پاس کوئی خط ضرور آیا ہوگا ہم لوگوں کو خیریت سے مطلع فرماویں۔ اس کا جواب حضرت نے فوراً دیا اور لکھا کہ میں خود

نہایت پریشان ہوں اور اس افواہ نے تو کمر توڑ دی۔ بجز اس کے کہ اپنے اللہ پر بھروسہ کئے بیٹھا ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ تحت جگر انشاء اللہ بخیریت ہے لیکن آنا کب مقدر ہے یہ نہیں بتا سکتا میں بھی دعا کر رہا ہوں تم بھی دعا کرو۔

میری اہلیہ اس وقت سخت بیمار تھی کہ شغدف سے نیچے اُترنا بھی دشوار تھا اور اس کی زندگی سے مایوسی تھی مگر الحمد للہ اس قدر مستقل مزاج تھی کہ ایک لمحہ کو بھی اسے ہراس نہ ہوا۔ ہاں جب بدوؤں کا اصرار ہوا کہ لاؤ اور قافلہ کا انکار ہوا کہ پیسہ بھی پاس نہیں تو دفعۃً اعلان ہوا کہ حملہ ہو کر قتل عام ہوا چاہتا ہے۔ اس خبر نے چار طرف گریہ و بکا کا کہرام مچا دیا اور اس وقت اس کے بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ کہہ کر یا اللہ عصمت و آبرو تیرے ہاتھ ہے، کاش شوہر سے پہلے مجھے قتل ہونا نصیب ہو۔ وہ رونے لگی، اس پریشانی میں اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب دیکھا کہ حضرت موجود ہیں اور اونٹ کی مہار تھام کر پہاڑ کے اوپر چڑھ رہے ہیں۔

ادھر بندہ نے خواب دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور غایت حزن میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیقہؓ سے کوئی قصہ ہوا ہے اس لئے میں اس سعی میں ہوں کہ صفائی کراؤں تاکہ حضرت کا ملال رفع ہو۔

آنکھ کھلی تو رہائی کا سامان شروع ہو چلا اور آخر سعی میں مجھے اٹھنا پڑا کہ بدوؤں اور اہلِ قافلہ میں سمجھوتہ ہو، ۱۰ محرم کا محبوس قافلہ ۱۰ صفر کو مدینہ میں داخل ہو لیا۔ وہاں سے بقیہ حالات کا ڈالا ہوا خط حضرت کو ملا مگر ایسے وقت کہ چوتھے دن میرا تار پہنچ گیا کہ میں براہ سہارنپور آ رہا ہوں۔ کیا ٹھکانا تھا حضرت کی مسرت کا کہ گاڑی آتی تھی ایک بجے مگر حضرت مدرسہ سے فارغ ہو کر بارہ ہی بجے اسٹیشن پر پہنچ لئے اور پوری دعوت کا تیار کھانا ساتھ۔ گاڑی آئی تو ادھر حضرت مجسم انتظار ایک ایک گاڑی پر نظر ڈال رہے تھے اور ادھر میں کھڑکی سے منہ نکالے حضرت کی صورت کا متمنی تھا کہ دفعۃً آمنا سامنا ہوا اور میں کھڑکی ہی سے نیچے کود پڑا۔ حضرت نے لپک کر چھاتی سے لگایا مگر آنسو میری آنکھوں میں بھی تھے اور حضرت کی آنکھوں میں بھی۔

ایک مرتبہ بندہ حضرت سے اجازت لے کر مدینہ منورہ سے حجاز ریلوے میں دمشق چلا گیا۔ مدنی اسٹیشن تک حضرت پہنچانے آئے اور جس وقت گاڑی آ جانے پر رخصتی معانقہ فرمایا تو اس حالت کو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا کہ حضرت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور قلب میں غیر معتدل حرکت۔ گرامی نامہ دست مبارک کا لکھا ہوا پیچھے پیچھے پہنچا جو مجھے بیت المقدس میں ملا اس میں تحریر فرمایا تھا آپ انشاء اللہ مع الخیر منزل مقصود پر پہنچ لئے ہوں گے مگر آپ کے چلے جانے سے میں تو بیکار محض ہو گیا ع از دیدہ برفتی و نرفتی ز دل ریش[1]۔

[1] آنکھ سے تو تم دور چلے گئے مگر زخمی دل میں سے نہیں جا سکے۔

واپس وطن آیا تو حضرت ۲۵ دن قبل وطن پہنچ لئے تھے مگر میرے اعزہ کو لکھ چکے تھے کہ تار آتے ہی مجھے خبر دینا کہ اسی دن ملنے کے لئے آسکوں. چنانچہ حضرت تشریف لائے اور واپسی کے وقت فرمایا اب سہارنپور پہنچکر اقامت[1] کی نیت کروں گا کہ اب تک تیرے انتظار میں کہ خدا جانے کس دن آجاوے مسافر بنا رہا اور نیت اقامت نہ کرسکا۔

میری ہی خصوصیت نہیں بلکہ حضرت کو اپنے خدام و منتسبین کے ساتھ بالعموم اس درجہ محبت تھی کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا میری برابر حضرت کو کسی سے بھی تعلق نہیں ہے مگر با ایں شفقت سیاست و اصلاح سے غفلت نہ ہوتی تھی کہ کسی سے کوئی عجب و ناز یا کوتاہی دیکھتے تو زبان سے تو بہت کم فرماتے مگر بے رخی و اعراض کا برتاؤ زیادہ فرماتے جس سے طالب بے چین ہو کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا اور بزبانِ حال کہتا تھا ؎

از فراقِ تلخ مے گوئی سخن ہرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن[2]

میرے متعلق بھی ایسا پیش آیا کہ بعض حاسد لوگوں نے حضرت کے کان میں میرے متعلق کچھ ڈالا اور میں نے اپنے ضعفِ قلب کی وجہ سے اس معاملہ کی صفائی سے وحشت کھائی جس پر یہ گمان صحیح ہو گیا کہ میری طرف جس خطا کا انتساب ہوا وہ بجا اور ٹھیک ہے. چنانچہ حضرت نے خط بھیجنا بند کر دیا اور بندہ نے مسلسل تین خط نہایت بے چینی میں لکھے مگر حضرت نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ آخر پریشان ہو کر چوتھا خط لکھا تو جواب تیز آیا کہ اول معاملہ کی صفائی کرنا ضرور ہے. چنانچہ حاضر خدمت ہوا اور بالمواجہ قائل سے دعوے کی ثبوت و صفائی ہوئی۔ حضرت کو جب علم ہو گیا کہ مجھ پر لے وجہ الزام اور اس کو سچ ثابت کرنے کے لیئے ایک گہری چال چلی گئی تھی تو حضرت کی شفقت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا اور پہلے سے بدرجہا زیادہ توجہ و کرم فرمانے لگے اور فرمایا غلطی سے دنیا میں کوئی بشر خالی نہیں مجھ سے بھی غلطی ہوئی اور اب بالکل اطمینان رکھو انشاء اللہ آیندہ ایسی نوبت کبھی نہ آئے گی۔ دو ہفتہ کا وہ تلخ زمانہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے تو طبیعت پریشان ہو جاتی ہے مگر اس کے ثمرات و برکات پر نظر ڈالتا ہوں تو شاکی کو اپنا محسن سمجھتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس کو میرے لئے وسیلۂ خیرات[3] بنایا

حضرت ہمارے بطیٔ الغضب اور سریع الفیٔ[4] تھے کہ غصہ بدیر آتا اور جلد اتر جاتا تھا. مجھے حیرت

---

[1] چونکہ سہارنپور وطن نہ تھا مدرسہ کے کام سے وہاں قیام تھا اس لئے سفر سے واپس آنے پر پندرہ روز کے قیام سے قصر ختم ہوتا تھا یہ نیت نہ ہوئی تو سفر قصر ہی رہا۔ [2] سخت وکڑوی جدا ہونے کی جو بات آپ کرتے ہیں بس جو چاہے کیجئے لیکن یہ نہ کیجئے کہ جدا کر دیں۔ [3] نیک کیفیات کا ذریعہ۔ [4] دیر میں غصہ ہونے والے اور جلد بے غصہ ہو جانے والے جس کی حدیث میں تعریف ہے۔

ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ حضرت کو غصہ آیا اور تیز لہجہ میں دھمکا رہے ہیں مگر جس وقت معتوب نے گردن جھکا کر زبان سے اتنا لفظ نکالا کہ حضرت بیشک مجھ سے خطا ہوئی اور آئندہ انشاء اللہ ایسا کبھی نہ ہوگا تو گویا حضرت کو غصہ آیا ہی نہ تھا، نہ آواز میں تیزی رہی نہ چہرہ پر سرخی۔ یہ فرما کر کہ بس بہت اچھا اسی محبت کے ساتھ باتیں کرنے لگتے جو آپ کا معمول تھا ہاں اگر اس کو ندامت نہ ہوتی تو حضرت پر اس کا اثر بڑھ جاتا اور اگر کسی کی قسمت میں شقاوت[1] مقدر ہوتی تو وہ حضرت کے غصہ کو جو کہ محض اس کی اصلاح نفس کے لئے ہوتا تھا ناگواری کے ساتھ دیکھتا اور کشیدگی[2] اختیار کرتا تھا اول اول حضرت اس کا تذکرہ تاسف[3] کے ساتھ اپنے دوستوں سے فرماتے اور آخر خالی الذہن ہو کر ہمیشہ کے لئے یکسو ہو جاتے تھے مگر ایسا بہت کم شاید ایک یا دو ہی کے ساتھ پیش آیا ہو ورنہ حضرت کا شفقت آمیز غصہ ہمیشہ بار آور[4] مثمر حسنات[5] ہوا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنی مخلوق کی اصلاح کے لئے نعمت[6] و نقمت کو توام بنایا اور ہر دو ابتلا[7] میں ثابت قدم رہنے کو اخلاص اور بے نفسی جانچنے کی کسوٹی قرار دیا ہے جس سے کسی زمانہ میں کوئی مرشد و مصلح حق کہ وجود باجود سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی خالی نہیں[8] رہا۔

حضرت کی سخاوت بھی حیرت بخش تھی کہ اکثر خدام تبرک کے خواہشمند ہوتے تھے اور اس وقت سائل کی حیثیت کے موافق جو کچھ بھی پاتے بے دریغ عطا فرمایا کرتے تھے۔ مولوی حبیب الرحمٰن سہاوری شرم کی وجہ سے حضرت کی خدمت میں تو عرض نہ کر سکے مگر حاجی مقبول احمد سے کہ حضرت کے سالے تھے کہا کہ حضرت سے ایک

---

[1] بدبختی۔ [2] الگ ہو جانا مغرور میں پھنسا رہنا۔ [3] افسوس کے ساتھ کہ ممکن ہے کوئی اس کو سمجھا کر راہ پر لے آئے یہ بھی کمال شفقت تھا۔ [4] نیک کیفیتوں کا پھل دینے والا کہ اس سے وہ اصلاح ہو جاتی جو برسوں کے مجاہدہ سے نہ ہوتی [5] انعام و سزا کو جوڑواں بچے ساتھ والے۔ [6] امتحان۔ [7] اصلاح کے لئے حضور نے بھی ناراضی ظاہر فرمائی تھی۔

عـہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ دوپہر کے وقت حضرت اپنے حجرہ سے جہاں آرام فرما رہے تھے باہر آئے اور استنجا کرنے کے لئے پانی لینا چاہا میں نے دیکھا تو دوڑ کر کنوئیں سے ڈول کھینچا اور لوٹا بھر کر پیش کر دیا حضرت استنجا کے لئے غسلخانہ میں چلے گئے میں نے دوسرا لوٹا بھر کر بطور کھیل کے اس لوٹے کا پانی بہانا شروع کر دیا اتنے میں حضرت تشریف لے آئے میری یہ حرکت دیکھ کر حضرت کو غصہ آگیا اور ایک چپت رسید کیا کہ پانی ضائع کر رہا ہے۔ یہ تادیب میرے لئے عمر بھر کا سبق بن گئی اس وقت میری عمر گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔

جب میں فارسی درجہ میں منشی فیاض علی صاحب سے پڑھتا تھا میرے چھوٹے بھائی اسحاق احمد نے روتے ہوئے حضرت کے پاس جا کر میری شکایت کر دی "دادے جی مجھے بھائی نے بہت ستایا ہے۔ حضرت سنتے ہی فارسی درجہ میں جو مدرسہ قدیم کے دروازہ کی چھت پر واقع ہے غصہ میں بھرے ہوئے آئے اور قمچی لیکر میری خوب پٹائی کی۔ یہ دو واقعے خود مجھ پر بیتے ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت نے غصہ ہو کر کسی کی پٹائی کی ہو۔

علاوہ مہمانداری کے حضرت کے یہاں کنبہ پروری بھی کافی ہوتی تھی میں نے اپنے بچپن سے یہ سماں دیکھا ہے کہ حضرت کے یہاں حضرت کے سالے حاجی مقبول احمد اور منظر علی خاں مسعود علی خاں (حضرت کی زوجہ کے دو بھانجے) مستقلاً رہتے تھے۔ نیز حضرت کے اپنے قرابتدار یعنی بڑی بہن محمود النساء اور ان کے پوتی پوتے (حبیبہ خاتون، احسان احمد اخلاق احمد اسحاق احمد ادریس احمد) (باقی برصفحہ آئندہ)

عربی رومال تبرکاً لیتا۔ چند روز بعد یہ رات کی گاڑی سے سہارنپور آئے اور حضرت سے قبیل فجر ملاقات ہوئی جبکہ حضرت حسب معمول مکان سے تشریف لائے۔ مصافحہ و مزاج پرسی کے بعد اول ہی حضرت نے فرمایا حافظ جی تم نے حاجی جی سے رومال کو کہا تھا اور اتنا فرما کر فوراً سر مبارک سے رومال اتار کر ان کو عطا فرمادیا کہ بیش قیمت بھی تھا اور حضرت کا مستعمل ہونے کے سبب تو بے بہا ہو گیا تھا۔

ایک بار مجھے بھی شوق ہوا کہ حضرت سے کوئی تبرک لیتا اور دبی زبان سے عرض کیا حضرت نے فوراً ہی چادر مبارک جس کو اوڑھ رہے تھے اتار کر لپیٹی اور خادم سے فرمایا بھئی یہ ان کے بیگ میں رکھدو۔

مولوی عبداللہ جان صاحب فرماتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ تھا اور اتفاق سے میری ساری گھڑیاں مرمت کے لئے گئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے گونہ تکلیف تھی حضرت کے پاس حاضر ہوا تو سرسری طور پر اس کا ذکر آگیا حضرت خاموشی کے ساتھ اٹھے اور حجرہ میں سے ایک جیبی گھڑی لاکر مجھ کو دیدی، اس وقت تو میں نے بطیب خاطر لے لی کہ مستعار سمجھا تھا اور ضرورت بھی تھی مگر عید کے دن جب اس کو واپس کرنا چاہا تو حضرت نے فرمایا کیا واپس لینے کے لئے دی تھی؟ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ عطا تھی اور میں نے اس کو اپنی ملک بنا لیا مگر اس کو معمولی گھڑی سمجھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھڑی ساز میرے مکان پر گھڑیاں دیکھنے آیا تو میں نے یہ گھڑی

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) طویل طویل عرصہ تک حضرت کے یہاں آکر رہتے۔ احسان احمد اور میرا ابتدائی تعلیم کا زمانہ حضرت ہی کے گھر میں گذرا ہے۔ میزان منشعب کا پہلا درس مجھے حضرت نے خود دیا پھر مولوی شمس الحق (برادر اکبر مولانا بدر عالمؒ) اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے فرمایا کہ اس کو سبق دیدیا کرو۔ حضرت نے مدرسہ میں دار التجوید کا آغاز فرمایا قاری قاسم یا قاری ضیاء الدین اس کے پہلے استاذ مقرر ہوتے اور اس درجہ کے پہلے متعلم مسعود علی خاں اخلاق احمد نذیر حسن اور جہاں تک یاد ہے مولانا محمد حامد مولانا بدر عالمؒ وغیرہ تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ باہر سے کوئی مہمان آتا تو حضرت ہم لڑکوں کو بلا کر قراءت سنواتے جس سے وہ لوگ بہت متاثر ہوتے۔

مذکورہ بالا دو قاریوں کے بعد قاری عنایت اللہ اعظم گڈھی بھی یہاں معلم قراءت رہے۔ ان کے بعد قاری عبدالعزیز صاحب جونپوری تشریف لائے اور طویل مدت تک مدرسہ میں کام کرتے رہے موصوف بڑے جہیر الصوت اور خوش آواز قاری تھے قدیم مدرسہ کی مسجد میں اکثر نمازیں اور جمعہ کی نماز دار الطلبہ کی مسجد کلثومیہ میں قاری صاحب ہی پڑھایا کرتے تھے۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کا زمانہ میں نے حضرت مولانا فاروق احمد صاحب کی زیر نگرانی مدرسہ دینیات بہاولپور میں گذارا شرح جامی کنز شرح تہذیب دیوان علی تک تعلیم پاکر میں نے پھر مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ کیلئے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا اشرف منظوری حضرت نے کارڈ ارسال فرمایا اس کا آغاز لخت جگرم سے تھا اس کے بعد طالب علمی اور مدرسی کے طویل زمانے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بے پایاں الطاف اور شفقتوں سے مستفید ہوتا رہا —— بزمانہ طالب علمی مجھے خرچ کی سخت تکلیف پیش آئی زبانی عرض کرنے کی ہمت نہ ہوئی پرچہ لکھ کر ڈاک کے ساتھ ملا نذیر کے ذریعہ حضرت کے پاس بھیجدیا عصر کی نماز کے بعد حضرت نے مجھے بلایا اور حجرہ کے سامنے والی سہ دری میں الگ لیجا کر بیٹھے اور بڑی شفقت سے فرمایا تم مجھ سے ہر مہینے تین روپے لے لیا کرو چنانچہ میں کئی مہینے تک حضرت سے یہ عطیہ حاصل کرتا رہا۔

ایک بار حضرت نے اپنے دو سفید لٹھے کے چوغے مجھے مرحمت فرمائے۔ حضرت سردی کے زمانے میں استنبولی جامہ وار کا ایک بہت خوبصورت انگرکھا پہنا کرتے تھے جو حضرت کے حسین قد و قامت پر بہت زیب دیتا تھا۔ ایک روز میں شام کے وقت حاضر تھا حجرہ میں تشریف لے گئے وہ قیمتی انگرکھا مجھے عطا فرما دیا۔ جس کو میں کبھی کبھی پہن کر بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔

بھی اس کو دکھائی، اس نے کہا کہ تمہاری جتنی بھی گھڑیاں ہیں اس کے سامنے سب کھلونا ہیں اور یہ گھڑی اصلی انگلش لیور ہے جو بدرجہ اقل سو روپیہ کے لگ بھگ قیمت کی ہے۔ تب تو میری آنکھیں کھلیں اور اس گھڑی کی وقعت میری نظروں میں ہو گئی۔ پھر میں نے مختلف گھڑی سازوں کو دکھایا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ تو بڑی نادر الوجود گھڑی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے غصہ میں ناراض ہو کر باہر صحن میں بیٹھے ہوئے بہت زور سے یہ گھڑی نوکر کے مارنے کے لئے اس کی طرف پھینکی جو برآمدہ میں کھڑا تھا۔ نوکر کے تو لگی نہیں بلکہ دیوار سے ٹکر کھا کر زمین پر گر گئی۔ میں نے جی میں سمجھ لیا کہ گھڑی تو ٹوٹ ہی گئی مگر یہاں مرمت نہ ہو سکے گی کسی انگریزی کارخانہ میں بھیجوں گا۔ اگلے دن جو دیکھتا ہوں تو گھڑی چل رہی ہے اور وقت صحیح دے رہی ہے میں حیرت سی مبہوت ہو کر رہ گیا، وہ دن ہے اور آج کا دن کہ گھڑی بدستور چل رہی ہے اور مرمت کا نام بھی نہیں آنے دیتی۔

ایک مرتبہ کوئی بزرگ تشریف لائے اور ان کو نعلین کی ضرورت تھی جیسے ہی حضرت کو معلوم ہوا حضرت نے اٹھ کر اندر سے جوتوں کا ایک نیا جوڑا لا کر نذر کیا اور ان بزرگ نے اسی وقت اس عطیہ کو لیکر سر پر رکھ لیا۔

شیخ محمد یعقوب صاحب نائب تحصیلدار پٹیالہ مؤلف عشرہ کاملہ ایک بار حاضر خدمت ہوئے اور خود عرض کی ہمت نہ پا کر حاجی احمد حسن صاحب کی معرفت مستعمل ملبوس کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت مسکرائے اور سبب پوچھا۔ عرض کیا کہ حضرت کچھ طبیعت ہی کا تقاضا ہے۔ ململ کا کرتہ زیب بدن تھا حضرت نے فرمایا اچھا بھئی یہ ہمارا حاجی کرتہ ہے جو گذشتہ سفر حج میں پہنا تھا یہی لے جانا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا انھوں نے عرض کیا حضرت میں اسی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ آپ اٹھ کر حجرہ میں تشریف لے گئے اور دوسرا کرتہ پہن کر پہلا کرتہ اُن کو عطا فرما دیا۔ حضرت کے بدن کا بالائی حصہ کبھی کبھی مکشوف نہیں ہوتا تھا اِلّا بضرورتِ خاص کہ کبھی جمعہ کے دن گرمی میں کسی خادم سے کمر ملواتے تو تنہائی میں کرتہ اتار دیا کرتے ورنہ غسل کے بعد باہر تشریف لاتے تو اندر ہی کپڑے پہن کر تشریف لایا کرتے تھے۔ عمامہ حضرت[عـــہ] متوسط طول کا باندھتے تھے مگر نہایت خوبصورت۔ شملہ دو سوا دو بالشت پیچھے چھوڑتے اور اکثر مشروع بھاگلپوری کا سبز یا کاہی ہوتا تھا۔ ہمیشہ آپ کھڑے ہو کر عمامہ باندھتے اور اس کے پیچ داہنی طرف سے بائیں جانب جاتے تھے۔

سفر میں احباب کے لئے ہدایا آپ کہیں سفر میں جاتے تو آپ کا معمول تھا کہ تمامی مخلصین کے لئے ہدایا اور سوغات لایا کرتے تھے جس میں اس پر بھی نظر رہتی تھی کہ کس کو

عـــہ حضرت کے عمامہ اور رومال میں ایک لطیف قسم کی خوشبو آتی تھی مجھ جب کبھی گھر سے مدرسہ یا مدرسہ سے گھر لیجانے کا اتفاق ہوتا تھا تو میں راستہ بھر اس مہک کا لطف اٹھاتا تھا۔ اس خوشبو سے ہم اکثر حضرت کے کپڑوں کو پہچان لیتے تھے (اخلاق احمد غزالی)

کیا شے مرغوب یا کس چیز کی ضرورت ہے چنانچہ رنگون سے آپ واپس تشریف لائے تو دو بڑے بکس آپ کے ساتھ تھے۔ تمامی مدرسین کے لئے ایک ایک جوڑہ کا کپڑا ان میں بند تھا اور کسی کیلئے بنیان تھا کسی کے لئے ٹوپی مجھے اونچی ٹوپی پہننے کی عادت تھی جب حاضر ہوا تو حضرت ایک خوبصورت بید کی بُنی ہوئی ٹوپی اور ایک رنگین خوبصورت کھڑاؤں نکال کر حجرہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا تمہیں اونچی ٹوپی مرغوب ہے اس لئے تمہارے لئے یہ لایا ہوں اور گھر میں کے لئے کھڑاؤں۔

ڈیرہ غازیخاں سے حضرت کی تشریف آوری پر حاضر ہوا تو حضرت نے وہاں کے بنے ہوئے خوبصورت پنکھے عطا فرمائے کہ موسم گرمی کا تھا غرض اتباع سنت کے علاوہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حضرت کو کسی وقت بھی اپنے مخلصین سے ذہول ونسیان نہیں ہوتا۔

سفر حج سے واپس تشریف لاتے تو چار چار کنستر زمزم اور کھجور کے لاتے اور عرصہ تک آپ کے پاس خدام کی آمد رہتی مگر کوئی بھی حضرت کے تبرک سے محروم نہ جاتا۔ مدرسہ کے طلبہ ومدرسین کی کثیر جماعت تو حضرت کے قریبی روحانی رشتہ دار تھے ہی کہ ایک ایک طالب علم کو خالص زمزم عطا ہوتا تھا۔ پھر باہر سے جو کوئی بھی جب کبھی آتا پہلا لفظ حضرت یہی فرماتے کہ بھئی ان کو زمزم پلاؤ اور مدنی کھجور کھلاؤ۔ اس کے علاوہ مخصوص خدام اور محترم دوستوں کے لئے عمدہ تسبیح شامی رومال جا نماز یا اور کوئی قیمتی چیز جو [illegible] وہاں کی ہوا لگی ہو خرید کر لاتے۔

مخلصین کے ہدیے

حضرت اپنے مخلصین کے ہدایا نہایت مسرت سے قبول فرماتے تھے مگر جس قدر ہدایا حضرت نے خود تقسیم فرمائے شاید قبول فرمانے کی نوبت اس سے چوتھائی بھی پیش نہ آئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی حضرت چونکہ صاف گو بہت تھے اس لئے بے تکلف خدام سے ہدیہ کا عیب ظاہر بھی فرما دیا کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے لکھنؤ کے خربزے بھیجے جو شیریں نہ تھے۔ آپ نے تحریر فرمایا تم پیسے خرچ کرکے چیز بھیجو اور مجھے شیریں معلوم نہ ہوں اس سے کیا فائدہ۔ ایک صاحب نے آم بھیجے اور جب انہوں نے حاضر ہو کر دریافت کیا کہ حضرت آم کیسے تھے؟ بیساختہ فرمایا کچھ نہیں تم نے تکلیف اٹھائی اور مجھے پسند نہ آئے ترشی غالب تھی۔

دنیاداروں کے ہدایا سے گریز

دنیاداروں کا ہدیہ قبول کرنے میں آپ کو دریغ ہوتا اور جس ہدیہ میں اخلاص نہ ہوتا اس کو آپ رد فرماتے تھے۔ بمبئی میں ایک سیٹھ نے آپ کے حج کو جاتے وقت ملازم کے ہاتھ سو روپے بھیجے کہ مجھے حاضری کی فرصت نہیں اس لئے روپے آدمی کے ہاتھ بھیجتا ہوں قبول فرما دیں۔ آپ نے واپس فرما دیا کہ بحمد اللہ مجھے ضرورت نہیں۔ آخر وہ خود آیا اور

معذرت کی تب آپ نے قبول کیا۔ اگر کسی غریب کا کوئی ہدیہ ہوتا تو آپ اس کی بڑی عظمت فرماتے اور ایسے قبول فرماتے تھے گویا اس کے محتاج ہیں۔

ایک شخص نے ٹوپی پیش کی جو شاید ۸ ؍ سے زیادہ کی نہ ہوگی آپ نے مسکرا کر اس کو لے لیا اور اسی وقت اوڑھ کر اپنی ٹوپی کو بکس میں رکھوا دیا۔

آپ قاضی عبد المجید صاحب کی درخواست پر شملہ تشریف لے گئے۔ جس نے بھی دعوت کا اصرار کیا آپ نے فرمادیا کہ ہماری دعوت تو عبد المجید نے سہارنپور میں کردی تھی اس لئے ہمیں تو دوسرے کی دعوت منظور کرنے کا حق رہا نہیں دعوت کے ذمہ دار تو یہ ہیں ان سے کہو یہ اپنے ہاں کھلائیں یا دوسروں کے ہاں، ہمیں تو کھانے سے بحث ہے۔ ان سے کہا جاتا تو یہ منظور کرتے نہ تھے کہ دو دن کے لئے تو یہ دولت نصیب ہوئی جو کچھ بھی برکت ہو وہ گھر میں رہے۔

بیوہ کی دعوت کچھ دیر بعد ایک لڑکا آیا اور اس نے اپنی بوڑھی ماں کا سلام پہنچا کر درخواستِ دعوت پیش کی۔ استفسارِ حال سے حضرت کو معلوم ہوا کہ وہ بیوہ ہیں اور حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہیں اور اسی تعلق پر دعوت کررہی ہیں حضرت نے بڑی خوشی سے منظوری بخشی اور یوں فرمایا کہ میرا سلام کہنا اور یہ کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ راستہ ہے پہاڑ کا جس کے آثار چڑھاؤ دونوں مصیبت خیز۔ پھر رات کا وقت ہوگا اور جگہ ہے دُور اس لئے خوشی سے یہ گوارا فرمادیں کہ صرف میرے لئے کھانا پکائیں اور مجھے یہیں بھیجدیں۔ انھوں نے اس کو قبول کرلیا اور حضرت نے قاضی عبد المجید سے فرمایا کہ قاضی جی ان کی دعوت رد نہ کرسکا کہ عورت ذات ہیں اور پھر بیوہ، ناحق ناراض ہوتیں اور طرح طرح کے وساوس لاتیں کہ غریب بیوہ کے ہاں کا کھانا کیوں کھاتے جبکہ بڑے لوگ خاطر تواضع کے لئے موجود ہیں۔ چنانچہ مغرب کے بعد ہی حضرت مکان پر تشریف لے آئے اور کھانے کا انتظار فرمایا، دیر ہوگئی اور کھانا نہ آیا حتیٰ کہ عشا کی اذان کان میں پڑی تو آپ نے فرمایا قاضی جی کھانا تو خدا معلوم کس وقت پہنچے میں نے تو ان کو کہلا کر بھیجدیا تھا کہ میں یہاں پر دوسروں کا مہمان ہوکر اور ان کا بلوایا ہوا آیا ہوں تم کیوں ناحق دردسری کرتی اور بار اٹھاتی ہو تم تو خود بیوہ ہو تمہاری تو امداد ہونی چاہئے نہ کہ اُلٹی تمہیں تکلیف دی جائے مگر وہ نہ مانیں اور اصرار ہوا تو اس اندیشہ سے کہ ناراض ہوں گی دعوت منظور کرلی، اب کیا کرنا چاہئے؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت وقت زیادہ گذرلیا اور نماز کا وقت بھی قریب آگیا۔ بھوک بھی زیادہ لگ رہی ہے مگر اتفاق سے اس وقت گھر میں صرف خشکہ اور دال پکا ہوا ہے اور وہ بھی دن کا کہ اتفاق سے میرے ایک دوست کا لڑکا چار منزلہ مکان کی چھت سے گر گیا اور میری گھروالی اس اطمینان پر کہ حضرت تو دعوت منظور فرما چکے وہاں چلی گئی سوچ رہا ہوں کہ اس تنگ وقت میں کیا چیز

پیش کروں حضرت نے شفقت وسنجیدگی سے فرمایا یہ تو میرا اپنا گھر ہے جو کچھ بھی ہو بے تکلف کھانا میرا فرض ہے۔ اور بھئی خشکہ تو بڑی لذیذ نعمت ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ دال ہو۔ جاؤ جلدی سے نکال لاؤ پھر نماز کو چلیں گے۔ چنانچہ وہ دال خشکہ لائے اور حضرت نے نہایت ہی رغبت اور بشاشت کے ساتھ کھایا کہ بار بار الحمد للہ فرماتے اور آخر میں کہا کہ آج تو خوب ہی سیر ہو کر کھایا۔ برتن سمیٹ سماٹ نماز کی عجلت میں مکان سے باہر نکلے کہ لڑکا کھانا لیکر آپہنچا۔ حضرت نے فرمایا واہ واہ خوب وقت پر آئے۔ اچھا ہوا ہماری موجودگی میں آگئے ہم نے تو بہت انتظار کیا، اب تو نماز کا وقت ہو گیا مسجد کو جا رہے ہیں۔ اور قاضی عبدالمجید سے فرمایا بھئی کھانا لے کر گھر میں رکھ آؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت واپس ہی نہ کر دیا جائے کہ اب تو ضرورت نہیں رہی۔ فرمایا نا بھائی واپس نہیں کر سکتے بلکہ لاؤ اس میں سے ایک لقمہ لڑکے کے سامنے کھا لوں۔ چنانچہ ایک لقمہ کھا کر کلی کی اور یہ فرما کر کہ صاحبزادے اپنی والدہ سے کہدیجیو کہ میرے سامنے ایک لقمہ کھایا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے! لڑکے کو رخصت کر کے تیز قدم مسجد کو روانہ ہوئے۔ راستہ میں فرمایا بیوہ اور غریب کا دل تھوڑا ہوتا ہے اس لئے میں نے لقمہ کھا لیا کہ بچہ خوش ہو گیا اور اب یہ جا کر اپنی ماں سے کہے گا۔ ورنہ بیچاری کو خیال ہوتا کہ خرچ بھی کیا تیار کرنے میں تکلیف بھی اٹھائی اتنی دور بچہ لے کر بھی گیا اور پھر بھی نہ کھایا۔

خدام کی دلداری

خدام کی دلداری کا حضرت کو خاص اہتمام تھا۔ بعض مخلصین انبہ یا ساول کے موسم میں حضرت کو تشریف آوری کی تکلیف دیا کرتے اور حضرت اس کو بخوشی منظور فرماتے بلکہ جہاں غایت بے تکلفی ہوتی تو اپنے خواص مخلصین کے نام لے کر فرماتے کہ فلاں فلاں کو بھی دعوت دیدو۔ چنانچہ مولوی محمد جلیل اور حاجی ریاض الاسلام کی دعوت پر ہر سال آپ کاندھلہ ضرور تشریف لے جاتے اور مجھے بھی تاریخ کی اطلاع کے ساتھ دعوت ضرور آتی اس لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ حضرت آم اور دعوت کھانے سے اتنا خوش نہ ہوتے جتنا اپنے دوستوں کو ایک جگہ بے تکلفی کے ساتھ جمع ہوتا دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ سب کو ساتھ لے کر آپ بیٹھتے خوش طبعی فرماتے مسکراتے اور جو آم شیریں نکلتا کبھی ادھر کبھی اُدھر خدام کو دیتے اور فرماتے میاں تم نے تو آم کھانے کا نام ہی کیا۔ ایک صاحب کہا کرتے تھے کہ جنتک پلنگ پر بیٹھ کر اتنے آم نہ کھائے کہ پٹی تک چھلکے آجائیں تو اس نے کیا آم کھائے۔ اور ایک جگہ تو مشہور ہے فلاں شخص نے ایک لنگی آم کھائے اور فلاں نے دو لنگی۔ کسی نے عرض کیا حضرت اس کا کیا مطلب؟ فرمایا کھاتے کھاتے دست آنے لگیں کہ لنگی خراب ہو جائے۔

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں حضرت بتقریب نشکر ہر سال سیوہارہ تشریف لایا کرتے مگر کمال

یہ تھا کہ نہ کبھی گنا کھاتے تھے نہ رس پیتے تھے نہ راب کا شوق تھا نہ گڑ کا۔ کبھی کبھی شاید ایک دو چمچہ نوش فرماتے ہوں مگر اخلاق و شفقت کا یہ حال تھا کہ خدام کی دعوت کبھی رد نہ فرماتے۔ آخری سفر سے کچھ قبل جب آپ سیوہارہ تشریف لائے تو میرے والد حافظ مختار احمد صاحب نے آپ کے لئے ایک من بورا تیار کرایا کہ رمضان اور سفرِ حج میں کام آئے گا۔ حضرت کے عزم واپسی کے وقت بورا تیار نہ ہو سکا تو والد صاحب نے اصرار کیا کہ حضرت ایک گاڑی اور رک جائیں بورا بھی تیار ہو جائے گا اچھا ہے حضرت کے ساتھ چلا جائے۔ فرمایا میں سہارنپور اسی گاڑی میں واپسی کو کہہ آیا ہوں۔ اگر میں نہ گیا تو وعدہ خلافی ہوگی۔ گھر والوں کے علاوہ مہمان بھی انتظار کریں گے۔ دوسرے یہ کہ میں تو آپ حضرات سے ملاقات کو آیا ہوں نہ کہ بورا لینے کے لئے۔ بس ملاقات کا مقصد حاصل ہو گیا۔ آخر جب زیادہ اصرار ہوا تو آپ حاجی مقبول کو چھوڑ گئے مگر اپنے عزم میں فرق نہ ڈالا اور اس ضعف میں تنہا سفر فرمایا۔

ایک بار مدینہ منورہ میں میرے سامنے ایک صاحب نے جائے نماز پیش کی جس پر خوبصورت نقوش تھے اور سرنامہ پر غالباً حضرت کا نام یا اور کچھ لکھا ہوا تھا حضرت نے بخوشی قبول فرمایا مگر یہ کہہ کر کہ جائے نماز پر لکھنا منع[1] ہے تمہاری دلداری کی بنا پر قبول تو کرتا ہوں مگر اس لکھے ہوئے کو مٹا دوں گا اس کو باقی نہ رکھوں گا۔

سفر میں رفقا کی راحت کا خیال

سفر میں حضرت اپنے رفقا کی راحت کا بہت خیال رکھتے اور ایسے بے تکلف بن جاتے تھے جیسے برابر کے دوست۔ سامان اٹھانے میں خود لپکتے اور اکثر ایسی چیز اٹھانے کی کوشش فرماتے تھے جس کے اٹھانے میں دوسروں کو جھجک ہو۔ کامران سے چلنے کا وقت آیا تو سامان اٹھا کر کشتی تک لانا پڑا حضرت نے اٹھ کر جلدی سے وہ دیگچہ اٹھا لیا جس میں کھانا پکا تھا کہ اوپر سے سیاہ ہو رہا تھا اور اندر سے چکنا۔ پھر ہر چند خدام عرض کرتے کہ آپ رہنے دیں آدمی بہت ہیں سب اٹھا لیں گے مگر ایک دو چیز حضرت لے ہی لیتے اور فرماتے کبھی مجھے بھی تو کچھ اٹھانا چاہئے کیا تم مجھے آدمی نہیں سمجھتے۔

ایک بار مجھے لاہور ساتھ لے گئے اور میں نے عرض بھی کیا مگر نہ مانا اور کرایہ آمد و رفت خود ادا فرمایا۔ حافظ فخر الدین صاحب کو بھی چند مرتبہ ساتھ لیا اور کرایہ دیا۔ بالخصوص عرب کے سفر میں امیر ہوں یا غریب تمام رفقاءِ سفر کی ضروریات کا خود دھیان رکھتے اور ہر ایک کی دلجوئی فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ خلافِ عادت مجھے دورانِ سفر ہوا اور میں چادر سے منہ ڈھانپ کر انجن کے قریب پٹری پر لیٹ رہا کہ تپ لرزہ کا اثر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ غنودگی آ گئی اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میرا بدن باقاعدہ

---

[1] متبرک الفاظ زمین پر اور پاؤں کے برابر ہوتے ہیں اور کبھی پاؤں بھی پڑ جاتا ہے۔

داب رہا ہے۔ چادر ہٹا کر دیکھتا ہوں تو حضرت ہیں شرم کے مارے پسینہ آگیا اور حضرت نے فرمایا کہنا مانو ذرا لیٹے رہو کہ میں بدن دبادوں کسل رفع ہو جائے گا مگر مجھ سے نہ ہو سکا اور میں اٹھ بیٹھا۔

ایک مرتبہ آپ کے مطوف نے آکر کہا کہ حضرت آپ کے بعض رفقا شکایت کرتے ہیں کہ تم حضرت کا خیال زیادہ رکھتے ہو اور سواری وغیرہ کا انتظام پہلے کر دیتے ہو اور ہماری خبر بعد میں لیتے ہو حالانکہ سب تمہارے حاجی ہیں۔ آپ نے فرمایا آئندہ اس کا خیال رکھو کہ ان کا انتظام پہلے ہو اور ہمارا سب کے بعد چنانچہ مدینہ منورہ جانے کے لئے جب سارا قافلہ تبرزیں پہنچ لیا تو آپ اور آپ کے خاص رفقا سب کے اخیر میں روانہ ہوئے۔

رفقا میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اہتمام کے ساتھ آپ اس کے پاس جاتے اور دوا کا انتظام فرماتے تسلی و تشفی دیتے۔

اخیر زمانہ میں آپ کو فالج کے اثر سے چلنا مشکل تھا کہ حرم شریف آنے میں بھی جوتہ کو ذرا کھینچ کر چلنا پڑتا تھا مگر کسی خادم کو معمولی بیمار بھی سنا تو خود تشریف لے جاتے۔

ایک سفر میں ینبع پہنچکر شب کو میرے پیٹ میں درد ہوا کہ بیتاب ہو گیا۔ حضرت فوراً تشریف لائے اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پڑھتے اور دم کرتے رہے حتی کہ سکون ہو گیا تب جا کر لیٹے۔ ایک طالب علم بیمار ہوا اور حضرت تمام رات اس کو چھاتی سے لگائے بیٹھے رہے کہ اس کو اپنی ماں بھی یاد نہیں آئی۔

اہلِ عرب کا احترام اہلِ عرب کا آپ احترام بہت زیادہ فرماتے تھے بالخصوص اہلِ مدینہ کا۔ آپ کے رفقا اور کسی جمال میں نزاع ہوتا تو آپ جمال کی طرفداری کرتے اور حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ لوگوں کو ان کی قدر نہیں۔ معلوم بھی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار تک پہنچانے والے ہیں، یہ محبوب کے ہم وطن ہیں۔

حضرت شاہ عبد الغنی صاحبؒ کے نواسہ مولوی عبد الکریم کو حضرت اصرار کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ سے لے کر اپنے ساتھ لائے کہ بحر العلوم کا خاندان علمِ دین سے بے بہرہ ہوا جاتا تھا۔ مولانا پانچ سال مدرسہ میں رہے مگر حضرت نے بیٹا بنا کر رکھا کہ ساتھ کھلاتے اور قریب ہی کا حجرہ قیام کے لئے تجویز فرمایا۔

ایک بار معاملات عرب اور تبدیل حکومت کے متعلق حاجی مقبول احمد صاحب نے کوئی ناملائم لفظ کہدیا جس کا ان کو بہت صدمہ ہوا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو اس قدر مغموم ہوئے کہ شاید اس سے زیادہ صدمہ کا اثر حضرت پر کبھی نہ ہوا ہو۔ مولوی عبد الکریم کی دلجوئی فرمائی اور بار بار معذرت کی۔ انھوں نے کہا حضرت حاجی صاحب نے مجھے گالی دی۔ فرمایا تمہیں گالی نہیں دی مجھے گالی دی۔ آخر جب مولوی صاحب کو راضی کر لیا تب سکون ہوا۔

مدنی فتنہ کے زمانہ میں جب سید عبد التواب صاحب مرحوم پریشان ہو کر ہندوستان آئے تو حضرت نے ان کو خاص مہمان بنا کر رکھا اور جگہ جگہ ان کی سفارش فرما کر معقول رقم نقد ان کے لئے فراہم کی اور ۲۵ ماہوار کا تقرر کرایا جب تک بھی وہ ہندوستان میں رہیں۔

حرمین میں سخاوت حرمین شریفین میں حضرت کی سخاوت بہت زیادہ بڑھ جاتی اور اتنی وسعت و فراخدلی سے صدقات فرماتے تھے کہ امراء بھی حیران ہو جاتے تھے۔ جمالوں کو جہاں حجاج ۴ یا ۸ بخشش دیتے ہوئے منہ بناتے ہیں حضرت ہر ایک جمال کو ایک روپیہ یومیہ دیتے۔ اپنے ساتھ بٹھا کر ان کو کھانا کھلاتے اور خوش طبعی فرمایا کرتے تھے۔ کسی جمال نے ذکر کیا کہ حضرت ہمارا حاجی تو ۴ یہ دیتا ہے یا کچھ نہیں دیتا تو حضرت کو افسوس ہوتا اور گنجایش پاتے تو حاجی کو نصیحت فرماتے کہ ان کے دینے میں بخل نہ کرو۔

عرب کی ہر چیز محبوب ہے عرب کے آدمی ہی نہیں بلکہ ہر چیز بالخصوص مدینہ منورہ کی مٹی تک آپ کو بہت پیاری تھی۔ زائرین کو آپ ابیار سبعہ[1] کا پانی اور تراب مدینہ لانے کی ترغیب دیا کرتے اور فرماتے کہ ان میں شفا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ مٹی کھانا نہیں کیونکہ ناجائز ہے ہاں لیپ وغیرہ میں استعمال کر لینا۔

بندہ حضرت کی معیت میں تھا اور میرے چچا صاحب مرحوم تھے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر وہ مرض باشرہ میں مبتلا ہو گئے کہ طبیب نے حرکت کرنا اور ہوا لگنا سخت مضر بتایا۔ واپسی کا وقت قریب تھا حضرت ان کے پاس آئے اور فرمایا حافظ صاحب گھبرانا نہیں جب تک تندرست نہ ہو جاؤ گے میں سفر نہ کروں گا قافلہ جائے چلا جائے میں تمہارے ساتھ ہیں ٹھیروں گا۔ مرحوم کا دل کمزور تھا اور وہ طرح طرح کے خیالات لیتے تھے۔ کہنے لگے حضرت پاس خرچ بھی کم رہ گیا ہے اور موسم نکل چکا پھر اونٹوں کا انتظام بھی دشوار ہوگا۔ فرمایا خرچ کا کیا فکر جو لوگ واپس ہوں گے وہ مکان پر اطلاع دیکر روپیہ کا حوالہ کرا دیں گے اور رہا اونٹوں کا انتظام سو جب چاہیں گے ہو جائے گا۔ مگر مرحوم ٹھیرنے پر راضی نہ ہوئے اور کہا کہ نہیں حضرت جیسے بھی بن پڑا سفر کروں گا۔ مجھے زیادہ فکر تھا کہ حضرت کی معیت میں اول تو اکثر حصہ حضرت کے پاس گذرتا ہے پھر بدوانی عربی زبان کی مہارت کے سبب قافلہ کا زیادہ بوجھ بار مجھ پر رہتا ہے کہ بدو اور حاجی کا نزاع دور کرنے میں گھنٹوں اپنے اونٹ پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا ایسی حالت میں چچا صاحب کی دیکھ بھال اور اونٹ پر ان کا ردیف[2] بن کر بیٹھنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ تیسرے دن قافلہ چل دیا اور حکیم رفاقت علی مرحوم سے کہ فوجی ڈاکٹر تھے راستہ کے لئے دوائیں وغیرہ لے کر

---
[1] سات کنوؤں کا پانی اور مدینہ کی مٹی۔ [2] ساتھ کا سوار۔

بمشکل تمام چچا صاحب کو شغدف میں لٹایا۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت تاکید کی کہ منہ پر ہر وقت روئی لپٹی رہے کہ ہوا نہ لگنے پائے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ پہلا پڑاؤ مناخہ میں ہوا کہ شہر سے ایک میل ہے۔ نماز کے لئے حضرت مسجد نبوی کو چلے اور مجھے ساتھ لیا۔ میں نے راستہ میں اپنی پریشانی عرض کی کہ حضرت میرا قلب بہت ضعیف ہے۔ چچا صاحب تو آج ہی کے برائے نام سفر میں کچھ کے کچھ ہو گئے دیکھئے مقدر کیا پیش لائے اور کس طرح دور دراز کا سفر اونٹوں پر طے ہو۔ ذرا سکوت کے بعد فرمایا بھئی اللہ کی مشیت میں کسی کا چارہ نہیں اور غیب کی خبر کسی کو نہیں کیا ہوتا ہے۔ ہاں اس کا مجھے بھی فکر ہے کہ سفر میں ہوا سے بچنا بہت مشکل ہے اور تیمارداری اس سے زیادہ مشکل۔ مگر گھبراؤ نہیں اللہ سب آسان فرمائے گا۔ میرا خیال یوں کہتا ہے کہ اب واپسی میں آستانہ شریفہ کی مٹی لے لو اور وہ منہ پر ملو۔ میں نے کہا حضرت وہاں مٹی کہاں۔ فرمایا قالین کے نیچے زمین پر جو بھی گرد غبار ہو نہ ہاتھ کو مل لیجو اور سیمنٹ لیجو مگر روضہ شریف کے قریب کی لیجو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور بعد نماز واپس آکر اپنے ہاتھ سے ان کے چہرہ پر مل کر روئی لپیٹ دی۔ نماز عصر کیلئے حضرت کے ساتھ پھر حرم شریف میں آیا اور اب حضرت عشا سے فارغ ہو کر واپس ہوئے کہ جا کر واپس آنے کی گنجائش نہ تھی اور مسجد نبوی کی نماز سے زیادہ حضرت کو کوئی چیز پیاری نہ تھی۔ بعد عشا واپس آیا تو ڈر رہا تھا کہ چچا صاحب خفا ہوں گے اور کہیں گے یہیں پروا نہیں کرتا گھنٹوں غائب رہتا ہے آگے کیا امید مگر پاس آکر مزاج پوچھا تو چچا صاحب نے مسرت کے ساتھ فرمایا ذرا میرا منہ کھول کر دیکھو مجھے تو نصف مرض گیا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ سوزش ہے نہ کرب۔ اس تراب نے تو اکسیر سے زیادہ کام دیا۔ بس دوائیں سب پھینک دو اور اب جاؤ تو تھوڑی سی مٹی اور لیتے آنا کہ ایک دفعہ ملنے کی اور حاجت ہے۔ میری مسرت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا اور فوراً حضرت کے پاس حاضر ہو کر قصہ سنایا۔ نوافل سے فارغ ہوتے ہی اندھیرے میں جب حضرت نماز فجر کے لئے حرم شریف کو چلے تو پھر ساتھ ہوا اور رخصتی صلوٰۃ و سلام کے بعد خاک آستانہ اچھی مقدار میں فراہم کر کے ساتھ لایا۔ یہاں واپس آتے ہی قافلہ اٹھ کھڑا ہوا اور حق تعالیٰ نے ساری پریشانی کا اس طرح خاتمہ فرمایا کہ دوسری منزل پر چچا صاحب شغدف سے خود اتر گئے اور فرمایا بھوک زیادہ لگ رہی ہے کچھ کھانے کا انتظام جلدی کرو۔ تیسرے پڑاؤ پر بالکل تندرست تھے کہ سارے سرخ دانے مرجھا کر سیاہ پڑ چکے تھے اور بجز نقاہت کے مرض کا نام نہ رہا تھا۔

تمر مدینہ سے حضرت کو گویا عشق تھا اور ہر نوع رغبت سے کھاتے تھے بالخصوص برنی۔ اور ہر نوع سے پوری واقفیت رکھتے تھے کہ یہ فلاں کھجور ہے اور اس کا یہ نام ہے اور اس کی یہ خاصیت ہے۔ آخری قیام میں چونکہ آپ کو کھجور کا پورا موسم دیکھنا نصیب ہوا اس لئے ابھی کچی ہی تھی کہ آپ نے ایک ڈبہ میں تازہ

کھجور بند کر کے کپڑا سلوا کر نام اور پتہ لکھوا کر یہاں بھیجا کہ تو تم بھی کھاؤ۔

کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ روضۂ مطہرہ میں روشن ہونے والا موم خدام روضہ سے تبرکاً لینا کیسا ہے؟ فرمایا بڑا موجب برکت ہے مگر مال وقف ہے کہ یہیں کے استعمال کے لئے بھیجا جاتا ہے اس لئے یوں کرو کہ اپنے طور پر بازار سے موم بتی خرید کر خدام کو دیدو کہ وہ روشن کر دیں اور پھر اس کو لے لو۔

آستانۂ محمدیہ پر حاضری کے وقت حضرت کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ آواز نکلنا تو کیا مواجہ شریف کے قریب بامقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ خوفزدہ مؤدبانہ دبے پاؤں آتے اور مجرم وقیدی کی طرح دور کھڑے ہوتے بکمال خشوع صلوٰۃ وسلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے۔ زائرین جو بیباکانہ اونچی آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے اس سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی اور فرمایا کرتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں اور ایسی آواز سے سلام عرض کرنا بے ادبی اور آپ کی ایذا کا سبب ہے۔ لہٰذا پست آواز سے سلام عرض کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ مسجد نبوی کی حد میں کتنی ہی پست آواز سے سلام عرض کیا جائے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس پر اشکال پیش کیا کہ جسد مبارک تو چند دیواروں میں محفوظ ہے پست آواز کس طرح مسموع ہوگی۔ فرمایا یہ اشکال تو چیخنے چلانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ قبر کے اندر تو کتنا ہی کوئی باہر سے چلائے اور پکارے مگر آواز نہیں پہنچے گی۔ بھئی یہ تو خصوصیات میں سے ہے جس پر یہاں کا قاعدہ جاری نہیں ہو سکتا۔

تیراندازی کا اس زمانہ میں صرف نام ہی رہ گیا ہے مگر میں حیران ہو گیا جبکہ ایک دفعہ حضرت نے کمان اور تیر کا نقشہ کھینچ کر اس کے ایک ایک جز کی حقیقت بیان فرمائی کہ اس عربی لفظ کا مصداق یہ ہے اور اس اسم کا مسمی یہ حصہ ہے اور اس کا یہ۔ گویا آپ نے برسوں تیراندازی سیکھی ہے۔ بندوق شاید کبھی چلائی ہو مگر اچھی بری کی شناخت اتنی زیادہ تھی کہ دہلی شیخ رشید احمد صاحب کی دکان اسلحہ پر تشریف لے گئے تو پستول رائفل اور مختلف کارخانوں کی برج لوٹ اور کارتوسی بندوقوں کا بڑے شوق اور غور کے ساتھ ملاحظہ فرمایا اور ان کے وہ حسن وقبح بیان فرماتے رہے جن کو سن کر شیخ صاحب بھی حیران تھے۔

میں نے بندوق کا لیسنس لیا تو بڑے شوق سے فرمایا اپنی بندوق دکھاؤ اور ملاحظہ فرما کر طریقہ تعلیم فرمایا کہ یوں اٹھانا اور یوں رکھنا چاہئے۔ آپ کا کبھی شکار کھیلنا بھی مجھے یاد نہیں مگر شکار کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ ایک دفعہ اجراڑہ ساتھ گیا اور بندوق ساتھ لے لی تو بعد ظہر فرمایا بھئی جنگل ہو آؤ دیکھو مور یا کبوتر مل جائے تو شکار ہی ہو جائے۔

یہی حالت نباتات سے واقفیت کی تھی کہ ایک بار آپ نے گاؤں کے راستے میں جتنی خودرو جڑی بوٹیاں

پڑتی گئیں بیان فرماتے رہے کہ یہ فلاں گھاس ہے اور اس کا یہ نام ہے اور یہ خاصیت ہے۔

طب میں آپ کو مہارت نہ تھی مگر نبض شناسی میں کمال تھا کہ خفیف حرارت نبض پر ہاتھ رکھتے ہی بتا دیتے تھے۔

مزارات پر حاضری کے لئے سفر کرنا آپ کو پسند نہ تھا۔ ہاں کسی سفر میں اپنے بزرگانِ سلسلہ کا مزار پڑتا تو حاضر ہو کر روحانی استفاضہ کا جو اصل طریق ہے اس پر عمل فرما لیتے اور منکرات پر نکیر فرمائے بغیر نہ رہتے۔

ایک مرتبہ آپ مولانا رحیم بخش صاحب کے ساتھ ایک بزرگ کے مزار پر حاضر ہوئے وہاں کے سجادہ نشین نے مولانا کے ساتھ حضرت کو بھی چائے نوشی کے لئے مدعو کیا۔ چائے سے فارغ ہو کر اٹھے اور باہر نکلے تو سجادہ صاحب نے دو سنہرے پیالوں میں مزار شریف کا چڑھاوا مٹھائی اور نقل پیش کیا۔

مولانا رحیم بخش صاحب گو حضرت گنگوہی سے بیعت تھے مگر عقیدت و محبت کا تعلق حضرت سے اتنا تھا کہ گویا حضرت ہی سے بیعت ہیں۔ ہر چند کہ حضرت کو بھی مولانا کے ساتھ بیحد محبت تھی اور احترام بھی فرمایا کرتے تھے مگر مولانا حاضر ہوتے تو بس حضرت کا منھ تکا کرتے اور زیارتِ جمال میں محو و مستغرق ہو جاتے تھے مجھے یاد ہے جب حضرت کا آخری سفر ہوا تو مولانا حیدر آباد جا کر حضرت سے ملے اور پھر بمبئی ساتھ گئے اور تین دن قیام فرما کر آخری رخصت ہوئے۔ حضرت ان کو سوار کرانے کے لئے اسٹیشن پر آئے تو بندہ ساتھ تھا جس وقت ریل نے سیٹی دی تو وہ منظر بھی عجیب تھا۔ مولانا لپک کر حضرت کو چمٹ گئے اور حضرت نے آغوش میں دبا لیا چلتی ریل میں مولانا سوار ہوئے کہ آنکھوں میں آنسو اور ادھر پلیٹ فارم پر حضرت چشم نم تھے۔ ڈاک گاڑی تیز جا رہی تھی مگر دو نظروں کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی حتیٰ کہ نگاہ سے اوجھل ہو گئی اور وہ نظارہ دنیا کا آخری نظارہ بن کر چشم زدن میں ختم ہو لیا۔ غرض مولانا کا ادب جو کہ عادت بن گیا تھا گوارا نہ کرتا تھا کہ کسی امر میں حضرت سے تقدیم کریں اس لئے آپ نے پھر حضرت کی طرف اشارہ فرما دیا۔ سجادہ صاحب حضرت کی طرف بڑھے اور حضرت رکے۔ فرمایا کیا ہے؟ عرض کیا حضرت صابر صاحب کا تبرک ہے۔ حضرت کی صاف گوئی تو دنیا میں بے نظیر تھی بے ساختہ فرمایا سجادہ صاحب آپ کو معلوم بھی ہے کہ مآ اُھل لغیر اللہ[1] ہے اس کا لینا بھی حرام اور کھانا بھی حرام۔ یہ فرما کر حضرت چل دیئے کہ پیچھے پیچھے مولانا رحیم بخش صاحب تھے اور سجادہ صاحب خاموش حجرہ میں تشریف لے گئے۔

خواجہ اجمیریؒ کے مزار پر

ایک بار حضرت راندیر جاتے ہوئے اجمیر اترے کہ شیخ الطائفہ[2] کے مزار پر حاضر ہوں۔ حضرت مولانا تھانوی اور بندہ ساتھ تھے۔ میزبان چونکہ مزاورین کے

[1] وہ چیز جو اللہ کے سوا کسی کے نام پر بنائی گئی ہو یہ آیت شریفہ ہے حرام چیزوں میں سے ایک ہے۔ [2] تمام جماعت کے بزرگ۔

حالات سے واقف تھے کہ طواف اور سجدہ کراتے ہیں اس لئے حسنِ تدبیر کے ساتھ کام کیا اور بعد عصر کا وقت تجویز ہوا۔ ہم سب حاضر ہوئے اور اندر کٹھرہ کے قریب کھڑے ہو گئے۔ حضرت تو جاتے ہی بیٹھ گئے اور مراقب ہو کر ایسے مستغرق ہو گئے کہ خبر ہی نہ رہی کہاں بیٹھے ہیں۔ چونکہ بیٹھنا وہاں کمال بے ادبی سمجھا جاتا ہے اس لئے چار طرف سے حضرت پر تیز اور ترچھی نظریں پڑنے لگیں۔ بیچارے میزبان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کہ کوئی شورش برپا نہ ہو جائے۔ گھبرا کر انھوں نے مولانا تھانوی سے کہ حضرت کے پاس کھڑے تھے چپکے سے عرض کیا کہ حضرت کو اٹھا دیجئے اندیشہ ہے کہ فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ مولانا نے فرمایا اس حالت میں میری ہمت نہیں کہ مخل ہوں اور حضرت کو اٹھنے کے لئے کہوں اور میری طرف اشارہ کیا کہ اس سے کہو یہ حضرت کی خدمت میں زیادہ جری ہے۔ وہ میرے پاس آئے اور گویا رو کر کہا کہ میرا دم ہوا ہو رہا ہے حضرت سے کہو جلدی اٹھ بیٹھیں دیکھو مجاوروں کا رنگ بدلا جاتا ہے اور پھر میرے سنبھالے نہ سنبھلے گا۔ میں نے کہا کہ حضرت مولانا کی ہمت نہیں ہوتی تو میں کیسے ہمت کروں مگر وہ اس درجہ سراسیمہ تھے کہ ہوش باختہ تھے کہنے لگے خدا کے واسطے جلدی کرو ایک دوسرے پر شالو۔ آخر میں نے حضرت کے شانۂ مبارک پر ہاتھ رکھا اور عرض کیا حضرت بس تشریف لے چلیں۔ فوراً حضرت کو افاقہ ہو گیا اور اٹھ کر ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں حضرت کو قصہ سنایا مگر حضرت نے فرمایا مجھے کچھ خبر نہیں اور ایسا تھا تو پہلے ہی مجھے اطلاع کیوں نہ کر دی۔

فراست حضرت کی فراست قابلِ حیرت تھی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے وصال پر مخلوق پریشان تھی جمعہ کا وقت تھا آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ آہ وزاری کر رہا اور حضرت کا عاشق و دلدادہ بنا ہوا پکار رہا ہے ہائے مجھے حضرت کی زیارت تو کرادو۔ لوگوں کو نماز پڑھنا مشکل ہو گیا مگر اس کو حضرت کا جاں نثار محب سمجھتے تھے اس لئے کچھ نہ بولے۔ حضرت نے مسجد میں جا کر مولانا محمود حسن صاحب سے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں اور پھر باہر تشریف لا کر غصہ کے ساتھ اس کو ڈانٹا کہ میں جانتا ہوں تجھے بہت صدمہ ہے، میں جانتا ہوں تو حضرت کا عاشق ہے، پھر فرمایا اس کو مسجد سے نکال دو، یہ نہ حضرت کا خادم ہے نہ اس کو حضرت کی محبت ہے۔ حاضرین کو تعجب تھا کہ ایسے عاشق بیتاب کے متعلق کیا فرما رہے ہیں مگر اے بسا ابلیس[1] آدم روئے ہست۔ بعد میں تحقیق ہوا کہ کوئی بدعتی تھا جو ہاتھ میں اس قسم کا پوڈر لگا کر آیا تھا کہ چہرہ پر ملنے سے سیاہ ہو جاوے حضرت گنگوہی کی کرامت تھی اور حضرت کی فراست کہ وہ اپنی روسیاہی کی چال نہ چل سکا اور مسجد سے نکال دیا گیا۔

---

[1] اے شخص بہت سے شیطان آدمی کی شکل میں ہوتے ہیں۔

صبر وتحمل صدمات میں حضرت کا صبر بے نظیر تھا۔ آپ کے اکلوتے صاحبزادے ابراہیم مرحوم کی شدتِ علالت سن کر عیادت کے خیال سے بندہ چلا تو اسٹیشن سہارنپور پر اترتے ہی نظر ڈالی کوئی مل جائے تو حال پوچھوں۔ لکھنؤ جانے والے ایک دوست ملے جو حضرت ہی کے پاس سے آرہے تھے دریافت کرنے پر انھوں نے اطلاع دی کہ انتقال ہو گیا اور مغرب سے قبل دفن بھی کر چکے۔ تیز کہنے لگے مجھے تو بیماری کا بھی علم نہ تھا میں حضرت کے پاس حاضر ہوا تو حضرت حسب معمول حجرہ کے پاس بیٹھے تھے اسی محبت سے معانقہ فرما کر باتیں کرنے لگے اور میں اپنی ضروریات پیش کرتا رہا۔ دو گھنٹہ بعد آدمی نے آکر کہا حضرت چلئے جنازہ طیار ہے۔ حضرت اُٹھے اور اتنا فرما کر روانہ ہوئے گھر میں سے ابراہیم کا جنازہ لے آؤں آپ تشریف رکھیں۔ میں نے حاضرین سے دریافت کیا جنازہ کس کا؟ اور یہ معلوم ہو کر کہ صاحبزادہ کا ذکر ہے مجسم حیرت بن کر اپنے کو نفرین کرنے لگا کہ ایسی حالت میں حضرت سے فضول باتیں کرتا رہا مگر کسی انداز سے پتہ ہی نہ چلا کہ گھر میں بیٹے کو غسل وکفن دیا جارہا ہے اور حضرت باہر اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہے ہیں چنانچہ حضرت جنازہ لے کر تشریف لائے کہ دوسروں میں اور حضرت میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔

صلۂ رحمی صلۂ رحمی اور عزیزوں کو مصیبت کے وقت تسلی دینا اور مال سے مدد دینا آپ کی فطرت تھی۔ آپ کے چچازاد بھائی مولوی انوار احمد صاحب پر ہردوئی میں انجینیر کی طرف سے ایک فوجداری مقدمہ دائر ہو گیا جس میں ان کی ٹھیکیداری کی ساری کمائی خرچ ہو گئی اور پریشان ہو گئے حضرت نے بار بار خط سے تسلی دی اور دعا کا وعدہ فرمایا اور روپیہ ان کے حقیقی بھائی مولانا صدیق احمد صاحب نے بھیجے جو اعانت کے لئے تھے نہ کہ قرض۔ حالانکہ زمانہ وہ تھا جبکہ آپ کی گذران بھی تنگی وعسرت سی ہوتی تھی۔ ان معنوی کمالات کے سامنے حسّی کرامتوں کی نہ کچھ وقعت ہے اور نہ کبھی اس پر نظر گئی کہ آپ کی کراماتِ حسیہ کو ضبط کیا جائے ورنہ آپ کے خدام میں ہر شخص کے ساتھ آپ کا معاملہ جدا تھا اور اس کی ضروریات و پریشانی میں آپ کے ظلِ عاطفت و برکات توجہ سے منجانب اللہ ہر طرح کی مدد ہوتی رہتی تھی کہ اسی کا نام کرامت ہے۔

۲۸ھ میں جب حضرت نے سفر حج کیا تو دار الطلبہ زیر تعمیر تھا۔ آپ نے چلتے وقت مستری سے بتاکید فرمایا کہ غربی دیوار کے شمالی گوشہ میں جو حجرہ بنایا جائے اور اس کی دیوار پختہ نہ کرنا اور نہ اس میں الماریاں زیادہ بنانا بلکہ پشت کی جانب دروازہ کی محراب رکھدینا۔ حضرت کے اس ارشاد کی وجہ کسی کے سمجھ میں نہ آئی اور وہ حجرہ بھی دیگر حجرات کی طرح پختہ بنا دیا گیا واپسی پر حضرت نے حجرہ کو دیکھا تو فرمایا تم نے یہ کیا کیا۔ میں تو تاکید کر گیا تھا کہ پشت پر دروازہ لگا کر چھوڑ دینا۔ عرض کیا کہ حضرت میں بالکل

بھول گیا کیونکہ میرے ذہن میں اس ارشاد کی کوئی وجہ آئی نہیں۔ فرمایا کوئی بات بلا وجہ بھی مان لیا کرتے ہیں مدت کے بعد اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جبکہ پشت کی افتادہ زمین خلد آشیاں کلثوم جہاں بیگم جاگیر دار بھوپال نے خرید کر وہاں عالی شان مسجد بنوادی اور اسی حجرہ کو توڑ کر دار الطلبہ سے مسجد میں جانے کا دروازہ رکھا گیا۔[1]

دعا کی برکت سالانہ جلسہ میں ایک دفعہ دیہاتی مہمان امید سے زیادہ آگئے کہ کھانا تیار شدہ نصف کو بھی بمشکل کافی ہوتا۔ کارکنانِ مدرسہ گھبرا گئے کہ نہ تیار کرانے کا وقت ہے کیونکہ جلسہ سے ایک بجے فراغ ہوا تھا اور نہ کوئی انتظام جنس وغیرہ کا فراہم ہو سکے۔ حافظ عبد اللطیف صاحب نے حالت حضرت سے عرض کی اور یہ بھی کہ باورچی بھی تھک گئے ان میں پکانے کی ہمت بالکل نہیں حضرت نے فرمایا کھانے کو چادروں سے ڈھانک دو میں آتا ہوں چنانچہ حضرت نے تشریف لا کر کچھ پڑھا اور کھانے پر دم کرکے دعاء برکت فرمائی اور حکم دیا کہ کپڑا دیگ کے منھ سے نہ ہٹایا جائے اور نیچے سے کھانا نکال کر کھلانا شروع کردیا جائے۔ الحمد للہ کہ سب مہمان فارغ ہوگئے اور کھانا بہیترا بچ رہا۔

---

[1] حضرتؒ کے کشف کے واقعات بہت خدام کو پیش آتے تھے مگر اصل کمال تو اتباع سنت ہے اس پر کسی کی توجہ ہی ہوتی تھی۔ طالب علمی میں قرابت کی وجہ سے حضرت نے اپنے حجرہ کے برابر کے حجرہ میں احقر جمیل احمد تھانوی کا قیام کرایا تھا۔ مدرسہ سے مسجد میں جانے کے دو دروازے تھے۔ موذن کو حکم تھا کہ فجر کے وقت ایک کی اندر کی زنجیر لگائے دوسرے میں باہر قفل لگائے مگر موذن قفل تو لگاتا اور دوسرے کی زنجیر نہ دیکھتا تھا۔ بچپن کی شرارت ایک دن جاتے ہوئے میں نے اس کی زنجیر قصداً کھولدی کہ آج موذن پر ڈانٹ پڑے اور نماز کے بعد باہر سے آہستہ سے اس میں ہاتھ لگایا کواڑ کھل گئے ابھی قفل کے انتظار میں سب تھے حاجی منقول احمد صاحب نے زور سے کہا ملاجی دیکھو کون اندر رہ گیا جو بعد میں نکلا ہے میں دل میں خوش کہ اب ملاجی پر ڈانٹ پڑیگی مگر حضرت نے فرمایا کہ نہیں کچھ نہیں اور سب خاموش ہوگئے میری شرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

فجر کے بعد حضرت حجرہ میں تشریف لے جاتے سردی میں کواڑ بند گرمی میں ادھ کھلے رہتے اشراق پڑھ کر باہر تشریف لایا کرتے تھے ایک روز میں صبح کی گاڑی سے گھر جا رہا تھا حجرہ میں جانے سے پہلے ملا نہ تھا باہر آنے کے وقت گاڑی کا وقت نہ رہتا تھا بغیر ملے جانے کو جی چاہتا تھا پریشان حجرہ میں بیٹھا تھا کہ حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے آواز دی حاضر ہوا فرمایا اور تو گیا نہیں عرض کیا اب جا رہا ہوں مصافحہ کیا والدہ کو سلام کہنے کو فرمایا خود پھر اندر تشریف لے گئے مجھے شرمندگی ہوئی کہ نماز میں نہ ملا تو معمولات ترک کرکے آکے ملے۔

۱۳۲۲ھ میں بعد تعطیل شعبان احقر بیعت ہوا مگر جرأت نہ ہوئی کہ اوراد و معمولات کو پوچھوں اور نہ تعطیل میں اس کے بغیر جانے کو جی چاہا۔ دو دن بعد ایک اور صاحب بیعت ہوتے انھوں نے ورد و وظیفہ پوچھا تو فرمایا فلاں وقت آجانا اور جمیل کو بھی لے آنا وہ اسی انتظار میں رکا ہوا ہے۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم کو بخار ہوگیا بعد مغرب حضرت کو اطلاع ملی حکم فرمایا کہ اس کے گھر تار دیدو کہ فوراً آؤ۔ سب حیران تھے مگر ان کے پہنچنے تک یہ ختم ہو چکا تھا

ہر شخص کو بہت بہت واقعات دیکھنے سننے میں آئے مگر اصل کمال نہ ہونے کی وجہ سے کسی ان کو مہتم بالشان نہیں قرار دیتا۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ مع خدام کے مہمان ہوئے مگر یہ شرط کرلی کہ کھانا ریل ہی پر کھاؤں گا مدرسہ نہ آسکوں گا چنانچہ کھانا اسٹیشن پر بھیج دیا گیا مگر ان بزرگ نے کھانا تھوڑا دیکھ کر واپس کردیا اور فرمایا کہ واپس کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اگر ماما نے دیا ہوگا تو گھر والوں کو معلوم تو ہوجائے گا کہ ماما نے کیسی حماقت کی کہ اتنے آدمیوں میں اتنا ذرا سا کھانا بھیجا۔ کھانا واپس آیا تو حضرت پر بہت گراں ہوا اور فرمایا جیسے یہ احتمال ہوا کہ ماما نے کھانا کم اتارا یہ احتمال بھی تو ہونا چاہئے تھا کہ شاید میزبان کا اللہ تعالیٰ سے کوئی خاص معاملہ ہو کہ وہ اس کے تھوڑے کھانے میں بہت برکت دیدیتے ہوں۔ پھر فرمایا بھائی ہمارا کام تو برکت ہی سے چلا اور چل رہا ہے ورنہ جتنے مہمان میرے یہاں آتے ہیں ان کے لئے میری آمدنی کافی نہ تھی۔ پھر فرمایا برکت کا احتمال نہ ہوا تھا تو کم از کم یہی احتمال ہونا چاہئے تھا کہ شاید آج گھر میں آٹا کم ہو کہ ایسا اتفاق بھی ہوجاتا ہے اور میزبان کا یہی فرض ہے کہ اس کے گھر میں جو کچھ ہو مہمان کے سامنے رکھدے تھوڑا ہو یا بہت۔ اور جو کھانا بھیجا گیا تھا اس کو دسترخوان پر رکھ کر بسم اللہ کرکے کھایا جاتا تو انشاء اللہ سب کو کافی ہوجاتا۔

مولوی حبیب الرحمن صاحب سہواروی لکھتے ہیں رجب ۱۳۶۹ھ میں بندہ نے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ حضرت دعا فرماویں کمترین کو زیارتِ حرمین شریفین نصیب ہو۔ حضرت کا جواب یہ آیا کہ تم یہ لکھو کہ مدینہ منورہ حج سے پہلے آؤگے یا بعد کو میں دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ تم کو مع اپنے رفقاء خاندان کے میری زندگی میں یہاں پہنچادے تاکہ ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوجائے۔ مجھے یہ جواب پڑھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نہ ابتک میرا ارادہ سفر عرب کا ہوا نہ میں نے حضرت کو اپنا ارادہ لکھا اور حضرت کے انداز تحریر سے ظاہر ہورہا ہے گویا ارادہ کرچکا اور صرف تعین باقی ہے کہ مدینہ منورہ پہلے جاؤں یا بعد میں۔ پھر میرا ہی نہیں بلکہ خاندان اور دوستوں میں رفقاء بھی حج وزیارت کی نعمت سے مالا مال ہونے والے ہیں۔ خدا کی شان کہ دو مہینے بعد دفعۃً ایسے سامان مہیا ہوئے کہ میں اور میرے ساتھ وطن اور خاندان کے بعض اعزہ واحباب سفر کے لئے تیار ہوئے اور حضرت کی بھی آخری زیارت نصیب ہوئی کہ پھر دوبارہ مقدر نہ ہوا۔[۵۳]

... انتظام کا غلبہ تھا رنگ الگ الگ۔ ۵۳ تجربہ یا الہام سے معاملہ معلوم ہوا۔

ت ۵ صحبت میں بغیر حضرت کے زبان دیئے جوابات منکشف ہوجاتے تھے۔ میرے بہنوئی حضرت کی اہلیہ ثانیہ کے بھانجے مولوی مظہر علی خاں ایک غیر مقلد ڈاکٹر کی ملازمت اور بحثوں سے غیر مقلد بن گئے تیز طبیعت تھے آریوں قادیانیوں سے مناظرے کرتے اور حنفیوں سے بھی کرتے تھے حضرت ایک دفعہ وہاں تشریف لے گئے تھے واپسی میں وہ اسٹیشن آئے تو فرمایا میاں مظہر تم بھی چلو، وہ کہتے ہیں میں نے پوچھ کر آیا تھا نہ سامان ساتھ نہ جانا مناسب تھا مگر اس وقت نہ معلوم کیوں زبان سے اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ بہت اچھا۔ کہتے ہیں کہ تھانہ بھون پہنچکر حضرت نے ایک دن بلاکر فرمایا کہ تم کو جو شبہ ہو وہ اب بیان کرو (باقی برصفحہ آئندہ)

پانچویں سفر حج ۱۳۳۳ھ میں حضرت کا جہاز عدن پہنچا تو وہ نازک زمانہ تھا جبکہ جنگِ عظمیٰ کے سبب جگہ جگہ سنسر اور بحری سفر میں طرح طرح کی دشواریاں تھیں۔ جہازوں کو عدن سے کوئلہ بھرنا پڑتا تھا اور وہاں کوئلہ کے ساتھ مزدوروں کا بھی بڑا قحط تھا۔ آپ کے جہاز سے قبل اسی کمپنی کا جہاز جہانگیر چار دن عدن بندر پر پڑا رہا اور جب اس کو کوئلہ نہ مل سکا تو مجبوراً وہ کوئلہ لینے کے لئے پورٹ سوڈان روانہ ہوا۔ رفقاء کو پریشانی ہوئی کہ دیکھئے کے دن پڑے رہیں اور پھر کوئلہ کے لئے کہاں جانا پڑے۔ حضرت نے فرمایا بھئی پریشانی سے کیا نتیجہ اللہ کارساز ہے۔ خدا کی شان آپ کے جہاز نے ایک شب عدن سے باہر لنگر انداز ہو کر اگلے دن گودی میں قدم رکھا کہ علی الصبح ایک سٹیمر کوئلہ کی دو بڑی کشتیاں بھری ہوئی کھینچتا لایا اور کپتان سے کہا یہ کوئلہ لو۔ کپتان نے کہا لاؤ مگر پہلے مزدور لے آؤ۔ چند منٹ میں مزدور بھی آگئے اور کپتان یہ حکم دیکر کہ کوئلہ جلد جہاز میں داخل کردو ایک بوٹ میں سوار ہو عدن چلا گیا۔ کوئلہ بھرا جا رہا تھا کہ نورنگ جہاز کا کپتان گھبرایا ہوا آیا اور کہا کہ یہ کوئلہ تو ہمارا ہے تم نے اپنے جہاز میں کس کے حکم سے لیا۔ ہم نے تو چار دن میں اپنے خلاصیوں سے بوٹ میں بھروا کر مزدوروں کا بمشکل انتظام کیا تھا کہ آج جہاز میں لا دیں۔ نائب کپتان نے کہا ہمیں کچھ معلوم نہیں خود بوٹ والا ہمارے پاس آیا اور بولا یہ کوئلہ لو ہم نے کہا لاؤ۔ نورنگ کے کپتان نے کہا اب کام روک دو باقی کوئلہ ہمارے جہاز پر جائے گا۔ نائب نے کہا ہمارے کپتان کو بولو وہ حکم دیگا تو ہم روک دیں گے۔ کپتان شام تک غائب رہا اور آخر ارکاٹی ہمراہ لے کر آیا تو اس وقت جبکہ سارا کوئلہ جہاز پر چڑھ لیا۔ قیمت و مزدوری کا حساب کر کے اس نے فوراً لنگر اٹھا دیا اور چوتھے دن جدہ بھی پہنچ گیا نورنگ اپنے دس رنگ دکھانے کو عدن کی گودی ہی پر کھڑا ابچتا رہا۔

دعا کا فیضان

ڈپٹی احمد حسن صاحب کے داماد میاں عبدالحکیم پروفیسر لاہور نے جب ایس اے وی کا پرائیویٹ امتحان پنجاب یونیورسٹی میں دیا تو اتفاق ایسا ہوا کہ یہ امتحان کی تیاری کچھ نہ کر سکے اور پرچے آئے ایسے سخت کہ تیاری کرنے والے طلبہ بھی گھبرا گئے۔ انھوں نے جوابات لکھے مگر ایسے کمزور کہ خود کامیابی سے مایوس تھے۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ پرچوں کی وجہ سے تو

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) میں نے سب سے قوی مسئلہ رفع یدین کا لیا اور حدیث پیش کی حضرت نے جواب دیا اور کوئی نیا جواب تھا مناظروں میں اس جواب پر خوب خوب بحث کئے ہوئے تھا مگر اب جو کہنا چاہتا ہوں فوراً دل میں آجاتا ہے کہ اس کا یہ جواب دیدیں گے دوسری تیسری غرض ہر دلیل پر یونہی جواب آگئے اور خاموش دل دل میں مناظرہ رہا حضرت نے فرمایا بھئی کہ اور کہو مگر کیا کہوں فرمایا اچھا دوسرا مسئلہ لو وہاں بھی ایک دلیل کے بعد یہی ہوا پھر تیسرا چوتھا پانچواں سب ایسے ہی رہے۔ کہتے ہیں میں نے سوچا اب تو حنفی بننا ہی پڑے گا دو چار روز کو وطن چل کر اہلحدیث والی نمازیں پڑھ لوں اجازت مل گئی اور چلا گیا خوش خوش نماز پڑھنے لگے مگر حیرت ہوگئی کہ رفع یدین کرنا چاہتا ہوں تو ہاتھ نہیں اٹھتے بلند آواز آمین کہنا چاہتا ہوں تو آواز نہیں اٹھتی آخر دوسرے دن واپس مدرسہ آگیا۔

ناکامی یقینی ہے لیکن حضرت دعا فرماویں تو شاید پاس ہو جاؤں۔ چونکہ ان کی داڑھی اور وضع قطع خلافِ شرع تھی حضرت نے ٹلا دیا اور نصیحت فرمائی کہ مسلمانوں کی سی وضع رکھو اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو۔ یہ بابوس ہو کر وطن آگئے۔ حسن اتفاق سے حضرت انبالہ گئے اور دو تین دن قیام ہوا عبدالحکیم نے موقع کو غنیمت سمجھا اور لگے حضرت کی خدمت میں ہر لحظہ وہر آن حاضر رہنے اور جہاں موقع ملتا بہت لجاجت سے عرض کرتے کہ حضرت میری کامیابی کے لئے دعا فرماویں۔ آخر ایک دن حضرت نے خوش ہو کر فرمایا کہ اچھا جاؤ انشاء اللہ پاس ہو جاؤ گے لیکن بھئی اپنا معاملہ حق تعالیٰ سے درست کرو۔ خدا کی قدرت کہ نتیجہ نکلا اور یہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے، اپنے خسر کو لکھا میرا فیل ہونا تو یقینی تھا مگر حضرت نے دعا[1] کر کے پاس کرا ہی دیا۔

ڈپٹی صاحب کے بڑے صاحبزادے میاں سعید احمد کہ ماشاء اللہ اسم با مسمیٰ اور باپ جاہ دنیوی باپ کی طرح صورت اور سیرت دونوں میں مسلمان مُلّا بنے ہوئے ہیں ڈگشنی محکمہ ڈاک میں ملازم تھے کہ ترقی کا دروازہ بہت تنگ تھا حضرت کو اس جوان صالح سے محبت تھی کہ قدرت نے سعید بنایا تھا۔ شملہ جاتے ہوئے آپ نے ڈگشئی اتر کر ڈیڑھ دن قیام فرمایا اور میاں سعید کی بہتری کے لئے دعا فرمائی۔ دو ہی مہینے گذرے تھے کہ ان کے افسر نے از خود ان سے کہا کہ اس محکمہ میں ترقی بہت محدود ہے عنقریب گورنمنٹ آف انڈیا میں مقابلہ کا امتحان ہونے والا ہے جس میں ٹائپسٹ اور لوڈویژن کے لئے امیدوار لئے جائیں گے تم اس امتحان میں قسمت آزمائی کرو انھوں نے عذر کیا مگر افسر نے اصرار کیا اور زبردستی ان کی جانب سے درخواست بھجوا دی۔ اب یہ حیران کہ ٹائپ

---

[1] دعا تو دعا الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر عطا فرمائی تھی ایک تاثیر لفظوں کی آج میرے دل میں قائم ہے۔ میرے والد صاحب نے علیگڈھ میں جوتے کا کارخانہ کیا تھا۔ جوتے گھر کے اندر عمدہ سے عمدہ مفت تھے قرابت اور نابالغی کی وجہ سے حضرت کے گھر میں آنا جانا کھانا پینا تھا ایک روز حضرت کھانا تناول فرما رہے تھے پانی مانگا میں لے کر حاضر ہوا جوتوں پر نظر پڑ گئی فرمایا یہ ٹُیا کھونسڑے سے پہن رہا ہے اس دن سے آج تک دل میں ہر انگریزی جوتے وغیرہ سے نفرت پیدا ہو گئی اور حیدرآباد دکن کے ایک قصبہ میں عید پر سوائے انگریزی یا دیہاتی جوتے کے کچھ نہ ملتا تھا مگر دل نے گوارا نہیں کیا۔ اس برکت سے عید سے ایک روز دن پہلے اللہ تعالیٰ نے دہلی کا جوتا مفت بھجوا دیا جو ایک صاحب کسی دکان سے تلاش کر لائے۔

مجھے غربت کی وجہ سے طالب علمی میں سفروں کا اتفاق نہیں ہوا۔ حضرت نے ملازمت دلوائی تو حیدرآباد دکن کے ایک قصبہ میں دل پر اس قدر فکر اور سہم سوار کہ حرارت سی معلوم ہوتی مگر انکار کروں تو گھر کے کئی نفوس کا ذمہ دار خرچہ کہاں سے لاؤں یہاں تو دل پر بن رہی ہے۔ جس روز بہادر پور سے تین بجے روانگی تھی رات کو احقر لالٹین لے کر حضرت کے ساتھ دروازہ تک گیا فرمایا اچھا تو کل جا رہا ہے عرض کیا جی ہاں گلے لگایا دعا دی۔ بس اس کے بعد دل کا وہ سارا اثر غائب اور مسلسل چار دن کا سفر ایسا طے ہوا کہ خطرہ باکر پاس نہیں آیا۔

جانتا نہیں۔ گورنمنٹ کے دفتر کے کام سے بالکل ناواقف۔ امتحان کا وقت اتنا تنگ کہ باوجود ہمہ تن کوشش کے تیاری ناممکن، چہ جائیکہ روزمرہ ڈاکخانہ کا کارِ منصبی بھی انجام دیتا ہوں۔ عجب پریشانی تھی کہ افسر نام بھیج چکے شرکت امتحان کی منظوری آچکی تاریخ امتحان سر پر آگئی مگر یہ ابھی یہی دریافت کرتے پھرتے ہیں کہ امتحان کس کس مضمون میں ہوگا۔ ایک معمولی سا ٹائپ مشق کے لئے ایک دوست سے مستعار لیا مگر کب؟ جبکہ ڈگشائی سے امتحان دینے کے لئے دہلی روانہ ہوئے۔ راستہ میں سہارنپور اترے اور سارا ہی قصہ حضرت کو سنایا۔ حضرت نے بہت خوش ہو کر فرمایا بھئی گھبراہٹ کی کیا بات ہے حق تعالیٰ شانہ کو سب قدرت ہے اللہ پر اعتماد رکھو اور اس کے بعد آپ نے کچھ پڑھنے کو بتایا اور تاکید فرمائی کہ جس دن جس مضمون کا امتحان ہو اس سے ایک دن پہلے اس مضمون کا نام اور امتحان کے وقت سے بذریعہ خط مجھے اطلاع دیتے رہنا۔ غرض حضرت کی دعا و توجہ لے کر دہلی روانہ ہوئے۔ امتحان کا کوئی نصاب مقرر نہ تھا۔ دنیا بھر کی معلومات عامہ اور اس کے ساتھ قدیم و جدید تاریخ و جغرافیہ ریاضی و ہندسہ اور تمامی دفاتر کے پیچیدہ مسائل غرض ہر شعبہ کے سوالات جن کی طرف وسوسہ و خیال بھی جانا مشکل۔ میاں سعید کہتے تھے کہ پرچہ امتحان پڑھتا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکوں گا مگر قلم اٹھاتے ہی مضامین کی اس قدر آمد ہوتی تھی کہ گھبراتا تھا پہلے کونسی بات لکھوں۔ شرح صدر کی یہ کیفیت تھی کہ مشکل سے مشکل سوال پانی بن جاتا تھا کہ غلطی کا واہمہ بھی نہ ہوتا تھا۔ امتحان ختم نہ ہونے پایا تھا کہ کامیابی کی توقع ہو چلی اور امنگ بڑھ گئی تھی۔ دیکھتا تھا کہ تمام ہندوستان کے قابل لوگوں کا مقابلہ ہے جن میں ہندوستانی بنگالی مدراسی پنجابی ہندو مسلمان اور انگریز سب ہی تھے کہ سیکڑوں کی تعداد میں ایم۔ اے۔ اس کثیر تعداد میں تحریری امتحان نے غالباً صرف اسّی کو پاس کیا جن میں میرا نمبر نمایاں تھا مگر ضرورت تھی صرف چالیس کی، اس لئے چوتھے دن تقریری امتحان کا نمبر آیا۔ یہ تحریری سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ممتحن چند افسر تھے جن کو اختیار تھا کہ اپنے اپنے مذاق کے موافق امیدوار کی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لئے ملکی اخلاقی سیاسی مذہبی ہر طرح کے سوالات کریں۔ نیز امیدواروں کی نقل و حرکت اندازِ گفتگو طریقۂ جواب۔ وضع قطع لباس نشست برخاست عزم استقلال سلیقہ ہر بات کا جائزہ لیں اور جو چاہیں سوال میں سے سوال پیدا کرنے پڑ جاویں۔ اللہ کی قدرت کہ نمبروار چاروں ممتحن سوالات سے اس طرح فارغ ہوتے کہ میاں سعید کے ہر جواب پر مسرور و محظوظ ہو کر ہنس ہنس پڑتے تھے۔ ایک ماہ بعد سب سے اول ایک دوست کے مبارکبادی کے تار اور اگلے دن انگریزی اخبارات کی اشاعت سے معلوم ہوا سیکڑوں امیدواروں میں سب سے اول رہنے کا سہرا حق تعالیٰ نے دعاءِ خلیل ہی کے سر رکھا کہ میاں سعید مجموعہ ہی میں نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مضمون میں اول رہے۔ چنانچہ فوراً ہی معقول تنخواہ پر تقرر ہوا اور اب ماشاء اللہ گورنمنٹ آف انڈیا میں اسسٹنٹ ہیں۔

ایسے واقعات اگر شمار کئے جائیں تو صدہا بلکہ ہزاروں نکلیں گے مگر آپ کے معنوی کمالات بالخصوص استقامت علی الدین اور اتباع سنتِ محمدیہ میں فنائیت کے سامنے ان کی نہ کوئی وقعت ہے نہ شان اس لئے مجھے خود اس سے دلچسپی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی طبیعت کو قدرت نے اتباعِ سنتِ نبویہ کا سانچہ بنادیا تھا اور اللہ و رسول کے ساتھ وہ محبت جو خون کی طرح آپ کی رگ رگ میں جاری و ساری تھی آپ کی مبارک طویل زندگی کے لمحہ لمحہ کو ایک بے نظیر مستقل کرامت بنائے ہوئے تھی۔ آپ کا عمر بھر دینی خدمت میں انہماک حدیث میں تبحر فقہ میں اجتہاد، تحریر و تقریر میں اشاعتِ دین، حرکت و سکون میں اظہارِ حق، قیام و قعود میں اتباع سنت لازمی و متعدی نفعِ دینی کا وہ بے پایاں سمندر تھا جس میں کوئی بھی غوطہ لگانے والا غواص[1] موتیوں سے کبھی محروم نہیں رہا اور اس بنا پر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع[2]

تربیت و تصرفات اور وصیت و وفات

بھوک ہر چند کہ ایک تکلیف ہے کیونکہ معدہ کی اس کھرچن کا نام ہے جو انسان کو غذا کی طلب پر مجبور کرتی ہے ہر قسم کے تعب اور مشقت کا متحمل بناتی ہے۔ مگر درحقیقت بڑی نعمت ہے کہ یہ نہ ہو تو غذا کی طلب نہ ہو اور غذا نہ ملے تو انسان مرجائے پس انسانی زندگی کا مدار صرف بھوک پر ہے اور اسی نے عالمِ دنیا کو آباد بنا رکھا ہے ورنہ گورستان بھی دنیا میں ہے جہاں ہم جیسے بیسیوں قرن جاچکے ہیں مگر چونکہ بھوک سے خالی ہیں اس لئے سنسان شہر اور عالم خموشاں کے باشندہ ہیں۔ بھوک کی حالت میں انسان سوکھے ٹکڑے بھی کھاتا ہے تو اس میں مزہ آتا ہے اور وہ خون بن کر طاقت پہنچاتے ہیں مگر بھوک کے بغیر بریانی و متنجن بھی کھائے تو نہ لذت آتی ہے اور نہ قوت پیدا ہوتی ہے بلکہ عجب نہیں کہ بدہضمی پیدا ہو کر ہلاکت کا سبب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب اپنی بھوک میں کمی محسوس کرتا ہے تو طبیب کی طرف رجوع کرتا اور زر و دواد ہر چیز کو لذت پسندی پر ترجیح دیتا ہے کہ کسی طرح بھوک کھل جائے جو غذا کی طلب پر مجبور و مضطر کرے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے روح انسانی میں بھوک کا مادہ رکھا ہے جو اس کو روحانی غذا کی طلب پر مجبور کرتا ہے اور وہ پیٹ کی بھوک سے زیادہ اور بڑی نعمت ہے کہ اس پر آخرت کی زندگی کا مدار ہے جب نفسانی خواہشات میں پڑجانے یا ناجنس بددینوں کی صحبت میں رہنے یا اس بھوک سے بے پروا ہو کر کاہلی و غفلت کی عادت ڈال لینے

[1] غوطہ زن۔ [2] یہ ہیں میرے باپ دادا تو تم ان کے مثل لاؤ اے جریر جبکہ ہم تم کو مجمع میں جمع کریں۔

وہ بھوک بند یا کمزور ہو جائے تو ضرورت ہے معالجہ کی کہ کسی طرح وہ پیدا ہو اور روح اپنی غذاؤں کو طلب کرکے اپنی زندگی قائم رکھ سکے جسمانی غذاؤں میں مفید اور مضر کی کوئی فہرست مرتب نہیں ہے۔ ان کا مدار صرف تجربہ پر یا کچھ طبی کتابوں کے احسان پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر دھوکا کھاجاتا اور مفید غذا سمجھ کر بھوک میں ایسی مضر چیز کھا بیٹھتا ہے جو اس کی زندگی کو ختم کردیتی ہے مگر روحانی غذاؤں کی مکمل فہرست جس میں تمامی مفید اور مضر چیزوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی آسمانی کتابوں میں بھیجدی ہے جس کو شریعت اور مذہب کہتے ہیں۔

اور اسلام نے تو اس تفصیل کو اتنا حد پر پہنچایا ہے کہ ہر مفید و مضر غذا کے نفع و نقصان کے درجے بھی بتلائے چنانچہ استعمال کے لئے فرض واجب سنت مستحب مباح کے مراتب قائم فرماکر ضرورت کی نوعیت دکھائی تو پرہیز کے لئے حرام مکروہ تحریمہ کراہت تنزیہا اور خلافِ اولیٰ کی تقسیم سے بچنے کی ضرورت کے مدارج بتادیئے، اور الیوم اکملت لکم دینکم[1] نازل فرماکر اطمینان دلادیا کہ اب اندیشہ نہیں کہ شاید کسی مضر کو مفید سمجھ کر کھالینے سے ہلاک ہوجاویں۔ اس عطا کردہ مکمل فہرست پر صرف عمل کی ضرورت ہے اور وہی نجات کی کفیل ہے۔ مگر بھوک کا سوال اب بھی باقی ہے کہ روح میں طلب صادق ہوگی تو وہ روحانی غذا ان کے استعمال اور شریعت پر عمل کی محرک بنے گی ورنہ بادل ناخواستہ[5] کیسی ہی قوی غذا کا استعمال کرے وہ بیکار بلکہ عجب نہیں منافقوں کے اعمال کی طرح مہلک و مضر ہو۔ چونکہ بھوک کے بغیر غذاؤں کی فہرست پر عمل دشوار تھا اس لئے حق تعالیٰ نے طبیب و معالج بناکر اپنے پیغمبروں کو بھیجا کہ یزکیھم[2] سے ان کی شانِ معالجہ بیان فرمائی اور مخلوق کو بتلایا کہ ان کی صحبت میں رہنا ان کی عقیدت و محبت رکھنا قدرتی قانون کے موافق تمہاری روح کو ان کی روحانی قوت میں منجذب کریگا اور جو سچی بھوک ان کے قلوب میں ہے وہ تمہارے قلوب میں اس طرح آئے گی جیسے لوہے[3] میں مقناطیس کے ساتھ صحبت و تعلق رکھنے سے مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر تم کو خود محسوس ہوگا کہ اتباع شریعت اور مرضیات الہیہ پر چلنے کی طلب تم کو رغبت ہے یا کسی شرم و دباؤ کے لحاظ میں۔ پس اب یہ کوئی علمی سوال نہیں جس میں مباحثہ کی ضرورت ہو بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کے متعلق بات ہے کہ اپنے قلب کو خود ٹٹولو۔ اگر وہ عبادات و مرضیات الہیہ کا ایسا طالب ہے جیسا روزہ دار شام کو سچی بھوک لگنے کے وقت افطاری کا طالب ہوتا ہے تو بیشک تمہاری بھوک

---

[1] آیت شریفہ ہے۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا۔ [2] ان کو پاکیزہ بناتے ہیں (برائیوں سے دور کرتے اور عمدگیوں سے زینت بخشتے ہیں)۔ [3] وہ لوہے کا ٹکڑا جس کو مقناطیس پتھر پر مل لیتے ہیں خود اس میں بھی لوہا کھینچنے کی تاثیر ہو جاتی ہے۔

[5] بلا خلوص اور بے توجہی کی عبادت پر ثمرات نہ ہوں گے گو فرض ادا قرار پائے گا۔ بادل ناخواستہ یہ نہیں کہ دل نہیں چاہتا پھر پڑھی تو اس پر تو اجر ہے۔

قائم ہے اور تم کو معالج کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں بلکہ برعکس ہے تو گویا تمہاری بھوک بند ہے اور اندیشہ ہے پوری ہلاکت یعنی سوءِ خاتمہ کا۔ یا رغبت تو ہے مگر پوری اور کامل نہیں ہے تو بھوک میں کمی ہے اور وہ بھی خطرہ سے خالی نہیں کہ مبادا بڑھ کر مرض کو لاعلاج نہ بنادے۔

اللہ کے پیغمبروں کے قلوب ایک برقی قوت کے مخزن اور مقناطیسی کشش کے سرچشمہ ہوتے ہیں اس لئے قلوب کو اپنی طرف منجذب کرکے اول ان میں بھوک پیدا کرتے اور پھر دوسروں میں بھوک پیدا کرنے والی برقی قوت پیدا کرتے ہیں، جن میں یہ طاقت معتدبہ[1] آجاتی ہے وہ شیوخ طریقت کہلاتے ہیں اپنے معدن[2] یعنی مشکوٰۃ قلب محمدی سے روحانی بھوک کی پیدا کرنے والی استعداد حاصل کرکے اپنے زمانہ کے مریضوں کو پاس بٹھاکر سینہ سے سینہ لگاکر کچھ دوا اور کچھ پرہیز کا پابند بناکر ان کے قلوب میں بھوک پیدا کرتے ہیں۔

سلوک وطریقت

اسی کا نام سلوک وطریقت ہے اور یہی بیعت واکتساب کا مقصود ہے پس طریقت درحقیقت شریعت ہی پر عمل[3] کا نام ہے کوئی شئے زاید نہیں مگر بشرطیکہ اس کی بھوک ہو کہ رغبت وشوق کے ساتھ اس پر عمل ہو۔ لہذا اگر پیر خلافِ شرع ہے تو مرضیاتِ الٰہیہ کا خود بھوکا نہیں وہ کسی قلب میں اس بھوک کو کس طرح پیدا کرسکے گا۔ آنکس کہ خودگم است کرا رہبری کند۔ اور اگر متبع شریعت ہے مگر دوسروں میں بھوک نہیں پیدا کرسکتا تو گو تندرست ہے مگر معالج طبیب بننے کی صلاحیت خود نہیں رکھتا۔ اسی بھوک کا نام فطرۃ ہے کہ فطرۃ[4] اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ۔

ہر بچہ اس بھوک کو اپنی زندگی بھر کا رفیق بناکر اپنے ساتھ لاتا ہے کہ ماں کے پیٹ سے جدا ہوکر گہوارۂ دنیا میں قدم رکھتے ہی غذا کی طلب میں چیختا چلّاتا اور ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے۔ شفیق ماں اس کی ناتوانی اور احتیاج وطلب کو دیکھ کر اسے اٹھا لیتی اور آغوش میں لیکر وہ پستان اس کے منہ میں دیدیتی ہے جس میں مادرانہ محبت کی وجہ سے دودھ جوش مارتا اور بچہ کے ذرا چوسنے سے اُبل اُبل کر اس کے منہ میں بھرتا چلاجاتا ہے۔ یہی حال روحانی بھوک کا ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی قلب میں پیدا ہوتی ہے اور بڑے ہوکر بری طرح صحبت یا عادت اور رواج میں ڈوب کر کم یا بالکل بند ہوجاتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے: کل[5] مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ

ـلہ طلب پیدا کرنے کے معالج کی ورنہ آگے کے ہرکام میں روحی معالج کی حاجت ہوگی۔ ـلہ قابل اعتبار۔ ـلہ صحیح پیر۔ ـلہ کان یعنی حضورؐ کے دل مبارک کے نور کے مقام سے۔ ـلہ یہ طریقۂ عمل ہے اسی کو طریقت کہدیا جاتا ہے۔ گمراہوں نے دھوکہ دینے کے لئے کچھ کا کچھ گھڑ رکھا ہے۔ خیال تو کیجئے دین تو صرف وہی ہے جو اللہ نے بھیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکر پہنچایا اور اس کی تشریح جو اس کے خلاف ہے وہ دین کیسے ہوسکتا ہے۔ ـلہ جو شخص خود ہی گمراہ ہے کس کی رہبری کرسکتا ہے۔ ـلہ اللہ کی تخلیق جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی تخلیق کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ ـلہ ہر بچہ تخلیقِ الٰہی پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی ونصرانی اور آتش پرست بنالیتے ہیں۔

دیکھ سانند یہاں اگر وہ بھوک قائم رہے اور اپنی غذا کی طلب میں ذرا بھی بلبلائے اور ہاتھ پاؤں ہلائے تو رحمت الٰہیہ میں جوش آجاتا اور وہ ماں سے زیادہ اس کی مربیہ بن کر اپنے آغوشِ لطف و کرم میں اس کو پرورش کرنے لگتی ہے اپنی محبت اس کو عطا فرماتی اور اپنے اولیاء کے قلوب سے انوارِ قدسیہ اس کے قلب میں پہنچاتی اور اس کو جوان بنا دیتی ہے۔

پس طریقت اور سلوک معالجہ روحانی کا نام ہے جس سے روح کی ظلمت و کثافت دور ہو کر وہ بھوک اصل حالت پر آجائے جو فطرت میں ودیعت ہے اور اسی لئے عمروں کا تفاوت مزاجوں کا اختلاف مشاغل کا تنوع طبائع کا تخالف اور زمانہ کا انقلاب طریقِ معالجہ کو بدلتا رہتا ہے کہ ہر طبیب مقصود صحت قلب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو طریق بھی جس مریض کے لئے مناسب پاتا ہے اس کو عمل میں لاتا ہے جیسے جہاد کا مقصود ہے کفار کو مغلوب کرنا مگر طریقۂ جنگ میں امیر لشکر کو اختیار ہے کہ جو صورت غلبہ کے لئے مفید پائے خواہ تیر اندازی ہو یا توپ و تفنگ کی گولہ باری اس کو اختیار کرے اس کو کوئی عاقل بدعت نہیں کہہ سکتا۔

اب بھوک کے ساتھ ایک اور چیز ملاؤ یعنی محبت۔ کیونکہ بھوک کا کام صرف اتنا ہے کہ غذا کی طلب پر مجبور کرے اگرچہ وہ غذا ادنیٰ اور اتنی قلیل ہو جس سے صرف معدہ کی کھرچن جاتی رہے۔ مگر محبت میں قدرت نے طلب کا کچھ ایسا مادہ رکھا ہے کہ سمندر کے پانی کی طرح جتنا بھی پیا جائے وہ پیاس کو بڑھاتا اور کسی حالت پر بس نہیں کرنے دیتا۔ بھوک میں طالب کو اپنا تعب و تکان محسوس ہو گا مگر محبت میں طالب کو بجائے تعب کے لذت آئیگی اور اس کو طلبِ محبوب میں اپنی جان کا دینا بھی پیارا معلوم ہو گا۔

مجنوں کا قصہ سنو، لیلیٰ کی محبت میں اس کا حال اتنا شکستہ ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا مگر اس نے کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی یہ خواہش نہیں کی کہ یہ محبت اس کے دل سے نکل جائے جس نے اس کو تکلیفوں کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اس کے باپ نے مرض کو لاعلاج پا کر آخری تدبیر یہ کی کہ اپنے ساتھ حج کو لایا اور بیت اللہ کا دامن پکڑوا کر اس سے کہا کہ دعا مانگ یا اللہ میری خطاؤں کو معاف فرما اور لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال لے۔ مگر وہ دعا مانگتا ہے ؎

الٰہی تبت من کل المعاصی ۔۔۔ الیک فقد تکثرت الذنوب

واما من ھوی لیلی و ترکی ۔۔۔ زیارتھا فانی لا اتوب

یا اللہ سارے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت اور اس کی زیارت کے شوق سے توبہ نہیں کرتا۔

---

[1] یعنی مقصود صحت قلب ہے وہ نص میں ہے باقی اذکار و اشغال اور ان کی صورتیں یہ خود مقصود نہیں ہیں تجرباتی آلات و ذرائع ہیں جیسے جہاد میں تیر توپ بم جیسے جہاد میں توپ کا استعمال بدعت نہیں یہاں اشغال بدعت نہیں کہ خود ان کو مقصود و ثواب نہیں قرار دیا جاتا ذریعہ مقصود ہیں۔

حقیقت میں جب روحانی غذاؤں کی بھوک پیدا ہوتی ہے وہیں ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے طالب ہر دم امتثالِ امر محبوب کے لئے تیار اور ہر وقت اس کی رضا جوئی میں ڈوبا رہتا ہے ساری شریعت پر عمل اس کو آسان نظر آتا ہے محض بھوک رفع کرنے کی خاطر نہیں بلکہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کا متمنی ہوتا ہے کہ اس جیسی ہزار شریعتیں بھی ہوں تو ان پر عمل کروں گا اور عمر کا لحظہ لحظہ بھی ایک نئے حکم سے جکڑا ہوا ہو تو اس کی تعمیل میں زندگی ختم کر دوں گا۔

فرہاد سے شیریں کی فرمائش ہوئی کہ پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر اس کے مکان تک لائے تو اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا ناممکن۔ بلکہ کام میں لگ گیا اور کوہ کنی میں لذت معلوم ہوئی۔ جب فانی مخلوق کی ذلیل محبت کا یہ اثر ہے تو کیا پوچھنا حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت کا کاس میں مر کھپنا تو عین حیات ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے باغ میں کروڑہا بلکہ ان گنت پھول کھلے اور مہکے جن کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ اور گو رنگ سب کے مختلف اور بو سب کی جداگانہ مگر ان کی سرشت و آب پاشی صرف اسی محبت سے ہوئی تھی کہ دنیا کی ہر چیز ان کی نظروں میں ہیچ اور امتثالِ امر محبوب کے سوا ہر شے ان کو بے وقعت نظر آتی۔ کتابوں کے اوراق الٹو اور ان محبت والوں کے قصے پڑھو تو مجسم حیرت بن جاؤ گے اور تمہارے دل میں بھی ایک گدگدی اٹھے گی۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ تمہارے دلوں میں بھی محبت کا مادہ رکھا ہوا ہے اور ہر جنس اپنے ہم جنس کی جانب کشش کیا کرتی ہے۔ مسلمان تو مسلمان کسی کافر کا دل بھی اس مادہ سے خالی نہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے مرکز سے بھٹک گیا اور مقصود سے غافل ہو کر محبوب حقیقی سے بہت دور جا پڑا ہے اس لئے اس کا یہ اضطراری جوش یا سیم و زر کی طرح جھک جاتا ہے یا دنیا کے مٹ جانے والے حسن کی طرف۔ کوئی باغات کا شیدا بن جاتا ہے کوئی تعمیرات کا کسی کو چٹے چمڑے والی عورتوں کے ساتھ گرویدگی ہوتی ہے اور کسی کو نرم و نازک کپڑوں کے ساتھ عشق ہوتا ہے بہر حال کوئی نفس نہیں جو کسی نہ کسی چیز کی طرف کشش نہ کرتا ہو۔ بس یہی مادہ جب بازاری حسین کسبیوں سے متنفر ہو کر ایک گھر کی مالک عفت مآب خاتون کی طرف کھچ آتا ہے تو ہر گندے مرض اور خطرناک نتیجہ سے امن مل جاتا اور اس وقت بدچلن عیاش کا نام نیک وضع پاک دامن قرار پا جاتا ہے۔

محبت ایک عجیب لخاصیۃ اکسیر ہے جو کبر و نخوت کے جھاڑ جھنکاڑ کو جس میں ہزاروں مہلک حشرات الارض[1] چھپے ہوئے ہیں یکدم صاف کر دیتی ہے خشوع و مسکنت کا بیج بوتی ہے ہمت بلند کرتی تواضع اور زہد کا سبق پڑھاتی، طاعت میں اخلاص پیدا کرتی، رضا جوئی کا مشاہدہ کراتی، فانی اور باقی فرق ظاہر کرتی اور

[1] زمین کے اندر رہنے والے جانور کیڑے وغیرہ۔

جس قلب کو اپنا گھونسلہ بناتی ہے اس کے جسم کو انسانیت کے سانچہ میں ایسا ڈھال دیتی ہے کہ کسی عضو اور کسی حاسہ سے بھی کوئی کام خلافِ انسانیت سرزد نہیں ہو سکتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمامی کمالات جن کے ذکر کرنے سے بھی دل کو فرحت ہوتی اور مزہ آتا ہے اسی محبت کے ثمرات تھے اور آپ کی عمر شریف کے ہر لمحہ اور ہر آن کا کارنامہ جو آج قانون اور اصولِ موضوعہ[1] بنا ہوا ہمارا راہبر ہے وہ اسی آتشِ سوزاں کا دھواں تھا جس کو مخلوق کے دلوں میں سلگانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے کہ ٹھنڈے سیاہ کوئلے کو اپنے سلگتے ہوئے انگارہ سے چمٹائیں اور پھونک مار کر اس کو بھی سلگائیں۔ یہی ایک چیز ہے جو سینوں میں سلسلہ بسلسلہ سلگتی چلی آئی کہ سلسلہ کے ہر شیخ کو طالب کے قلب میں آتشِ محبت سلگانے کیلئے اپنی چھاتی سے چمٹانا ضرور ہوا۔ محبین خدا کے قصوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں مگر خود محبت چونکہ بھوک کی طرح ایک وجدانی چیز ہے اس لئے دنیا میں وہ الفاظ نہیں جن سے اس کی حقیقت بیان ہو سکے۔ ہاں خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں یحبہم[2] و یحبونہ اور والذین[3] آمنوا اشد حبا للہ۔ اس لئے اس میں شک نہیں کہ محبت کوئی چیز ضرور ہے۔ نیز یہ کہ ایمان درحقیقت اسی شدتِ محبت کا نام ہے جس کو اصطلاحِ دنیا میں عشق کہتے ہیں کہ مومن اس سے خالی نہیں ہو سکتا اور جو اس سے خالی ہو اُسے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ مومن کا مصداق بن سکے۔ البتہ اس کے مراتب غیر متناہی[4] ہیں جن میں ادنیٰ درجہ الفت اور میلانِ قلب[5] کا ہے اور انتہائی درجہ ولہ[6] کا۔ پھر اسی کی کیفیت بڑھتی رہتی ہے اور کسی حد پر بس نہیں کرتی۔ یہ درجہ صرف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا تھا جس کی وجہ سے آپ خطابِ محبوبیت سے نوازے گئے۔ البتہ نیچے کے مراتب میں جس خوش نصیب کے لئے جتنا مقدر تھا وہ عطا ہوا اور اتنے ہی میں ان پر وہ احوال طاری ہوئے کہ دیکھنے والے قیس اور فرہاد کے قصوں کو بھول گئے۔

محبت کے ثمرات عجیب و غریب ہیں کہ محبوب کی طرف دل کھنچتا ہے اور اس کے پہلے ہی حملہ میں وہ عقل و ہوش جن کے بل بوتہ دنیا کی طلب میں سر کھپ رہا تھا رخصت ہو جاتے ہیں ؎

حدیثِ[7] حسن او ناگہ فرو خواندند در گوشم ۔۔۔ در آمد عشق یکبارہ ببرد از عقل و از ہوشم

بیچارہ بیتابیٔ دل کو چھپاتا ہے مگر چھپ نہیں سکتی ؎

ہر[8] چند مے دارم نہاں در سینہ ام سرِّ تو جاں ۔۔۔ لیکن ہمی گردد عیاں از چشم و از رخسارہ

[1] مقرر شدہ۔ [2] اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ [3] اور جو لوگ ایمان لے آئے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت سخت محبت کرنے والے ہیں۔ [4] حد پر ختم نہ ہونے والے۔ [5] دل کا جھکنا۔ [6] حیرانی۔ [7] محبوب کے حسن کی بات اچانک میرے کان میں ڈالدی تو عشق ایک دم آپڑا مجھے عقل و ہوش سے دور کر دیا۔ [8] بہت کچھ تیرے راز کو اپنے سینے میں سو طرح کی طرح چھپا کر رکھتا ہوں لیکن آنکھوں اور رخساروں سے ظاہر ہوی جاتا ہے۔

پھر دیدارِ محبوب کی تمنا اور قرب کی آرزو پیدا ہوتی ہے مگر نہیں سمجھتا ؎

ہزاراں[1] سرُ دراں آنجا پائمال است ۔۔۔ نظر در روے دریں جا خود محال است

باایں ہمہ نہ جان کا اندیشہ کرتا ہے نہ مال و آبرو کا۔ آگے بڑھتا اور اس تمنا میں مرجانا بھی حصولِ مراد سمجھتا ہے ؎

اگر فرہاد[2] را حاصل نہ شد پیوند با شیریں ۔۔۔ ہم آخر جانِ شیرینش برآمد در تمنایش

ہجر و دوری سے گھبرا کر محبوب تک اپنی خبر پہنچانے اور خود محبوب کی خبر معلوم کرنے کا مشتاق ہو کر رسول[3] تلاش کرتا اور قاصد کا دامن پکڑتا ہے اور نہیں پاتا تو دیوانہ وار نسیم و صبا کو مخاطب کرتا ہے ؎

کفیٰ[4] حزناً انی مقیم ببلدۃ ۔۔۔ وانت باخری ما الیک سبیل

وان[5] لم یکن بینی وبینک مرسل ۔۔۔ فریح الصبا منی الیک رسول

پھر تضرع و زاری اور منت و سماجت سے محبوب کو اپنے حال پر ترس دلاتا اور عرض کرتا ہے ؎

تنم[6] بپوسد و جانم بزیرِ خاک شود ۔۔۔ ہنوز مہر تو باشد در استخواں اے دوست

پھر اپنے نفس کی مخالفت کرتا اور یہاں تک بڑھتا ہے کہ نفس جس چیز کو تکلیف بتا رہا ہے یہ اس کو راحت کہہ رہا ہے اور نفس جس کو لذت کہہ رہا ہے یہ اس کو تلخی بتا رہا ہے کیونکہ اس کے لئے لذت اسی میں ہے جو محبوب کی طرف سے آئے ؎

ہر دَرد[7] و رنج کز تو رسد بر دلِ حزیں ۔۔۔ آں محض راحت است مرا عین عافیت

آتشِ شوق شعلہ زن ہوتی ہے تو فریاد کرتا ہے ؎

مشتاقی[8] و صبوری از حد گذشت مارا ۔۔۔ گر تو شکیب داری طاقت نہ ماند مارا

اور قلق و اضطراب کے ہاتھوں گھبراتا ہے تو چیختا ہے ؎

کارم[9] ز اشتیاق تو جانم بلب رسید ۔۔۔ وز تو ہنوز مژدۂ وصلے نمے رسید

اب اس کی زبان محبوب کے ذکر سے اور تخیل محبوب کے فکر سے مانوس ہو جاتا ہے ؎

اے[10] نام تو ام شفاءِ امراض ۔۔۔ وز یادِ تو ام حصول اغراض

---

[1] ہزاروں سردیاں پیروں سے روندے جاتے ہیں اس جگہ اس میں نظر کر لینا بھی خود محال ہے۔ [2] اگرچہ فرہاد کو شیریں سے مل جانا نصیب نہ ہو سکا مگر آخر کار اس کی جان شیریں تو اس تمنا میں نکل گئی۔ [3] پیامی۔ [4] غم کے لئے یہ کافی ہے کہ میں ایک شہر میں قیام رکھتا ہوں اور تو دوسرے میں تجھ تک کوئی راستہ بھی نہیں۔ [5] اور اگر میرے تیرے درمیان کوئی پیام لے جانے والا نہیں تو نہ سہی کیونکہ صبا ہوا میری طرف تجھ تک پیام رساں ہے۔ [6] میرا بدن ریزہ ریزہ اور جان خاک کے نیچے ہو جائے گی مگر اے محبوب تیری محبت میری ہڈیوں میں پیوست رہے گی۔ [7] ہر وہ تکلیف اور غم کہ تیری طرف سے غمگین دل پر پہنچتی ہے وہ میرے لئے خالص راحت اور عافیت ہوتی ہے۔ [8] شوق کی آگ لپٹیں مارتی ہے ہمارا شوق اور صبر تو حد سے گذر گیا اور اگر تم صبر کر سکتے ہو تو ہم کو تو یہ طاقت نہیں رہی۔ [9] میرا کام تو یہ ہے کہ تیرے شوق میں جان ہونٹوں پر پہنچ گئی اور تیری طرف سے اب تک کسی ملاقات کی خوشخبری نہیں پہنچ سکی۔ [10] اے وہ ذات کہ تیرے لئے تیرا نام تمام بیماریوں کی شفا اور تیری یاد سے تمام غرضوں کا حصول ہے۔

اور کہتا ہے ؎

واللہ[1] ماطلعت شمس ولاغربت ۔۔۔ الا وذکرک مقرون بانفاسی
ولا[2] هممت بشرب الماء من عطش ۔۔۔ الا رأیت خیالا منک فی الکاس

اور کہتا ہے ؎

اے[3] نام تو راحتِ دہانم ۔۔۔ وز یادِ تو پُر شکر دہانم
گر[4] بر سرِ من تو تیغ رانی ۔۔۔ جز نام تو بر زبان نرانم

یہ ہے وہ ذکر اللہ جو اللہ کو پیارا ہے اور جس پر ثمرہ مرتب فرمانے کا وعدہ ہے کہ فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا کیونکہ محبت محبوب پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی۔ آج جو بیچارہ محب ہے امتحان کے سچا ثابت ہونے کے بعد محبوب بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے: قل[5] ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ خود سوچو کیا فرق ہے گھڑی کی رفتار کی طرح اللہ کا نام رٹنے میں کہ دل کہیں ہو اور خیال کہیں۔ اور محبانہ و عاشقانہ اشتیاق سے اللہ جلالہٗ کا نام پاک لینے میں۔ کہ وہ محبانِ دنیا کی عادت و خوئی اور یہ محبانِ خدا کی طلب و جستجو۔ بھوک کی طلب کا مدار پھر بھی خود غرضی پر ہے اور وہ شکم سیری پر ختم ہو جانے والی ہے۔ مگر محبانہ طلب خاص مخلصانہ طلب ہے اور غیر متناہی ہے کہ مر کر ہزار بار بھی زندہ ہو تو یہ طلب ترقی کرتی رہے گی اسی لئے اس کا صلہ بھی محبوب کی طرف سے غیر متناہی[6] راحت یعنی خلود[7] فی الجنۃ ہے کہ جیسا کام ویسا انعام۔

ملکۂ یادداشت غرض یہ محبت جب قلب میں اس درجہ پیوست ہو جاتی ہے کہ محبوب کا خیال ہمہ وقت قائم رہنے لگے اور کسی وقت بھی دل سے نہ ہٹے تو اس کا نام نسبتِ یادداشت ہے۔

یقین اور حضور اور ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے دن میں انسان سب کچھ کرتا اور اس کا یقین رکھتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اور جو کچھ کر رہا ہوں اسی کی روشنی میں کر رہا ہوں اسی کا نام یقین اور حضور ہے اور ان مختلف اثرات کو رنگہائے نسبت کہتے ہیں کہ ایک ہی باغِ محبت کے گوناگوں پھول ہیں جن کی بُو جُدا جدا ہے مگر مہک واحد اور سب میں مشترک ؎

بہر[8] رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش ۔۔۔ من انداز قدت را مے شناسم

---

[1] خدا کی قسم نہ کبھی آج تک طلوع ہوا نہ غروب مگر اس حال میں کہ تیرا ذکر میرے سانسوں میں ملا ہوتا ہے۔ [2] اور میں نے پیاس میں کبھی پانی پینے کا قصد نہیں کیا مگر تیرا خیال پیالے کے اندر نظر آ گیا۔ [3] اے وہ کہ تیرا نام میرے منہ کی راحت ہے اور تیری یاد سے میرا منہ شکر بھرا ہے [4] اگر میرے سر پر تو تلوار چلائے تو تیرے نام کے سوا میری زبان پر کچھ نہ آئے۔ [5] آپ فرما دیجئے اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔ [6] نہ ختم ہونے والا۔ [7] جنت میں ہمیشہ رہنا۔ [8] تم چاہے جس رنگ کا لباس پہن لو میں تمہارے قد کے انداز کو پہچان لیتا ہوں۔ اثرات اور رنگ کیسے ہی الگ الگ ہوں محبت پہچان لی جاتی ہے۔

مگر سب رنگوں میں پیارا رنگ وہ ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ محبت کا اثر امتثال محبوب پر بکمال اعتدال تھا اور جو شان زرخرید غلام کی اپنے مولیٰ اور آقا کے سامنے ہونی چاہئے وہ آپ کی اپنے اللہ جل جلالہ کے سامنے تھی۔ ہمہ وقت آقا کے دروازہ پر حاضر ہر لحہ حکم کے منتظر ہر امر میں طاعت کیلئے تیار اور اس کے ہر تصرف و انقلاب میں راضی و مسرور، نماز میں دل لگایا تو پاؤں ورم کر آئے گویا اسی کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور روزہ دار بنے تو ایسے کہ مہینہ مہینہ مسلسل ہو گیا اور چھوڑنے کا قصد نہ کیا، غنی بنے تو لاکھوں درہم و دنانیر کے ڈھیر نظر اور ہاتھوں سے گذار دیئے اور زاہد و فقیر بنے تو ایسے کہ گھر میں ایک دینار رکھ کر رات گذارنا دشوار ہو گیا، متاہل بنائے گئے تو نو نو بیبیاں رکھیں اور بار نفقہ کا پاس نہ آیا، اور سپہ سالار لشکر بنے تو ایسے کہ کوہ و جبل کو لرزہ آیا۔ درزی کی سوئی کو تامل ہوتا ہے کہ ململ میں چل کر ٹاٹ میں مشکل سے چلے لیکن آپ کو حق تعالیٰ نے بادشاہ سے لیکر گدا تک ہر شخص کو جتنے بھی مختلف حالات دنیا میں پیش آسکتے ہیں سب ہی میں چکر دیا مگر آپ یکساں تھے اور گویا مرکز سے بندھی ہوئی رسی کے طول پر دائرہ کا چکر لگا رہے تھے کہ جنوب ہو یا شمال اور مشرق ہو یا مغرب مگر آپ کا رخ ہر حال اور ہر وقت مرکز پر ٹھیرا ہوا تھا۔ موسم بدلے زمانہ بدلا، حالات پلٹے، وقت پلٹا، کبھی عسر ہوا کبھی یسر کبھی راحت ہوئی کبھی تکلیف، کبھی دن ہوا کبھی رات کبھی گرمی ہوئی کبھی سردی کبھی کوئی پیدا ہوا کبھی کوئی مرا کبھی فتح ہوئی کبھی شکست کبھی تمول ہوا کبھی فقر کبھی جوانی ہوئی کبھی بڑھاپا کبھی سفر ہوا کبھی حضر کبھی بیماری لاحق ہوئی کبھی صحت کبھی سب و شتم ہوا کبھی اعزاز و احترام، گردش فلک کے نیچے جو کچھ ہونا چاہئے سب ہی کچھ ہوا مگر آپ اپنی غلامی و عبدیت کے متوالے ہر حال میں مسلوب الارادہ تھے کہ بجز زبان حضور اور لبیک یا اللہ کچھ جانا ہی نہیں ؎

روزہا[1] گر رفت گو رو باک نیست — تو بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست

نسبتِ عبدیت اس کا نام نسبتِ عبدیت ہے اور یہی ترکۂ پدری ہیں ان خواص اولیاء کو دیجاتی ہے جن کو اقطاب کہا جاتا ہے کہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے سبب اصلاحِ امت کے لئے جانشینی کا کام انہی سے لیا جاتا ہے۔

بات بہت دور چلی گئی مگر بلا اختیار۔ حاصل یہ ہے کہ سلوک طریقت کا مقصود صرف یہ ہے کہ سالک کے قلب میں مرضیاتِ الٰہیہ کی ایسی طلب پیدا ہو جائے جیسی بھوکے کو غذا کی طلب ہوتی ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے خاص تعلیم کی کہ مجاہدہ و ریاضت کرے تاکہ بداخلاقیوں کے وہ عوارض دور ہو جاویں جنھوں نے فطرۃ کو مغلوب کر کے اس بھوک کو بند کر دیا اور اس تعلیم پر عمل کے ساتھ ضرورت ہے شیخ کے ساتھ انس اور

---

[1] بہت سے دن اگر چلے گئے تو کہدو جاؤ کچھ ڈر نہیں بس تو رہ لے وہ کہ تیرے جیسا کوئی پاک نہیں۔

تعلق کی کہ اس کے محب خدا قلب سے مرتبط ہو کر اپنے سیاہ کوئلہ قلب میں محبت کی چنگاری لگ جائے اور وہ بڑھتی رہے اور پہنچے جہاں تک بھی پہنچنا اس کے لئے مقدر ہوا۔ اس محب خدا کا شریعت پر عمل نہ جنت کی ہوس میں ہوگا نہ دوزخ کے خوف[1] میں بلکہ اس لئے ہوگا کہ اللہ جل جلالہ محبوب ہے اور وہ جنت دوزخ پیدا نہ فرماتا تب بھی مستحق تھا کہ مطلوب بنے اور ہم طالب و شیدا۔ اور اس کے ساتھ ہی چونکہ اس کی رضا اتباع شریعت ہی میں ہے کہ خود ارشاد فرما چکا[2] لہذا جائز ہی نہیں کہ اس سے سرمو قدم ہٹائیں ۔

ما ہر چہ[3] خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ۔ الا حدیث یار کہ تکرار

مولوی ظفر احمد صاحب کو جب حضرت نے بیعت فرمایا تو حجرہ میں لے گئے اور تصوف کی حقیقت مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح فرمائی۔ سلوک کا مقصود یہ ہے کہ بندہ کا دل حق تعالیٰ کی مرضیات کا ایسا طالب ہو جائے جیسا کہ جسم غذا کا طالب ہے اور اس کو عبادت کی ایسی خواہش ہو جیسی جسم کو غذا اور پانی کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ دل حق تعالیٰ کی عظمت و محبت سے پُر ہو جائے اور ماسوی اللہ کی محبت و عظمت سے خالی ہو جائے۔ جبتک اغیار کی محبت و عظمت اس درجہ میں قائم ہے کہ عظمت و محبتِ حق سے مزاحمت کرتی ہے اس وقت تک وہ مرضیاتِ حق کا طالب نہیں ہو سکتا اور نہ معاصی سے پوری طرح بچ سکتا ہے۔

پس اب دو چیزیں ضروری ہوئیں ایک تخلیہ کہ دل کو اغیار سے پاک کیا جائے اور دوسرے تحلیہ کہ دل کو محبت و عظمتِ حق سے پُر کیا جائے۔ پہلے زمانہ میں مشائخ ان دونوں کی الگ الگ تعلیم کرتے تھے مگر اب چونکہ عمریں قصیر ہیں اور افکار و مشاغل بھی زیادہ ہیں اس لئے اس وقت مشائخ نے ایسا طریقہ تجویز کیا ہے جس میں دونوں مقصود ساتھ ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ طریقہ کثرتِ ذکر ہے کہ طالب حق تعالیٰ کے ذکر اس درجہ مشغول ہو کہ یادِ الٰہی اس کے ہر بُنِ مو میں سرایت کر جائے۔ اس سے دل محبت و عظمتِ حق سے پُر ہو جاتا اور اغیار کی محبت و عظمت سے خالی ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے مرضیاتِ الٰہیہ کا شوق بڑھتا اور اس کی طلب دل میں مستحکم اور معاصی سے نفرت قوی ہو جاتی ہے کیونکہ جب وہ کسی معصیت کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک وحشت و ضیق اور ظلمت و بے چینی ایسی پیدا ہوتی ہے جو غیر ذاکر کے دل کو محسوس نہیں ہوتی۔ اس سے پریشان ہو کر وہ معصیت پر اقدام کرنے سے

---

[1] یعنی طلب جنت اور خوف دوزخ محض اس لئے ہوگا کہ محبوب نے طلب و خوف کو بتانا خود ان کی طلب و خوف نہ ہوگا۔

[2] فاستقم کما امرت راہ مستقیم پر رہو جیسے تم کو حکم دیا گیا ہے۔

[3] ہم نے تو جو کچھ پڑھا بھلا دیا سوائے محبوب کی بات کے جس کو بار بار دہراتے ہیں۔

رک جاتا ہے، اور اگر اتفاقاً معصیت کا صدور ہوجائے تو وحشت و دل تنگی ترقی پکڑ کر اس کو بہت جلد توبہ کی طرف مضطر کرتی ہے کہ بدون سچی توبہ کے اس کو چین نہیں پڑتا۔

ذکر و شغل کی تعلیم

اور کثرتِ ذکر کے دو طریقے ہیں ایک وہ جو مشائخ کا معمول ہے مثلاً ذکر نفی[1] اثبات اور ذکر اسم ذات[2] وغیرہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو دعائیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات اور مختلف حالات کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں ان پر مواظبت کی جائے میرے نزدیک ان دونوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے"۔ اس کے بعد آپ نے اپنے دستِ مبارک میں میرے ہاتھ لیکر حسب معمول بیعت فرمایا اور پھر دو سو بار ذکر نفی اثبات اور دو ہزار مرتبہ اسم ذات کی تلقین فرمائی اور خود باقاعدہ کرکے دکھلایا کہ چار زانو بیٹھ کر آنکھیں بند کرکے لا الٰہ کو کامل مد کے ساتھ گردن کی دائیں طرف لے جاکر الا اللہ کو قلب پر ہلکی ضرب کے ساتھ ختم کیا۔ دو تین بار اسی طرح کرکے دکھلایا اور فرمایا کہ مشائخ کا معمول یوں ہی ہے اور اسی طرح سکھلاتے آئے ہیں اس طرح نفع زیادہ اور جلدی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ذکر اسم ذات بھی خود کرکے دکھلایا۔

اور پھر فرمایا کہ حصن حصین سے ادعیۂ ماثورہ متعلقہ اوقات و حالاتِ مختلفہ معلوم کرکے ان کا بھی ورد کیا جائے اور چلتے پھرتے تسبیح ہاتھ میں رکھ کر شغل پاس انفاس کی مشق کی جاوے۔ اوپر کے سانس میں اللہ اور نیچے کے سانس میں ھو کا تصور کیا جائے، یہ بہت مثمر انوار و برکات ہے۔ نیز ذکر اسم ذات میں یہ تصور کیا جائے کہ لفظ اللہ کے ساتھ ایک نور منھ سے نکلتا ہے جو میرے سارے جسم کو محیط ہے اور پھر احاطہ کو اس قدر وسیع کیا جائے گویا تمام عالم کو محیط ہے اور تم اس میں فانی ولاشے ہو۔ اور لا الٰہ میں یہ تصور کیا جائے کہ قلب سے تمام ظلماتِ علائق ماسوی اللہ کو پس پشت پھینک رہا ہوں۔ اور الا اللہ میں یہ تصور کیا جائے کہ قلب انوارِ محبت و عظمتِ حق سے پُر ہوگیا۔

حضرت کے سوانح عمر[3] بتا رہے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو نسبتِ عبدیت سے نوازا تھا کہ اتباعِ شریعت میں گھل مل جانے کے سوا آپ پر کسی حال کا غلبہ نہ تھا اور صرف استقامت کا رنگ آپ پر چڑھا ہوا تھا کہ آپ کی زبان آپ کا دل اور آپ کے بدن کا رُواں رُواں بس یہ پکارتا تھا کہ اتباعِ سنت میں فنا ہوجاؤ اور عادات ہوں یا عبادات ہر حال اور ہر امر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اپنا امام اپنا ہادی اپنا پیشوا اپنا راہبر بناؤ کہ بجز اس کے کوئی صورت بھی فلاح کی نہیں۔ سنتِ محبوب ہی وہ قلعہ ہے جس کے چار طرف قدرت نے سربفلک دیواروں کا حصار کھینچ دیا ہے اور دروازہ پر امین و قوی پہرہ دار

---

[1] لا الٰہ الا اللہ۔ [2] اللہ اللہ۔ [3] عمر بھر کے واقعات۔

ٹکڑے کر دیتے ہیں کہ اس کے اندر شیطان کی کسی طرح رسائی نہیں ہو سکتی۔ پس ہر طرح کا امن چاہتے ہو تو اپنے آپ کو حصار کے اندر لے آؤ ورنہ اندیشۂ ہلاکت سے محفوظ نہ رہو گے۔

آپ کی ساری تعلیم کا خلاصہ صرف یہی تھا اور جس طرح آپ نے اس حال پر اپنی عمر شریف کے لمحات و ایام گذارے آپ چاہتے تھے کہ آپ کے منتسبین بھی اسی کے عاشق بن کر اپنی زندگیاں ختم کر دیں اور اس کے سوا کسی دوسرے رنگ کا مزہ بھی نہ چکھیں۔

موصوف کی نسبت کے متعلق حضرت گنگوہی کا بیان

حضرت امام ربانی مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے آپ کی نسبت کے متعلق جو ارشاد فرمایا وہ اس کی شہادت ہے کہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ شانہ نے میرے قرۃ العین[1] سید از لی خلیل احمد کو نسبتِ صحابہ سے نوازا ہے اور یہ کہ تمہاری نسبت کو میری نسبت سے زیادہ قرب و مناسبت ہے۔

چونکہ محبت میں یہ خاصیت ہے کہ مغایرت کو پسند نہیں کرتی اور کانِ[2] نمک کی طرح ہر شے کو اپنے رنگ میں لے آتی ہے چنانچہ المرء[3] مع من احب سے اسی کی طرف اشارہ ہے اور یہی سلوک کا اصل الاصول ہے جس کی ابتدا بیعت سے ہوتی ہے پس آپ اس تعارف و تعلق کو سالک کے قلب میں بڑھانے کی اول ہی کوشش فرماتے اور اس کو تعلیم کرتے تھے کہ شیخ سے ملنا جلنا بڑھائیں۔

بیعت کے بعد خط و کتابت کی تاکید

خط بھیجنے کا پابندی سے خیال رکھیں اور جہاں اوراد و اذکار کے پابند ہوں وہیں حب مع الشیخ کے وسائل اختیار کرنے کی سعی کرتے رہیں۔ بعض لوگ بیعت ہو کر جاتے اور مراسلت سے غفلت کرتے تو آپ کو یہ رسمی بیعت ناگوار گذرتی اور جب موقع پاتے اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔

بمبئی میں ایک صاحب آئے اور میں نے یہ سمجھ کر کہ حضرت نے پہچانا نہیں ان کی تقریب کی کہ یہ حضرت کے خدام میں ہیں حضرت نے ان پر غور کی نظر ڈالی اور شکایت کے درجہ میں فرمایا کہ میرے پاس تمہارا کبھی کوئی خط بھی نہیں آیا پھر بھلا پہچانوں کیسے؟ عرض کیا کہ حضرت خط بھیجنے کی مجھے عادت نہیں[4] ہے۔ بے ساختہ فرمایا مجھے بھی عادت نہیں کہ جو خط نہ بھیجے اسے یاد رکھوں۔"

مولوی محمود الغانی صاحب کرسوی کا خط بعد مدت آیا تو تحریر فرمایا عرصۂ دراز کے بعد عنایت نامہ

---

[1] آنکھ کی ٹھنڈک ازل سے نیک۔ [2] جیسے نمک کی کان جو چیز اس میں گر جاتی ہی نمک بن جاتی ہے۔ [3] انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے محبت کرے۔ [4] کس قدر غلط جواب ہے یا پاس رہ کر زبانی عرض کر کر کے حالات کی اطلاع پر ہدایات لیکر پیروی کی جاتی یا خط سے۔ جب دونوں نہیں تو خالی بیعت ہو جانے سے کیا ہو گا جیسے ڈاکٹر سے معاہدہ ہو جائے کہ ہمارا علاج کرنا پھر نہ حال بتایا جاتے نہ دوا بھیجی اور استعمال کی جائے تو کیا صحت ہو سکتی ہے۔

متضمن خیریت موجب مسرت ہوا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ نے ہم کو بالکل بھلا دیا مگر خیر اس خط سے معلوم ہوا ابھی کچھ تعلق[1] باقی ہے جو موجب یاد آوری ہوا۔"

محبت شیخ چونکہ پہلی سیڑھی ہے محبت الٰہیہ کی کہ جس طرح ایک نل سے وابستہ ہو کر دوسرے نل میں پانی آتا ہے اسی طرح شیخ کے منور قلب سے فیضان محبت سالک کے قلب میں پہنچے گا بشرطیکہ قلب طالب میں مستمندانہ[2] نشیب اور قلب شیخ کے ساتھ پوری محبانہ بندش ہو اس لئے اس کے حصول کی جو صورت حق تعالیٰ نے عالم اسباب میں تجویز فرمائی ہے اس کو آپ عمل میں لاتے اور نتیجہ مولیٰ کریم کے حوالہ فرماتے تھے کہ درحقیقت قلب میں محبت ڈالنا بطن مادر میں جنین کے اندر روح ڈالنے کی طرح اسی کا کام ہے۔

آپ روحانی معالج تھے اور معالجہ میں حاذق ہونے کے ساتھ حق تعالیٰ نے دست شفا بھی آپ کو مرحمت فرمایا تھا اس لئے جو کوئی بھی آپ کے دامن سے وابستہ ہوا وہ بالعموم کامیاب و صحتیاب ہوا چونکہ یہاں طبیب کا مطب بیان کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ وہ دوسروں کے لئے مفید کہ ہر مرض کا علاج جدا ہے اور ہر قسم کی تشخیص الگ۔ ہاں بالاجمال اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ آپ کا مطرح[3] نظر ہمیشہ یہ رہا کہ دوا کی مقدار نہایت قلیل ہو مگر زود اثر اور کثیر النفع ہو، بس میرے علم میں آپ کا کوئی خادم بھی ایسا نہیں جسے آپ نے متقدمین کے موافق چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات تلقین فرمایا ہو۔ آپ زیادہ تر اول ذکر نفی اثبات اور اس کے ساتھ دو ہزار یا تین ہزار یا چھ ہزار جیسی بھی سالک کی طبیعت اور اس کی فرصت و گنجائش دیکھتے ذکر اسم ذات بتلاتے اور بعض کو صرف چار سو مرتبہ ذکر لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم پر اکتفا فرماتے۔

ذکر میں دو باتوں کی تاکید

البتہ دو باتوں کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے ایک یہ کہ ذکر میں عجلت نہ ہو بلکہ پورے اطمینان اور شوق کے ساتھ پورا کیا جائے دوم مواظبت اور پابندی ہو کہ کسی حال میں ترک نہ کیا جائے کیونکہ ایک قطرہ جو ہمیشہ پڑتا رہے آخر ایک دن سوراخ کر دیگا مگر بارش کے کروڑوں قطرے جو موسلا دھار بن کر ادھر برسیں اور ادھر ختم ہو جاویں خاک بھی اثر نہ کریں گے۔ نیز آپ کا معالجہ زیادہ تر مرکبات سے ہوتا تھا جو معجون کا حکم رکھتی تھیں اور ان میں متعدد امراض اور مختلف قوتوں کی رعایت ایک وقت میں جمع کر دی جاتی تھی چنانچہ آپ اکثر ذکر ہی کے ساتھ مراقبہ تعلیم فرما دیتے تھے مثلاً یہ کہ ذکر میں لفظ اللہ کے ساتھ یہ تصور کرو کہ منہ سے ایک نور نکل رہا ہے جو اڑ کر اوپر تمام عالم کو محیط ہے۔ اور جب اس کے اثرات ظاہر ہونے لگتے تو

---

[1] یعنی اصلاح و تربیت کا نہیں صرف دوستی کی طرح خیریت معلوم کرنے کا۔ یہ تعریض تھی کہ اصل بات چھوڑ کر فضول میں مبتلا ہو رہے ہو۔ [2] حاجتمندانہ پستی۔ [3] نگاہ پڑنے کی جگہ۔

مراقبہ معیت تو مراقبہ معیت تعلیم فرماتے کہ ذکر کے وقت معیتِ حق کا تصور کرو کہ اللہ میرے ساتھ ہے اور پھر اس تصور کو ہر وقت اور ہر حال قائم رکھو کہ اللہ ساتھ ہے نہ جسم ہے نہ جہت نہ کوئی صورت ہے نہ کیفیت۔ ان تصورات کے قائم ہو جانے پر طالب کی جو حالت ہوتی تھی اس کو وہی خوب جانتا ہے جس پر گذری اور جس نے اس طریق کو طے کیا ہے۔ مجھے جہاں تک علم ہے انھیں تصورات قائم ہو جانے حضور مع اللہ کی شان پیدا ہو جاتی تھی اور پھر حضرت منتظر رہتے تھے کہ اس میں قوت اور شان تمکین پیدا ہو جائے کہ کسی وقت بھی ذہول و غفلت نہ ہو اور کوئی مشغلہ خواہ دنیا کا ہو یا دین کا اور کوئی حادثہ خواہ موت کا ہو یا ولادت کا اس حضور کو نہ مٹا سکے۔

خلافت کا معیار اسی کو اصل نسبت فرمایا کرتے اور اسی کے پختہ ہو جانے پر بیعت کی اجازت فرمادیا کرتے تھے۔ جبتک اس حضور کا تمکن اور جذر قلب میں بیٹھ جانا حضرت نے اپنی فراست و روحانیت سے جانچ نہیں لیا کتنے ہی حالات عجیبہ اور واردات حسنہ سالک پر کیوں نہ پیش آئے ہوں مگر آپ مجاز طریقت ہرگز نہ بناتے۔ ہاں دلدہی فرماتے اس کے شوق کو بڑھاتے واردات سے اس کی نظر ہٹاتے اور گویا محبت کے ساتھ فرماتے کہ بچو آگے بڑھو اور چلو چلو کہ مقصود ابھی آگے ہے۔ یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو راستہ کے مناظر اور شاہی باغ کی تفریح گاہیں ہیں عنقریب وہ محبوب نظر آیا چاہتا ہے جس کے نظارہ سے مست ہو کر تمہیں اپنی بھی خبر نہ رہے گی کہ کون ہو اور کہاں ہو عزیز و دوستو لپکو لپکو کہ بس چھاتی سے لگنے والی صرف ایک ہے اور وہ اتنا دیکھنا چاہتی ہے کہ تم اس کے طالب ہو اور اس کے آغوش کی تمنا میں پریشان حال بکھرے بال یہ جنگل قطع کر رہے ہو دیکھو دوڑو مت گھبراؤ مت آیا وہ وقت کہ نگاہ دوچار ہوئی اور ہاں خود لپک کر تم کو فرشِ خاک سے اٹھا لے گی اور لوریاں دے کر کہے گی کہ آ میرے بچھڑے ہوئے لال جس کے پاؤں میں میری خاطر چھالے پڑ گئے۔ اس مزہ کے سامنے راستہ کی ساری کلفت بھول جاؤ گے۔ تمہارا قلب محبت کا لذت چشیدہ بن جائے گا کہ اب وہ تم کو جدا کرے گی تو تڑپو گے اور ایڑیاں رگڑ کر اسی کی طرف ہاتھ پھیلاؤ گے۔ وہ کہے گی کہ ایک قلب میں دو کی گنجائش نہیں اور رقابت و شرک مجھے ناپسند ہے اگر آنا چاہو تو ہمارے سوا ہر شے کی محبت و تمنا دل سے رخصت کر کے آؤ تو کیسی دنیا اور کیسی اس کی ترقی سب کو پس پشت ڈالو گے اور پروانہ وار لپک کر التجا کرو گے کہ بارالہا پروردگارا ہم کو اپنا بنا لیجئے اور آستانہ سے دھکے نہ دیجئے۔ جناب خواجہ عزیز صاحب نے خوب فرمایا ہے۔

سب تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

دل میں داغوں کی یہ کثرت ہو گئی — رونما اک شانِ وحدت ہو گئی

ایک تم سے کیا محبت ہوگئی ۔۔ ساری خلقت ہی سے وحشت ہوگئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں ۔۔ مر ہی جاؤں گا جو صحت ہوگئی

آہ یہ وہ ٹھنڈی آگ ہے جس کی سوزش میں لذت جس کے درد میں مزہ جس کی ناریت میں نور اور جس پر مرمٹنے میں بقاء حیات ہے کسی کا منہ نہیں کہ جو کام کرنے سے تعلق رکھتا ہے اس کو کہہ کر سمجھائے اور لفظوں سے بتادے کہ حضرت سالک کو کہاں پہنچانا چاہتے تھے اور کس راستہ سے لے جانے اور اس کی مرافقت[1] کا کیا حق ادا فرمایا کرتے تھے جس نے دنیا کے کسی سفر میں حضرت کے ساتھ رہ کر اس کا اندازہ کیا ہو کہ آپ نے اس کے دکھ درد میں کتنا ساتھ دیا وہ سمجھ لے کہ یہ صرف نمونہ اور عکس تھا اس مرافقتِ طریق حق[2] کا جس کے لئے حضرت دنیا میں آئے تھے اور ہزاراں ہزار مخلوق کو ہر طرف سے پکڑتے تھامتے سنبھالتے دائرہ کے چکر پر اپنے ساتھ دوڑاتے لپکاتے لے چلے گئے حتیٰ کہ خود تو اپنے مرکز پر پہنچکر جس پاک مٹی سے پیدا ہوئے تھے اس میں جا ملے مگر محور پر چلنے والوں کو صحیح راستہ بتا گئے کہ اس دائرہ سے ایک نقطہ بھی اندر یا باہر نہ جھکیں ورنہ مرکز سے رُخ پھرتے ہی خدا جانے مقصود سے کتنا دور چلے جائیں

حضرت بالعموم ابتدا میں ذکر بالجہر کی تعلیم فرماتے تھے مگر متوسط کہ سونے اور سننے والے کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا کرتے تھے کہ اس سے مذکور کی طرف میلان اور شوق میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ فخر الدین صاحب کو تحریر فرمایا "اذکار میں آواز متوسط بلند ہونا چاہئے مگر ضرب قوت کے ساتھ ہو اور اگر ذوق شوق میں آواز زیادہ بلند ہو جائے تو مضائقہ نہیں" چونکہ یہ سلوک کی ابتدا تھی اس لئے شیطان رخنہ اندازی شروع کرتا اور قلب میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا تھا۔ کوئی کہتا کہ حضرت ذکر بالجہر سے تو شرم آتی ہے تو فرماتے کہ بھائی یہ شیطانی وسوسہ ہے اس کو تعوذ[3] دفع کرو اور ہمت کے ساتھ اپنے کام میں لگو۔ ایک خادم نے لکھا کہ حضرت ذکر بالجہر سے شہرت کا اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں گے بزرگ ہوگئے اور ریا کا احتمال ہے اس لئے مناسب ہو تو ذکر خفی تعلیم فرمادیں۔ جواب تحریر فرمایا۔ انشاءاللہ شہرت اور ریا کا اندیشہ نہیں اس زمانے میں تو ایسے لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کا نام لیں یا علم دین پڑھیں پاگل سمجھتے ہیں پھر ریا کا کیا موقع ہے۔ ریا تو ان افعال میں ہوتی ہے جو لوگوں کے نزدیک اچھے سمجھے جاویں[4]

کارکن کار بگذر از گفتار ۔۔ کاندریں راہ کار آید کار

ذکر کے آداب

نیز فرمایا کرتے کہ ذکر با وضو ہونا چاہئے بلکہ درویش سالک کو ہر وقت باوضو رہنا چاہئے اور اسم ذات ہو یا نفی اثبات اطمینان کے ساتھ خوب ٹھہر ٹھہر کر کرنا چاہئے اور معنی کا بخوم

---

[1] ہم سفری۔ [2] راہِ خدا کی ہم سفری۔ [3] اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا۔
[4] کام کر دکام، باتیں بنانے سے درگذر کر دکیونکہ اس راہ میں تو کام ہی کام آتا ہے

لحاظ رکھنا چاہئے اور بہتر ہے کہ آخر شب میں اٹھ کر تہجد کے بعد ذکر ہونا چاہئے کہ برکت اور قبولیت کا وقت ہے اور طبیعت پر اس وقت سکون و انبساط بھی زیادہ ہوتا ہے. ہاں کسی عذر کی وجہ سے کبھی آنکھ نہ کھلے تو دن میں جس وقت موقع پائے پورا کرلے اور آخر شب میں اٹھنے کا خاص اہتمام کرے کہ سلوک کی پہلی سیڑھی یہی ہے کسل کو پاس نہ آنے دے ہمت کو بلند کرے کہ آنکھ کھلتے ہی اُٹھ بیٹھے جہاں کسمسایا اور خیال کیا کہ اب اٹھوں اب اٹھوں بس وقت ہاتھ سے گیا کہ پھر سو کر اٹھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

سالک کو رؤیا پر مبارکبادی اور تنبیہ

سالک کو خواب نظر آتے تھے کہ حج کو جارہا ہوں. بزرگوں کے مجمع میں بیٹھا ہوں، بغیر کشتی و جہاز کے سمندر عبور کررہا ہوں، حرم شریف میں نماز پڑھ رہا ہوں، فرشتوں سے مصافحہ کررہا ہوں، ہوا میں اُڑ رہا ہوں، ایک قوتِ پرواز ہے جو زمین سے اوپر اٹھائے ہوئے خلا میں چلا رہی ہے یا مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا اور کسی نبی کی زیارت ہوتی یا مقامات متبرکہ میں کسی مقام کی. تو ایسی تمام خوابوں پر آپ مبارکباد لکھتے اور تحریر فرماتے کہ الحمد للہ حسنِ احوال کی علامت ہے اور کوئی پریشان خواب لکھا کہ سانپ پکڑے ہوئے ہوں یا شیر مجھ پر حملہ کررہا ہے یا کتا بھونک رہا ہے وغیرہ تو اطمینان کہ یہ سب شیطانی اثرات ہیں دُور مت انشاء اللہ دفع ہوجائیں گے اور جب ایسا خواب دیکھ کر آنکھ کھلا کرے تو اعوذ پڑھ کر بائیں طرف تھوتھو کرکے کروٹ بدل لیا کرو" ایسے وحشت ناک خواب زیادہ تر ان لوگوں کو نظر آتے تھے جو کسی نااہل پیر کی بیعت توڑ کر ادھر متوجہ ہوتے تھے کیونکہ ان کے ذہن کا یہ تخیل و اندیشہ کہ فسخ بیعت سے کوئی مصیبت نازل نہ ہو جیسا کہ متروک پیر غصہ ہوکر دعوی کے ساتھ کہہ رہا ہے ان کے دماغ میں متخیل ہوتا اور پھر شیطان اس میں سہارا لگاتا اور حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کی طلب صادق اور پختگی و ہمت کا امتحان لیا جاتا تھا. پس ایسی صورت میں آپ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتے اور قلباً و جسداً لساناً و قلماً[1] ہر طرح اس کو سنبھالتے اور پھسلنے سے بچاتے تھے۔

پورب کی ایک مسماۃ کو یہی صورت پیش آئی اور اتنی وحشتناک خوابوں کا سلسلہ بندھا کہ خدا کی پناہ. حضرت سے تجدید کرتے ہی کبھی خواب دیکھا کہ نجاست بھرے ہوئے سنڈاس میں کو گذر رہی ہوں کبھی دیکھا گھر میں آگ لگ گئی اور جان بچا کر باہر جنگل کو بھاگ رہی ہوں، کبھی دیکھا الہ آباد کے اسٹیشن پر ریل کی منتظر ہوں مگر ریل آکر چلی گئی اور میں حیران پریشان بیٹھی رہ گئی وغیرہ وغیرہ. وہ بیچاری بلکہ دوسرے سننے والے بھی یہی تعبیر دیتے کہ فسخ بیعت کے وبال میں وصول الی اللہ سے محرومی ہوئی اور گندگی

[1] دل سے جسم سے زبان سے قلم سے۔

آتش عذاب میں پڑگئی مگر اللہ رے استقلال وہ یہی کہتی رہی کہ جو پیر عورتوں کے مجمع میں منہ کھول کر آئے اور پردہ نشین جوان مریدنیوں سے کہے کہ میرا منہ دیکھ لو تاکہ قیامت کے دن مجھے پہچان سکو تو وہ پیر بننے کے ہرگز قابل نہیں ہے۔ اگر بیعت کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی محبت اور اس کے احکام کی تعمیل نصیب ہو تو پیر کا مریدوں سے زیادہ متبع شریعت ہونا ضروری ہے پس یا کہو کہ پردہ کا حکم شریعت میں نہیں ہے اور اگر یہ غلط ہے تو بے پردہ پیر ہرگز بیعت کے قابل نہیں ہے۔ کئی مہینے تک اس بیچاری کو یہ ابتلا رہا۔ آخر فضل الٰہی نے دستگیری کی کہ خواب دیکھا گھر میں آگ لگی اور گھبرا کر باہر نکلی، کوئی تعاقب کر رہا ہے کہ ہلاک کرے اور یہ بدحال پریشان بھاگ رہی ہے کہ جائے پناہ تلاش کرے۔ کچھ فاصلہ پر چند نورانی صورتیں نظر آئیں اور یہ ان میں گھس گئی کہ دشمن سے بچاویں۔ ایک بزرگ کھڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے غصہ کے تیز لہجہ میں تعاقب کرنے والوں کو دھتکارا وہ معدوم و فنا ہو گئے اور آنکھ کھل گئی۔ خواب ہی میں قلب پر وارد ہوا کہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی تھے۔ بس وہ دن آفتوں کے ختم کا دن تھا کہ اس کے بعد نورانی خواب نظر آنے لگے اور قلب کا سکون بڑھتا چلا گیا۔

ہونہار منتسبین پر خصوصی توجہ جن منتسبین کو آپ ہونہار پاتے ان کی طرف خصوصی توجہ فرماتے اور اولاد سے زیادہ ان کو محبوب سمجھتے تھے۔ حافظ فخر الدین صاحب کو بیعت کے بعد صرف تسبیحات بلا قید وقت وغیرہ پڑھنا تعلیم فرمایا اور حالات کی اطلاع دیتے رہنے کا حکم دیا۔ طبیعت میں استعداد پا کر کچھ ہی دنوں بعد نفی اثبات اور ایک ہزار بار اسم ذات کا ذکر تلقین فرمایا اور چار سال تک یہی چلتا رہا کہ بحمد اللہ کامیاب ہوئے اور مولوی محمد یحییٰ صاحب کے ہاتھ سے اجازت نامہ لکھوا کر بھیج دیا۔ اثناء سلوک میں ان پر ایک خاص حالت حزن کی پیدا ہوئی کہ کھانے پینے سے بے رغبتی بڑھ گئی خوراک کم ہو گئی۔ طبیعت ہر وقت مضمحل رہنے لگی کہ بیوی سے بولنے کو دل چاہے نہ بچوں سے ہنسنے کو، دوستوں سے مل کر وحشت ہوتی اور اکیلے پڑے رہنے میں مزہ آتا۔ رونے کو دل چاہتا اور جنگل کی طرف نکل جانے کی طلب ہوتی تھی۔ ہر وقت حزن کا غلبہ دیکھ کر یاں کو پریشانی ہوئی اور ان کے والد نے حضرت کو لکھا کہ بچہ کی ایسی حالت سے ماں بہت متفکر ہے۔ حضرت نے ان کو جواب لکھ دیا کہ چند روز کی مشقت ہے اس کا خیال نہ کریں ان شاء اللہ جلد کامیابی ہوگی اور یہ صورت نہ رہے گی۔ خود حافظ صاحب نے اپنا حال بذریعہ تحریر پیش کیا تو آپ نے جواب لکھا مبارک حالت ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے: کان[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم متواصل الاحزان۔ پس حزن خواہ اپنے نقصان پر ہو یا محبوب حقیقی سے

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل فکر وں والے تھے۔

مجبوری پر ہو یا خوف و رجا کی وجہ سے ہو بہر حال اچھا اور عمدہ ہے۔ نیز ذاکر کا قلب جب ذکر کے ساتھ منصبغ ہو جاتا ہے تو لذائذ دنیویہ سے طبع میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ یہ نعمت میرے لخت جگر کو نصیب ہوئی"۔ اس کے بعد جب آپ تورجہ تشریف لائے کہ حافظ صاحب وہاں اسٹیشن پر ملازم تھے تو مسرت کے ساتھ فرمایا حافظ جی تمہارے ساتھ تو ہمارا پرانا تعلق نکلا۔ غرض کیا حضرت وہ کیسے فرمایا تمہارے والد صاحب سے خط کتابت رہی اور معلوم ہوا کہ انھوں نے تو غدر سے پہلے مولانا مملوک علی صاحب سے تحصیل علم کیا ہے اور مولانا رحمت اللہ علیہ میرے نانا تھے۔ بعض خدام پر کشف زمانی و کشف کونی کا دروازہ کھلتا کہ رات کو واقعہ خواب میں دیکھا اور صبح کو اس کا ظہور بجنسہ ہو گیا۔ مگر آپ اس کی مقصودیت بھی ذہن میں نہ جمنے دیتے تھے۔ بعض پر حقائق علمیہ کا انکشاف ہوتا اور طرح طرح کے نکات و دقائق احادیث و آیاتِ قرآنیہ کے متعلق منکشف ہوتے تو آپ مبارکباد دیتے مگر فرماتے کہ مقصود ابھی آگے ہے۔ کسی پر مخلوق سے وحشت اور خلوت کی محبت کا غلبہ ہوتا تو آپ سنبھالتے اور صحرانوردی سے روکتے تھے۔

مولوی لطیف احمد صاحب حضرت مولانا رائپوری سے بیعت تھے اور بچپن سے حضرت رائپوری کے زیر سایہ پرورش پائی تھی مگر طبیعت میں آزادی تھی کہ شرارتوں کی وجہ سے حضرت نے کئی بار سزا بھی دی۔ آخر آوارہ گردی کی دھن میں وطن سے نکل پڑے اور برسوں بنگال کی طرف مارے پھرے کہ اسی درمیان میں حضرت رائپوری کا وصال ہو گیا۔ اسی مدت میں بیسیوں پیروں کے پاس پہنچے اور سب ہی نے چاہا کہ مرید کریں۔ ایک بدعتی فقیر نے تو اتنا زور دیا کہ پچیس دن تک روکے رکھا اور جانے کی اجازت نہ دی، مگر حضرت کے انتساب کی برکت تھی کہ کسی جال میں نہ پھنسے اور آخر پچیسویں دن شب کو چوری سے نکل بھاگے اور اب گجرات کی سیر و سیاحت شروع کی۔ اس اثناء میں ایسے ناقابلِ بیان واقعات پیش آئے کہ عیاذاً باللہ ارتداد کی طرف میلان ہوا اور ایک معزز یورپین پادری کا رقعہ لیکر احمد آباد کے پادری مسٹر مارٹن کے پاس جانے کی نوبت آئی۔ آخر معمولی میلان پر حضرت سے بذریعہ تحریر بیعت ہوئے تو کایا پلٹ گئی اور خود لکھتے ہیں کہ حضرت کا روحانی تصرف ہے جو آج یہ غلام مسلمان ہے ورنہ عرصہ سے کسی جا کا پادری بنا بیٹھا ہوتا۔ الحمد للہ کہ حضرت کی دعا سے میری تمامی دنیوی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا"۔ ان کی بیعت حضرت کے قیام ہندوستان کے اخیر زمانہ کی ہے اور بیعت کے بعد شاید حضرت کی زیارت کا اتفاق راندیر میں ایک یا دو ہی دفعہ اور پھر آخری سفر حج کے وقت حیدرآباد میں ہوا باقی جو کچھ تعلیم ہوئی وہ بذریعہ تحریر ہوئی اور اب ان کے احوالِ حسنہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ بے روزگاری سے ان کو پریشانی لاحق ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ وساوس و خطرات کا ہجوم ہو کر ذکر کے اثر سے جنگل میں جا بیٹھنے کا شوق بڑھا تو حضرت نے

تحریر فرمایا تمہاری پریشانی اور بیکاری سے کلفت ہے۔ حق تعالیٰ شانہ تمہارے لئے رزق کا باب مفتوح فرماوے تمہاری پریشانیوں کو رفع فرماوے اور اہل وعیال کو صحت عطا فرماوے۔ وساوس وخطرات کا کچھ فکر نہ کریں، نہ اس کے دفعیہ کے درپے ہوں، جب اطمینان قلب نصیب ہوگا یہ سب خطرات رفع ہوجائیں گے۔ جس وقت فرصت ہوا کرے مراقبہ کرلیا کریں۔ جنگل میں جاکر بیٹھنا اور کھانا پینا ترک کرنا راہبوں کا کام ہے اسلام میں یہ نہیں ہے۔ فقط والسلام

دوسرے خط میں تحریر فرمایا آپ التزام اور اقامت کے ساتھ اپنا ورد اور وظائف پڑھتے رہیں اور پورے کرتے رہیں، کیفیات کے پیچھے نہ پڑیں جنگل کے نکل جانے کا خیال صرف خیال ہی کے درجہ میں رہنا چاہئے۔ البتہ کبھی کسی وقت تفریح کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کا مضائقہ نہیں۔ ذکر چار زانو بیٹھ کر کرنا چاہئے مراقبہ کے لئے کوئی بیٹھک مخصوص نہیں۔ ذکر اسم ذات یک ضربی کرنا چاہئے۔ خواب میں حضرت گنگوہی کی زیارت موجب برکت ہے۔ والسلام

رخصت کے وقت حضرت نے ان کو مشورہ دیا کہ عاشق الٰہی کے ساتھ مراسلت رکھیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ وہ تو جوابی خط کا بھی جواب نہیں دیتے۔ فرمایا تم نے پتہ کیا لکھا تھا؟ عرض کیا خیر نگر دروازہ میرٹھ فرمایا یہی تو خرابی ہے پتہ بھی غلط لکھا اور پھر خود بندہ کا پتہ تحریر فرما کر ان کے حوالہ کیا اور فرمایا میرے لوگوں میں سب سے زیادہ انتظام جواب کا اسی کے ہاں ہے۔

لگی ہوئی ملازمت کا ترک آپ کو بالکل پسند نہ تھا اور کبھی اجازت نہیں دیتے تھے کہ خود کوئی ملازمت یا سلسلۂ معاش کو چھوڑے کہ کفران نعمت ہے اور اس کے وبال میں آدمی بہت پریشان ہوتا ہے۔ ذکر وشغل تو کیا نماز بھی اطمینان سے نصیب نہیں ہوتی۔ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" اسی طرح لوگ اپنے اہل وطن اور اعزہ کی طرف سے کوفت وکلفت پاکر خواہش کرتے کہ وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا رہیں تو یہ بھی آپ پسند نہ فرماتے اور لکھا کرتے کہ بھائی پریشانی سے دنیا میں کوئی بھی خالی نہیں ہے۔ پریشانیاں تو انسان کے ساتھ پیدا ہوئی ہیں کہ جبتک انسان رہے گا پریشانیاں اس کے ساتھ رہیں گی اس لئے منہ سر لپٹے پڑے رہو اپنی طرف سے کہیں جانے کا خیال نہ کرو کہ باہر جاکر خدا جانے کن پریشانیوں میں مبتلا ہوگے۔

مولوی لطیف احمد کو اہل بدعت کی طرف سے روحی تکالیف کے ساتھ بدنی تکلیف بھی پہنچی تو آپ نے لکھا۔

مکتوب گرامی السلام علیکم۔ آپ کی اور قاری نظام الدین صاحب کی تکلیف جو آپ صاحبوں کو پہنچی موجب کلفت اور موجب مسرت ہوئی۔ کلفت تو اس وجہ سے کہ دوستوں کی تکلیف موجب کلفت ہوا ہی کرتی ہے اور مسرت اس وجہ سے کہ جو کچھ تم صاحبوں کو تکلیف پہنچی ہے وہ فی سبیل اللہ تھی تم نے

حدیث میں دیکھا ہوگا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت مبارک مجروح ہوئی تھی تو آپ فرماتے تھے

هل انت الا اصبع دميت وفی سبیل الله ما لقیت[1]

اہل اللہ کو یہ تکالیف قدیم سے اٹھانا پڑی ہیں یہاں تک کہ قتل تک ہوئے ہیں۔ پس اگر ہم کو یا ہمارے دوستوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو موجب مسرت ہونا چاہئے۔ میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔[2]

حضرت کی تحریر مختصر مگر جامع اور ایسی بابرکت سیدھی سادی ہوتی تھی کہ دو فقروں میں بڑے بڑے مسائل و مراحل طے فرما دیتے تھے۔ تکلیف جسمانی ہو یا روحانی موجب کلفت بھی رہے کہ اجر کا مدار اسی پر ہے اور شان تسلیم و رضا بھی مرتب ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان دو اضداد یعنی رنج و خوشی کے ایک جگہ جمع ہونے کا عملی سبق آپ نے دو سطروں میں پڑھا دیا۔

اندازِ تحریر بعض سالکین پر بغض فی اللہ کا غلبہ ہوتا کہ وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ جن کو معاصی یا بدعقیدگی میں منہمک پاتے تو کوئی تعلق نہ رکھ سکتے تھے تو آپ اس کو اعتدال پر لانے کے لئے فرمایا کرتے کہ میاں خدا بن کر تو تم نہیں آئے، اس کی مخلوق ہے وہ جو چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے۔ اللہ کی مشیت یہی ہے کہ کافر اور مومن، فاسق اور صالح سب اس دنیا میں آباد رہیں کہ شروع سے عالم کو اسی طرح چلایا ہے۔ نرمی و شفقت کے ساتھ ان کو سمجھاؤ کوئی نہ مانے تو یہ سمجھ کر کہ اللہ کی مشیت یوں ہی ہے چپ ہو جاؤ مگر قطع رحمی نہ کرو۔

خود مجھ پر یہ حالت گذری کہ اپنے خاندان کے بعض بڑوں کو مبتلائے بدعات یا بے نمازی دیکھتا تو اندر ہی اندر جھرا کرتا تھا کہ نہ زور کے ساتھ نصیحت پر قدرت تھی اور نہ ان کی یہ غفلت ضبط ہو سکتی تھی حضرت کو لکھا تو آپ کا والا نامہ آیا۔

گرامی نامہ السلام علیکم۔ بغور سنو خداوند تعالیٰ اجل و علیٰ شانہ نے دنیا میں کافر و مسلم دیندار و بددین حسن اور قبیح پیدا فرمائے اور ہر ایک کو لما خلق لہ[3] کی طرف رغبت دی تم کسی پر داروغہ کر کے نہیں بھیجے گئے۔ تم بقدرِ وسعت امر بالمعروف کے مامور ہو اور جب نہ کر سکو تو خدا کی مخلوق کو خدا پر حوالہ کرو۔ پھر کسی کی حالت کا مشاہدہ آپ کے لئے کیوں سوہانِ روح ہے۔ دنیا میں جو چیز پیدا ہوئی ہے کتنی ہی قبیح ہو حکمت سے خالی نہیں ہے پھر قاضی شہر کے اندیشہ سے کیوں دبلا ہو۔

ماثورہ دعاؤں کی ترغیب و تاکید حضرت اپنے منتسبین کو نشست برخاست خواب بیداری دخول

---

[1] نہیں ہے تو مگر ایک ایسی انگلی کہ خون آلودہ ہوگئی ہے اور خدا ہی کے راستہ میں تو ہے وہ مصیبت جس سے تو نے ملاقات کی ہے۔

[2] باپ کی میراث چاہتے ہو تو باپ کا علم سیکھو۔ [3] اس عمل کی جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

خروج بول براز صبح شام دن رات غرض ہر وقت اور ہر حال کے متعلق جو دعائیں حدیث[1] میں آئی ہیں ان کی مواظبت پر اہتمام کی تعلیم دیتے اور عادات میں بھی اتباع سنت محمدیہ کے ہمہ وقت دھیان اور لحاظ قائم رکھنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اس کی برکت سے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت قلب میں پیدا ہوتی تھی۔ اور چونکہ آپ ہی دربار خداوندی کے فیوضات تقسیم فرمانے کا واسطہ و وسیلہ ہیں اس لئے برکات محبوبیت کی بارش برسنے لگتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے پیدل یا بہل میں یا تانگہ یا موٹر میں یا ریل پسنجر پر راستہ قطع کرتے تھے تو آپ کے منتسبین اس میل ٹرین میں سفر کرتے تھے جس کا زبردست انجن آندھی کی طرح بیسیوں اسٹیشنوں کو چھوڑتا ہوا جاتا تھا کہ سوئے تھے وطن کے اسٹیشن پر اور آنکھ کھلی تو منزل مقصود پر کھڑے نظر آئے اور راستہ کا کوئی جنگل پہاڑ بستی باغ دریا جھیل شہر یا گاؤں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

بدعت سے بچنے کی تاکید ہاں دوا کے ساتھ آپ کو پرہیز کا بہت اہتمام تھا تھا کہ سب سے زیادہ آپ بدعت[2] سے بچنے کی تاکید فرمایا کرتے اور سمجھاتے تھے کہ دوا کھا کر ضد کا استعمال کیا تو دوا کا نفع کیا خاک ہوگا۔ قلب کی ساری صلاحیت کا مدار ہے حق تعالیٰ کی محبت پر اور اس کا طریق صرف وہ ہے جو اس کے اپنے محبوب اکمل نے تعلیم و تعمیل کے ذریعہ زبان سے کہہ کر اور بدن سے کر کے مخلوق کو دکھا دیا پس اس کے خلاف ذرہ برابر بھی دوسروں کی تجویز کو پسند کیا تو نہ وہ نور و برکت رہے گی جو سنت محمدیہ پر موقوف تھی اور نہ وہ حصار[3] و امن رہے گا جو معمولات محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس بدعت کا ارتکاب تو بڑی چیز ہے اس کی رغبت اور قلب میں اس کی طرف سے وحشت کی کمی کو بھی سالک کے لئے آپ سم قاتل فرماتے تھے کہ لاکھ دوائیں اور مقویات استعمال کرے مگر ساتھ میں ذرا سا سنکھیا کھالے تو انجام ظاہر ہے کہ مرنے سے بچ بھی گیا تو خشکی کا دوسرا مرض اتنا قوی ہو گیا جس کے سبب قوی دواؤں کا اثر بھی کمزور پڑ گیا اور اب معالجہ بھی مشکل ہو گیا۔

سالک جتنا بھی سنت کے دامن سے چمٹے گا اسی قدر باران رحمت میں جوش آئے گا اور جتنا اس سے قلباً یا جسداً ہٹے گا اسی قدر شیطان اس پر قابو پائے گا۔

آپ کی تعلیم کا سارا راز ان دو حرفوں میں مضمر تھا کہ عادت ہو یا عبادت اللہ کے محبوب کی ہر ادا کو

---

[1] یہ حصن حصین اور مناجات مقبول میں مل جائیں گی۔

[2] بدعت کے لئے حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جس نے ہمارے اس کام یعنی دین میں کوئی نئی بات پیدا کی جو اس سے ماخوذ نہیں وہ مردود ہے اس کی دو صورتیں ہیں جو قرآن و حدیث میں نہ ہو اس کو ثواب قرار دینا، یا صرف جو جائز ہو اس کو یا مستحب کو واجب قرار دے لینا ہے اور فرمایا ہے کہ بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔

[3] قلعہ۔

دانتوں سے مضبوط تھامو اس پر عمل کرو اور محبت و شوق کے ساتھ عمل کرو کہ ہمارے اللہ کے محبوب پیغمبر کا طریقہ ہے۔ اس طرح اول محبوب کی محبت قلب میں آئے گی اور وہ پہنچائے گی محب یعنی اللہ جل جلالہ کی محبت تک کہ اس کی وجہ سے شوق ہوگا اللہ کو راضی رکھنے کا اور طلب ہوگی مرضیات کی فہرست معلوم کرنے اور اس پر چلنے کی۔ لہذا شریعت کے علم اور عمل کا شیدا بن کر اپنی زندگی کے لمحات اس حالت پر گذاریگا جو آفرینش بنی آدم کی غایت ہے اور جس کی تعلیم کے لئے آنحضرت روحی فداہ دنیا میں تشریف لائے تھے اسی کا نام حیات طیبہ ہے اور یہی شریعت کی روح اور طریقت کا مقصود ہے۔

اعمال میں آپ کی نظر زیادہ ان امراض پر جاتی تھی جو وبائی بن کر عموم لیتے اور اندھیاؤں کی طرح نہ آگ دیکھیں نہ پانی سب کو مکدر و مغلوب بناتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً سود دینا کہ سود لینے کو سب حرام سمجھتے ہیں مگر سود دینا اتنا آسان ہوگیا کہ معمولی ضرورت بلکہ خرافات اور حظ نفس میں بھی بے دریغ اس پر جھکتے ہیں کہ قلوب سے بھی اس کی حرمت و وحشت کا اثر جاتا رہا۔ لہذا آپ کسی کو سنتے کہ اس پر سودی قرض ہے تو بہت زیادہ تاکید فرماتے کہ اس بلائے بے درماں سے جہاں تک ممکن ہو جلد نکلو اور فاقہ کرو تنگی جھیلو ضروریات کو بند کرو مگر اس وبال سے کسی طرح نجات پاؤ جو شعلہ نار کی طرح سارے چھپر پھوس کو ایک آن میں راکھ بنا چھوڑیگی

داڑھی کی تاکید اسی طرح داڑھی کو منڈانا یا کتروانا کہ ایک مشت سے کم ہو جائے آپ کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا میں نے بارہا دیکھا کہ کوئی اجنبی آتا جس پر خفگی کا کوئی حق نہ ہوتا تو آپ باکراہ اس سے گفتگو کرتے اور گرانی کے سبب منہ پھیر لیا کرتے کہ ایسی حالت کا دیکھنا آپ کو برداشت نہ ہوتا تھا۔ کوئی ایسا شخص بیعت ہوتا تو سب سے اول اور سب سے زیادہ تاکید اسی کی ہوتی تھی کہ آئندہ کبھی داڑھی نہ کتروانا۔ اور کسی خادم کو اس کا مرتکب پاتے تو اول نرمی سے اور پھر غصہ سے نصیحت فرماتے اور آخر تیسری بار صاف فرما دیا کرتے تھے کہ میرا تعلق داڑھی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ رہے گی تو وہ بھی رہے گا اور یہ قطع ہے تو اسی وقت وہ بھی قطع ہے۔

نیز فرمایا کرتے کہ نصرانیت کا لباس داڑھی منڈانا یا کتروانا عورتوں کا مردانہ وضع سے انس کھڑا جوتہ پہننا۔ پردہ میں کمی کرنا وغیرہ طاعون اور ہیضہ کی طرح وباء عام بن کر پھیلے ہوتے ہیں کہ جسے دیکھو اس مرض میں مبتلا ہے الا من شاء اللہ[1]۔ ان کے نزدیک گویا داڑھی رکھنا شعار اسلام اور طریقہ محمدیہ ہی نہیں اور اسلام کی صورت سے بھی وحشت ہے۔ ایسی حالت میں محبت حق کا حصول ناممکن ہے۔

انداز تعلیم و تربیت حضرت کی تعلیم سالکین کے طبائع کی رعایت پر مختلف ہوتی تھی جو کسی ایک صورت میں محدود نہیں اور اس کا مدار محض آپ کی حذاقت تشخیص اور فہم خداداد پر تھا

[1] بجز اس کے جس کو اللہ نے چاہا۔

کو کسی کو چشتیت کی تعلیم فرمائی اور کسی کو نقشبندیت کی کسی کو مراقبہ صمدیت تلقین فرمایا کسی کو مراقبہ معیت کسی سے ذکر کا کام زیادہ لیا کسی سے شغل کا۔ کسی کو اوراد زیادہ تعلیم کئے کسی کو محض ایام بیض کے روزے اور تہجد اوابین واشراق کے نوافل۔ مگر یہ امر مشترک سب میں ملحوظ رہتا تھا کہ عادات میں اور احوالِ مختلفہ کی ادعیہ ماثورہ میں سنت کا اتباع اور خیال اور دھیان ضرور رکھیں اور جادۂ شریعت سے جاول برابر بھی قدم نہ ہٹائیں، اور سالکین کے لئے تو تاکید تھی کہ صغیرہ گناہ کو بھی سانپ بچھو سمجھیں اور گنجائش چھوڑ کر عزیمت[1] پر عمل کریں۔

حافظ فخر الدین ریلوے ملازم تھے اور اکثر ریلوے ملازمین کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت ہے۔ آپ ان کو سفر میں ساتھ لیتے تو ٹکٹ دینے کے دروازہ پہنچ کر آپ ان کو آگے بڑھاتے کہ چلو اور اس طرح نظر ڈالا کرتے کہ ٹکٹ لیا تھا یا نہیں۔

خدام کو ساتھ کھانا کھلاتے تو دیکھا کرتے کہ پانی کا برتن سیدھے ہاتھ میں اور بری طرح سے لیا یا سکون آرام کے ساتھ۔ چاء پلاتے تو نظر رکھتے کہ پیالی داہنے ہاتھ سے اٹھائی یا بائیں سے۔ بہرحال یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ حضرت کے منتسبین کو کیا کیا تعلیم ہوئی۔ عوام سے زیادہ آپ کی طرف علماء اور اہلِ ذوق کا رجوع ہوا کہ اس جماعت کے ایک شخص کی اصلاح گویا ہزاراں ہزار کی اصلاح تھی۔ اس لئے آپ کی نسبت عبدیت کا نور جو آپ کی پیشانی میں چمک رہا تھا ان قلوب کو زیادہ کھینچتا تھا جو ایک قوم کے مقتدا ہیں یا آئندہ بننے والے ہیں۔

نیز آپ کی توجہ زیادہ تر اپنے مرشد مولانا گنگوہی کے ان متوسلین کی طرف زیادہ مبذول ہوئی جن کا کسب ناتمام رہ گیا تھا یا صرف بیعت ہو کر اس کے ثمرات سے ناآشنا تھے اور ان کی تکمیل کو آپ اپنے اوپر منجملہ حقوق شیخ سمجھ کر واجب الادا سمجھے ہوئے تھے۔ حضرت کے یہاں کوئی رجسٹر نہ تھا کہ مریدین کے نام لکھے جاتے اور صحیح شمار ہو سکتی۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے اطرافِ ہند میں حضرت کے منتسبین بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں اور آخر زمانہ میں تو اتنا رجوع بڑھا کہ ایک دفعہ میں کئی کئی سو کو آپ نے اس طرح بیعت کیا کہ عمامہ دور تک پھیلا دیا اور طالبین اس کو پکڑتے چلے گئے۔ جو سفر بھی آپ کا ہوا جہاں آپ نے دینی مدرسہ کی بقا[2] اور زائرین کی تعلیمِ دین کا نفع اس سے اٹھایا وہیں سلسلۂ روحانیہ کی تخم ریزی بھی فرمائی اور بدعات و معاصی سے توبہ کرا کے اتباعِ سنت پر جمے رہنے کا عہد لیا۔ پھر جس نے کسب[3] کرنا چاہا اس کو تعلیم دی ورنہ برکات دخولِ سلسلہ سے مالامال ضرور کر آئے۔

---

[1] جو حکم اولاً ہو وہ عزیمت ہے جو عذر کے وقت نرمی کا ہے وہ رخصت ہے اور گو رخصت پر عمل کرنا بھی پسندیدہ ہے مگر نفس کو ڈھیل کا عادی بنانے میں وہ بے عذر یا غیر واقعی عذر میں بھی رخصت و گنجائش اختیار کر لیتا ہے جو مضر ہوتا ہے اس لئے کوشش عزیمت کی ہونی چاہئے تاکہ نفس کو ڈھیل نہ ملے اور جب واقعی عذر ہوگا تو عزیمت پر عمل ہو ہی نہ سکے گا اس وقت صحیح عمل پر رخصت کا عمل ہوگا اور نفس کی شرارت نہ چل سکے گی۔ [2] مظاہر علوم کی امداد۔ [3] کما ناطریق کی دولت کا نسبت مع اللہ کا حضورِ دل اور محبتِ الٰہی۔

رنگون کا سفر

چنانچہ حاجی محمد یوسف کی دعوت پر آپ رنگون تشریف لے گئے تو ان کی درخواست پر پورا رمضان وہاں گذارا اور دس بارہ تاجر داخل سلسلہ ہوئے جن میں محمد ابراہیم سیٹھ ابراہیم محمد منی اور محمد جیوا کرواصاحب قابلِ ذکر ہیں۔

میرٹھ، دہلی، کاندھلہ، گلاؤٹھی وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا کہ بارہا تشریف لاتا ہوا اور حضرت کی جوتیوں کے صدقے اچھے اچھے پھلدار درخت پیدا ہوئے۔ ہاں میوات کا منظر جو آپ کی سکونت ہند کے آخری سال کا آخری نظارہ بھا ضرور قابلِ ذکر ہے جو قصبۂ نوح کے سیدھے سادے مسلمان باشندے محراب خان اور نصر اللہ خاں پٹواری نے لکھ کر بھیجا ہے۔

میوات کا سفر اور اہلِ میوات کی اصلاح کی تاکید

یہ طویل وعریض علاقہ میو قوم سے آباد ہے جو مسلمان ضرور ہیں مگر جہالت اور مذہبی ناواقفیت کے سبب ان کو مسلمان کہنا مشکل۔ کوئی عالم اس علاقہ میں گیا بھی تو تقدیر سے بدعتی اور زر پرست کہ گاؤں کے گاؤں مرید کئے مگر کسی مرید کو اس سے زیادہ بیعت کا کوئی مقصود ہی معلوم نہ ہوا کہ جب چھٹے مہینے پیر کا دورہ ہوا تو ہر مرید نقد نذرانہ لیکر حاضر ہوگیا اور پیر کی نذر قبول کر لینے کو جنت کی قیمت سمجھ لیا کہ جو چاہے کروں اور جہاں چاہے رہوں۔ اول مولانا محمد صاحب نے اور پھر ان کے بھائی مولانا محمد الیاس صاحب نے اپنی مخلصانہ توجہ اس کی اصلاح اور ظلمتِ جہالت دور کرنے کی طرف مبذول کی اور بحمد اللہ برسہا برس کے بعد اس ملک میں جو علمِ دین کے نام سے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا جگہ جگہ مکاتب قرآن مجید کھل گئے اور نو عمر بچے ان میں پڑھنے کو آنے لگے۔ حضرت وہاں کی حالت سُن سن کر ہمیشہ مسرور رہتے اور قلبی توجہ سے اندر ہی اندر کام لیتے ہوئے مولانا محمد الیاس کو تاکید فرماتے رہتے تھے کہ اس طرف توجہ بڑھاتے رہیں۔ آخر جب آپ نے ہندوستان چھوڑنے کی دل میں ٹھان لی تو باوجود ضعیف اور علیل ہونے کے آپ نے میوات جانے کا عزم کیا اور تشریف لے گئے۔ یہ ایک قدرتی کشش تھی کہ آپ کا پہلا سفر اور انجان لوگوں میں جانا مگر مخلوق آپ کا نام ہی سن کر زیارت کے شوق میں گھروں سے نکلی تو یہ عالم تھا کہ قصبہ نوح ہی کے نہیں بلکہ گرد و نواح کے دیہات اور دُور دور کے ہندو مسلمان بچے اور جوان ہزاراں ہزار کی تعداد میں گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور اس شوق میں کہ پہلے ہم زیارت کریں بستی سے باہر سڑک کے دونوں طرف قطار باندھ کر دور تک پرے باندھ لئے۔ حضرت کی موٹر وہاں پہنچی تو حضرت اُتر لئے اور مخلوق پروانہ وار گری تو خدام کو اندیشہ ہوا کہ حضرت گر نہ جائیں مگر اللہ رے ہمت سب ہی سے آپ نے مصافحہ کیا اور آگے بڑھے کہ دس ہزار کی گویا بھیڑ پیچھے تھی اور ہر شخص کی زبان پر بے اختیار

یہ لفظ جاری تھے واہ واہ پیر کیا ہیں فرشتہ ہیں۔ دل چاہتا ہے اس نور کے ٹکڑے کو دیکھے ہی جاؤ۔ پیر بہت دیکھے مگر ایسا سوہنا پیر کبھی نہیں دیکھا۔

جمعہ کا دن تھا نماز ہوئی تو مسجد اندر باہر سے لبریز، چھت ساری پُر، راستے دور تک بند کہ کبھی سارے ملک کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ نماز کے بعد وعظ شروع ہوا اور حضرت قیامگاہ پر تشریف لے آئے کہ واعظ مرعوب نہ ہو۔ دل کے دل وعظ چھوڑ کر حضرت کے پیچھے ہولئے کہ ہمیں تو وعظ میں یہ مزہ نہیں آتا جو پیر کی صورت دیکھنے میں آتا ہے کہ نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں، گلاب کا پھول کھلا ہوا مہک رہا ہے۔ خدا جانے کتنی دیر کا مہمان ہے۔ بس پیر کی تو صورت دیکھنے ہی جاؤ، جانے پھر دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ پھر اس بے شمار مخلوق نے الٹی پلٹی باتوں کی اپنی گنواری زبان میں پوچھ گچھ جو شروع کی تو سننے والے پریشان ہوئے جاتے تھے مگر حضرت ہر بات کا جواب مسکرا کر دیتے اور ان کی دل لگتی دلیل سے ان کو سمجھاتے تھے۔ آخر بیعت کا وقت آیا تو ایک پر ایک گرتا اور ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ سعادت سب سے اول مجھے حاصل ہو۔ مگر صدہا کا مجمع اور حضرت کے دو ہاتھ اس لئے عمامہ دور تک پھیلا دیا گیا اور ایک کافی نہ ہوا تو دوسرا اور تیسرا عمامہ اس میں باندھ دیا گیا اور دو طرفہ صف اس کو تھامے ہوئے دور تک چلی گئی۔

بیعت کے الفاظ تب حضرت نے خطبہ پڑھا اور آیت ان الذین یبایعونک تلاوت فرمائی پھر سب کو یک زبان کلمۂ طیبہ پڑھا کر ایمان کی تجدید کرا کے توبہ کرائی کہ کہو عہد کیا ہم نے کفر نہ کریں گے شرک نہ کریں گے بدعت نہ کریں گے چوری نہ کریں گے زنا نہ کریں گے جھوٹ نہ بولیں گے کسی پر بہتان نہ دھریں گے، پرایا مال ناحق نہ کھائیں گے اور کوئی گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ہرگز نہ کریں گے اور اگر ہو جائے گا تو فوراً توبہ کریں گے بیعت کی ہم نے خاندان چشتیہ میں نقشبندیہ میں قادریہ میں سہروردیہ میں خلیل احمد کے ہاتھ پر یا اللہ ہماری توبہ قبول فرما اور ہم کو اپنے نیک بندوں کی جماعت میں محشور فرما۔ اس طرح دو مرتبہ میں تقریباً ایک ہزار میواتی داخلِ سلسلہ ہوئے اور ایک ہی نظر کیمیا اثر میں نماز روزہ کے پابند اور اتباع سنت پر اتنے پختہ کہ جان جائے مگر ایمان نہ جائے۔

نسبت کی کشش حضرت کی نسبت میں کشش بہت تھی بارہا تجربہ ہوا کہ حضرت نے کسی کو سہارنپور میں یاد کیا اور فوراً ہی اس کے دل میں حاضری خدمت کے لئے بے چینی و اضطراب پیدا ہوا۔ مولانا عبداللہ صاحب مرحوم بعض دفعہ رات کو تھانہ بھون میں اٹھے اور سہارنپور چلنے کی تیاری کی۔ لوگ کہتے کہ ریل نہیں مل سکتی کہ صرف دس منٹ باقی ہیں اور اسٹیشن دو میل ہے۔ مگر فرماتے کہ مجھے جانا ضروری ہے

ریل ملے یا نہ ملے، مگر ریل مل جاتی اور واپسی پر احباب دریافت کرتے تو فرماتے کہ حضرت نے یاد فرمایا تھا اس لئے قلب میں بے چینی پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے ریل مل جانے کا مجھے پورا وثوق بھی تھا۔ چنانچہ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا میں تو یاد ہی کر رہا تھا۔

حاجی محمد خاں مرحوم خورجوی جو گھوڑوں کی تجارت کے سلسلہ میں کابل گئے اور امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی ملاقات سے مشرف ہوئے تھے کہتے تھے کہ میں خورجہ میں تھا کہ دفعۃً قلب پر تقاضہ ہوا بلند شہر چل۔ ہر چند اس تقاضہ کو رد کیا مگر رد نہ ہوا آخر اسٹیشن پر آیا اور مجھے اپنے اوپر مرض کا شبہ ہوا کہ آخر آج سفر کس لئے کر رہا ہوں اور بلا وجہ یہ تقاضا کیوں ہے؟ معلوم ہوتا ہے مجھے مراق ہو گیا یا ہونے والا ہے، اسی اُدھیڑ بن میں ریل پر سوار ہو کر بلند شہر کے اسٹیشن پر اُترا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک بنچ پر حضرتؒ اور مولانا محمود حسن صاحبؒ بیٹھے ہیں۔ میرا دل خوش ہوا کہ خیر یہ سفر بیکار نہ گیا۔ پاس آ کر حضرت سے مصافحہ کیا تو مسکرا کر فرمایا میں تو تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی یاد نے تو مجھے ایسا مضطرب بنا دیا کہ مجھے اپنے دماغ پر مرض کا شبہ ہو گیا تھا اور اگر اس وقت جناب نہ ملتے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا۔

مولوی ظفر احمد صاحب اپنے بالائی حجرہ میں بیٹھے مشغولِ ذکر تھے کہ دفعۃً نیچے آنے کا دل پر تقاضا ہوا۔ ذکر ملتوی کر کے نیچے آئے تو دیکھتے ہیں کہ حضرت کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ عرض کیا حضرت کیا مجھ سے ارشاد فرمانا ہے؟ فرمایا ہاں ذرا چارپائی بچھا دو میں لیٹوں گا کچھ تعب سا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے واقعات صدہا ہیں اور یہی قوت تھی جو سالکین و منتسبین کو منجذب کرتی اور بہت جلد اپنے رنگ میں رنگ لیا کرتی تھی۔

ہمت بھی حضرت کی بہت عالی اور عزم اتنا قوی تھا کہ دنیوی معاملات میں بھی آپ جو ارادہ کر لیتے اس سے ہٹتے نہ تھے تو اور دینی امور بالخصوص تربیتِ سالکین میں تو آپ کی توجہ اور ہمت ایک بڑی چیز تھی کہ قوی تر انجن بن کر ہزارہا من بوجھ سے لدی ہوئی بیسیوں گاڑیوں کو یکدم متحرک بنا دیتی اور آن کی آن میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کرتی تھی مگر اس کا تعلق صرف انہی سے ہے جن کو اس کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے مشاہدہ کیا۔

بمبئی میں سیٹھ محمد عمر صاحب کہ بچپن سے آزادی لئے ہوئے تھے وطن سے نکل کر ایسی خرافات میں مبتلا ہوئے کہ ان کے عزیزوں کو پہچاننا مشکل تھا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔ تمام بمبئی میں لچوں اور شہدوں کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی کہ عزت و آبرو والے ڈرتے تھے جس کے چاہا سر بازار جوتے مار دیئے اور پولیس جدا گھبراتی تھی کہ اوباشوں کا بڑا جرگہ زیر فرمان تھا۔ آخر جب وقت آیا اور حضرت سے مرید ہوئے تو ایک ہی نظر تیر کا کام کر گئی اور مسجد کا ملا بنا دیا۔ ہر شخص حیران تھا کہ یہ محمد عمر وہی ہے جو پہلے تھا یا کوئی دوسرا ہے ؎

وہ لوٹ پوٹ ہی دیکھا نگاہ کی جس پر   کسی کے بس کا ترا تیر بے کماں نہ ہوا

مولوی حبیب احمد نانوتوی نے خواب دیکھا کہ حضرت مجھے بیدوں سے مار رہے ہیں کہیں دو دو گز پرے جا پڑتا ہوں اور پھر بار کا مزہ لینے قدموں میں آپڑتا ہوں۔ صبح کو حضرت سے خواب عرض کیا تو فرمایا ہاں بھئی کام کسی کا اور نام کسی کا۔ حضرت کو حاضرین کے خطرات و وساوس پر بھی بہت جلد اطلاع ہو جاتی تھی۔

ایک مرتبہ آپ مولوی عبداللہ جان کے پاس جانے لگے اور مولوی ظفر احمد صاحب کو ساتھ لیا۔ راستہ میں ان کے قلب میں یہ خطرہ گذرا کہ حضرت ایسے جنٹلمین کے پاس از خود کیوں تشریف لے جاتے ہیں۔ اگر وہ التجا و درخواست کرتے تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو کر حضرت نے فرمایا مولوی عبداللہ جان کا دل بہت اچھا ہے گو ظاہر دنیاداروں جیسا ہے۔" مولوی ظفر احمد صاحب پر یہ سن کر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

مولوی حبیب الرحمن صاحب سہاروی حضرت کے سفرِ حج سے قبل حاضر خدمت ہوئے تو خیال ہوا کہ مسلسلات کی اجازت حضرت مجھے بھی عطا فرما دیتے۔ حضرت نے ادھر منہ کر کے فرمایا مولوی حبیب الرحمن تم بھی طلبہ میں چل بیٹھو مسلسلات کی اجازت لے لو۔ خوشی سے پھولے نہ سمائے مگر ساتھ ہی خیال ہوا کہ صحاح کی اجازت بھی مل جاتی تو حضرت نے پھر متوجہ ہو کر فرمایا صحاح کی بھی اوائل سنا دو اجازت دیدوں گا۔ دوسری خوشی ہوئی مگر فکر ہوا کہ کوئی شناسا بھی نہیں کتابیں کس سے مانگوں تو تیسری بار حضرت نے ادھر رخ فرمایا اور کہا جاؤ کتب خانہ سے کتابیں لے لو۔ سچ ہے بن مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک فرحاں و شاداں اٹھے اور حسب مراد اجازت حاصل کی۔

بیعت کے موقع پر طلبِ صادق کا امتحان

حضرت ابتدا بیعت میں سائل کی طلب کا امتحان ضرور لیا کرتے اور چونکہ روحانی نفع کا مدار اسی طلب پر ہے اس لئے جب تک فراست و وجدان سے اس کا اطمینان نہ فرما لیتے اس وقت تک بیعت نہ کرتے تھے۔ بارہا دیکھا کہ کسی کو حضرت نے درخواست کرتے ہی بیعت فرما لیا اور بعض کو مہینوں ٹالا۔ اور جب جواب دیا یہی دیا کہ تھانہ بھون جاؤ یا یہ کہ رائپور جاؤ۔ آخر معلوم ہوا کہ حقیقتاً اس کو تذبذب تھا اور جب توحیدِ مطلب حاصل ہو کر یک درگیر محکم گیر[1] کا مضمون حاصل ہوا اسی وقت حضرت نے بیعت فرما لیا۔ سید شیر محمد صاحب نے کہ خلیفہ ہیں مولانا تھانوی کے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت یہ پیرزادے اور مولوی اکثر محروم کیوں رہتے ہیں؟ فرمایا پیرزادے تو باپ کے بعد اپنے کو پیر سمجھ بیٹھتے ہیں اور مولوی تحصیلِ علوم کر کے عالم فاضل ہو جاتے ہیں کہ آئندہ کسی شے کی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ جب تک بزرگوں کے جوتے سیدھے نہیں کئے جاتے تب تک حالت نہیں بنتی۔

---

[1] ایک در کو پکڑ و مضبوط پکڑو۔

علماء کو اصلاحِ حال اور بیعت کی زیادہ ضرورت ہے

علم محض آلہ و ذریعہ ہے عمل کا اور عمل کے بعد ایک درجہ ہی حال کا کہ عمل کو اعضاء بدن سے تعلق ہے اور حال کو قلب سے کہ عمل کا محرک قلب ہو اور یہ نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ کی محبت و عظمت قلب میں راسخ اور جاگزیں نہ ہو جائے۔ پس جس طرح بادام میں ایک پوست ہے کہ محافظ ہے گری کا مگر گری کے اندر ایک روغن ہے کہ گری سے مقصود وہی ہے۔ اسی طرح علم اگرچہ مورثِ عمل ہے مگر عمل سے بھی مقصود صرف وہ حال ہے جو عمل میں ایسا گھلا ملا ہے جیسے گری میں تیل۔ کہ وہ نہ ہو تو چھلکا جلانے کے قابل ہے اور گری پھینک دینے کے قابل۔ چونکہ عمل کا روغن یعنی شوق و اخلاص اور حلاوت و حسنِ نیت سلوک کے بغیر نصیب نہیں ہوتا اس لئے علماء کو خانقاہوں میں بیعت و اکتساب کی ایسی ضرورت ہے جیسے پڑھنے کے بعد گُننے کی اور سیکھنے کے بعد مشق و تمرین کی ورنہ ایم اے پاس کرنے والا بھی تعلیمی یا تجارتی یا صنعتی کام میں نہ گھل مل سکتا ہے نہ بے تکلف کھل کر آزادانہ اس کو انجام دے سکتا ہے مگر علماء یا تو علم ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیتے ہیں کہ عمل کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور آگے بڑھے بھی تو بس عمل کو کافی سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ابھی ان کو آخری درجہ اور طے کرنا ہے جو سب میں زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ اس کے بغیر علم موجبِ وبال[1] ہے اور عمل پوست بے مغز کی طرح ردی اور بیکار اور جب اس کی ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو طلب نہ ہوگی اور طلب کے بغیر قوی النسبت شیخ کے بیٹے اور بیوی کو بھی کبھی کچھ نہیں ملا، اجنبی کو دس بیس سال رہنے سے تو کیا مل سکتا ہے۔

ہاں عورتوں کی بیعت میں اتنی طلب کا آپ امتحان نہ لیتے بلکہ ادنیٰ درخواست پر بیعت فرما لیا کرتے تھے کہ صنفِ ضعیف ہے اور مردانہ نفاق و تصنع سے خالی۔ یا کوئی مبتلائے بدعات ہوتا تو اس کے اظہارِ طلب پر بھی آپ کو زیادہ کرید نہ ہوتی تھی کہ مبادا بدک نہ جائے اور سلسلہ میں جکڑبند ہو جانے کے بعد سیدھا ہو جانے کی توقع غالب ہوتی ہے۔ ایک بار سالانہ جلسہ کا موقع اور مہمانوں کے کثیر مجمع کا ازدحام مگر دیکھا کہ آپ گھبرائے ہوئے ایک شخص کو تلاش فرما رہے تھے کہ فلانا کہاں ہے وہ بیعت ہونے کو کہتا تھا عادت کے خلاف اس الٹی طلب و تلاش پر دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی عمر بدعات میں گذری تھی چنانچہ بیعت ہو کر ان کی کایا ہی پلٹ گئی کہ خود متبع سنت ہو کر اکثر اہلِ خاندان کو متبع سنت بنا چکے۔ بیعت کے بعد عموماً آپ نماز باجماعت کی پابندی کا حکم فرماتے کہ معراج المومنین یہی ہے اور قلب میں سب سے اول اسی کا تخم جمتا ہے جو چند روز بعد ایسا سایہ دار مضبوط درخت بنتا ہے جس کے نیچے

---

[1] عذاب کا ذریعہ ہے کہ جاننے والے کا ہر گناہ نہ جاننے والے سے بہت سخت ہوتا ہے۔

ہزار پیادہ وسوار آرام لیتے ہیں۔ پھر داڑھی وغیرہ کے متعلق کوئی عملی ضعف یا کسی بدعت میں ابتلاء کا اعتقادی نقص ہوتا تو اس کی تصریح فرما کر نصیحت کرتے اور ہر امر میں اتباع سنت کا لحاظ رکھنے کی تاکید فرما کر ہر نماز کے بعد کچھ وظیفہ پڑھنے کو بتلاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ فجر و مغرب کے بعد سو سو مرتبہ کلمہ تمجید اور ظہر کے بعد سو مرتبہ لاحول اور عصر کے بعد تین تسبیح درود شریف اور عشا کے بعد سو مرتبہ استغفار نیز فرائض پنجگانہ کے بعد تسبیح فاطمہ اور کم سے کم ایک پارہ قرآن مجید کی روزانہ تلاوت۔

حزب الاعظم پر پابندی کی تاکید

اور حزب الاعظم کی ایک منزل کہ حزب الاعظم سے آپ کو خاص محبت تھی اور اس کی مواظبت کو بہت زیادہ موجب برکت سمجھتے تھے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی دعائیں ہیں جن میں آپ نے ہر خوبی اپنے اللہ سے مانگ لی اور ہر عیب و مضرت سے پناہ چاہ لی ہے، نہ اس سے زیادہ جامع کوئی دعا ہے نہ اس سے زیادہ کسی دوسرے کی تصنیف کی ہوئی دعا یا ورد میں حسنِ ادب اور مقبولیت و حلاوت پیدا ہو سکتی ہے۔
پھر اگر مرید عالم ہوتا تو تہجد و اوابین کی نوافل بتا کر علم دین کی تعلیم یا دوسری طرح اشتغال بالعلم کی تاکید فرماتے کہ قلب اور دماغ کا بہترین شغل ہے اور یہی اس کے سلوک کا طریق بن کر مورث شان حضور ہو جاتا تھا اور نہ دوازدہ تسبیح ذکر بالجہر یا اس کے مناسب مزاج آپ کا نور فراست جو کچھ بھی تجویز کرتا وہ اس کو خوب سمجھا کر تلقین فرماتے تھے۔ ہاں اس تلقین میں کہ تربیت[1] و اکتساب کہلاتا ہے پھر دوبارہ آپ طلب صادق کو جانچتے تھے کہ طلب کے بغیر مداومت و التزام نہیں ہو سکتا اور پھر بنا بلے سودا اور بچوں کا کھیل بنا جاتا ہے۔
مولوی محمد زکریا صاحب نے ایک مرتبہ کسی مخلص دوست کے متعلق حضرت سے عرض کیا کہ فلاں کو حضرت کے ساتھ محبت ہے مگر اس نے کچھ کرنا شروع نہیں کیا حضرت اس کو کچھ تلقین فرمادیں۔ بیساختہ فرمایا وہ پوچھے بھی یا یوں ہی بتلادوں؟ عرض کیا حضرت سے اس کو تعلق ضرور ہے مگر یا شرم و حجاب مانع ہے یا یہ توجہی اور جب تعلق ہے تو حضرت از خود ہی ارشاد فرمادیں۔ تب آپ نے تیز لہجہ میں فرمایا میں تو نہیں بتاتا[2] تم بتادو۔ عرض کیا حضرت توبہ توبہ میں کیا بتا سکتا ہوں؟ ارشاد ہو تو اسے لکھدوں کہ پوچھے، فرمایا اپنی طرف سے جو چاہو لکھو میری طرف سے نہیں۔
چند روز بعد مولانا عبدالقادر صاحب سے کہ حضرت مولانا رائپوری کے خلیفہ و جانشین ہیں اور حضرت کے ساتھ وہی محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں جو حضرت کے منتسبین کو حضرت کے ساتھ ہے اسی قسم کا تذکرہ آگیا تو فرمانے لگے کہ مولوی صاحب مجھے تو اس کی بڑی غیرت ہے کہ بلا طلب کے بتلاؤں۔ کسی کو دس دفعہ

[1] شیخ کی طرف سے تربیت بڑھانا اور ترقی دینا مرید کی طرف سے اکتساب ان امور کو کمانا اور اپنے اندر پیدا کرنا۔

[2] کہ یہ طریق کی غیرت کے خلاف ہے۔

غرض ہو تو پوچھے ورنہ میری پاپوش سے۔ مگر ان باوا بیٹوں کا یہ اصول ہے کہ دوسرے ایسے تیسے کے سر ہو جاؤ۔" مولوی زکریا نے چونکہ حضرت کی پدرانہ شفقتوں میں پرورش پائی تھی اور تعلیق میں تو حضرت کے گویا قوتِ بازو اور ہاتھ کا قلم یا آنکھوں کی روشنی ہی تھے اس لئے حضرت ان کو بہت ہی پیار کی نظر سے دیکھتے تھے عرض کیا کہ حضرت جب اس کو اپنے ساتھ تعلق ہو تو کیا مقتضائے تعلق یہ نہیں کہ اس کی خیر خواہی کی جاوے؟ فرمایا میں منع تھوڑا ہی کرتا ہوں یہ بھی اپنا اپنا اصول ہے۔

اس کے بعد مولانا کو خطاب فرما کر اپنے داماد کی بیعت کا قصہ سنایا کہ میں ایک دفعہ محمد یامین کو ساتھ لیکر گنگوہ حاضر ہوا اور عرض کیا کہ محمد یامین حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہے۔ حضرت نے کچھ اعراض فرما کر کہا خود بہکا کر لائے ہو گے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس امر میں اتنی غیرت ہے کہ اشارۃً بھی کسی سے یہ کہنا گوارا نہیں کہ حضرت کی طرف توجہ کرو۔ میرا شیخ تو آفتاب ہے لاکھ دفعہ کسی کا جی چاہے حاضر آستانہ ہو ورنہ جہاں چاہے بھٹکا پھرے، بہلانے پھسلانے سے مجھے تو بڑی عار آتی ہے؟ طلب اور تلقین کے تمامی مراحل جب طے ہو جاتے اور سالک اپنا کام شروع کر دیتا تب تو آپ کی توجہ و شفقت کی کچھ انتہا نہ رہتی تھی۔ اب تک تو وہ طالب تھا اور آپ مطلوب مگر اکتساب میں لگ جانے کے بعد آپ طالب بنتے تھے اور سالک کو مطلوب سمجھتے تھے۔ توجہ[1] کی یہ صورت کہ سالکین آنکھیں بند کر کے گردنیں جھکا کر شیخ کے گرد بیٹھیں اور شیخ اسی طرح بیٹھ کر اپنے خیال سے ان کے قلوب پر اثر ڈالے آپ کو پسند نہ تھا، مگر اصل توجہ کہ آپ سالک کا خیال دل میں رکھتے اور ہمت و عزم سے اس کی مدد فرماتے قریب و بعید دونوں حال یکساں تھا، ہاں خاص حالت میں اپنے پاس بُلا لیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ چند روز میرے پاس رہو۔ اور اس کا نفع بس وہی سمجھتا ہے جس کو یہ مبارک وقت نصیب ہوا۔

مولانا عبداللہ مرحوم کے قلب پر اثنائے سلوک میں ایک غیر اللہ کا تعلق مستولی ہو گیا کہ شرم کے مارے حضرت سے عرض نہ کر سکے اور وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا کہ جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آپ نے مجبور کیا کہ تھانہ بھون چھوڑ کر سہارنپور قیام کریں۔ چنانچہ وہ آئے اور ان سے حضرت نے کچھ کام نہ لیا کہ کام کے قابل ہی نہ رہے تھے، خود تصرف و ہمت سے مدد فرمائی کہ قلب سے کائی سی پھٹتی چلی گئی اور ایک مہینہ نہیں گذرا تھا کہ گویا ان کو ہوش آ گیا اور قلب بالکل خالی ہو کر محبتِ الٰہیہ سے معمور ہونے لگا۔ بدنظری اور امرد یا اجنبی عورت سے محبت کا

[1] جو عام طور سے بعض بزرگوں کے یہاں رہی ہے ہمارے بزرگوں میں نہیں کہ اس سے فوری اثر ہوتا ہے یہ جاتا رہتا اور بعض دفعہ سخت مضر ہو جاتا کہ وہ اس وقت اپنے کو اونچے درجے پر سمجھنے لگا ہے اثر کم ہوتے اپنے کو گمراہ سمجھ بیٹھتا ہے بلکہ بعض دفعہ معاصی میں جا پڑتا ہے دائمی تعلق اور توجہ کی صورت اور اس کی مدد سے ذکر و شغل سے جو حال و مقام ہوتا ہے وہ دائمی ہوتا ہے وہی یہاں معمول تھا اور ہے۔

تعلق آپ کو بہت گراں گذرتا تھا اور سالک کو اس سے بچنے کی بہت ہی زیادہ تاکید فرماتے تھے کہ ”جب قلب کو گھیر لیتا ہے تو پھر کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا جس زمانہ میں مالٹا تھے ان پر اثنا ذکر و شغل ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوتی تھی مگر کر نہ سکتے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی۔ حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرہ بھی تھا حیرانم[1] کہ بچۂ دہقاں را بچہ کار سپر دندے

صلاح[2] کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

مجھے ایسے کام کے لئے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ۔“ آخر یہ میرٹھ سے دیوبند گئے اور وہاں سے تھانہ بھون کا ٹکٹ لے کر سہارنپور پہنچے۔ اتفاق سے تھانہ بھون کی گاڑی نہ ملی اور مجبوراً مدرسہ مظاہر علوم میں آئے۔ بعد نماز ظہر حضرت سے ملے تو حضرت نے محبت کے ساتھ پاس بٹھالیا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھو۔ بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی پر اعتراض ہے کہ انھوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا، آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ چونکہ میں نے اسی دروازہ پر پرورش پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے اس لئے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں۔ بعد عشا بکمال شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرماکر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے۔“ یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑا اس ذکر شغل کو جس میں جان سے عاجز ہوگیا اور حضرت اصرار فرماویں کہ گھبراؤ مت ذکر شغل جاری رکھو اور کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ یہاں تک کہ جب مکان تشریف لیجانے لگے تو فرمایا کتب خانہ کے سامنے والے کمرہ میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جاوے۔ پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرہ سے باہر مراقب ہوکے بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی

---

[1] میں حیران ہوں کہ دہقانی بچے کو کیا کام سپرد کرتے ہیں۔ [2] کام کی درستی کہاں اور میں خراب کہاں۔ دیکھو تو راہ کا تفاوت کہاں سے کہاں تک ہے۔

کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے، مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا کہ جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اپنے دستِ مبارک سے اس کو صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے اور درس کے لئے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لئے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی لہذا میں نے اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آگیا۔ حضرت نے ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کئے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں مت تلاش کرنا کہ یہ جواب کتابی نہیں ہے۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال اور پھر اس کا جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا۔ فرمایا اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم ایک دن یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے چنانچہ واپسی میں بجائے ایک دن کے میں نے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرت کے حجرہ کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون و قوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی و بے نیاز بنا دیا۔ اللہ جزائے خیر دے حضرت کو کہ میری ایسی دستگیری فرمائی جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔"

توجہ کا اثر حضرت اپنی قوتِ قلبیہ کے تصرف کو بہت کم کام میں لاتے اور خاص ضرورت ہی کے وقت صرف فرمایا کرتے تھے۔ سہارنپور میں اہل اسلام اور آریہ کا مناظرہ ہوا جو موضع رڑکی سے منتقل ہو کر سہارنپور آیا تھا حضرت شریک جلسہ تھے اور مسلمانوں کی طرف سے فریقین کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لئے مولوی کفایت اللہ اور مولوی احمد اللہ صاحب تجویز ہوئے تھے۔ مگر مولوی احمد اللہ تھک گئے تو صرف مولوی کفایت اللہ صاحب نے اس خدمت کو انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجلس مناظرہ میں آریوں کی طرف ایک جوان خوبصورت گیروے کپڑے پہنے ہوئے سادھو تھا جو آرام کرسی پر لیٹا رہتا اور جب مسلمانوں کے مقرر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ گردن جھکا کر بیٹھ جاتا تھا مقررینِ اسلام کی تقریریں نہایت پراگندہ اور خراب ہو رہی تھیں حتیٰ کہ مولانا عبدالحق حقانی سے دورو تسلسل کی تقریر بھی نہ ہو سکی تو میں نے صدرِ جلسہ مرزا عزیز بیگ کو ایک پرچہ پر لکھ کر دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے جب مناظر تقریر کرنے کو کھڑا ہوتا ہے تو یہ

جوگی اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا مولانا خلیل احمد صاحب کو اس کی اطلاع دیدو"۔ صدر جلسہ نے یہ پرچہ پڑھ کر حضرت کی طرف سرکا دیا اور حضرت نے پرچہ پڑھتے ہی گردن جھکالی کہ دونوں حق و باطل میں تصرف قلب کی جنگ ہونے لگی، دو منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ وہ سادھو بیقرار ہو کر آرام کرسی سے اٹھا اور میدانِ جلسہ سے باہر چلا گیا۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی وہ تقریریں ہوئیں کہ گویا دریا کا بند کھل گیا۔ اور حالانکہ اس مناظرہ میں بہت کچھ بے عنوانیاں ہوئی تھیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ آدمی مشرف باسلام ہوئے۔ اسی دن دوپہر کو کھانا کھانے میں حضرت نے فرمایا اس کا تو مجھے یقین تھا اور ہے کہ اسلام غالب رہے گا الحق یعلو ولا یعلی[۱] مگر حق تعالیٰ کی شان بے نیاز[۲] ہے اس کا خوف ہر وقت اور ہر بشر کو ہے"۔

سالانہ جلسہ سے فارغ ہو کر باہر کے مہمان رخصت ہوئے۔ پنجاب جانے والی گاڑی پہلے آئی اور اس طرف کے مہمان گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی میں ایک سادھو بیٹھا تھا جو ہردوار سے آرہا تھا۔ اسٹیشن پر ازدحام دیکھ کر اس نے دریافت کیا کہ یہ بھیڑ کیسی ہے؟ حضرت کے خادم نے جو اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے جواب دیا کہ یہاں سہارنپور میں ایک بڑے بزرگ شیخ ہیں، سب لوگ مختلف اطراف سے ان کی زیارت کو آئے تھے اور اب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے ہیں۔ وہ حضرت کے حالات پوچھنے لگا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ کہتے تھے کہ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ قلب پر ایک غیر مانوس اثر اور دباؤ پڑ رہا ہے جس کا ظاہری سبب کوئی معلوم نہیں ہوتا اور دل اندر سے گھبراتا اور ویران ہوا جاتا ہے۔ حیران تھا کہ دن ہے رات نہیں، مجمع ہے تنہائی نہیں، ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہے جنگل یا بیابان نہیں ہے پھر یہ وحشت و پریشانی کیوں ہے کہ طبیعت آپے سے نکلی جاتی ہے اور زبان گنگ اور سُن ہوئی جاتی ہے۔ اسی پریشانی میں تھا کہ دفعۃً حضرت کی شبیہ نظر آئی اور اس کا عکس دل پر پڑنا شروع ہوا اور اشارہ ہوا کہ پڑھو حسبی اللہ[۳] ونعم الوکیل چنانچہ زبان گنگ تھی مگر دل نے اس کا ورد شروع کیا اور گھبراہٹ و اضطراب کے بادل پھٹنا شروع ہو گئے چند منٹ میں وہ کیفیت جاتی رہی اور قلب کو سکون نصیب ہوا۔ کان میں آواز آئی سادھو کہتا ہے واقعی تمہارے گرو بڑے کامل اور بہت زور والے ہیں۔ اس وقت میں سمجھا کہ یہ اثر ڈال رہا تھا اس لئے میں نے کہا بس تم میں اتنی ہی ہمت تھی ذرا کچھ کر کے دکھایا ہوتا وہ کھسیانہ ہو گیا اور منہ موڑ کر بیٹھ گیا کہ پھر بات تک نہیں کی۔

ہاں اپنی توجہ و خیال طالب سالک کی طرف بڑھانے کے لئے کہ گھڑی کو چلانے کی غرض سے گویا

---

[۱] حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ [۲] یہ کیا ضروری ہے کہ ہمارے ذریعے سے فرمائیں تو شکست کا اندیشہ بھی ہے۔
[۳] مجھے کافی ہے اللہ اور وہ بہترین ذمہ دار ہے۔

لوک دیتاہے آپ سالک کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ جلد جلد خط بھیجئے اور حالات کی اطلاع دیتے رہو بلکہ اگر کسی کے خط میں معمول ٹلتا تو خود ابتدا فرماتے اور شکوہ لکھتے کہ تم کو اس کا خیال نہیں ہوتا کہ مجھے انتظار رہتا ہے آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت کو اپنے بتائے ہوئے نسخہ میں تبدیل کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، یا پہلی ہی مرتبہ تشخیص کامل کے بعد وہ تعلیم فرمادیتے جو آخر تک چلتا اور حضور کی شان پیدا کردیتا تھا ورنہ درمیان میں ایک دو مرتبہ خفیف سا اضافہ فرمادیتے اور آخر تک اس کا نباہ کراتے تھے۔ حضرت کے تعلق میں خداداد برکت بہت زیادہ تھی۔ کسی کا کوئی مشغلہ ملازمت وصنعت بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہوا آپ نے کبھی نہیں چھڑایا، نوکری نہیں چھوڑنے دی، بیوی بچوں کے ساتھ محبت میں کمی نہیں آنے دی، کھانا پینا کم نہیں کرایا، چلہ کشی کبھی نہیں کرائی، جنگل یا دریا کے کنارہ کبھی نہیں بھیجا، دماغ میں خشکی کبھی نہیں آنے دی اور طاقت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالا بلکہ ہمیشہ ان صورتوں سے منع کیا یہاں تک کہ اپنے پاس رہنے پر بھی کبھی زور نہیں دیا ہمیشہ بہت ہلکا کام بتایا کہ تمامی تعلقات مباحہ بحال رکھتے ہوئے بشاشت کے ساتھ انجام پاجائے۔ مگر اس کا ثمرہ اتنا کثیر دیکھا کہ برسہا برس مجاہدوں میں پڑنے والے بھی وہ بات نہ پاسکے۔ آپ کے سلسلہ میں نہ وجد وحال کی دھوم دھام تھی نہ گریہ وبکا کا شور وغل نہ مکاشفات کا ورود تھا نہ واردات کا صدور، گویا سالک آنکھیں بند کئے ریل میں بیٹھا ہوا مقصود کی طرف جاتا اور خود اس کو بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں جارہا ہوں اور کہاں پہنچ گیا۔ آپ کے تعلیمی اصول صرف دو تھے کہ امراضِ قلب میں ہر مرض کے مستقل علاج کی اس زمانے میں فرصت نہیں رہی لہٰذا سہل طریقہ یہ ہے کہ سالک کے قلب پر ذکر اللہ کو غالب کردیا جائے تاکہ محبتِ حق میں مغلوب ہوجائے اس سے تمام رذائل اور اخلاق ذمیمہ خود بخود جاتے رہیں گے کیونکہ محبت کا خاصہ ہے کہ جب دل میں جگہ پکڑلیتی ہے تو سب چیزوں کو مغلوب کردیتی ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں فروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت[1]

اس اصول کا خلاصہ یہ تھا کہ جنگل کی جھاڑیوں کی درانتی سے کاٹنا دشوار بھی ہے اور مہینوں کا دھندا ہے۔ آسان تدبیر یہ ہے کہ چلتے ہوئے انجن سے ایک چنگاری آگ کی پھینکدو کہ سارے جھاڑ جھنکاڑ بلکہ ان کی جڑوں میں رہنے والے سانپ بچھو بھی بھک سے اڑجائیں گے۔" مگر اس کے لئے ضرورت ہے دو باتوں کی ایک یہ کہ جھاڑیاں خشک ہوں تاکہ آگ قبول کریں، دوم چنگاری والا انجن تیز رفتار ہو کہ گرجتا پھینکتا چلا جائے اور اتنے یہاں کا میدان صاف ہو دوسرے جنگل پر جا آتش برسائے۔ پس اخلاقِ ذمیمہ کی تازہ شاخوں میں

---

[1] عشق تو وہ شعلہ ہے کہ جب بھڑک اٹھتا ہے محبوب کے سوا جو کچھ بھی ہو سب کو پھونک ڈالتا ہے۔

خشکی تو ذکراللہ سے آتی تھی۔ مگر آتشِ محبت آپ کے اس قلب سے پڑتی تھی جو محبتِ الٰہیہ کی انگیٹھی بنا ہوا تھا۔ اور اس لئے طالب کو آپ کے قلب میں اپنا تعلق بٹھانا اور آپ کا جوش محبت میں ہمت وعزم پر متوجہ ہونا ضروری تھا اور جتنا اس میں وقت صرف ہوتا اسی قدر حصولِ مقصود میں توقف ہوتا تھا[1]۔ دوسرا اصول یہ تھا کہ ذکراللہ سے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جو ذاکر کو خود بخود معاصی سے متنفر اور طاعات کا شائق اور راغب بنا دیتا ہے۔ کیونکہ معصیت سے اس نور میں کمی آتی ہے لہٰذا وہ اس سے گھبراتا اور کتراتا ہے اور طاعت سے اس میں ترقی ہوتی ہے لہٰذا وہ اس سے مانوس ہوتا اور اس کی طرف جھکتا ہے۔ گویا طاعت اس کی غذا بن جاتی ہے اور معصیت سمّ قاتل اور زہرِ ہلاہل۔ مگر اس ذکر میں جب تک لذت نہ آئے اس پر مواظبت نہیں ہو سکتی۔ اور لذت پیدا ہونے کی آسان صورت یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا جائے اور عادات روزمرہ میں بھی آپ کے اتباع کا خیال رکھا جائے اور اوقاتِ مختلفہ میں جو دعائیں آپ نے تعلیم فرمائیں یا خود پڑھی ہیں ان کا دھیان اور ورد رکھا جائے۔ اور ہمہ وقت اس کا اہتمام رہے کہ میرا کوئی حرکت وسکون سنت کے خلاف نہ ہو۔ تو محبوب رب العالمین کے ساتھ قلب کا یہ تعلق ذکراللہ میں حلاوت و برکت پیدا کرے گا اور اس طرح پر سالک الذاکرین اللہ کثیرا[2] میں داخل ہو کر ہمہ وقت اللہ کی یاد میں رہے گا۔ کریم کے دروازہ پر جا پڑا ہوا فقیر انشاء اللہ خالی ہاتھ واپس نہ آئے گا۔ خصوصاً جبکہ مقبولین و محبوبین کی طرف منسوب اور ان کا نام لیوا ہو یہ سمجھ کر بیٹھا ہو کہ ملے یا نہ ملے مگر اس دروازہ سے نہ ٹلوں گا نہیں کیونکہ یہاں سے اٹھا تو دروازہ ہی کون سا ہے جس پر جا کر پڑوں یا کچھ ملنے کی امید رکھوں"۔ مگر اس پرواز و رجاؤ کے لئے بھی کبوترانِ حرم سے وابستگی اور آستانۂ حق پر جمنے والے شیخ سے چمٹا رہنے کی ضرورت ہے کہ اسی کا نام توحید مطلب[3] اور حب شیخ و تعلق مع الشیخ ہے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد[4] دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

پانی سے بھرے ہوئے نل سے پانی حاصل کرنے کی صرف ایک صورت ہے کہ اپنا نل نیچا کر کے اس نل سے اتنا چپکا دیا جائے کہ سارا پانی نل ہی میں آوے کہ بغیر بندش تام کے سارا پانی نل میں نہ آئے گا ادھر ادھر نکل جائے گا اور نشیب اس لئے ضروری ہے کہ بلند بلکہ مساوی سطح پر بھی پانی کا چڑھنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے[5]۔ پس اس روحانی فیضان کے لئے آپ بیعت کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر طالب ہرجائی

---

[1] اگر کسی نے جلد تعلق کرا کے توجہ کر لیا جلد کامیاب ہو گیا ورنہ دیر لگی۔ [2] کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے والے۔ [3] مقصد کا ایک ہونا۔ [4] ایک چیونٹی تھی شوق رکھتی تھی کہ کعبہ شریف پہنچ جائے۔ ایک کبوتر کے پاؤں پر ہاتھ جا لئے اور اچانک پہنچ گئی۔ مگر کبوتر حرم کا تھا بیچ پرے یوں لگ لپٹ جانا منزل پر پہنچاتا ہے۔ [5] بس دو کام کرنا بیچ پیر سے لپٹا رہنا اور تعمیل ہدایت میں سرنگوں ہونا۔

بنا رہتا ہے اور اس کو وہ یکسوئی نہیں ہوتی جو ایک پاکدامن شریف عورت کی طرح اس کا یقین دلائے کہ میں زبردست محتاج ہوں اور بجز شوہر کے دوسرے مرد کی طرف آنکھ اٹھانا بھی مجھے حرام ہے۔ ہاں مطلق صحبت کا فیضان ہر وارد و صادر کو پہنچتا تھا کہ بارش برستی ہے تو اس کی خنکی اپنے اور غیر ہر شخص ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ پس اگر کسی نے بدون بیعت کے آپ سے تعلیم و تلقین ذکر کی درخواست کی تو آپ نے بیساختہ جواب دیا کہ یہ طریقہ مولانا اشرف علی صاحب[1] کا ہے تم تھانہ بھون چلے جاؤ۔ اسی اصول پر آپ نے حضرت گنگوہی کے منتسبین کو بھی اکثر تجدید بیعت کے بعد ہی ذکر و شغل تلقین فرمایا۔ البتہ ان کی طرف توجہ سے زیادہ کام لیا کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔

طالب اگر شجرہ مانگتا تو آپ اکثر دیدیا کرتے مگر فرمایا کرتے کہ وظیفہ نہ بنانا کبھی کبھی دعا میں توسل اہل اللہ یا حصول برکت کے لئے پڑھ لینا۔

مستورات کا وظیفہ

مستورات کو آپ ذکر و شغل تعلیم نہ فرماتے بلکہ نماز پنجگانہ کے اہتمام اور اتباع شریعت کی تاکید فرما کر ایک پارہ کی تلاوت ایک منزل حزب الاعظم اور نماز کے بعد تسبیح فاطمہ اور کلمہ تمجید و لاحول و درود شریف و استغفار کی تسبیحات تعلیم فرماتے اور فرمایا کرتے کہ شوہر کی اطاعت بچوں کی تربیت خانہ داری کا انتظام خود طاعت ہے۔ اللہ کا حکم سمجھ کر رسول کے طریقہ کے موافق اس کو انجام دو کہ یہی بہت کچھ ہے۔ پھر کوئی اضافہ چاہتا اور اس کو فرصت و فراغت دیکھتے تو تہجد و اوابین اور اشراق کے نوافل بتاتے اور اس پر بھی کوئی اضافہ چاہتا اور اس کی طبیعت میں مناسبت اور امور خانہ داری سے مہلت متحقق فرماتے تو ذکر دوازدہ تسبیح اور پاس انفاس تعلیم فرمادیا کرتے تھے۔ محض اتنی تعلیم پر ان کے قلوب میں شریعت کی عظمت اور شارع علیہ السلام کی محبت حق تعالیٰ کی مرضیات سے رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی تھی کہ اصل ایمان ہے۔ مستورات میں صوفی کرم حسین صاحب کی لڑکی کو البتہ حضرت نے تفصیلی طریق پر سلوک طے کرایا اور اس پر حالات و واردات بھی بہت زیادہ طاری ہوئے جن کی نگہداشت میں حضرت نے خاص اہتمام فرمایا۔ چونکہ واردات سالک ذکر میں لانے کی چیز نہیں اس لئے بیان کرنا فضول ہے اور ان کو چھوڑتا ہوں۔

نصائح سلوک

اثنائے سلوک میں آپ کی عامہ تعلیم و نگہداشت مقصود پر نظر رکھنے کے متعلق ہوتی تھی کہ سالک ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ چند امور جن کو نصائح سلوک کہنا چاہیئے اپنی یادداشت اور حافظ فخر الدین صاحب کے خطوط سے ملخص کر کے درج کرتا ہوں:۔

چونکہ شب کے وقت خلوت اور سکون حاصل ہوتا ہے اس لئے ذکر و شغل کے لئے رات کا وقت بہتر ہے اگر کسی کو رات کا وقت نہ ملے یا کبھی رات کو کسی ضروری کام یا سو جانے کی وجہ سے وظیفہ رہ جائے تو دن میں

[1] اس کا یہ رنگ تھا کہ ان کا دل اس طرح بھی ذمہ داری لے لیتا تھا گو بیعت سے کم۔

پورا کرلے کہ عبادت کے لئے رات دن سب برابر ہیں: جعل اللہ[1] لکم الّیل والنہار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا

تلاوت[1] کلام اللہ چلتے پھرتے لیٹے بیٹھے ہر حال میں درست ہے مگر کلام مجید کو بغیر وضو نہ چھوئے اور حالتِ ناپاکی میں زبان سے بھی نہ پڑھے، لیٹے ہوئے پڑھنے میں بہتر ہے کہ گھٹنے سکیڑ لیوے۔ برہنگی کی حالت میں نہ پڑھے۔ ہاں درود شریف وغیرہ ناپاکی کی حالت میں بھی پڑھنا درست ہے۔

سالک[2] کو حلال لقمہ اپنے پیٹ میں پہنچانا چاہئے تاکہ نورانیت پیدا ہو، اور حرام[2] بلکہ مشتبہ سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے کہ ظلمت پیدا ہوتی ہے۔

ہدیہ[1] و تحفہ صرف ان لوگوں کا قبول کرنا چاہئے جو محبت یا دینی تعلق غرض جائز وجہ سے پیش کرتے ہوں اور ایسے لوگوں سے نہ لینا چاہئے جو منصب اور عہدۂ ملازمت کی وجہ سے یا ناجائز ضرورت پورا کرنے کو دیں

جن[2] کی آمدنی کا بیشتر حصہ حرام یا مشتبہ ہو ان کی دعوت بھی قبول نہ کرے[3]۔ مگر بلا وجہ مسلمانوں کے حالات میں تجسس بھی نہ چاہئے۔

قبض[1] کی حالت پیدا ہووے تو امیدوار رحمت بن کر توبہ و استغفار اور خشوع و خضوع کے ساتھ گریہ وزاری میں مشغول ہو اور اپنے مولی کریم سے توفیق طلب کرے اور ناامید نہ ہو۔ بحالت بسط ہر وقت شکرِ نعمت ادا کرتا رہے کہ ازدیادِ نعمت شکر کے ساتھ وابستہ ہے۔ لئن[4] شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔

مراقبہ کی حقیقت

مراقبہ[1] کی حقیقت نگہداشت ہے کہ حضور کے ساتھ قلب کو خطرات[5] ماسوی اللہ سے خالی و محفوظ رکھنا یہ جو محض آنکھیں بند کرکے اور گردن جھکا کر کیا جاتا ہے اور عرف میں اسی کو مراقبہ سمجھا جاتا ہے صرف مبتدیوں کو عادت ڈالنے کے لئے ہے کہ یکسوئی سے مناسبت ہوجائے اور پھر رفتہ رفتہ جب طبیعت معتاد[6] ہوجاتی ہے تو وہ کیفیت مراقبہ قائم ہو کر ہمہ وقت جاری

---

[1] اللہ نے بنایا تمہارے لئے رات اور دن کو ایک کے پیچھے ایک آنے والا اس کے لئے جو ارادہ کرے اللہ کے ذکر کا اور شکر گذاری کا۔
[2] اشکال یہ ہے کہ آجکل خرید و فروخت ناجائز طریقوں سے ہورہی ہے اور سود کی آمیزش ہر کاروبار میں ہے تو اس سے کیسے بچے اس کے لئے فقہا نے یہ صورت لکھی ہے کہ تم اپنا معاملہ شریعت کے مطابق صحیح کرلو پہلے کا حال نہ پوچھو ہاں اگر معلوم ہی ہوجائے کہ خاص یہ چیز سود رشوت جوے یا اور حرام طریقہ کی ہے تو اس سے پرہیز ضروری ہے۔
[3] کہ مکروہ تحریمی ہے اگر معلوم ہوجائے اور اگر کل آمدنی حرام ہو تو تمامی حرام ہے زیادہ حلال ہو تو جائز ہے۔
[4] ضرور ہے کہ اگر تم شکر کروگے تو ہم تم کو زیادہ دیں گے اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔
[5] خیالات۔ [6] عادی۔

رہتی ہے اور کسی وقت منقطع نہیں ہوتی۔

مراقبہ میں حق تعالیٰ کی کسی صفت کا انضمام[1] اس لئے کرتے ہیں کہ اس صفت کے لحاظ سے اس کی عظمت اور اس کے ساتھ محبت قلب میں راسخ ہو جائے، ورنہ آخر میں ایک بے کیف حضور رہ جاتا ہے جس کو نسبت مسلسلہ کہتے ہیں۔

سالک کو پاکی اور طہارت کا بہت خیال رکھنا چاہئے بلکہ ہمیشہ باوضو رہنا چاہئے کہ سونا بھی باوضو ہو۔

غیر جنس[2] سے اختلاط ہرگز نہ رکھنا چاہئے بجز اس کے کہ اس کی اصلاح کی نیت سے ہو بشرطیکہ اس کی حالت رو باصلاح ہو۔ اور اس اختلاط میں اپنا کوئی قول یا فعل خلافِ شرع سرزد نہ ہو، ورنہ علیحدگی اختیار کرے اور ایسے مضر اختلاط سے سخت پرہیز کرے۔

جو عبادت[3] تھوڑی ہو مگر خلوص اور مداومت کے ساتھ ہو وہ اس کثیر عبادت سے جو خلوص یا مداومت کے ساتھ نہ ہو بدرجہا بہتر ہے کہ عبادت و ریاضت کی تمام برکات وابستہ ہیں خلوص اور مداومت کے ساتھ۔

تصورِ شیخ کی مطلق ضرورت نہیں اور اس میں تکلف اور آورد مضر ہے۔ جب مرید کو شیخ کے واسطہ سے استفادہ ہوگا تو خود اس کی محبت سالک کے قلب میں پیدا ہو جائے گی۔ اور جب محبت ہوگی تو شیخ کا تصور و خیال خود آئے گا۔ اصل شے جس کا نفع ہے وہ محبت ہے اور تصور اس کا فرع غیر اختیاری۔ ورنہ محض تصور بجائے مفید ہونے کے بسا اوقات مضر ہوتا ہے۔

تہجد کی نفلوں کا اہتمام بہت زیادہ کرنا چاہئے کہ شعارِ صالحین ہے اور روحانیت کے لئے بیحد مفید۔ اگر شب میں فوت ہو جاویں تو بعد طلوع آفتاب بارہ رکعت ادا کرلے اور تہجد کے وقت اٹھنے کا اطمینان ہو تو وتر بعد نوافل تہجد ادا کرے ورنہ بعد عشاء۔ مگر رمضان میں بعد تراویح جماعت کے ساتھ پڑھنے چاہئیں۔ اور دنوں میں ان کو جماعت سے ادا نہ کرے۔

سالک کو اپنے دل اور دماغ کی صحت کا زیادہ خیال کرنا چاہئے۔ ان کو تقویت پہنچانا بہ نیت تقویت[4] فی العبادت خود عبادت ہے۔ اور اس کی طرف توجہ نہ کرنے سے پھر انسان نہ دنیا کے کام کا رہتا ہے نہ دین کے کام کا۔

طریقت سے مقصود یہ ہے کہ دنیا و ما فیہا کی طرف سے بے رغبتی ہو اور اللہ و رسول کی محبت دل میں جاگزیں ہو۔ بس اس سے اِدھر یا اُدھر نظر نہ ہٹانا چاہئے۔

کیفیات و حالات ہر سالک کو پیش آتے ہیں مگر جس قدر زیادہ صحابہ کرامؓ کے حالات سے مطابقت ہوگی

---

[1] ملانا۔ [2] کافر فاسق فاجر سے میل جول۔ [3] بدرجہا بدرجہ بذیں۔ [4] عبادت میں قوت پیدا کرنے کی نیت سے کہ یہ سب خدائی مشین کے کل پرزے ہیں ان کو چکنا رکھنے سے کام لینا ہے۔

اتنے ہی مامون ہوں گے، اور جتنی دوری ہوگی اسی قدر پر خطر اور سلامتی سے دور ہوں گے۔

کشف القبور اور کشوفِ کونیہ ہرگز قابلِ التفات نہیں کہ سب اطفالِ سلوک کے کھیل ہیں۔ اکثر پر خطر اور قاطعِ راہِ مقصود ہو جاتے ہیں۔

علم کی فضیلت اسی لئے ہے کہ وہ مورثِ عمل ہے اور عمل اس لئے مطلوب ہے کہ مورثِ حال ہو اگر حال نصیب نہ ہوا تو نہ عمل مفید کہ منافقین بھی کرتے بلکہ مسلمانوں سے زیادہ کرتے تھے۔ اور نہ علم مفید کہ آخر شیطان کو بہت کچھ نصیب تھا اور حدیث میں ہے کہ عالم بے عمل دوزخ میں جائے گا کہ اس کی آنتیں چکی کی طرح اس کے گرد گھومیں گی۔

سالک کے لئے دو چیزیں سخت مضر ہیں۔ بدعت سے تعلق اور نعمتِ الٰہیہ کا کفران۔ پس کچھ بھی ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ نصیب ہو تو منعم کا انعام سمجھ کر جھک جائے اور ہزاراں ہزار شکر ادا کرے کہ بشر سا ناپاک اپنے خالق برتر کی پاک درگاہ میں نام لینے کے قابل بنا اور وہاں اس کا تذکرہ ہوا کہ فاذکرونی اذکرکم[1]۔

اللہ والوں سے لپٹا رہے اور ان کی محبت دل میں ہو تو انشاء اللہ خاتمہ کبھی خراب نہ ہوگا اور دل میں اگر اللہ والوں سے بغض ہوا تو خاتمہ خراب ہونے کا بہت اندیشہ ہے اس لئے کچھ بھی نہ کرے تو محض دخولِ سلسلہ بھی نفع سے خالی نہیں۔

علومِ دینیہ کی تدریس اور خدمت تعلیم بھی طرق وصول الی اللہ سے ہے کہ طرق وصول ایک شئ میں منحصر نہیں۔ مگر اہل اللہ کے قواعد کا پابند ہونے کی حاجت ضرور ہے کہ بغیر روحانی تعلق کے محبت کا حصول دشوار ہے اور برکت بھی دخولِ سلسلہ ہی میں ہے۔

انسان کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی بحالت ذکر قلب میں سرور و انبساط ہوتا ہے کبھی گرمی محسوس ہوتی ہے کبھی مزہ آتا اور دل لگتا ہے اور کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ طبیعت اچاٹ ہوتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ نہیں۔ اصل خیر و برکت ذکر کی مداومت میں ہے یہ کسی حال نہ چھوٹنا چاہئے۔ اور غلامی کا امتحان بھی اسی میں ہے کہ بندۂ خدا نہ بندۂ لذت نہ بنے۔

سب کچھ کرے مگر اپنے کو متقی و کارگزار کبھی نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فلا تزکوا انفسکم[2]۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برہ[3] نام بھی پسند نہیں فرمایا۔

جب کوئی اپنا بڑا اور بزرگ ناخوش ہو تو اس سے عاجزی اور خوشامد کرے اور اس کا دل اپنے ہاتھ

---

[1] تو تم میرا ذکر کیا کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔ [2] تو تم اپنی پاکیزگی نہ جتاؤ۔ [3] نیک بی بی کہ اس میں بھی ایک طرح کا دعویٰ ہے۔

میں لیوے. چھوٹے اور بڑے میں یہی فرق ہے. جو شخص اس کے خلاف عمل درآمد کریگا دینی یا دنیوی نقصان اٹھاویگا۔

شانِ حضور[25] اور اتباعِ سنت میں جتنی ترقی ہوگی اسی قدر قربِ الٰہی بڑھے گا اور برکت ہوگی۔

مولانا صادق الیقین کے بھانجے مولوی محمود العانی اپنے نانا شاہ سراج الیقین صاحب قدس سرہ سے بیعت تھے. ۳۰ ربیع الثانی ۳۵ھ کو حضرت کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوکر تجدید کی درخواست کی. حضرت نے استخارہ کا حکم دیا اور بعد استخارہ ان کے قلب پر وارد ہوا: فاستجاب[1] لھم ربھم انی لااضیع عمل عامل منکم. چنانچہ انھوں نے پختگی ظاہر کی اور بعد مغرب حضرت نے بیعت فرماکر یہ مختصر وجامع مضمون ارشاد فرمایا "ہر چیز کی تحصیل سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مقصود کیا ہے اور غیر مقصود کیا ہے تاکہ غلطی سے محفوظ رہے اور مقصود بخوبی ذہن نشین اور متمیز ہوجائے. سو سمجھنا چاہئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں برکتِ صحبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ ان ہی طاعات وعبادات[2] مشروعہ صوم وصلوٰۃ وجہاد وغیرہ کے حصول نسبت کا ہوجاتا تھا. اور ایک نظر اشرف اور میں کل مقامات طے ہوجاتے تھے. بعد اس کے جب اکابر امتِ مرحومہ نے دیکھا کہ اس قوتِ قدسیہ کے مستور ہوجانے کے سبب اب یہ[3] امور وصول الی اللہ کے لئے کافی نہیں ہوتے تو انھوں نے خاص خاص طرق ذکر کے نکالے تاکہ کثرتِ ذکر سے حق تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہوجاوے. خواہ اس کو علاقہ محبت کا کہو یا بندگی اور نیازمندی کا تو مقصود اذکار واشغال سے یہ ٹھیرا کہ اسم کی کثرت اور تکرار سے مسمی یعنی حق تعالیٰ کا حضور ہوجاوے، اسی کو حدیث شریف میں احسان[4] سے تعبیر فرمایا ہے اور ان تعبد[5] ربک کانک تراہ اس کا حاصل اور مدلول ہے. باقی رہیں کیفیات وحالات یہ امور زائدہ ہیں مطلوب اور مقصود لذاتہ نہیں. کسی کو ہوتی ہیں اور کسی کو نہیں ہوتیں. شیخ محی الدین بن عربی نے فرمایا ہے الکیفیات[6] تربی بھا اطفال الطریقۃ طریق باطن کے بچے ان سے پرورش کئے جاتے ہیں. پس طالب کو لازم ہے کہ مقصود کی طرف ملتفت اور متوجہ رہے اور غیر مقصود کے درپے نہ ہو۔

حوادث پر صبر اور وقائع میں تقدیر پر نظر رکھنے کی تعلیم حضرت کے ہاں خاص اہتمام سے ہوتی تھی. حافظ فخرالدین صاحب کے والد ماجد کا انتقال ہوا تو حضرت نے تعزیت نامے میں یہ الفاظ تحریر فرمائے۔

"یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا گذشتنی[7] اور گذاشتنی ہے. ہر ایک جز اس کا ناپائیدار ہے. اگرچہ مفارقتِ اعزہ بظاہر شاق ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو سب کے سب اپنے حقیقی دار[8] کی طرف پس وپیش رجوع کر رہے ہیں اور

---

[1] پس قبول کرلی ان کی بات ان کے رب نے. میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا. [2] صرف یہ عبادات شرعیہ.
[3] اچھی طرح عبادت کرنا. [4] یہ کہ تم اپنے رب کی عبادت ایسے کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو. [5] کیفیتوں سے تو طریق کے بچوں کی پرورش کی جاتی ہے. [6] چھوٹنے اور چھوڑنے کے قابل. [7] گھر یعنی جنت کہ آدم علیہ السلام وہیں پیدا ہوئے وہیں گئے ہم سب بھی وہیں جائیں گے بلا سزا یا سزا کے بعد گر جائیں گے وہیں۔

ایک پائدار راحت کی طرف سفر ہورہا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو یہ نہایت لذیذ امر ہے۔ بہرکیف اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حبیب کی سچی متابعت کی توفیق عطا فرمائے جس کے ساتھ اخروی راحت و آرام وابستہ ہیں۔

جنگِ عظمیٰ کے زمانہ میں جبکہ خانقاہوں، بتوں اور پہاڑی غاروں سے عجیب عجیب پیشینگوئیوں کی صدائیں آرہی تھیں۔ ایک خادم نے دریافت کیا کہ اب تو نقرا و دراویش بھی تبدیلِ سلطنت کا حکم لگانے لگے جس کی بنا پر لازمین اپنا جمع شدہ روپیہ لینے کے لئے مستعفی ہو رہے ہیں لہذا میرے متعلق حضرت کا کیا مشورہ ہے؟ تو آپ نے تحریر فرمایا:

بھائی کس کو خبر ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ تمہارا تو فنڈ میں ہزار دو ہزار ہی روپیہ ہوگا لوگوں کا تو کاروبار میں لاکھوں روپیہ لگا ہوا ہے اگر ایسی موہوم باتوں پر وہ خیال کریں تو سب کاروبار بند ہو جاویں۔ پس تم سکون کے ساتھ اپنا کام کئے جاؤ۔ جو مشیتِ الٰہیہ ہوگی وہ خود ظاہر ہو جاویگی۔ ان باتوں پر التفات کرو۔

حضرت اپنے متوسلین کی تربیت محض قلم اور زبان ہی سے نہیں فرماتے تھے بلکہ مال اور جان سے بھی فرماتے تھے کہ کسی کو ناداری سے پریشان پاتے تو قرض یا ہدیہ جس پر جتنی قدرت پاتے خود مدد فرماتے۔ کوئی سفارش چاہتا تو تحریراً و تقریراً سفارش فرماتے اور اس کی ہر ضرورت میں جتنا ہاتھ بٹا سکتے اس میں دریغ نہ فرمایا کرتے تھے۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب سلمہٗ خسرودکن کے علاقہ صرف خاص تعلقہ سلوڑ کے صدر مقام قصبہ انوا کے باشندہ تھے اور ان کے باپ ہری رام نے کہ مرہٹہ منعصب ہندو خاندان کا تھا ان کا نام بلی رام رکھا تھا۔ اللہ کی شان کہ ان کے قلب میں نورِ اسلام چمکا اور چودہ[۱۴] برس کی عمر تھی کہ باپ نے سرکاری مدرسہ میں بغرض تعلیم روانہ کیا تو اس کو بہانہ بنا کر گھر سے تنِ تنہا چل دیئے۔ اس خوف و ہراس میں کہ کوئی عزیز قریب باخبر ہو کر پکڑنہ لے منزل بمنزل چل کر ریلوے اسٹیشن پر آئے اور راستہ میں طرح طرح کی تکلیف اٹھا کر بمبئی پہنچے۔ یہاں علانیہ مشرف باسلام ہوئے اور اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ جو نور ان کے قلب میں چمکا تھا اس نے صرف اسلام پر قانع نہیں رکھا بلکہ ان کو گدگدایا کہ علم دین حاصل کریں۔ بمبئی میں چونکہ اہلِ وطن کے تجارتی تعلقات تھے اس لئے وہاں سے گھبرا کر دہلی آئے اور چھ مہینے میں قرآن شریف ختم کر کے ابتدائی تعلیم دینی شروع کر دی۔ دہلی میں دل نہ لگا اور اس لئے مدرسہ مظاہر علوم میں آگئے۔ یہاں پہنچکر تو گویا ماں کی آغوش میں پہنچ گئے کہ حضرت نے سینہ سے لگا کر باپ اور ماں دونوں کو بھلا دیا۔ درسیات سے فارغ ہو کر سند لے چکے تو حضرت نے مدرسہ کا مدرس بنا دیا اور اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیا۔ پھر نکاح کا فکر کیا اور رشتہ تجویز فرما کر پیام لے گئے حتیٰ کہ مہر کی تقلیل پر خود زور دیا اور خود نکاح پڑھا کر روحانی بیٹے کو متاہل بنا بٹھایا۔[۱]

---

[۱] بعد میں وہ خود اورنگ آباد میں رہنے لگے بڑے نیک صوفی عالم ہیں۔

ہندوستان سے سوئے مدینہ

الحاصل چونکہ آپ مدنی مٹی[1] سے پیدا ہوئے تھے اور تقدیر میں مہاجرانہ وفات لکھی تھی اس لئے آپ نے ۱۶ رشوال[2] سے ۵ ار ربیع الثانی تک ڈیڑھ سال کی رخصت مدرسہ سے لیکر دارِ محبوب کا دفعۃً عزم کر دیا اور اوائل شوال میں آپ نے اپنے عزیزوں دوستوں اور خدام سے رخصتی ملاقات کے لئے انبہٹہ، گنگوہ، دیوبند، کاندھلہ اور میرٹھ کا سفر کیا کہ ایک ایک کے مکان پر گئے اور یہ الفاظ فرمائے کہ میرا کہا سنا معاف کرنا میں عرب جا رہا ہوں۔"
کسی نے اگر جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا سفر مبارک کرے اور بخیریت واپس لائے تو فرمایا بھائی جب میرا شباب تھا تو جب کبھی حاضر آستانہ ہوا ہوں یہی تمنا ساتھ لیکر گیا ہوں کہ وہاں کی پاک زمین مجھے نصیب ہو جائے۔ اب جبکہ تمام میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے میرے ساتھ کے پڑھے ہوئے میرے ہمعصر عزیز دوست ایک ایک کر کے ملک بقا کو راہی ہو چکے ہیں کب تک زندہ رہوں گا۔ اب اس توقع پر جا رہا ہوں کہ شاید اب میرا وقت آگیا ہو اور مدینہ طیبہ کی خاک پاک مجھے نصیب ہو جائے اور جوارِ نبوی[3] میں مجھ کو بھی جگہ مل جائے دعا کرو حق تعالیٰ ایمان کے ساتھ اٹھنا نصیب فرمائے اور مراد پوری کرے۔"

شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی سے فرمایا کہ میاں اپنے بچوں کا نکاح کر دیتے تو ہم بھی شریک ہو جاتے چنانچہ انھوں نے سلسلہ جنبانی شروع کی اور خدا کی شان کہ چند ہی دنوں میں دونوں لڑکوں کا رشتہ پختہ ہو کر جلد سے جلد تاریخ بھی مقرر ہو گئی ورنہ برسوں ہیرا پھیری کرنا قومی رواج تھا حضرت کے فرمانے کی برکت تھی کہ خود بخود سامان مہیا ہو گئے اور حضرت خوشی خوشی اس میں شرکت کے لئے میرٹھ تشریف لائے یہاں بھی ایک ایک خادم کے مکان پر مستقل تشریف لے گئے اور آخری سلام فرما کر ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے

حافظ فخر الدین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کے اس مبارک ارادۂ ہجرت سے خدام پریشان ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟ فرمایا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے اور سلسلہ اسی طرح چلتا رہا ہے کہ جب کوئی شیخ وصال کرتا ہے تو اس کے خلفاء کام کرتے ہیں اور ان سے مخلوق ہدایت و فیضان حاصل کیا کرتی ہے پس میرے لوگوں کو چاہئے کہ میرے خلفاء میں سے جس کی طرف چاہیں رجوع کریں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ میں اگر ہندوستان ہی میں رہتا تو آخر کب تک زندہ رہتا۔

کوئی چیز باہر سے ہدیہ آئی اور حضرت نے حسب عادت گھر سے منگا کر مخلصین کے سامنے رکھی کہ کھائیں مولوی زکریا بولے حضرت کے طفیل میں کیا کیا کچھ کھایا اور کھاتے ہیں۔ یہ سن کر فرمایا اب طفیل میں کھاتے ہو

---

[1] بعض بزرگوں کا قول ہے کہ انسان جہاں کی مٹی سے پیدا ہوتا وہیں وفات پاتا ہے۔ [2] ڈیڑھ سال کی رخصت از ۱۶ رشوال ۱۳۴۴ھ تا ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ۔ [3] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس۔

چند روز بعد انشاء اللہ مستقل کھاؤ گے کہ لوگ خود پیش کریں گے۔"

کاندھلہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں تنہائی پاکر میں نے عرض کیا کہ حضرت مبارک جگہ تشریف لئے جارہے ہیں اس کی مسرت ہے مگر اپنی بیکسی کا قلق ہے کہ مولانا رائپوری حیات تھے تو حضرت کی مفارقت کا صدمہ وہاں حاضر ہوکر کم ہو جاتا اور جب طبیعت گھبراتی تو رائپور جاکر سکون مل جاتا تھا۔ اب جدھر نظر اٹھاتا ہوں کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔ اتنا کہہ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے اور ہچکی بندھ گئی حضرت بھی چشم نم ہوئے اور ذرا سکوت کے بعد فرمایا اللہ خلیفتی علیک انشاء اللہ کہیں جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور کوئی مشورہ کی ضرورت پیش آئے تو اپنے بھائیوں سے لیجو اور ان سے ملتے رہیو"

غرض جلد جلد وہ آخری منظر ختم ہوگیا اور اوائل شوال میں حاضر ہوا تو شفقت کے ساتھ فرمایا لو بھئی اب ہماری تاریخ روانگی مقرر کردو کہ کس تاریخ یہاں سے چلیں۔ بندہ ہی نے ۲۶ شوال مقرر کی کہ پنجشنبہ کا دن تھا مگر کیا خبر تھی کہ یہ تقرر آخری زیارت کا ہے جو اپنی زبان سے تجویز کررہا ہوں حضرت میرٹھ ہی میں تھے کہ حیدرآباد سے بلاوا آگیا اور مدرسہ کو نفع پہنچنے کی توقع تھی۔ ہرچند کہ لمبا سفر تھا مدت دراز بلکہ عمر بھر کے لئے قیام کی نیت سے سفر تھا سارا اسباب بندھوانا اور یہاں کے تمامی معاملات طے کرنا تھے ضعیفہ اہلیہ اور ان کے بیمار بھائی کو ساتھ لے جانا تھا اور پھر دو سو کے قریب رفقا کی معیت تھی اور ہر نزدیک و دور سب کو اطلاع ہوچکی تھی کہ ۲۶ شوال کو روانگی ہے اور اس لئے کوئٹہ اور کشمیر تک سے خدام رخصتی زیارت کے لئے آنے والے تھے۔ سب کچھ تھا مگر خدا داد عزم بے نظیر ہمت مدرسہ اور کار تعلیم پر جاں نثاری اور صدقات جاریات علمیہ کا شغف اور انہماک اتنا زبردست تھا کہ دنیا میں نظیر نہیں ملتی اس لئے یہیں سے ارادہ کرلیا کہ میں ۹ شوال کو حیدرآباد چلا جاؤں گا اور گھر والے حسب تجویز ۲۶ کو رفقاء کے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوں۔ میں وہیں سے بمبئی میں آملوں گا۔" چنانچہ آپ کر گذرے جو عزم کیا تھا اور حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ بندہ قافلہ کے ساتھ بمبئی تک گیا اور حضرت کا حیدرآباد لائن پر استقبال کرکے کہ مولانا رحیم بخش صاحب عاشقانہ طرز سے ہمراہ تھے قیامگاہ پر آیا۔ آخر چوتھے دن حضرت نے تاکیداً فرمایا کہ وطن واپس جاؤ اور اب ٹھیرنا فضول ہے۔ وہ سماں عمر بھر نہ بھولوں گا جبکہ رخصت ہوکر عشا کے بعد چلا اور حضرت گاڑی میں سوار کرانے کے لئے سڑک تک آئے۔ ہرچند عرض کیا کہ اندھیرا ہے راستہ خراب ہے وقت ناوقت ہے حضرت تکلیف نہ فرماویں یہیں سے رخصت کردیں مگر پدرانہ شفقت نے نہ مانا اور جب گاڑی پر سوار ہونے لگا تو حضرت نے چھاتی سے لگالیا کہ میں رو رہا تھا اور حضرت کا قلب غیر معتدل حرکت کررہا تھا۔ آخر ہوا وہ جو ہونا مقدر تھا کہ حضرت مجھے دیکھتے رہے اور میں

۱؎ اللہ تعالیٰ میرے بجائے تمہارے نگراں ہوں گے۔

حضرت کو تکتا رہا یہاں تک کہ راستہ کے موڑنے دو باپ بیٹوں کو ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا ؎

حیف[1] در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد ٭ روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

میرے لئے تو یہی آخری معانقہ تھا مگر آپ اپنے دو سو رفقاء کی برات کے دولہا بنے ہوئے بیس[2] دن بمبئی میں ٹھیرے کہ سب آپ ہی کی معیت کے شوق میں گھروں سے نکلے تھے اور موجودہ جہاز بکثرت اتنے ٹکٹ نہیں دیسکتا تھا۔ آخر ۲ ذیقعدہ کو زیّانی جہاز میں آپ سوار ہوئے جس کے متعلق مشہور تھا کہ سب میں بڑا اور نہایت بوسیدہ و سست جہاز ہے۔ خدا کی شان کہ اس کی رفتار اچھے جہازوں سے بھی بڑھ گئی اور ۱۰ ذیقعدہ کو آپ کامران میں بغرض قرنطینہ اُتر گئے ۱۸ کو وہاں سے چل کر ۲۱ کو جدہ اور وہاں سے اونٹ کی سواری پر ۲۵ کو مکہ مکرمہ پہنچ لئے۔ مناسکِ حج سے فارغ ہو کر دارِ محبوب کا قصد فرمایا اور ۱۲ محرم ۱۳۴۵ھ کو حرم نبوی کی خاک پاک کا سرمۂ چشم بنانا آپ کو نصیب ہوا کہ آپ کی عمر کا سوا برس باقی رہ گیا تھا۔ خوشی کی گھڑیاں گذرتی محسوس نہیں ہوا کرتیں۔ یہ زمانہ آپ کے لئے ایسی فرحت و سرور کا تھا کہ آپ کی تہتر سال ڈیڑھ ماہ کی عمر میں کوئی وقت بھی اس کی نظیر نہیں کہا جاسکتا۔ محبوب کا وطن، محبوب کا قرب، وصال کی راتیں وصال کے دن جو کچھ بھی لذت ہو وہ تھوڑی ہے پھر مشغلہ کلام محبوب کی شرح کا کہ اسی میں ہر آن دماغ مشغول اور اسی میں زبان اور خیال منہمک۔ بچپن سے جس تمنا و شوق کی آگ احشا[2] میں جل رہی تھی اس پر ٹھنڈے پانی کی پھوار برسی اور جس توقع و امید میں زندگی کے پل اور لمحے گذارے تھے خدا خدا کرکے اس کے بر آنے کی صورت نظر آئی۔ خدام دردِ فرقت میں بیتاب مگر آپ وہاں سے مجھے تحریر فرماتے ہیں کہ میں ابتداءِ سفر سے اس وقت تک بحمد اللہ نہایت راحت و آرام سے ہوں، اور حق تعالیٰ شانہ کے اس بے انتہا انعام پر کہ مجھ جیسے ناکارہ کو یہاں پہنچادیا نہایت شاداں فرحاں ہوں ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل ٭ نسیم صبح تیری مہربانی

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و صحبہ و بارک وسلم۔

۱۷ صفر ۱۳۴۵ھ کو آپ کے رفقاء واپس ہند ہوئے اور مولوی محمد زکریا صاحب مولوی محمد الیاس[3] صاحب اور مولوی محمد جلیل صاحب کاندھلوی کے سوا سب کو آپ نے رخصت کر دیا۔ اب ہمہ تن تالیف بذل المجہود میں اشتغال ہو گیا اور وسطِ شعبان میں آپ اس کو ختم فرما کر بالکل فارغ ہو لئے۔ بذل کا ختم ہونا تھا کہ ادھر لقاءِ رب کا

---

[1] افسوس پلک جھپکنے میں محبوب کی صحبت ختم ہو گئی پھول کا چہرہ ہم نے جی بھر کے بھی نہ دیکھا تھا کہ بہار ختم ہو گئی۔

[2] سینہ و جگر کے درمیان کا اندرونی حصہ۔ [3] شیخ الحدیث صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ بھی واپس ہو گئے تھے اور ایک صفحہ بعد کی عبارت سے بھی یہ نکلتا ہے۔

شوق بڑھنے لگا اور اُدھر کشش اپنا کام انجام دینے لگی ؎

اگر از جانبِ معشوق نباشد کششے[1]   طالبِ عاشق بیچارہ بجائے نرسد

تعلقات سے یکسوئی ہونے لگی خلوت و تنہائی سے انس بڑھ گیا۔ تلاوتِ کلام اللہ کی رغبت اتنی ہوئی کہ دیکھنے والے ترس[2] کھاتے اور عرض کرتے کہ اس ضعیفی میں تعلیق ابوداؤد کی ناقابل برداشت محنت سے دماغ تھک لیا ہے اب اس پر رحم فرمایئے۔ مگر آپ جواب دیتے کہ دماغ سے کام ہی لینا کیا باقی ہے جو رعایت کروں اچھا ہے جس نے دیا ہے اسی کے کام آوے ؎

جان بھی دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قیس سے پوچھو کہ لیلیٰ کے ساتھ باتیں کرنے میں کیا مزہ ہے؟ اور اس سے اندازہ کرو کہ محبِ خدا کو کلام اللہ کی تلاوت میں کیا لذت آنی چاہئے۔ ماہِ رمضان قریب آچکا تھا اور عمر کا آخری رمضان تھا کہ تجرد[3] عن الخلائق و ملکوتی صفت نصیب ہونے کے لئے آئندہ کبھی یہ وقت نصیب ہونے والا نہ تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے متوسلین کو بھی خطوط لکھدیئے کہ آئندہ جواب کا انتظار نہ دیکھیں۔ چنانچہ احقر کے پاس جو ۲۶ شعبان کا لکھا ہوا خط آیا تو اس میں تحریر فرمایا تھا۔ اب رمضان شریف آگیا خطوط کا لکھنا دشوار ہوگا لہذا جواب کا انتظار چھوڑ دیجئے اور رمضان بعد مولوی زکریا وغیرہ احباب حج کے لئے واپس ہوں گے اور بعد فراغِ حج وطن کو واپس ہو جاویں گے پھر جواب کا ملنا نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ بہرکیف اب آپ اپنی خیریت سے اکثر اطلاع کرتے رہیں اور ممکن ہوا تو کبھی کبھی میں بھی اپنی خیریت لکھدیا کروں گا۔

اُدھر سے امراض و عوارض کے ہدایا پیش ہونے لگے کہ اول نزلہ کا سخت دورہ ہوا اور پھر بخار آیا کہ کئی دن تک آستانۂ محبوب تک جانے کی طاقت نہ رہی۔ مگر رمضان کی خاطر افاقہ ہوا اور وہ مبارک مہینہ اس مجاہدہ نامہ میں گذرا کہ بیان کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے اور دو چار فنجان چا اور بمشکل آدھی چپاتی۔ دن بھر تلاوت اور رات بھر ساعت کہ شاید سونے کے لئے تین گھنٹے بھی نہیں تھے۔ رمضان ختم نہ ہوا تھا کہ تپ لرزہ شدید ہوا اور اسی میں فالج کا اثر۔ مگر آپ نے ہندوستان میں اطلاع نہ دی کہ خدام پریشان ہوں گے۔ چنانچہ ۱۲ شوال کو بندہ کے پاس خط تحریر فرمایا تو اس میں لکھا کہ گذشتہ ہفتہ میں مختصر خط لکھوا چکا ہوں مگر اس میں اپنی بیماری کی خبر قصداً نہیں لکھی تھی کہ باعثِ تشویش ہوگی۔ اب الحمد للہ افاقہ ہے اور طبیعت رو بصحت ہے۔

---

[1] اگر محبوب کی جانب سے کشش نہ ہو تو بیچارہ عاشق کسی مقام پر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ [2] صبح کو کھانے سے قبل تین چار پارے خود تلاوت فرماتے اور بعد ظہر دو پارے اہلیہ کو سناتے۔ بعض آیات پر بے اختیار گریہ غالب ہو جاتا اور رونے لگتے تھے پھر ترجمہ فرما کر گھر والوں کو سناتے۔ [3] مخلوقات سے علیحدگی اور فرشتوں کی سی صفت۔

اس لئے اطلاعاً لکھتا ہوں۔ آخر رمضان المبارک میں مجھے کچھ تپ لرزہ کی شکایت ہوئی مگر دو روز بعد وہ تو بالکل جاتی رہی لیکن بائیں ٹانگ اور بائیں ہاتھ میں ایک خدر[1] واسترخا، کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے چلنا پھرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا درد یا تکلیف بالکل نہیں تھی صرف قوتِ مشی اور قوتِ ماسکہ[2] کام نہیں کرتی تھی۔ اب الحمد للہ کہ بہت افاقہ ہے اور طبیعت گویا اچھی ہے۔ بے تکلف تو اب بھی چلنا یا پکڑنا نہیں ہوتا مگر تھوڑا بہت چل سکتا ہوں۔"

اس وقت آپ نے لکڑی اور آدمی کے سہارے آستانۂ محبوب پر حاضر ہونا پھر شروع کر دیا کہ پاؤں بہ تکلف اٹھانے اور گویا گھسیٹتے ہوئے چلتے تھے مگر پنجگانہ اوقات میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ذیقعدہ میں آپ نے مولوی زکریا صاحب اور مولوی جلیل صاحب کو بھی رخصت فرما دیا اور اب عجیب کیفیت میں دن گذرنے لگے کہ شوقِ لقا کہتا تھا جلد وہ دن آئے جس میں قفس عنصری کا جال ٹوٹے اور ادب کہتا تھا کہ چُپ رہو سنتِ الٰہیہ کے غلام[3] بنے ہوئے کام کئے جاؤ۔ یہ دن کچھ عجیب حسرت اور مسرت سے مخلوط گذر رہے تھے کہ ان خوابوں کا اور رویائے مبشرات کا خیال آتا جو عرصہ سے بار بار دیکھ رہے تھے تو امید بڑھتی تھی کہ ضرور یہاں کی مٹی میں ملنا نصیب ہو گا اور شاہنشاہ کی بے نیازی وجلالتِ شان پر نظر جاتی تھی تو خوف ہوتا تھا کہ دیکھئے کیا مقدر ہے۔ بامید وصال حقیقی شاداں[4] تھے تو خوف قطعیت[5] واندیشۂ ہجر سے ترساں ولرزاں ؎

زجاں[6] دادن نمی ترسم من اے جاں ۔ ازیں ترسم کہ از تو دور مانم

آپ نے ۵ ذیقعدہ ۔۔۔ کو مظاہر علوم کے ظاہری تعلق سے انقطاع کی تحریر سرپرستان کے نام رجسٹری کرا کے بھیجدی تھی کہ میں جب سہارنپور سے رخصت ہوا تھا تو میں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اور نہ اب تک ہجرت کی نیت کی ہے کیونکہ مجھ کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کے نزدیک میں اس مقدس ارض کے قابل ہوں یا نہیں۔ اگر حق تعالیٰ شانہٗ کو مجھ جیسے ناکارہ کا قیام اس مقدس زمین میں منظور نہ ہوا تو اپنے سیاہ اعمال کے ساتھ واپس ہو جاؤں گا۔ لیکن ابھی تک مجھ کو بحمد اللہ یہاں دلبستگی ہے اور یہاں سے واپسی کے لئے مضطر نہیں ہوا۔ لہٰذا یہاں کے قیام سے کسی طرح برداشتہ خاطر نہیں ہوا ہوں۔ اگر خدانخواستہ میں یہاں نہ ٹھیرایا گیا اور واپسی ہوئی تو بھی میں اس قابل نہیں رہا ہوں کہ مدرسہ کی کوئی خدمت بعوض تنخواہ بجا لا سکوں۔ اس لئے جو انتظامات عارضی طور پر کئے گئے تھے ان سب کو مستقل کر دیا جائے مگر اس کے چند ماہ بعد جبکہ آپ اپنے رفقا کو ہندوستان بھیج چکے۔

---

[1] بے حسی اور ڈھیلاپن۔ [2] روکنے والی۔ [3] کہ موت کی تمنا نہ ہو گو شوقِ لقا میں تمنا جائز ہے مگر صورت اس کی بن جاتی تھی کہ گویا مرض وغیرہ سے تنگ ہو کر تمنا کی جاتی ہے اس لئے اس سے پرہیز رہا۔

[4] خوش خوش۔ [5] قطع تعلق و دوری۔

[6] اے محبوب میں جان دینے سے نہیں ڈرتا بلکہ اس سے ڈرتا ہوں کہ تم سے دور نہ رہ جاؤں۔

ہجرت کی نیت

تو ہجرت کی نیت پختہ کرلی اور ایک دن گھر میں تشریف لاکر متعلقین سے فرمایا کہ اب مجھے اپنے قیام کا یقین ہوگیا ہے لہذا میں تو ہجرت کی نیت کرچکا۔

زندگی کے آخری ایام میں درسِ حدیث

چنانچہ بقیہ ایام جتنے بھی گذرے وہ مہاجرانہ اقامت کے گذرے۔ حتی کہ ربیع الثانی کا دوسرا جمعہ پڑھ کر عمر شریف کا آخری ہفتہ آیا اور آپ نے بعض علماء مدینہ کے اصرار پر ابو داؤد پڑھانا شروع کردیا کہ مولوی سید احمد صاحب قاری بنے اور مولانا عمری مدرس حرم شریف سامع۔ شنبہ اور یکشنبہ کو بعد عصر دو دن مدرسہ شرعیہ مدنیہ میں درس دیا تھا کہ تیسرے دن دو شنبہ کو جبکہ ظہر کی نماز حرم شریف میں پڑھ کر واپس ہوئے تو راستہ میں فرمایا

مرض الموت کا آغاز

"سینہ کے اوپر کے حصہ میں پھر آج کچھ درد محسوس ہو رہا ہے" اس سے تین چار دن پہلے بھی اسی طرح ایک درد محسوس ہوا تھا جو مالش اور سینک سے دو تین گھنٹہ میں جاتا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر مالش اور سینک ہوئی مگر عصر کے وقت معلوم ہوا کہ درد تو کم ہے لیکن ضعف بہت ہے کہ حرم شریف جانے کی ہمت نہیں ہے۔ چنانچہ عصر کی نماز مکان پر مولوی سید احمد صاحب کے اقتدا میں پڑھی اور باوجود ضعف کے کھڑے ہو کر پڑھی۔ پھر ضعف اور بڑھا کہ بدن میں بجائے حرارت کے خنکی اور پسینہ تھا۔ مغرب کی نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر پڑھی بلکہ مولوی سید احمد سے فرمایا کہ مختصر اور جلدی پڑھاویں۔ عشا کی نماز کے لئے نیچے اترنا بھی دشوار ہوگیا اور پلنگ ہی پر بیٹھ کر پڑھی۔ کرب اور بے چینی کے ساتھ ساتھ ضعف بڑھتا رہا اور تمام رات کلمہ و استغفار اور درود وردِ زبان رہا مطلق نیند نہیں آئی۔ صبح سہ شنبہ نمودار ہوئی تو نماز فجر بھی پلنگ پر بیٹھ کر ادا فرمائی مگر پسینہ اور بردِ اطراف[1] بڑھتا جا رہا تھا اور روقت پکار رہا تھا کہ یہ صبح ہوش و حواس کی آخری صبح ہے۔ دن میں دوا دارو کا خدام کو اہتمام رہا مگر نہ پیشاب ہوا اور نہ کوئی دوا ہضم ہوئی۔ ظہر کے وقت اتنا ضعف ہوگیا کہ وضو بھی کرنے کی طاقت نہ رہی اور تیمم فرما کر پلنگ پر بحالتِ قعود نماز پڑھی اور اس کے بعد حرکت و سکون نہ تکلف اور دوسرے کا محتاج ہوگیا۔ عصر کے وقت ہوش و حواس میں اختلال شروع ہوگیا اور امام کی آواز پر خود رکوع نہ کیا بلکہ جب حاجی مقبول احمد صاحب نے رکوع کا لفظ کہہ کر اشارہ کیا اور جب سجدہ کو کہا تو سجدہ کرلیا۔ اس طرح چار رکعت بمشکل پوری کراکے آپ کو لٹا دیا گیا اور اس کے بعد سکوت بڑھتا گیا کہ اس سے پہلے بات کا سمجھنا اور جواب دینا یا از خود کوئی بات فرمانا برابر جاری تھا۔ مغرب کے وقت مولانا سید احمد صاحب نماز پڑھانے کے لئے آئے تو بالکل غفلت تھی کہ نماز کے واسطے پکار کر اطلاع کی مگر کچھ جواب نہ ملا اور نہ اٹھنے کی طاقت محسوس ہوئی۔ خدام نے اپنی نماز علیحدہ پڑھ لی مگر انتظار رہا کہ کچھ التفات یا افاقہ ہو تو نماز کے لئے

[1] ہاتھ پیر وغیرہ کا ٹھنڈا ہونا۔

عرض کیا جائے گا لیکن بالکل دنیا سے قطع تعلق ہو چکا تھا اور سوائے پاس انفاس کے نہ کوئی حرکت تھی نہ کسی بات کا جواب نہ سوال۔ شب میں ایک دو مرتبہ ماءِ زمزم ڈالا گیا تو اس کے حلق سے اترنے میں بھی تکلف ہوا لہذا وہ بھی ترک کر دیا گیا۔

وفات پورے چوبیس گھنٹے اس عالم خموشی میں گذار کر بیوم چہار شنبہ کہ عرب میں ۱۴ اور ہندوستان میں ۱۵ ربیع الثانی تھی منزلِ مقصود پر پہنچ لئے کہ باوازِ بلند اللہ اللہ کہنا شروع کیا اور دفعۃً آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئے۔ ہرچند کہ وقت تنگ تھا مگر غیب سے عجلت کے سامان مہیا ہو گئے۔ غسل کا انتظام ہوا۔ سید احمد نواب صاحب مرور نے نہلایا۔ ابو مسعود نے پانی دیا اور مولوی سید احمد اور مولوی عبدالکریم نے مدد پہنچائی۔ جلد جلد جنازہ طیار ہوا اور آستانۂ محمدیہ پر بابِ جبریل کے باہر صلوٰۃ جنازہ کی جگہ لا رکھا گیا۔ صلوٰۃِ مغرب سے فراغ کے بعد مدرسہ شرعیہ مدنیہ کے صدر مدرس مولانا شیخ طیب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع کو لے چلے۔ بایں ضیقِ وقت کہ اطلاع کا موقع ہی نہیں ملا جنازہ[1] کے ساتھ اتنا ازدحام تھا کہ بہتیروں کو باوجود کوشش کے کندھا دینا نصیب نہ ہوا اور سریر کو صرف ہاتھ لگا دینا ہی غنیمت معلوم ہوا۔

اے تماشا گاہِ[2] عالم روئے تو — تو کجا بہرِ تماشا می روی

آخر آپ کا جسد اور جو آتشِ محبت میں گھل گھل کر مغز استخواں رہ گیا تھا قبۂ اہلِ بیت کے متصل عشا سے قبل آغوشِ لحد کی سپرد کر دیا گیا اور وہ شب شبِ عروس قرار پائی کہ دیرینہ مراد جو صدہا مرتبہ آپ کی زبان اور قلم سے نکلی تھی کہ کاش میری مٹی بقیع کی خاکِ پاک میں مل جائے الحمد للہ پوری ہو گئی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ[3]۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

مرض موت سے پیشتر رؤیا اور اس کی تعبیر مرض کے پہلے ہی دن آپ نے فرمایا تھا "میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں ایک مکان میں ہوں جس کے نیچے تہ خانہ ہے اور چھت اس کی تختوں سے پٹی ہے۔ اس میں سے دو تختے نیچے کو جھکے ہیں اور نکل گئے ہیں پس میں بہت سہولت سے اس تہ خانہ میں اتر رہا ہوں، وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بہت بڑا اور اچھا چونہ قلعی کیا ہوا روشن مکان ہے اور اس میں ایک طرف دروازہ ہے جس سے روشنی وغیرہ آتی ہے لیکن لوٹنے وغیرہ کا ارادہ انہی تختوں

---

[1] چارپائی۔ [2] اے وہ کہ تیرا چہرہ تمام عالم کے لئے تماشہ کی جگہ ہے تو کہاں تماشہ کرنے جا رہا ہے۔
[3] اللہ ہی کے لئے ہے جو وہ لے لیں اور انہی کا ہے جو عطا فرما دیں۔ ہر وہ شخص جو زمین کے اوپر ہے فنا ہونے والا ہے پس آپ کے رب جلال و اکرام کی ذات باقی رہے گی۔
عہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ (اخلاق احمد)

کی طرف سے جدھر سے آیا ہوں کر رہا ہوں۔ اتنا کہنے کے بعد فرمایا اس کے بعد میرا خیال دوسری طرف چلا گیا اور پھر آنکھ کھل گئی، اس کے بعد خود ہی تعبیر بتائی کہ وقت تو جب بھی ہو مگر یہ میرے لئے بشارت ہے کہ انشاءاللہ قبر میں سہولت ہوگی۔ اور وہ دروازہ دروازۂ جنت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے"۔

مولوی سید احمد صاحب خواب اور تعبیر سن کر جب باہر چلے گئے تو آپ نے اہلیہ کو پاس بلایا اور التجا کے درجہ میں یہ الفاظ فرمائے کہ جو کچھ تمہارے حقوق میرے ذمہ ہوں یا میں نے تم کو برا بھلا کہا ہو وہ سب اللہ واسطے معاف کر دو۔ اس کے بعد ان کے بھائی حاجی مقبول احمد سے کہ مدت سے حضرت کے پاس رہتے تھے فرمایا کہ میں تم پر بہت مرتبہ خفا ہوا ہوں اور اکثر برا بھلا کہا ہے تم بھی معاف کر دو۔

اہلیہ کی دلدہی اخیر زمانہ میں اہلیہ کے ساتھ حسنِ معاشرت بہت بڑھ گیا اور ان کی بیوگی کے تصور سے ان کی دلدہی زیادہ فرمانے لگے تھے۔

ایک مرتبہ ان سے فرمانے لگے کہ مدینہ منورہ میں رہ کر یہاں کے مصائب و تکالیف پر اگر کوئی صبر کرے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں خاص طور پر اس کی شفاعت کروں گا۔" اہلیہ نے عرض کیا کہ مجھے تو کوئی تکلیف یا مصیبت نہیں ہے میں تو بحمد اللہ بہت راحت سے ہوں۔ فرمایا آخر کچھ تو ہے ہی۔ یہی روٹی ٹکڑے کی۔ غرض بات کو ٹلا دیا لیکن ان کو چند ہی روز بعد بیوہ بننے پر معلوم ہوا کہ مصیبت کیا چیز ہے اور اس پر صبر کسقدر کٹھن ہے۔ مگر اللہ رے ہمت کہ شوہر کی آخری وصیت کو پورا کر دکھایا کہ بعالم غربت و تنہائی یکایک دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور پچاس برس کے محسن سرتاج کو صرف چوبیس گھنٹے بعالم ہوش اور چوبیس گھنٹے بعالم بیہوشی بیمار دیکھ کر اچانک بقیع کو جاتا ہوا دیکھا مگر نہ چیخ نکالی نہ آہ و زاری کا شور مچایا کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں، مگر صدمہ نے اندر ہی اندر چر لیا۔

اہلیہ کا وصال اور آخر کار چار مہینے ہوئے کہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ کو قبل مغرب خود بھی دنیا سے رخصت ہو کر اگلے دن پنجشنبہ کو شوہر کے قدموں میں دفن ہوگئیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ سعید تکرونی مدنی کہتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت شوق تھا اور اکثر اس مطلب کے لئے دعائیں پڑھا کرتا مگر زیارت سے مشرف نہ ہوتا تھا جس زمانہ میں حضرت مولانا مدینہ منورہ تشریف لائے تو قبل اس کے کہ مولانا سے میری شناسائی ہو میں نے خواب دیکھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ رسول اللہ ہیں اور ایک عالم ہندی خلیل احمد نام کا انتقال ہو گیا ہے ان کے جنازہ کی شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں"۔ چنانچہ میں نے اپنا خواب اسی زمانے میں مولانا شیخ الفا ہاشم سے بیان کیا تھا جب مولوی زکریا صاحب وغیرہ ہندوستان واپس ہوئے اور مولانا واپس نہ ہوئے تو شیخ الفا ہاشم

نے مجھ سے کہا کہ تمہارے خواب کی صداقت کے بعض قرائن ظاہر ہو رہے ہیں کہ مولانا نے اقامت کی نیت فرمائی اور ہندوستان نہیں گئے"۔

گریہ و بکا اخیر زمانہ میں آپ کا اندرونی سوز و گداز زیادہ بڑھ گیا تھا کہ ضبط نہ فرما سکتے اور بات بات پر رقت و گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ بزرگوں کی عمروں کا ایک بار ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے دو سال زندہ رہا تو اپنے شیخ کی عمر کو پہنچ جاؤں گا۔ اتنا کہہ کر رو دیئے اور فرمایا سب چلے گئے میں ہی رہ گیا۔

ایک مرتبہ کسی نے عرض کیا کہ حضرت ہندوستان کا کب تک ارادہ ہے؟ تو چشم پرآب ہو گئے اور فرمایا اب تو بقیع کا ارادہ ہے"۔ آخرت کا قیامت کا یا بزرگوں کا جس وقت بھی ذکر آتا تو آبدیدہ ہو جاتے اور آواز میں تغیر آجاتا تھا۔ آپ کے ہاتھ پر مدراس کی طرف کے ایسے لوگ جو نہ اردو سمجھتے تھے نہ عربی بواسطہ ترجمان بیعت ہوئے تو مولانا اصغر حسین صاحب نے کہا حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب کو مالٹا میں لے جا کر بٹھا دیا اور حضرت کو یہاں پہنچا دیا کہ دور دراز کے لوگ جن کے طلب فیض کا کہیں گمان بھی نہ ہوتا فیض حاصل کرنے لگے۔ یہ سن کر آپ پر گریہ غالب ہو گیا اور فرمایا بھائی وہ بڑے لوگ تھے میں تو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں نے کہتے کہتے مجھے تو شیخ بنا دیا۔

جتنی مدت کی رخصت اتنے ہی دن کا قیام یہ عجیب اتفاق ہے کہ مدرسہ سے ڈیڑھ سال کی حاصل شدہ رخصت ہی آپ کی حیاتِ دنیویہ کی مدت تھی کہ اس میں نہ ایک دن کم ہوا نہ زیادہ[1]۔ یہ رخصت کا زمانہ ۱۶ ربیع الثانی کو ختم تھا اور سورج ڈوبنے میں گھنٹہ بھر باقی تھا کہ آفتابِ علم و عمل غروب اور مدرسہ کا چمکتا ہوا چراغ یکدم گل ہو گیا۔ مگر بیسیوں مشعلیں روشن کر کے دنیا میں چھوڑ گیا کہ شریعت و طریقت کے مہکتے ہوئے پھول گلزار خلیل میں تا قیامت کھلتے رہیں۔

تصانیف ان مجسم صدقات جاریات کے علاوہ آپ کی تصانیف ہدایات الرشید مطرقۃ الکرامہ اتمام النعم تنشیط الآذان المہند اور سب سے آخری تالیف بذل المجہود جداگانہ کارنامے ہیں جو ایصال ثواب کا سلسلہ تا دیر قائم رکھیں گے۔ اور خود مدرسہ عالیہ مظاہر علوم تو ایسی مستقل یادگار ہے کہ اس کے علمی ممد سے بواسطہ و بلا واسطہ جو طالب علم بھی دینی نفع اٹھائے گا وہ آپ ہی کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔

خلفاء نیز روحانی سلسلہ میں آپ کی یادگار وہ خلفاء ہیں جن کے قلوب میں آپ آتشِ محبتِ الٰہیہ سلگا کر دنیا سے اٹھے ہیں کہ

سب سے اول حضرت حافظ قمر الدین صاحبؒ امام جامع مسجد سہارنپور

[1] بہت ممکن ہے کہ حضرت پر ہندوستان میں بھی منکشف ہو گیا ہو کہ اتنی عمر کی مدت باقی ہے۔

اور پھر حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاندھلوی کہ اعلیحضرت امام ربانی کی وفات کے چندہی روز بعد آپ کی طرف سے مجاز ہوئے مگر افسوس کہ دونوں حضرات وصال فرماکر سہارنپور کے گورستان میں سوگئے۔

نیز مولانا مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی جن کو غالباً ۱۳۱۰ھ میں اجازت ملی تھی تپ کہنہ میں وفات پاکر کاندھلہ میں مدفون ہوئے فرحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

صرف سلسلۂ نقشبندیہ میں آپ نے مکہ مکرمہ میں حاج محمد حسین حبشی کو بھی اجازت دی تھی مگر ترکی انقلاب میں وہ کہیں چلے گئے اور اب پتہ نہیں کہ زندہ ہیں یا وصال فرماگئے۔

ہاں جو حضرات بقید حیات اور سلسلۂ خلیلیہ کے مایۂ ناز ہیں وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ مقیم نظام الدین دہلی۔

جناب حافظ فخرالدین صاحب ریلوے ملازم غازی آباد۔

مولانا ظفر احمد صاحب مفتی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔

مولانا حافظ فیض الحسن صاحب گنگوہی مقیم کانپور۔

مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور۔

اور مولانا رشید احمد صاحب مدرس انجمن ہدایت الرشید قصبہ گروٹ ریاست ہلکر ہیں۔

متعنا اللہ بطول بقائھم۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

ممکن ہے[1] اور کوئی صاحب بھی مجاز ہوں کہ حضرت کے الطاف خدام پر بیش از بیش تھے مگر کام کے لئے یہ حضرات کافی ہیں اس لئے حضرت کے متوسلین یا دیگر حضرات طالبین سلوک میں جس کو بھی اکتساب کا شوق ہو ان حضرات میں جس سے طبعی اُنس پائیں ان کی طرف رجوع کریں انشاء اللہ محروم نہ رہیں گے ہر چند کہ بڑوں کو دیکھ لینے والی نظر چھوٹوں کو وقیع نہیں سمجھتی مگر یاد رکھیں کہ پھر ایسے بھی نصیب نہ ہوں گے کہ زمانہ قحط الرجال کا ہے۔

اب میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے اور آپ کو اور تمامی امت محمدیہ کو توفیق بخشے کہ سنت کو اپنے دائرۂ اعمال کا مرکز بنائیں اور عادات ہوں یا عبادات اقوال ہوں یا افعال، حرکات ہوں یا سکنات، تفکرات ہوں یا تخیلات سرامر اور ہر حال میں طریقۂ محمدیہ مرضیہ کو مطرح نظر قرار دے کر محبانہ و عاشقانہ مگر عاقلانہ و مودبانہ طریق پر اللہ جل جلالہ کی رضاجوئی میں اپنی عمر کو ختم کردیں۔ اور اگر شامت اعمال سے یہ درجہ نصیب نہ ہو تو کم سے کم سنت کی عظمت اور

---

[1] اور خود مصنف حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب جو بڑے پایہ کے خلفا میں تھے تواضعاً نام نہ لکھا۔

متبعینِ سنت کے ساتھ محبت اور ان کے قدم بقدم چلنے کی رغبت قلب میں ضرور ہو کہ بس یہی کام آنے والی چیز ہے۔ نیز درخواست ہے کہ جو حضرات اس سے نفع اٹھائیں میرے لئے بھی دعا فرمادیں کہ حق تعالیٰ شانہ اپنی محبت اور اپنے حبیب کا اتباع نصیب فرماوے اور دنیا سے حلاوتِ ایمان کے ساتھ اٹھاوے ؎

عمرِ عزیز[1] قابلِ سوز و گداز نیست

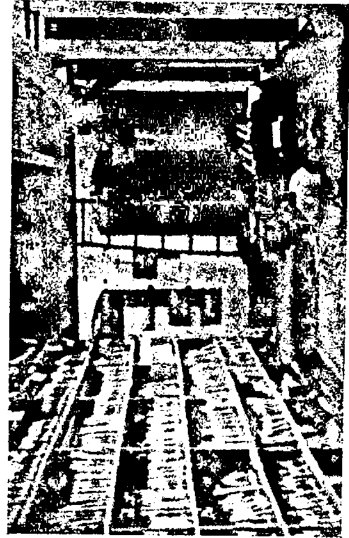
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی عبدہ ورسولہ سیدنا ومولانا وقائدنا وامیرنا وشفیعنا وھادینا ونبینا ومرشدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔ فقط

بندۂ ناچیز **عاشق الٰہی** عفی عنہ

---

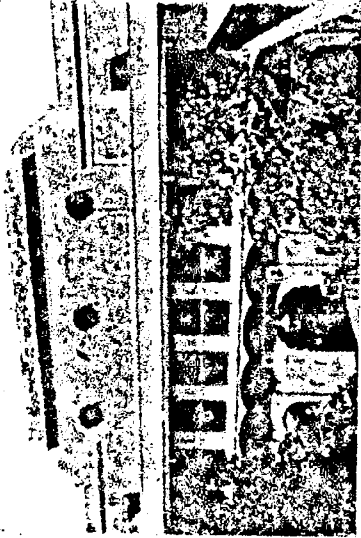
[1] عزیز عمر سوز و گداز جلنے پگھلنے کے قابل نہیں اس دھاگہ کو مت جلاؤ کہ یہ زیادہ لمبا نہیں یعنی دنیاوی امور کے سوز میں نہ جلاؤ۔



کتب خانہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور



درسگاہ قدیم و حجرۂ قیام گاہ حضرت رحمہ اللہ



دار الطلبہ و دار الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور


آپ بیتی
شمائل ترمذی
خصائل نبوی
فتاویٰ مظاہر علوم
سوانح عمری
مکتبۃ الشیخ
۴۴۵/۳ - بہادر آباد - کراچی ۵